PDF
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
فروری 2018
FEBRUARY 2018

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہو گا۔ شُکریہ

MEMBER APNS — CPNE

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لیلیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 48 • شمارہ 02 • فروری 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Health

دنیا کا سب سے مہنگا زہر جس کی قیمت اربوں روپے میں ہے | World's Most Expensive Poison

computerxtech 0 Oct 03, 2017

اس ایک لیٹر زہر کی قیمت تقریباً ایک ارب 10 کروڑ پاکستانی روپوں کے مساوی ہے۔ دنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایکWorld's Most Expensive Poison) قسم "ل... Readmore

---

Health

بوڑھوں کو جوان بنانے والی سائنس | Old to Young Conversion Science

computerxtech 0 Sep 11, 2017

انسان کے جسم میں خلیوں کی دو سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ فوٹو : فائلپچھلے سال [illegible] 20... Readmore

---

Health

صحت کے معاملے میں خواتین کی 10 سنگین غلطیاں | Ten Health Mistakes by the Women

computerxtech 0 Sep 11, 2017

خوبصورت نظر آنے کے لیے خواتین دنیا بھر کے جتن کرتی ہیں لیکن اکثر کو شکایت رہتی ہے کہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فوٹو، فائلکراچی: اچھی صحت اور خ... Readmore

---

Health

ایسپرین دانتوں کو خرابی سے روک کر انہیں ازخود مرمت کے قابل بناتی ہے | Dental Treatment with Aspirin

computerxtech 0 Sep 11, 2017

کوئنزیونیورسٹی کے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایسپرین دانتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ فوٹو: فائل لندن: سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گھروں میں ... Readmore

---
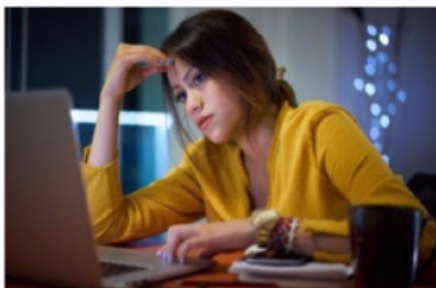
Health News

فکر اور پریشانی سے نجات پانے کے تین آسان طریقے | Three easy ways to eliminate Tension

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ماہرین نفسیات نے پریشان خیالی سے چھٹکارا پانے کے تین اہم طریقے بیان کئے ہیں۔ فوٹو: فائل لندن: ماہر نفسیات کے مطابق پریشان اور فکرمندی کی س... Readmore

---

Health News

ادرک جوڑوں کے درد کے لیے اکسیردوا | Benefits of Ginger

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ادرک میں کئی اجزا جلن، درد اور سوزش کو کم کرتے ہیں۔ فوٹو: فائلکراچی: ادرک کے جسمانی و طبی فوائد سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور اب ماہرین نے اس کے اس... Readmore

Interesting News

بچت کرنے کے 7 طریقے | Seven Methods of Savings

computerxtech 0 Oct 13, 2017

پیسہ خرچ کرنا جتنا ضروری ہے، پیسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ بچی ہوئی رقم مستقبل میں کسی آڑے وقت میں کام آ سکتی ہے۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی ... Readmore

---

Interesting News

دنیا کے خطرناک روڈ | World's Most Dangerous Roads

computerxtech 0 Oct 02, 2017

دنیا بھر کے خطرناک ترین روڈ میں ایسی گزرگاہیں شامل ہیں جو اپنی تعمیر، محل وقوع، اونچائی، طوالت اور موسم کی وجہ سے عام سڑکوں کی نسبت مختلف ہیں دنیا بھر... Readmore

---

Interesting News

عرب امارات کے حکمران کروڑوں ڈالر خرچ کرکے زمین پر مریخ بنائیں گے

computerxtech 0 Oct 01, 2017

امارات کی حکومت نے اگلے 100 سال میں مریخ پر انسانی آبادی بسانے کے منصوبے کا افتتاح کردیا۔ فوٹو: حکومتِ بیئیدبئی؛ متحدہ عرب امارات کے حکمران 15 ک... Readmore

---

Interesting News

کیا آپ مریخ پر جانا چاہتے ہیں ؟

computerxtech 0 Oct 01, 2017

مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ پانی کی موجودگی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرخ سیارہ انسان کی دلچسپی کا سبب بن چکا ہے فوٹو: فائلانسان چاند پر... Readmore

---

Interesting News

مریخ کے بارے میں 11 حیرت انگیز معلومات

computerxtech 0 Oct 01, 2017

خلائی کھوجیوں کی بڑی تعداد مریخ پر پہنچی گئی ہے اور امید ہے کہ اگر زمین کے علاوہ زندگی اسی سیارے پر ممکن ہے۔ فوٹو، فائلکراچی: زمین کے بعد مریخ عا... Readmore

---

Interesting News

اے ٹی ایم استعمال کرنے والے اسے ضرور پڑھیں اور فراڈ سے بچیں

computerxtech 0 Sep 24, 2017

سائبر لٹیرے اے ٹی ایم میں تبدیلی کرکے بھی آپ کو قیمتی سرمائے سے محروم کرسکتے ہیں۔ (فوٹو: فائل)کراچی: پورے ملک میں نقد رقم نکلوانے کےلیے آٹو ٹیل... Readmore

MEDICAM
Whiteness
in 14 days
*No Side Effects
MEDICAM
BLEACH CREAM
MEDICAM
Bleach Cream
MEDICAM
BLEACH CREAM
Skin Whitening Cream
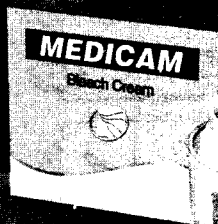
عزیزانِ من......السلام علیکم!

قصور میں پیش آنے والے روح فرسا واقعے نے پورے پاکستانی معاشرے کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ اس سے پہلے بھی کچھ آٹھ بچیوں کے ساتھ ہوا۔ شواہد ہیں کہ ملعون مجرم ایک ہی ہے لیکن وہ تادمِ تحریر آزاد ہے۔ سوشل میڈیا پر کچھ معزز اور معتبر خواتین نے بہت حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنے بچپن میں جنسی تشدد اور مجرمانہ استحصال کے واقعات کا انکشاف کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زینب کے قاتل جیسے مجرم عرصۂ دراز سے ہمارے اردگرد پنپ رہے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ بچوں پر جھپٹنے والے ان درندوں کو ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ ایسا خیال بھی کسی کے دماغ میں گزر نہ پاسکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے تفتیشی افسران اور استغاثے کی پیروی کرنے والے دل و جان سے ایسے غلیظ اور بھیانک جرائم کی بیخ کنی کو اپنا مشن بنالیں۔ ایک طرف یہ شرمناک معاشرتی واقعہ ہے اور دوسری طرف ایک چوہا کہانی جاری ہے۔ چوہا شراب کے مٹکے میں گر گیا۔ جدوجہد کر کے باہر آیا تو خمار سے بے حال تھا۔ آتے ہی پوچھا، بلی کہاں ہے؟ میرے سامنے لاؤ، وہ آئی اور چوہے کو کھا گئی۔ کچھ یہی حال اپنے ٹرمپ صاحب کا بھی ہے۔ اقتدار کے نشے سے بے حال ہیں۔ آئے دن کچھ نہ کچھ ہذیان فرماتے رہتے ہیں۔ وائٹ ہاؤس کا ماتحت عملہ ان کے فرمودات کی وضاحتیں دے دے کر پریشان ہوگیا ہے۔ شمالی کوریا کی بلی کو خوفناک لہجے میں للکارا، ادھر سے دہشت ناک غراہٹ سنائی دی تو فوراً ہی دبک گئے۔ امریکی قوم اپنی جمہوریت کے ہاتھوں پریشان ہے۔ قومی مفاد کے نام پر جذباتی تقریروں اور جارحانہ نعروں سے مرعوب ہو کر ٹرمپ کی جماعت کو ووٹ دے بیٹھے، اب پشیمان ہیں۔ امریکی دانش ور اور سنجیدہ حلقے سخت تشویش میں مبتلا ہیں کہ اس اقتدار کی بقیہ مدت کیا گل کھلائے گی، چار سال کب اور کیسے پورے ہوں گے۔ آئے دن اس شخص کا کوئی نہ کوئی اسکینڈل سامنے آرہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ موصوف بچپن سے عورتوں کے شوقین تھے۔ ارذل پیشوں سے وابستہ خواتین سے شوق فرماتے رہے۔ امریکا کے صدارتی الیکشن کے دنوں میں ایسی متعدد خواتین کو زبان بندی کے لیے دو کروڑ ڈالر دینے کی خبر ابھی تازہ ہے۔ اس شخص نے بیت المقدس میں امریکی سفارت خانہ منتقل کرنے کا اعلان کر کے اپنی مسلم دشمنی کا کھلا ثبوت دیا ہے۔ پھر پاکستان کے بارے میں موذی سے بڑھ کر زہرافشانی کر بیٹھا۔ یہاں سے منہ توڑ جواب دیا گیا تو اب ان کے سفارت کاروں کی بھاگ دوڑ جاری ہے۔ مفاہمت اور مصالحت کی کوششیں چل رہی ہیں کیونکہ افغانستان کے چوہے دان میں بھیجے گئے ہزاروں امریکی فوجیوں کا دانہ پانی اور ساری رسد پاکستان کے راستے پہنچتی ہے۔ متبادل اور مہنگے راستے مل سکتے ہیں لیکن ان کے بندوبست کے لیے وقت درکار ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ اقتدار کے نشے میں دھت اس حکمران کو ربّ العالمین وہ متانت و بُردباری اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس کے منصب کا تقاضا ہے۔ اب چلتے ہیں اپنی بہار آفریں محفل میں جہاں دھیمے اور بلند لہجوں کے باوجود کوئی للکار نہیں ہے۔

بہاولپور سے مظہر سلیم ہاشمی کا سالانہ تجزیہ ”طویل عرصے کے بعد تبصرہ لکھ رہا ہوں اور سالانہ جائزہ تو بہت ہی زیادہ عرصے بعد۔ یہ سب بطور تبصرہ نگار میری پسند ناپسند ہے سو کسی کا متفق ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ آغاز حسب معمول سرورق سے اور اس سال کے ٹائٹلو بھی مکس رہے۔ یعنی اچھے، بہت اچھے، گزارہ اور آؤٹ کلاس۔ میرے نزدیک ان کی نمبرنگ کچھ یہ رہی۔ 12۔ ستمبر، ایسا لگا جیسے پرانے ٹائٹلو مکس کردیے ہوں۔ 11۔ مئی، سچویشن اچھی تھی لیکن حسینہ بہت بری۔ 10۔ دسمبر، کوئی ستر اسّی کی دہائی کا ٹائٹل لگ رہا تھا۔ 9۔ فروری، سب کچھ بہت پیارا تھا لیکن پرانا ٹائٹل تھا اس لیے اچھی پوزیشن نہ لے سکا۔ 8۔ مارچ، بہترین سچویشن لیکن لڑکی کوئی لڑکا نما لگ رہی تھی۔ اس لیے پسند نہیں آیا کوئی خاص۔ 7۔ اکتوبر، سادہ سا ٹائٹل۔ ماسک مین کے ساتھ اچھا لگا۔ 6۔ اگست، دیسی لک والی من موہنی حسینہ متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ 5۔ نومبر، دلکش نقوش والی خوبرو حسینہ بڑی اچھی لگی لیکن درد سے چلاتے شخص کی موجودگی نے کام خراب کردیا۔ 4۔ جون، اگرچہ ٹائٹل گرل، گرل کم اور آنٹی زیادہ لگ رہی تھی پھر بھی یہ سال کے چند بہترین ٹائٹلو میں سے ایک رہا۔ 3۔ اپریل، فرنگی حسینہ اور چلاتا شخص جہاں سرورق کی خوبصورتی بڑھا رہے تھے وہاں موجود بھاگتے شخص نے ایک بہترین سچویشن بنا دی۔ بہت پیارا سرورق تھا۔ 2۔ جنوری، بہت خوبصورت لڑکی، قبول صورت زخمی شخص اور پستول بردار ہاتھ، فل جاسوسی ٹائٹل، بہترین لگا اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ 1۔ جولائی، لڑکی کو نشیلی آنکھوں اور اسٹریٹ بالوں کے ساتھ قبول صورت کہا جاسکتا ہے لیکن وہاں موجود مرد کے چہرے کے تاثرات کمال کے پینٹ کیے ہیں ذاکر انکل نے۔ مزہ آگیا، سونے پہ سہاگا بیگ چھیننے اور قتل کی سچویشن تھی جس نے ٹائٹل کو نمبر ون کی پوزیشن پر لا کھڑا کیا۔ چینی نکتہ چینی کی محفل میں اس سال خوب رونق لگائی رکھی ممبرز نے۔ منصور حبیب پلیجو، لیلیٰ کوثر لاشاری، اے آر جٹ، طلعت مسعود، سیف خان نے تو پہلی پوزیشن بھی اپنے نام کی۔ ان کے علاوہ مجھے سبا ارشد، ایمانے زارا شاہ، سعدیہ قادری، پرویز لانگاہ، قدرت نیازی، تانیہ مہر، اشفاق شاہین، فراز سومرو، کوثر اسلام، شفقت محمود، شاہد ذوالفقار اور وصلی برادران کے تبصرے بے حد پسند آئے۔ ان سے ہٹ کر محفل میں توصیف علی، عرفان راجا، عاصم جٹ، بلقیس خان، منحہ رمشا، مومنہ کشف، شفقت محمود، حفصہ طارق، انیلہ ظفر، بابر عباس کے تبصرے کمال کے رہے اور خوب رونق لگائے رکھی۔ بابر عباس کا حالیہ جنوری کا تبصرہ آؤٹ کلاس ہے لیکن رائٹرز کے حوالے سے ان کی کہی گئی کچھ باتیں ناگوار گزریں۔ بشریٰ افضل نے بھی ایک حاضری لگوا ہی لی۔ ان سے بھی جلد ملاقات کا ارادہ ہے۔ سال کی ابتدا میں ایک 007 بھی تشریف لائے لیکن جلد ہی رفوچکر ہوگئے۔ مجموعی طور پر چینی نکتہ چینی کی نوک جھوک بحال

ہوئی لیکن وہ مزہ نہیں جو پہلے کبھی آتا تھا۔ تو پیارے تبصرہ نگارو...... ذرا اور جم کے محفل میں شغل لگاؤ۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ سابقہ سال کی طرح اس سال بھی جاسوسی کے روشن ستارے اللہ نے اپنے پاس بلالیے۔ سلیم فاروقی، ایم اے راحت اور احمد صغیر صدیقی جیسے کہنہ مشق قلم کار اس سال ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ ادارے کی طرف سے سلیم فاروقی اور ایم اے راحت صاحب کی وفات پر ان کے تذکرے کے ساتھ ان کی کہانیاں بھی شامل کی گئی تھیں لیکن احمد صغیر صدیقی کی وفات کا ذکر بھی نہ کیا گیا جس کا ازحد افسوس ہوا۔ ابتدائی صفحات جاسوسی کا خاصہ ہیں اور اس سال ان پر ایک ہی نام چھایا رہا۔ جی ہاں امجد رئیس۔ ایک سے بڑھ کر ایک تراجم انہوں نے لکھے اور سب سپر زبردست۔ اپریل کے شمارے میں تلاشِ ماضی ان کی تحاریر میں میرے نزدیک اول نمبر پر رہی، جبکہ اکتوبر کی جیک ریچر والی آبلہ پا نے دوسری اور جون کی نیلا دائرہ نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ دوسرے نمبر پر ایچ اقبال رہے۔ انہوں نے بھی ابتدائی صفحات کے لیے تین ہی کہانیاں لکھیں۔ مردِ آہن نومبر میں پیش ہوئی اور ان کی سب تحاریر پر بازی لے گئی۔ مئی کی جنگِ دلربا ایک بہترین کاوش رہی۔ البتہ فینٹسی کافی زیادہ رہی۔ جولائی کی پُرخار راستے کا مرکزی خیال بہت اچھا تھا لیکن مجھے کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ پروین زبیر نے اس سال دو ہی تحاریر لکھیں اور دونوں ابتدائی صفحات پر آئیں۔ خلافِ توقع مجھے ان کی قلم پر وہ گرفت محسوس نہ ہوئی جو ان کی تحاریر کا خاصہ ہوتی ہے۔ کرکٹ کے موضوع پر لکھی گئی فروری کی تحریر جنونِ وفا اور دسمبر کی دوسری موت میں تسلسل اور روانی کا فقدان نظر آیا۔ موضوع بہت اعلیٰ رہے لیکن قلم کی گرفت میں روانی محسوس نہ ہوئی۔ بس ایک جملے میں کہوں تو ایسا لگا کہ جیسے کوئی کمی سی رہ گئی۔ جنوری کے شمارے میں حسام بٹ نے برعکس کے ساتھ تشریف لاکر خوشگوار سرپرائز دیا۔ سال کی پسندیدہ ترین کہانیوں میں سے ایک رہی لیکن باقی پورا سال وہ سسپنس میں ہی بری طرح مصروف رہے، جاسوسی میں جھلک دکھانے سے گریز کیا۔ مارچ کے شمارے میں اقبال کاظمی مرحوم کی تحریر راہ گزیدہ سرپرائز آف دا ایئر رہی۔ اتنے طویل عرصے بعد مرحوم کی تحریر پرانے دور میں لے گئی اور خوب محظوظ کرایا۔ اختتام البتہ اس کا ایسا لگا جیسے وہ مکمل نہ کرسکے اور کہانی تشنگی کا احساس چھوڑ گئی۔ ڈاکٹر سلیم عادل نے ستمبر کے مہینے میں طویل عرصہ بعد رقصِ ابلیس کے نام سے ترجمہ لے کر حاضری دی جو کہ کافی دلچسپ رہی۔ منفرد مزاج کے ساتھ ایک نہایت دلچسپ کہانی رہی۔ اس سال ابتدائی صفحات پر کبیر عباسی نے بھی اگست کے مہینے میں دوراستے کے ساتھ انٹری ماری اور کیا خوب انٹری دی۔ سال بھر کی سب سے زیادہ تذکرہ ہونے والی کہانی قرار پائی اور خوب چرچے رہے اس کے۔ قسط وار میں انگارے کے ہنگامے سارا سال جاری رہے۔ بلاشبہ کسی بھی ڈائجسٹ کی قسط وار کہانی کے مقابلے میں یہ نمبرون رہی۔ دسمبر کی قسط ذرا سلو رہی۔ لیکن لگتا ہے کہ شاہ زیب کے ہنگامے نئے سال میں نئی تباہیاں لے کر آئیں گے۔ آوارہ گرد سال کی ابتدا میں کافی زیادہ دلچسپ اقساط پر مشتمل رہی جس پر تعریف کے خوب ڈونگرے برسائے گئے لیکن انڈیمان سے واپسی والی قسط نے مزہ کرکرا کردیا۔ پاکستان واپسی کے بعد سے شہزی کا کا کچھ ماٹھا ہو گیا ہے۔ تھائی لینڈ میں اس کی موجودگی بھی دیکھتے ہیں کب تک دلچسپی برقرار رکھتی ہے۔ مختصر کہانیوں میں نمبرون پر منظر امام رہے۔ ہر موضوع پر قلم آرائی کی اور ہمیں ہنسانے سے لے کر رُلانے تک کا کام بخوبی سرانجام دیا۔ کبیر عباسی کی کیس سیریز بھی خوب رہی۔ تنویر ریاض کے تراجم کمال تھے۔ عکس فاطمہ اور جمال دستی نے بھی خوب سماں باندھا۔ عمران قریشی اور اعتزاز وصلی کی آمد بھی خوش آئند رہی۔ انجم فاروق ساحلی کی تجربے کی ذہانت ایک خوبصورت داستان رہی۔ زویا اعجاز نے بھرم اور مکافات کے ذریعے اپنی جگہ بخوبی بنائی اور نبھائی۔ یاسر اعوان ایک نیا نام لیکن کہانیاں آؤٹ کلاس۔ مئی کی چہرہ ساز اور نومبر کی ثبوت میری پسندیدہ رہیں۔ ایک بات یہاں کہنا چاہوں گا کہ جانے کیوں مجھے ان کی کہانیاں اسّی کی دہائی کی بہترین تحاریر کا ری۔ سائیکل ورژن لگتی ہیں۔ کیا باقی قارئین کو بھی ان کا لکھا پہلے سے پڑھا پڑھا لگتا ہے یا یہ صرف میری خام خیالی ہے؟ دسمبر کی جاگیر کے اسیر عبدالقیوم شاد جیسا طرزِ تحریر رکھتی ہے۔ میری جولائی کی آسان مشکل اور دسمبر کی حاسد کو تبصروں میں بہترین پذیرائی ملی۔ بات کی جائے جاسوسی کے پیارے پیارے رنگوں کی تو میرے نزدیک روبینہ رشید ایک سے بڑھ کر ایک پیش کیے گئے چار رنگوں کے ساتھ بازی لے گئیں۔ مئی کی زنِ آہن سب سے زیادہ پسند آئی۔ ستمبر کی لہو کا کھیل اور دسمبر کی ہم قدم اگرچہ ماخوذ محسوس ہوئیں لیکن دلچسپی کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کی تھیں۔ جولائی میں پیش کیا گیا پہلا رنگ سوگ وزیاں بھی بے حد شاندار رہا۔ رنگوں میں اس سال ایک نیا نام زویا اعجاز کا شامل ہوا اور کیا زبردست طریقے سے شامل ہوا کہ سال کے چار رنگ لکھ ڈالے۔ آغاز جنوری کے تاوان سے ہوا اور اختتام دسمبر کے ہولناک سائے سے۔ مارچ میں شناخت کے نام سے خواجہ سراؤں کی زندگی جیسے تلخ موضوع کو زیرِ قلم لائیں لیکن جانے کیوں مجھے جون کے ماہ میں پیش کیا گیا رنگ قیمت سب سے عمدہ لگا۔ سال کے بہترین رنگوں میں سے ایک کہانی تھی۔ اگر میں سال بھر کے رنگوں کی نمبرنگ کروں تو یہ رنگ شاید پہلے نمبر پر آئے۔ گڈ جاب زویا۔ اور امید ہے کہ تواتر سے ایسا لکھنا برقرار رہے گا۔ فاروق انجم نے بھی اس سال چار رنگ لکھے۔ جون کی مظلوم عاشق میرے نزدیک سال کی سب سے بری تحریر ہوتی لیکن اکتوبر میں فرار لکھ کر انہوں نے میرا خیال غلط ثابت کردیا۔ اپریل کا رنگ پسِ آئینہ ان کی ایک بہترین کاوش تھی جس میں دلچسپی برقرار رہی۔ مئی کا رنگ منصوبہ ساز کو خواہ مخواہ اتنا پیچیدہ بنادیا گیا کہ کہانی اپنا مقصد کھو بیٹھی۔ امید ہے کہ نئے سال میں یہ کچھ بہتر کاوشیں لے کر حاضر ہوں گے۔ اسماء قادری نے بھی اس سال تین رنگ لکھ ڈالے۔ جنوری میں پیش کیا گیا پرل سیریز کا رنگ رگِ جاں سب سے اچھا رہا۔ جولائی میں دہشت نگر کے ساتھ بھی ایک لاجواب کہانی پیش کی۔ اگست کی مظلوم ظالم بہت روایتی سی لگی اور کوئی خاص رنگ نہ جما سکی۔ امید ہے اس سال اور کچھ نہ سہی پرل سیریز کی ہی ایک دو اقساط پڑھنے کو مل جائیں گی۔ سلیم فاروقی صاحب اس سال صرف دو رنگ پیش کرپائے اور باقی کے لیے انہیں زندگی نے مہلت نہ دی۔ فروری کی قزاقِ اجل ان کا مخصوص مار دھاڑ اور ایکشن والا انداز لیے ہوئے تھی جو کہ سسپنس ختم ہونے کے باوجود پسندیدگی کے معیار پر پورا اتری۔ البتہ مارچ میں پیش کی گئی اونچی اُڑان ایک بہترین کاوش تھی۔ کبیر عباسی کے بھی اس سال دو رنگ آئے۔ اپریل کی آخری خواہش کے ذریعے انہوں نے صحیح ہم سب کو اپریل فول بنایا اور کئی لوگوں کو تحریر ہضم ہی نہ ہوسکی، لیکن اکتوبر کا رنگ انتخاب میرے نزدیک سال کے بہترین رنگوں میں سے ایک تھا۔ کلائمکس سے قدرے اختلاف کے باوجود اس تحریر نے واقعی متاثر کیا۔ اس سال کے ٹاپ کلاس رنگوں میں سے ایک رہی۔ باقی سب لوگوں کے ایک ایک رنگ ہی شامل ہوئے۔ امجد جاوید نے اگست میں خنجر بکف لکھ کر زبردست قسم کی واپسی کی اور

مزید کا انتظار ہے۔نومبر میں عشق زہرناک کے ساتھ منظر امام آئے۔کہانی مزیدار تھی بس طول دینے کے چکر میں تھوڑا پٹری سے اتر گئی۔شبنم شفیق کا فروری کا رنگ شکار جاسوسی کے مزاج کے عین مطابق ایک خوبصورت کاوش تھی۔کہنا بس یہ تھا کہ بہت خوب لکھا ہے، اس معیار کی شاندار کہانیاں لکھا کریں۔ستمبر میں شکیل کاظمی نے بھی خود کردہ را کے ساتھ ایک خوبصورت آغاز کیا اور نومبر کے شمارے میں میرے تحریر کردہ رنگ باعثِ تاخیر کو جن ساتھیوں نے پسندیدگی کی سند سے نوازا ان کا بے حد شکریہ۔آپ کی محبتیں برقرار رہیں تو آئندہ بھی بہتر سے بہتر کاوشیں پیش کرتا رہوں گا۔کترنیں اور کارٹون بھی مناسب رہے۔‘‘

ایم اقبال کی سینٹر جیل میانوالی سے حاضری ’’جاسوسی کے دیوانے تو ہم 41 ماہ سے ہیں مگر اپنا محبت نامہ بھیجنے کی دوسری جسارت کر رہا ہوں۔ پچھلی مرتبہ تو میرا خط ردّی کی ٹوکری میں چلا گیا اس دفعہ اللہ خیر کرے۔ادارے اور جاسوسی کے تمام قارئین اور تمام اہلِ وطن کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔نئے سال کے آتے ہی ادارے نے شمارے کی قیمت بڑھادی ویسے بھی ہمیں تو جیل میں 125 روپے کا شمارہ مل رہا ہے۔ٹائٹل پر نظر ڈالی تو حسینہ کی تعریف کرنے سے قاصر رہے کیونکہ عرصہ ہوا ہے کسی کی تعریف کیے۔اب تو کسی کے سحرزدہ کردینے والے حسن کو دیکھ کر بھی تعریف نہیں کر پاتے اس لیے سیدھا دوستوں کی محفل میں پہنچے جہاں کوئٹہ سے سیف خان تشریف فرما تھے۔اچھا تبصرہ تھا۔محمد صفدر معاویہ، بلقیس خان، عبدالجبار رومی انصاری ان کے تبصرے پڑھے، اچھے لگے۔بہاولپور سے مومنہ کشف کا شوخ و چنچل تبصرہ اچھا لگا۔اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کا پُرغرور تبصرہ بھی پسند آیا۔باقی بھی سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کے قلم کا شاہکار انگارے پڑھی جہاں تاجور بھی شاہ زیب کے سچے جذبوں کی دھیمی آنچ سے پگھل گئی۔مغل صاحب پلیز اب ان کو ملا بھی دیں، ان کی جدائی اب اچھی نہیں لگتی۔کہانی نے اتنا مزہ دیا کہ ایک دفعہ پڑھنے کے فوراً بعد دوسری دفعہ پڑھی پھر کہیں جا کر دل کو چین آیا۔ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد پڑھی۔شہزی خان کی مشکلیں ہیں کہ بڑھتی ہی جارہی ہیں لگتا ہے شہزی نے کاسپا کو جیسے ناگ کو چھوڑ کر غلطی کی ہے، چلو آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔سرورق کے رنگوں میں پہلے محمد یاسر اعوان کی زخمی دل پڑھی، زبردست کہانی تھی۔عرفان جیسا حقیر تحفہ شاید ہی کوئی دے پائے مزہ آگیا پڑھ کر۔دوسرا رنگ اسما قادری کی مداوا پڑھی جو بہت ہی اچھی لگی۔عمران کے ساتھ ناانصافی ہوئی بہت پھر اس نے تو ایسا بننا ہی تھا آخر میں۔‘‘ (لیجیے مل گیا خط)

فیصل آباد سے عائشہ مرزا کی عرضی ’’یکم جنوری کو جاسوسی ہاتھ میں آیا تو سرورق میں ہی کھو گئی۔بہت بہت خوب صورت سرورق تھا۔چینی نکتہ چینی میں آپ کی لاجواب باتوں کے بعد سیف خان صاحب کا اچھا سا تبصرہ پڑھا۔مخدہ رمشا اور ایمانے زارا کے تبصرے ہمیشہ کی طرح زبردست رہے۔سب سے اچھا تبصرہ عباس برادرز کا تھا جس کو پڑھتے وقت مسکراہٹ لبوں سے جدا نہیں ہوئی۔مجھے تو کچھ خاص تبصرہ نہیں کرنا آتا پھر بھی کوشش کرتی ہوں، بڑوں کی محفل میں آئی ہوں تو سیکھ ہی جاؤں گی۔(انشاء اللہ! پیوستہ رہ شجر سے) سرورق کے پہلے رنگ میں یاسر اعوان صاحب زخمی دل لیے حاضر تھے۔نئے سال کا تاثر لیے زخمی دل اچھی تحریر تھی۔اختتام پر خوشی اور غم کا ملا جلا احساس تھا۔دوسرے رنگ میں اسما قادری کے قلم سے خوب صورت تحریر پڑھنے کو ملی۔ایک طرف دہشت گردوں کا مکروہ چہرہ اور دوسری طرف عمران اور زارا کی محبت جس میں اتنا وقت گزر جانے اور کٹھن راہوں پر چل کر بھی کمی نہیں آئی، شاندار تحریر تھی۔تابکار مجرم، او مائی گاڈ۔دلچسپی سے بھرپور، انکشافات سے لبریز تھی۔ویسے سرورق کے دونوں رنگوں میں ایک بات مشترک تھی، دونوں میں ہیرو اپنی جان دے دیتا ہے۔شبنم شفیق صاحبہ کی لمحۂ آخر نے چونکا دیا۔اندھیرے میں قید شاہانہ کا حال پڑھتے ہوئے میں خود بھی کانپ رہی تھی مگر سردی سے۔دو دوستوں کے درمیان جب پیسا آجائے تب کام خراب ہوتا ہے۔اسی بات کو عیاں کرتی فاروق انجم صاحب کی تحریر اعتراف کامیاب رہی۔بندوبست بھی اچھی تھی۔جعلی تصویر ویل ڈن جی۔پکڑ میں ہم شکل بھائی یقیناً سادہ لوح تو نہیں تھے۔تحریر دلچسپ تھی۔لمحوں کا کھیل بور کرتی تحریر تھی۔تلاش بھی مجھے پسند نہیں آئی، بہروپیا اچھی تھی۔‘‘

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کا تبصرہ ’’نئے سال کا خوبصورت سا شمارہ ہاتھ آتے ہی سرورق پر نگاہیں دوڑائیں۔ایک نیلی نیلی خاتون، ہم رنگ چشمہ لگائے ٹکر ٹکر سرد و گرم دیکھنے میں مگن تھی۔دل نے کہا اسے آواز دے کر انفارم کروں ذرا پیچھے تو مڑ کر دیکھیے پستول کی زد میں ہیں......! لیکن پھر ارادہ ترک کر کے اداریے کی طرف قدم بڑھائے۔اخبارات میں انسانیت سوز واقعات پڑھ کر طبیعت اتنی مکدّر ہو چکی ہے کہ اداریہ پڑھ کر مزید طبیعت بوجھل ہوگئی۔پتا نہیں کس طرف جارہے ہیں ہم۔اُف پلیز کچھ لائٹ سا لکھا کیجیے۔نکتہ چینی میں پچھلے ماہ طلعت قابض تھے تو رواں ماہ سیف خان نے میدان مار لیا مبارکاں۔ڈاکٹر سبا آپی کو جو مشورے دے رہے ہیں ان پر آپ کا عمل کرنا بھی بنتا ہے۔میرا تبصرہ کوئی دریائے نیلم تھوڑی ہے جو شائیں شائیں کررہا تھا۔عائشہ مرزا ایک آپ ہیں کہ للکار کی وجہ سے جاسوسی سے قطع تعلق کردیا اور ایک ہم ہیں للکار نے جاسوسی کا فین بنادیا۔مومنہ کشف...... آہا...... آپ کو میرا تبصرہ مزے کا لگا حالانکہ لوگوں کو ہری مرچ لگتا ہے۔پرویز لانگاہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں۔ایک ہی سانس میں جاری تبصرہ میں نے بھی ایک ہی سانس میں پڑھا۔آئندہ سکون سے کاؤچ پر بیٹھ کر تبصرہ لکھیے گا تاکہ ہیڈ لائنز اور تبصرے میں فرق تو پتا چلے۔باقی سب کے تبصرے بھی اچھے رہے۔انگاروں کی تپش دھیمی ہونے لگی تھی کہ تاجور صاحبہ کی شادی نے پھر سے ماحول گرم کردیا۔شاہ زیب نے فلمی ہیرو کی طرح اینٹری تو خوب ماری ہے، شکر ہے اچانک افتاد سے تاجور کا ہارٹ فیل نہیں ہوا۔ایک مزے کی بات ہے شاہ زیب کو ہمیشہ ہی اپنے دشمنوں کو بلیک میلنگ کے لیے مواد مل جاتا ہے...... غیبی امداد...... ہاؤ لکی......! ویسے اب کسی دنگے فساد کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔سیف کی ماں کی موت سوگوار کرگئی لیکن اسپتال میں پہلے سے داخل ہونے والی سچویشن ڈالنا حقیقت سے دور لگی۔اسما قادری کی مداوا نے برسوں سے جاری دہشت گردی کے کچھ پہلوؤں کا عمدگی سے احاطہ کیا۔عمران و صنوبر جیسے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کا شکار ہونا اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ معاشی طور پر مستحکم و غیر مستحکم دونوں ہی ان عناصر کے

ہاتھوں استعمال ہو رہے ہیں۔ عمران نے اپنے گناہوں کا مداوا تو کرلیا لیکن اس کی موت سے للکار والا عمران یاد آ گیا۔ لمحۂ آخر میں عفان و نویزا دونوں ہی مشکوک لگ رہے تھے لیکن کہانی نے زور سے پلٹا کھایا اور آفندی کی اپنی ہی بیٹی کے ہاتھوں موت نے اسے آخری وقت اچھا سبق دیا۔ تابکار مجرم...... زبردست کہانی رہی۔ ایلی روسیا اعلیٰ قسم کی کرمنل مائنڈڈ نکلی۔ ویسے آغاز میں جیسے وہ بندمی ہوئی ملی تھی شک سا ہوا تھا مگر پھر کہانی کے ساتھ ہی چل پڑے یوں بھی ہیری بوش جیسے ڈیٹیکٹیو کے ہوتے ہوئے ہم کیوں ہلکان ہوتے ویسے بھی اس نے کمالِ مہارت سے کلیو نکالا۔ جینیس ......راشیل تو بلاوجہ دم چھلا بنی رہی۔ اب آتے ہیں ذرا زخمی دل کی طرف جس نے دل زخمی زخمی کر دیا۔ کہانی مجھے ایک کہانی نہیں لگی بلکہ دو کہانیوں کو جوڑ کر ایک کہانی بنانے کی کوشش لگی۔ بالکل سمجھ سے بالاتر سچویشن دکھائی گئی ہیں۔ اعتراف، بندوبست، لمحوں کا کھیل اچھی تھیں۔ البتہ جعلی تصویر سیر ینا راض کی کمالِ مہارت تھی۔ ترجمہ شدہ کی سب سے فٹ کہانی لگی۔''

راولپنڈی سے عبدالودود عامر کی عالمانہ باتیں ''جاسوسی کا نئے سال کا پہلا شمارہ دو تاریخ کو ہی مل گیا۔ سب سے پہلے سرورق کا جائزہ لیا جہاں پر ایک حسینہ بڑے بڑے چشموں سے نہ جانے کسے جھانک رہی تھی اور ایک حضرت خون کے بستر پر الٹے سوئے ہوئے تھے جبکہ پس منظر میں سر پر ہیٹ اور ہاتھ میں پستول تھامے ہوئے دوسرے حضرت ایک کے بعد شاید کسی دوسرے کو سلانے کی فکر میں تھے۔ اس کے بعد چینی نکتہ چینی کا رخ کیا جہاں پر اداریے میں میرے دل کی بات لکھی ہوئی تھی۔ بیشک ان حالات کے ذمّے دار کسی نہ کسی حد تک ہم خود ہیں کیونکہ فرد معاشرے کی اکائی ہے۔ اگر ہر فرد اپنی ذات میں سدھار لانے کی کوشش کرے تو یقیناً اس کی ذات سے آنے والی تبدیلی معاشرے پر بھی اثر انداز ہوگی اور معاشرہ بتدریج تبدیلی کی طرف بڑھے گا۔ تبصروں میں ابتدائی صفحے پر سیف خان براجمان تھے۔ مبارک ہو سیف بھائی! جو حیرت آمیز خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور ادارے کے منتظمین کو دعائیں دے رہے تھے بلاشبہ سیف بھائی کا تبصرہ لاجواب تھا۔ اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ اپنے جاسوسی کا ایک سال مکمل ہونے کی خوشی منا رہی تھیں اور ٹائٹل حسینہ کو حسینہ ماننے سے انکار کرتے ہوئے اس بات کا احساس دلا رہی تھیں کہ ان کو اب واقعی عینک کی ضرورت ہے۔ پرویز احمد لانگاہ بھائی کا مختصر مگر بہترین تبصرہ تھا۔ پرویز بھائی یہ لالہ آفریدی اور احمد شہزاد والی بات سمجھ میں نہیں آئی آپ اور طلعت والی آ گئی تھی۔ واقعی مغل صاحب ہر بار ہیرو بے چارے کی مت مار دیتے ہیں۔ ہیروئن کو ایک کے چکر سے نکالتا ہے تو دوسرے میں پھنسا دیتے ہیں اور لانگاہ بھائی آپ بریانی کا بار بار ذکر کر رہے ہیں لگتا ہے کہ بیگم نے جب آپ انگارے میں مصروف تھے، اس دوران آپ کی پلیٹ میں کچی مرچیں بھی ڈال دی تھیں، عرفان راجہ میرے پڑوس یعنی گوجر خان سے تبصرہ لے کر شریکِ محفل تھے۔ اشفاق شاہین صاحب کا تبصرہ ہمیشہ سے بہترین ہوتا ہے اس بار بھی لاجواب تھا اور عباس برادران کی مثلث کاوش بھی بہترین تھی ظاہر ہے تین دماغ لگے ہوئے تھے، باقی لوگوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ چینی نکتہ چینی کے بعد سیدھے چلے اپنی پسندیدہ انگارے پہ۔ جہاں شاہ زیب بریک کے بعد دوبارہ فل ایکشن موڈ میں نظر آ رہا ہے اور تاجور سے ملاقات کھڑکانے کے بعد اب داراہیوں کو کھڑکانے کے درپے ہے، لگے رہو چیمپئن صاحب! یہ عشق نہیں آساں۔ آوارہ گرد اب تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہے۔ شہزی کا کا اس بار بھی فل ایکشن میں نظر آیا۔ چلیں اچھا ہے بچہ کسی کام تو لگا ورنہ تو ہر وقت لڑکیاں مرتی رہتی تھیں اس پر۔ یاسر اعوان زخمی دل کے ساتھ سرورق کے پہلے رنگ میں چھائے ہوئے تھے چند ایک چیزوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو کہانی بہترین لگی۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، کیا ہارٹ بینک والوں کے پاس کوئی بھی تندرست آدمی جا کر اپنا دل پیش کر دے کہ حضور نکالیے میرا دل اور کسی اور کو لگا دیجیے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ مداوا اسما قادری صاحبہ کا دوسرا رنگ، پچھلے کچھ عرصے میں پاکستان پر بیتے حالات کا آئینہ دار تھا۔ اسما قادری صاحبہ بہترین انداز میں کہانی کو لے کر آئیں اور آخر تک قاری کو کہانی میں سموئے رکھا بلاشبہ جہاں سوشل میڈیا کے فوائد ہیں وہاں پر یہ نقصان بھی ہے کہ دین کا مناسب شعور نہ ہونے کی بنا پر صنوبر جیسے لوگ غلط ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں اور وطن کے دشمنوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف ظلم اور ناانصافی بھی عمران جیسے افراد کو دہشت گردی کی پُرخار راہوں میں دھکیل دیتی ہے۔ جب تک معاشرے میں ظلم اور ناانصافی رہے گی یقیناً عمران جیسے کردار پیدا ہوتے رہیں گے۔ محمد فاروق انجم مختصر سے اعتراف کے ساتھ چھا گئے۔ لمحہ آخر دلچسپ لیکن کچھ عجیب سی لگی۔ امجد رئیس صاحب تابکار مجرم کے ساتھ اول صفحات پر موجود تھے یقیناً یہ کہانی ماہِ اول کا بہترین تحفہ ہے۔ اس کے علاوہ تلاش، جعلی تصویر اور وسیم بن اشرف صاحب کی پکڑ بھی پسند آئی۔''

راولپنڈی سے عائشہ خان کی اُلجھنیں، تفکرات اور تکالیف ''پہلی بار تبصرہ کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ اس کی وجہ ایک اُلجھن یا شاید دو یا زیادہ الجھنیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں ایک بالکل عام سی قاری ہوں۔ جو شاید بابا آدم کے زمانے سے جاسوسی پڑھ رہی ہے۔ (اچھا...... حیرت ہے!) میری سوچ اور اپروچ بھی عام سی ہے۔ تو اسی عام سوچ اور سادہ الفاظ سے اپنی الجھن بتاتی ہوں۔ قسط وار کہانیاں ہم سب ہی فالو کرتے ہیں۔ ہر کہانی تقریباً ایک جیسے پلاٹ پر چلتی ہے۔ ایک عدد ہیرو ہوتا ہے اس کی ہمیشہ ایک عدد میسنی سی ہیروئن ہوتی ہے۔ جس کا کام ہیرو کے لیے زندگی عذاب کرنا اور کہانی آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ہیرو کے ساتھ کوئی نہ کوئی زیادتی ہوتی ہے اس کے بعد وہ ورلڈ ٹور پر نکل جاتا ہے۔ سب سے پہلے انڈیا کی باری آتی ہے۔ وہاں کے لوگ ہمیشہ کینہ پرور نکلتے ہیں اور ایک نمبر کے بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی بھی جنگلی لوگوں کا علاقہ یا کوئی نئی تہذیب جہاں ہیرو فتح کے جھنڈے گاڑھتا ہے اور نئی بندیاں بھی امپریس کرتا جاتا ہے۔ اس سب میں پاکستانی زمیندار اور سیاستدان بھی تڑکا ڈالتے رہتے ہیں۔ ستانوے پرسنٹ پولیس کرپٹ ہوتی ہے۔ جو اچھے ہوتے ہیں وہ ہیرو کے دوست یا رشتے دار ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ہیرو کو ایک یا دو دوست لازمی ملتے ہیں جو اس کے لیے مرمٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ ہیرو سے زیادہ ایکٹیو بھی ہوتے ہیں۔ عقل اور نظر بھی زیادہ رکھتے ہیں اور ہیرو کی ہی کسی سائڈ سہیلی سے سیٹنگ بھی کر لیتے ہیں۔ بس ان کا مذاق ذرا بکواس سا ہوتا ہے جو ہر طرح کی سچویشن میں طول ڈالنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔ مطلب کسی بھی سچویشن میں ہیرو ہیروئن کے معاملے کے سوا باقی معاملوں میں انتہائی لکی یعنی خوش قسمت ہوتا

ہے۔اس کی گولی اور داؤ سب پر چل جاتا ہے اور وہ سب سے بچتا ہوا بڑی عقل مندی اور بہادری سے نئی معیبت تک چلتا جاتا ہے۔تاکہ اسٹوری بھی بڑھتی رہے۔مگر عموماً ہیرو حضرات خشک قسم کے ہوتے ہیں۔مذاق سے دور، مزے سے دور، لڑکیوں سے دور......بس اپنی لاجک لیے۔ان کے لیے فری ٹائم میں ایک ہی کام ہوتا ہے ہیروئن کے معصوم اور پریشان تصور میں کھوئے رہنا۔جبکہ ہیروئن کا کام پریشان ہونا اور نالاں رہنا ہوتا ہے۔خیر اس طرح ہیروئن کا اور اپنا مسئلہ حل کرتے کرتے ہیرو نیشنل اور انٹرنیشنل کاز پر کام کرنے لگ جاتا ہے۔سب کی مٹی پلید کرکے، ہیروئن سے ذلیل ہوکر، دوستوں کے مذاق برداشت کرکے آخر اچانک کہانی منکا ہی دیتا ہے۔اگر ہیرو کی جگہ ہیروئن مین کردار ہو تب بھی وہ میسنی ہی رہتی ہے۔خیر اس سب میں اب مجھے کیا مسئلہ ہے؟ مسئلہ ہے مجھے انگارے اور آوارہ گرد سے۔بات یہ ہے کہ جب یہ دونوں کہانیاں اسٹارٹ ہوئیں تو باقی کہانیوں کی طرح کچی پکی تھیں۔دونوں نے آہستہ آہستہ اپنا تسلسل بنایا۔دونوں میں ہیروئن کی وجہ سے کافی مسئلے ہوئے۔دونوں ہیرو حضرات باہر سے گھوم کر بھی آچکے ہیں۔اب جو انگارے ہے وہ روز بروز نکھرتی جارہی ہے۔آپ خود کو انہی حالات میں جکڑا ہوا پاتے ہیں۔ویسے ہی جوش میں آتے ہیں اور ویسے ہی روتے ہیں مگر آوارہ گرد ابھی تک کوششوں میں لگی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔دونوں کہانیوں میں نیو اور یوٹرنز رج کے ڈالے گئے ہیں مگر نہ جانے کیوں مجھے آوارہ گرد اتفاقات کا مربا لگتی ہے۔میں تلخ الفاظ کے لیے معذرت خواہ ہوں۔میں کہانی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں مگر نہ چاہتے ہوئے بھی میرے اندر کی ساس جاگ جاتی ہے اور مجھے اس کے ہر ٹرن ہر بات سے الجھن ہوتی ہے۔یوں کہہ لیں کہ ایک ہی بار میں شہزی کا کا اتنے اچانک اور اتنے ہی مسائل والی سچویشنز میں گھر جاتا ہے، میں ایز اے قاری گھوم کر رہ جاتی ہوں آخر کسی سچویشن میں ٹھہراؤ کیوں نہیں آتا۔آخر شہزی ہر بات کو اتنا کیوں ایکسپلین کرتا ہے اور آخر اتنا خشک کیوں ہے؟ اب کی قسط پڑھ کر تو میں تپ سی گئی تھی۔مطلب ہمیں پتا ہے پلاٹ کیا ہے مگر اس پلاٹ پر ہماری توجہ بنائی جائے۔رائٹرز کا اپنا اسٹائل ہوتا ہے مگر قاری کی دلچسپی اور تسلسل کا خیال بھی بہت اہم جز ہے۔میں ایک سادہ سی اپروچ کی عام سی قاری ہوں مگر اس بار ذرا جذباتی ہوگئی تھی۔مجھے معاف کیا جائے اور بات کا حل نکالا جائے۔''

ہری پور ہزارہ سے ذوالفقار کی دردناک درخواست ''جاسوسی کا ٹائٹل اس بار بہت پیارا تھا۔چشمہ پہنے حسینہ واقعی حسینہ لگ رہی تھی بس ٹیڑھا چشمہ تھوڑا عجیب لگ رہا تھا۔اوپر پستول والے بھائی جان کی شکل کسی اداکار سے ملتی جلتی لگی مگر یاد نہیں آیا کس سے۔اس کے پستول سے نکلنے والی گولی نے ایک بندے کو خون وخون کردیا۔نیچے مڑے تڑے ہاتھوں کے ساتھ وہ بھی خون میں لت پت پڑا تھا۔بہت اچھا رہا ٹائٹل۔تبصروں میں سیف خان کا جانا پہچانا نام دیکھ کے بے پناہ خوشی ہوئی۔عرفان راجہ سے میری بھی دعا ہے پان سی علیک سلیک ہے فیس بک پر۔ان کا تبصرہ اچھا تھا۔عائشہ مرزا، خوش آمدید۔اب ہر ماہ تبصرہ لکھنا۔انجم فاروق ساحلی ہر ماہ دو تین لائنوں کا تبصرہ ہی کیوں لکھتے ہیں؟ عبدالجبار اور منحہ رمشا کے تبصرے بھی اچھے تھے۔پرویز احمد لنگاہ کا تبصرہ پڑھ کے بہت ہنسی آئی۔ایمانے زارا، آپ نے کارستانیوں کی طرح ادھر بھی میرا نام نہیں لکھا، یہ زیادتی ہے ویسے۔مومنہ کشف میں تو ہوں ہی معصوم اور سیدھا سادہ۔کہانیوں کی سمجھ تو لگ جاتی مگر انگلش کہانیاں سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔منشی محمد عزیز کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔بابر عباس، حسنین عباس اور کمیل عباس، تینوں نے مل کے تبصرہ لکھا اور اسی حساب سے رج کے بونگیاں بھی ماریں۔بونگیوں میں انہوں نے محترم رائٹرز کو بھی نہیں بخشا۔مغل اعظم کو شغل اعظم بنادیا۔بہت برا لگا۔انگارے بہت مزے کی کہانی ہے لیکن جب اس کے آخر میں باقی واقعات آئندہ ماہ دیکھتا ہوں تو بڑا غصہ آتا ہے۔آوارہ گرد کی اپنے پاس موجود شماروں میں سے تین قسطیں پڑھ لی ہیں۔درمیان سے یہ کہانی شروع کی ہے اور افسوس ہورہا ہے کہ پہلے کیوں نہیں پڑھی۔کہانیوں میں یاسر اعوان کی زخمی دل اچھی کہانی تھی۔دل کے لیے ہونے والی بھاگ دوڑ دلچسپ رہی۔عرفان کی محبت نے بہت متاثر کیا۔اس نے اپنی محبوبہ کو بچانے کے لیے اپنا دل دے دیا۔اسما قادری کی مداوا بھی شاندار کہانی تھی۔عمران نے اپنی جان دے کے صنوبر اور مراد کے ساتھ بہت سے لوگوں کو بھی بچالیا اور اپنے دشمنوں کو بھی ماردیا۔فاروق انجم کی اعتراف کافی بور تحریر رہی۔خاص طور پر شروع میں جو کاروبار کے متعلق باتیں بتائی گئیں انہوں نے بہت بور کیا۔اینڈ بھی عجیب سا ہوا۔اس کہانی کی کسر شبنم شفیق کی لمحہ آخر نے پوری کردی۔سنسنی سے بھرپور کہانی بہت مزے کی رہی۔باقی انگلش کہانیاں پڑھنے کی میں نے بہت کوشش کی مگر مجھے ان کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔اس لیے میرا ڈائجسٹ تو مکمل ہوگیا۔انگلش کہانیاں چھوٹی بے شک ہوں مگر شروع میں تو انگلش کہانی نہ لگایا کریں۔سب سے مزے کی تو پہلی کہانی ہی ہوتی ہے، وہ انگلش دیکھ کے بہت غصہ آتا ہے۔امید ہے میری درخواست پر آپ عمل کریں گے۔''

دبئی، یو اے ای سے طلعت مسعود کی مداحی ''نئی امیدوں اور امنگوں کے ساتھ نئے سال کا سورج طلوع ہوچکا ہے اور اس کا اثر جاسوسی کے سرورق پر بھی نظر آرہا ہے۔کافی عرصے بعد ایک منفرد ٹائٹل نظر آیا۔جسے پسٹل والے انکل کی دھمکی بھی ہمیں غور سے دیکھنے سے باز نہ رکھ سکی۔اداریے میں معاشرے کی بے حسی اور بدلتے ہوئے رویوں کے بارے میں تشویش کے اظہار کے ساتھ نئی امیدوں کے لیے ہم بھی دعاگو ہیں کہ یہ سال بہتری لائے۔چینی نکتہ چینی کے سنگھاسن پر سیف خان براجمان تھے اور خوشی سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہے تھے جس کی عمر ویسے بھی ایک مہینہ ہی ہے۔بھرپور اور مفصل تبصرہ پہلی پوزیشن کا حق دار تھا۔صفدر معاویہ تفصیلاً سب کہانیوں پر روشنی ڈالتے نظر آئے۔عائشہ مرزا صاحب پہلی خوشی میں پھولے نہ سما رہی تھی۔مبارکباد اور امید ہے آئندہ بھی شامل ہوتی رہیں گی۔بلقیس خان صاحبہ بھی شاید ڈاک کی مہربانی کی وجہ سے تاخیر کا شکار تھیں۔منحہ رمشا کا دلچسپ تبصرہ اچھا لگا۔فراز سومرو کا متناسب تبصرہ بہتر رہا۔پرویز لنگاہ بھائی کا تبصرہ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا جیسے چائنا کٹنگ کا شکار رہا ہو۔اچھا تبصرہ امید ہے جلد سے جلد ہی آپ کی اگلی حاضری ہوگی۔ایمانے زارا شاہ ہم پچھلے مہینے نہیں آئے لیکن محفل میں ہمارا ذکر چلتا رہا اور اسی خوشی میں دوبارہ دستک دے دی ہے۔(شاباش بیٹا) تبصرہ زبردست رہا۔مومنہ کشف کا معصومانہ اور دلچسپ تبصرہ تھا۔منشی عزیز مئے کو طویل عرصے بعد خوش آمدید۔اشفاق شاہین صاحب بھی محتاط انداز میں رائے دیتے نظر آئے۔انکل بابر عباس سردی کے موسم میں ناشتا نہ ملنے کا غصہ اتار رہے تھے۔انکل جی کوئی نہیں صبر کریں۔اس عمر میں

اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ کہانیوں کا آغاز حسبِ معمول انگارے سے کیا۔ شاہ زیب اور تاجور کے معاملات تو کافی تیزی سے آگے بڑھے۔ لیکن اب شاہ زیب کے خفیہ کیمرے کا ذکر کچھ زیادہ محسوس ہونے لگا ہے۔ امید ہے اب آگے اس کا ذکر تھوڑا کم ہوگا ویسے بھی اگلی قسط کافی دھماکا خیز لگ رہی ہے۔ پہلا رنگ زخمی دل بالکل متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک صحت مند شخص کا دل ڈونیٹ کر کے زندگی قربان کرنا کافی فلمی سا لگا۔ کیونکہ مرنے کے بعد اعضا کے عطیات کا سنا تھا۔ دوسرا رنگ اسما قادری صاحبہ جمانے میں کامیاب رہیں۔ دہشت گردی کے عفریت اور جانے انجانے میں مختلف وجوہات کی بنیاد پر درندہ صفت لوگوں کے آلۂ کار بننے والوں کی داستان کو بہت عمدگی سے بیان کیا۔ ہمارے حکومتی اور معاشرتی نظام کو بھی ان وجوہات پر سوچنا ہوگا جس کی وجہ سے کئی معصوم ذہن ان دہشت گرد قوتوں کے ہتھے چڑھ جاتے۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس صاحب کا نام تابکار مجرم کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ تراجم کے حوالے سے حقی صاحب اور اثر نعمانی صاحب کے بعد اس وقت امجد صاحب بہترین تراجم پیش کر رہے ہیں اور ابتدائی صفحات کا حق بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ سنسنی خیز اور تھرل سے بھرپور کہانی۔ امریکی تفتیشی اداروں کی چپقلش اور مجرموں تک رسائی کی کوششوں، تابکار مادّے کی غیر قانونی ترسیل سے لے کر ہیری اور راشیل کے آپس کے تعلق، ان سب واقعات نے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ہمارے نزدیک یہ اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ مختصر کہانیوں میں تلاش از عفان آزاد بہتر رہی لیکن کہیں کہیں کہانی میں تسلسل کا فقدان نظر آیا۔ پکڑ کی تعارفی لائن میں ہم شکل بھائیوں کا پڑھ کر سسپنس کسی حد تک بریک ہوگیا کہ اس میں ہم شکل کا کوئی کردار ہوگا اور آخر میں وہی ہوا۔ (جی نہیں ابتدائی صفحات پر ہی یہ حقیقت سامنے آگئی تھی) بندوبست نچلے طبقے کی مشکلات کو بیان کرتی اچھی کہانی رہی۔ جعلی تصویر بھی اچھی لگی۔ اعتراف ایک نارمل کہانی لگی۔ زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ باقی کہانیوں کو ابھی فرصت میں دیکھیں گے۔ اس مہینے اسی کے ساتھ اجازت۔''

کوئٹہ سے **سیف خان کی تنقید و تعریف** ''ہر نئے دن کا آغاز نئی امیدیں، نئی امنگیں لے کر آتا ہے...... نئے سال کا نیا نیا آغاز ہوا تو نثار لائبریری کراچی کے ابراہیم جمالی صاحب نے اچانک جب یہ خوشخبری سنائی کہ آپ کا تبصرہ محفلِ نکتہ چینی میں سب سے زیادہ چینی ڈکار کر اول صفحے پر آیا ہے تو ایسا لگا جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے...... جیسے صحرا میں ہولے سے چلے بادِ نسیم...... جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آئے۔ نئے سال کا خوشگوار آغاز ہو چکا تھا۔ مابدولت پورے کروفر کے ساتھ محفلِ صدارت سنبھال چکے تھے۔ شگفتہ سی حسینہ سرورق دیکھ کر دل ڈگمگایا ضرور...... اور کونے والے صاحب جی کے خطرناک تیور اور مہیب نال والا پستول دیکھ کر تو بے اختیار رفوچکر ہو جانے کی بھی سوجھی...... جہاں جامشورو والے پرویز احمد لنگاہ پونچھا لگانے میں مصروف تھے اور لہک لہک کر محمود احمد مودی، ابراہیم جمالی اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی سے میل ملاقاتوں کا احوال لڈیاں ڈال ڈال کر سنا رہے تھے۔ گویا ہمارا دل گردہ جلانے کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اگلی مڈبھیڑ ایمانے زارا شاہ سے ہوئی۔ ایمانے بیٹا یہ ہر تبصرے میں اسلام آباد کا ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے کیا؟ ہم بھی ٹنڈو الہ یار میں نہیں رہتے...... ہونہہ! صدارت کے ادب آداب کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں مزید کھری کھری نہیں سنائیں اور پاس گزرتے منشی محمد عزیز مئے کو ریسیو کرلیا۔ یہاں آپ کو دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ آتے جاتے رہا کریں۔ مومنہ کشف البتہ ناک بہا بہا کر ہماری شان میں گستاخی کی مرتکب ہو رہی تھیں۔ ان سے پرے بیٹھے اشفاق شاہین صاحب پر نظر پڑی اور ہاتھ ہلایا۔ وہ بھی پان کی پچکاری چھوڑ کر جواب دینے لگے۔ اس بار فہرست میں امجد رئیس صاحب کو اولین صفحات پر دیکھ کر سکون بھری سانس لی...... جنوری کی ایک سرد شام تابکار مجرم نے یادگار بنا دی۔ کہانی تجسس اور تھرل سے بھرپور رہی۔ ڈی ٹیکٹیو ہیری بوش اور ایف بی آئی ایجنٹ راشل کی میچول انڈر اسٹینڈنگ اور ذہانت نے پولیس اور ایف بی آئی کے مابین ابہام دور کرنے میں مدد دی جس سے مجرم فائدہ اٹھا رہے تھے۔ قتل کے روایتی سراغ رسانی سے شروع ہونے والا پلاٹ آہستہ آہستہ پھیلتا اور پیچیدہ ہوتا چلا گیا اور ایک موقع ایسا بھی آیا کہ ہر سطر کے ساتھ کہانی کا زاویہ بدلنے لگا تھا۔ ایسی کہانیاں بالکل کسی گیم کی طرح ہوتی ہیں جہاں قاری کو کہانی کے جاسوس سے زیادہ کیس حل کرنے کی فکر ہوتی ہے تاہم ہیری بوش ہوا کے دوش پہ جیسے اڑتا رہا اور کہانی میکسویل کی خودکشی تک الجھی ہی رہی۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس صاحب نے اپنی عمدہ روایت برقرار رکھی۔ تابکار مجرم کا شمار سال کی بہترین تحریروں میں ہوگا۔ رنگوں میں اسما قادری صاحبہ نے مداوا کے پہلے سین کا اختتام ہی ڈرامائی انداز میں کر دیا۔ حالیہ دہشت گردی کی لہر اور بم دھماکوں کی لپیٹ لیے تحریر کا تھیم اگرچہ جاندار تھا لیکن بیانیہ اور واقعات غیر متاثر کن رہے۔ زارا کا کردار تشنہ رہا...... اور یہ نکتہ بھی مدھم رہا کہ یکا یک عمران کی کیسی کایا پلٹ گئی کہ اپنی ہی تنظیم کے کمانڈرز کے پرخچے اڑا دیے۔ زخمی دل میں یاسر اعوان صاحب دل پہ دل ٹرانسپلانٹ کر رہے تھے۔ ثانیہ کے لیے آنے والا دل سیٹھ صدیقی کو کیسے لگ سکتا ہے جبکہ اس کے لیے ڈونر اور ڈونی کے بلڈ گروپ کے ساتھ ساتھ ٹشو ٹائپنگ جیسے کئی میچنگ ٹیسٹس لازمی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کہانی میں کئی سقم موجود تھے۔ گولی نکالنے کے بجائے ہارٹ ٹرانسپلانٹ کے کئی گنا زیادہ حساس آپریشن کا مشورہ عجیب و غریب لگا۔ مختصر کہانیوں میں وسیم بن اشرف نے ہم شکل بھائیوں میں سے نقلی البرٹ کو قتل کی واردات میں پکڑ لیا لیکن تب...... جب وہ دنیاوی پکڑ دھکڑ سے دور جا چکا تھا۔ اوسط درجے کا ترجمہ رہا۔ متراجم کی جھرمٹ میں گھری فاروق انجم کی طبع زاد تحریر اعترافِ قتل کی واردات سے ہوتی ہوئی بلیک میلنگ اور اعترافی ریکارڈ پہ منتج ہوئی۔ کہانی اچھی رہی لیکن ہلکے سے انداز اختتام نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ انگارے کی تین چار اقساط میں اکٹھی پڑھتا ہوں۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ مغل صاحب کے اس شاہکار سلسلے پر تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضری ہوگی۔''

لاہور سے **اشفاق شاہین کی پسند** ''نئے سال کا پہلا شمارہ چونکہ انعام میں ملنا تھا لہٰذا جتنا انتظار تھا۔ اتنا ہی تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل اس بار لاجواب تھا۔ حسینہ کی نیلی سوچتی آنکھیں بہت گہری اور بھلی لگیں۔ چینی نکتہ چینی میں اس بار سیف خان بازی لے گئے بلاشبہ ان کا تبصرہ بہترین رہا۔ ایمانے، صفدر، عبدالجبار رومی اور عباس برادران کے تبصرے لاجواب ٹھہرے۔ باقی احباب کی شرکت محفل کو چار چاند لگا گئی۔ حسبِ معمول سب سے پہلے انگارے کا

مطالعہ کیا۔شاہ زیب اور تاجور ملے تو لیکن ہنوز رکاوٹیں ہزار۔شفقت بی بی اللہ کو پیاری ہوئیں۔شاہ زیب نے تاجور کے ماموں کو بھی بچایا تو سامنے آکر رونمائی کے خطرات اور بڑھ گئے ہیں۔دارابیوں کے ہاتھوں تاجور کی جلد رخصتی شاہ زیب کے لیے ایک چیلنج بن چکی۔دیکھیں کیا ہوتا۔آوارہ گرد کی اُڑان لمبی ہوتی جارہی ہے۔کاسپا کو کوایک بڑے نقصان سے بچا کر پھر روڈلف سے گٹھ جوڑ اب کاسپا کو شاید برداشت نہ کر سکے۔سرورق کی پہلی تحریر زخمی دل یاسر اعوان نے خوب لکھی۔قانون کی دھجیاں کیسے اڑائی گئیں، پاؤں تلے روندا گیا۔دوسروں کے حقوق غصب کیے گئے لیکن ایک ذات او پر بیٹھی جو بہترین منصف ہے۔عرفان کا انجام افسردہ کر گیا۔اسما قادری کی سرورق کی کہانی مداوا ایک کمال تحریر......کئی راز کھولتی خوب صورت کہانی۔دہشت گردوں کا بہر حال کوئی مذہب نہیں ہوتا، انجام بہت عمدہ رہا عمران اور صنوبر کے کردار لازوال رہے۔مختصر کہانیوں میں شبنم شفیق کی لمحۂ آخر اور فاروق انجم کی اعتراف دونوں بہت پسند آئیں۔“

خیر پور میرس سے فراز حسین سومرو کے اعتراضات ”سالِ نو کا شمارہ بک اسٹال کے چار چکر لگانے کے بعد کافی تاخیر سے 30 دسمبر کو ملا اس لیے مختصر سا تبصرہ۔سرورق خوب رہا اور حسینہ خوب تر، فہرست اور اداریے کے بعد محفل میں اپنے سیف خان شاندار تبصرے کے ساتھ صدارت کرتے نظر آئے۔برادر، ناچیز کو یاد کرنے کا شکریہ۔محمد صفدر معاویہ کا خط ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔عبدالجبار رومی صاحب خط پسند کرنے کا بے حد شکریہ، ہوائیں جو شہر جام شورو سے پرویز لنگاہ دعاؤں کے ساتھ شامل تھے۔ایمانے، مومنہ کشف اور منشی عزیز مئے کے بعد اشفاق شاہین کے تبصرے پسند آئے۔بابر عباس کھاریاں کی جگتوں کے ساتھ محفل اختتام پذیر ہوئی۔مطالعے کا آغاز اس بار مترجم ناول تابکار مجرم سے کیا۔دسمبر کی سرد شب میں لحاف اوڑھ کر دو مگ کافی کے ساتھ جو مزہ ناول نے دیا، وہ بیان سے باہر ہے اور امجد رئیس مغربی ناول میں مشرقی رومان شامل کر کے تحریر کا مزہ دوبالا کر دیتے ہیں۔مغل صاحب کی انگارے بغیر ایکشن کے بھی اپنا آپ منواتی رہی۔سیفی کی موت کی خبر آخر کار ماں کی جان لے گئی، یہ قسط دکھی کر گئی۔وسیم بن اشرف مغرب سے پکڑ لے کر آئے۔البرٹ، اور ڈینس نے کیا خوب کھیل کھیلا۔انجم فاروق ساحلی لمحوں کا کھیل لائے، بڑا پیچیدہ کیس تھا۔ہیلن ہی ویٹا اور قاتل نکلی۔لمحۂ آخر سسپنس سے بھرپور اچھی تحریر تھی۔نویزا، گلریز کی بیٹی نکلی۔کہانی کو اگر وسعت دیتے تو شاید اور بہتر ہوتا۔فاروق انجم صاحب کی اعتراف میں نصیر احمد اپنا غبن چھپانے کے لیے دلشاد کو قتل کر بیٹھا مگر سلیم پاشا کی وجہ سے پکڑا گیا۔پہلا رنگ زخمی دل میں افضل ملک کا کردار پسند آیا۔تحریر کا اختتام بالکل فلمی قسم کا ہوا۔عرفان کا دل ڈونیٹ کرنا قطعی غیر حقیقی تھا۔کیا وطن عزیز میں ہارٹ ٹرانسپلانٹ کی سہولت موجود ہے؟ آخری رنگ مداوا، اسما قادری نام ہی کافی تھا، تحریر بھی بہترین رہی۔بولتے کارٹونز کے ساتھ شمارہ مکمل کیا۔کولمبس کا امریکا بیسٹ کترن لگی۔“

کراچی سے ڈاکٹر سبا کی تباہ کن بمباری ”سالِ نو کا پہلا شمارہ دیدہ زیب ٹائٹل لیے سچ مچ آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بنا۔شمارے پر درج قیمت ستر روپے ادارے کی جانب سے نئے سال کا تحفہ محسوس ہوئی۔اندر دیکھا تو ہر دلعزیز جانے مانے سیف خان براجمان تھے۔بھلا کیوں نہ اچھلتے ان کے راہ دکھانے پر۔ادارے نے نہ صرف ویب سائٹس پر شمارے بین کر دیے تو دوسری طرف دس روپے بڑھا کر بچت کے شوقین قارئین پر مرے پر سو درے والا محاورہ بھی سچ کر دیا۔بہر حال یہ ایک بہترین قدم ہے۔امید ہے اس کے دوررس نتائج دیکھنے کو ملیں گے۔دیگر احباب میں صفدر معاویہ، ایمانے زارا شاہ، پرویز لنگاہ اور عبدالجبار رومی کے تبصرے پسند آئے۔عبدالجبار واقعی حیرانی ہے کہ میرا تبصرہ زیادہ چھانٹی کیے بغیر شائع کر دیا گیا اور بابر عباس صاحب، آنکھوں کی ڈاکٹر میں تو نہیں لیکن شاید آپ کو اسی کی تلاش ہے کیونکہ میں نے تو ٹائٹل گرل کو صرف حسینہ کہا اور اس پر بھی اگلی سطر میں افسوس کیا لیکن آپ نے دلنواز بھی کر دیا۔خیر ہو جاتا ہے۔آپ جلد چشمہ بنوالیں۔اس ماہ مصروفیت زیادہ رہی اس لیے کہانیاں پڑھ نہ سکے لیکن ایک دو احباب کی طرف سے ڈاکٹر ہونے کے باعث زخمی دل پر توجہ دینے اور رائے مانگی گئی تو تجسس سے مجبور ہو کر آغاز کر دیا اور یقین کریں اپنا دل بھی زخمی زخمی ہو گیا۔میرا خیال ہے ہر اچھا مصنف لکھنے سے قبل اپنے موضوع کے حوالے سے معلومات ضرور حاصل کرتا ہے لیکن اس کہانی میں ایسا لگا کہ مصنف نے ہندی فلموں سے متاثر ہو کر کہانی لکھی۔بلکہ پوری کہانی فلمی سی لگی۔جس میں دل اس طرح ٹرانسپلانٹ ہو رہا ہے جیسے کوئی آلو سبزی۔اور ڈاکٹرز تو ماشاء اللہ اتنے کمال تھے کہ دل کے قریب پھنسی گولی نکالنا تو دشوار تھا لیکن پورا دل نکال کر اس کی جگہ دوسرا فٹ کرنا انتہائی آسان محسوس کر رہے تھے جیسے کوئی مشین کا پرزہ ہو۔ایک بات مزید عجیب لگی کہ کہانی کس زمانے میں لکھی گئی۔ایک طرف ملک میں تبدیلی قلب کے آپریشن ہو رہے اور دوسری طرف موبائل فون استعمال ہی نہیں ہو رہا اور ناہید کو بلیک میلر سے رابطے کے لیے فون استعمال کرنا پڑ رہا ہے چھپ چھپ کے تو دوسری طرف اسے خود کان میں سرگوشیاں کر کے بلانا پڑ رہا۔اور عرفان جیسا بونگا عاشق تو کہانیوں میں بھی کبھی نہ دیکھا، دل ڈونیٹ کر کے مرتا بنا، اس کی یہ قربانی ادب کی تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھی جائے گی۔خیر اس دفعہ تو تنقید ہی تنقید ہو گئی۔اب تھوڑی سی تعریف بھی کر لیتے ہیں۔انگارے لاجواب ہے، شاہ زیب تاجور کی شادی نہیں ہونے دے گا اور یہی اس کہانی کی انفرادیت ہو گی۔ورنہ مغل صاحب کی سیکنڈ ہینڈ ہیروئن تو مشہور زمانہ ہیں۔اسپائی کیمرا جادو کا چراغ بن گیا ہے لیکن مغل صاحب کا انداز تحریر باندھے رکھتا ہے اور اپنی معروف روٹین کے باوجود میں کسی نہ کسی طرح اس کے لیے وقت ضرور نکال لیتی ہوں۔اسما قادری کی مداوا بھی اچھی رہی۔اس سے زیادہ بولا تو کہانی کا پوسٹ مارٹم ہو جائے گا۔دیگر کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکی۔موقع ملا تو پھر چھریاں چاقو لے کر آؤں گی۔اگر نو انٹری کا بورڈ نہ لگ گیا تو۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

ادریس احمد خان، ناظم آباد کراچی۔منشی محمد عزیز مئے، وہاڑی۔محمد شیراز، میانوالی۔بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، کھاریاں۔عطاء اللہ اعوان، صادق آباد۔عبدالجبار رومی انصاری، قصور۔

قفس شکن

زویا اعجاز

چیتے کی طرح چست و چالاک اور عیار مجرم کی ہنگامہ آرائیاں

ہمارے سماجی نظام کے فرسودہ قوانین خوش حالی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں... ایسی رکاوٹیں انسان سے جینے کا حق چھین لیتی ہیں... خاندان کی مشکلات... صعوبتوں نے انہیں اس قدر بے بس کردیا تھا کہ وہ خوش حالی و نجات کی تلاش میں نکل پڑے... مگر انہیں نہیں معلوم تھا کہ جسے وہ اپنی منزل سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں سنہری دلدل ہے... ایک ایسی ہی دلدل کی فسوں خیز داستاں جس میں بے شمار لوگ اپنی مرضی کے خلاف پھنس چکے تھے... کوئی ان کی دست گیری... کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا... حکم سے سرتابی کی سزا صرف اور صرف موت تھی... وہ منتظر تھے کہ کوئی اٹھے اور پیش قدمی کرے... روشن مستقبل کی چاہ میں تاریکیوں کا شکار ہو جانے والے معصوم اور سادہ لوگوں کی بے بسی و لاچاری...

چلتے چلتے اچانک ہی ایک نیا رخ اختیار کرنے والی داستاں......

اس مختصر کیمپ میں لگ بھگ پندرہ افراد موجود تھے۔

بدن پر لباس کبھی اُن کے وجود کو ڈھانپے ہوئے ہوگا لیکن اب تو چند چیتھڑے ہی لٹکتے دکھائی دیتے تھے جو ہلکی سی جنبش پر بھی رقص کرنے لگتے۔ بے ترتیب داڑھیاں جھاڑ جھنکاڑ کی صورت اختیار کرچکی تھیں۔ آنکھوں میں اَن گنت رتجگوں کی داستان سرخی بن کر جھلکتی۔ اس اجنبی سرزمین کے موسم بھی بہت نامہربان لگتے تھے۔ اپنے وطن میں جس سرما کا خوشدلی سے استقبال کیا جاتا تھا، یہاں اس کی شدت ناتواں وجود اور نیم برہنگی کے باعث برچھی کے مانند رگوں کے ریشے اُدھیڑتی تھی۔

وہ خیمہ کے روزن سے آسمان کی طرف دیکھتے تو مزید ٹھٹھر کررہ جاتے تھے۔

''کیا دیس میں کوئی جانتا ہوگا کہ ہم یہاں کس حالت میں موجود ہیں؟'' ایک کونے سے آواز ابھری۔

''کون جانے اور کیسے جانے بھلا؟ وہ تو آج بھی خوابوں کے بوجھ تلے جی رہے ہوں گے۔'' دوسری آواز نے کہا۔

''ہاں! یہ خواب بھی تو ہم ہی انہیں تھما کے آئے ہیں۔''

''اس سرد جہنم میں تو ماہ و سال کا حساب ہی بھول گیا ہے۔ جانے وہ کس رُت میں سانس لے رہے ہوں گے؟''

''وہاں بھی سرما اپنے عروج پر ہوگا لیکن اتنا علم ہے کہ وہ کسی لحاف میں لیٹے اپنے مدھر سپنوں میں مگن منتظر ہوں گے کہ وقت کے کس لمحے میں ہماری جانب سے رقم و تحائف موصول ہوں گے۔''

قریبی جنگل سے ایک دہاڑ نے اُن کی گفتگو میں تعطل پیدا کر دیا اور خیمہ میں کچھ لمحات کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔

☆☆☆

جنگل موت کے تصور کی طرح وحشتناک تھا۔

دن بھر یہاں مختلف النواع جانوروں، حشرات کی آوازیں اعصاب کے لیے ایک کڑا امتحان ثابت ہوتی تھیں لیکن رات ہوتے ہی اس خوف پر اپنی بقا کی خواہش غالب آجاتی۔ اگر کسی لحہ کوئی چوپایہ یا درندہ اس طرف رخ کر لیتا تو انہیں ایک یقینی موت سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ جنگلی درندوں سے زیادہ سرکاری وردی میں ملبوس قانون کے محافظوں کی سفاکی ان کے لیے زیادہ خطرناک ہے۔ جنگلی درندے تو اپنی جبلّت سے مغلوب ہو کر ایک ہی حملے میں چیر پھاڑ کر زندگی کی قید سے آزاد کر دیتے ہیں لیکن قانونی محافظ انہیں ہر پل ایک نئی موت سے ہمکنار کرتے تھے۔

جسمانی تشدد، کھانے پینے کے مسائل اور موسم کی سختی سے قطع نظر انہیں 'زائد خوراک' کے ضمن میں مغلظات اور بدگوئی بھی وافر مقدار میں ملتی لیکن بے بسی کی انتہا تو یہ تھی کہ وہ انہیں 'زبان دانی' میں کمزوری کے باعث کوئی جواب بھی نہ دے پاتے تھے۔

اسی پل ایک درد بھری تان نے چھناکے سے سکوت کو توڑ ڈالا۔ سلیم خان کی آواز اور کرب ہمیشہ ہی ان سب کی سماعت کے لیے پگھلا ہوا سیسہ ثابت ہوتی تھی۔ وہ اکثر اپنا مقامی گیت گاتے گرد و پیش سے بیگانہ ہو جاتا تھا۔

میں اپنے بَن کا شہزادہ تھا
پربت میرا دربار تھا اور ہوائیں میری کنیز
شجر میرے محافظ تھے اور چرند پرند میری سلطنت
میں اپنے اختیار و خوش قسمتی سے ناواقف تھا
میری نادانی نے مجھے ایک اجنبی رہگزر کا مسافر بنا دیا
قسمت مجھ سے روٹھ گئی، میرا محل مجھ سے چھوٹ گیا
ناز و نعم میں پروردہ میں شہزادہ
اب اپنی سلطنت کا رستہ بھول گیا

کچھ لمحوں کے لیے وہ سبھی اس کے سحر میں مبتلا ہو گئے۔ اپنی 'ریاست' سے محرومی کا درد مشترک تھا۔ یہ صدماتی کیفیت اس وقت زائل ہوئی جب زین نے ایک جانب رکھی ہوئی پلیٹ کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''اوئے خانہ خراب! یہ کیا کر رہے ہو؟'' سلیم نے اپنا گیت ترک کر دیا۔

''بھوک اپنے نکیلے پنجوں سے میرا معدہ نوچ رہی ہے۔ اب مزید برداشت ممکن نہیں۔'' زین نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''یہ حرام جانور ہے۔ اس کا تو نام لینے سے ہی زبان پلید ہو جاتی ہے اور تم اسے کھانا چاہتے ہو؟'' عدنان نے نیم بیزاری سے کہا۔

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ موت کے شکنجے میں حلال و حرام کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ میری زندگی سے کئی اور زندگیاں بھی منسلک ہیں۔ اگر میری اس قربانی سے میرا خاندان سلامت رہتا ہے تو میں گوشت کھانا تو درکنار یہ جانور بننے کے لیے بھی تیار ہوں۔'' اس نے نظریں چُراتے ہوئے جواب دیا اور گوشت کے ٹھنڈے پارچے دانتوں سے کترنے لگا۔

ہر نوالہ کسی چابک کی طرح اس کا وجود زخمی کرتا رہا۔

اس طویل رات کی صبح ابھی بہت دور تھی اور صبح سے قبل ہی ان افراد کی تعداد میں کمی واقع ہو جانی تھی۔ گزشتہ ایک ماہ سے یہی معمول جاری تھا۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ برفانی جہنم ان کی قبر ثابت ہوگا اور ایک نہ ایک دن وہ سبھی اپنے ارمانوں سمیت اس جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

☆☆☆

اگلی صبح سرما کے ٹھٹھرے ہوئے سورج کی بے دم روشنی اداسی اور بیزاری میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ رات کے جانے کس پہر اُن کی آنکھ لگ گئی اور وہ جان ہی نہ پائے کہ فرشتۂ اجل ان کے دو ساتھیوں کو اپنے ہمراہ ایک ایسے سفر پر لے گیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔

ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں آسمان کی جانب ساکت تھیں۔ سرد، اکڑے ہوئے وجود نیلگوں رنگت اختیار کر چکے تھے۔

''سمجھ نہیں آتا کہ ان کی خوش نصیبی پر رشک کریں یا اپنے زندہ بچ جانے پر ماتم؟'' سلیم دل گرفتہ تھا۔ مرحوم بہزاد سے صوبائی تعلق داری کی بنا پر وہ بہت قریب تھا۔

''یہ قفس ہمارا ذاتی انتخاب تھا اس لیے ماتم کرنے کا کیا فائدہ؟ اپنے انتخاب کا سامنا دلیری سے کرو۔'' عدنان نے اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں کہا۔

چند لمحوں بعد وہاں دو افراد کی آمد نے انہیں مزید

مضطرب کر دیا۔ وہ اس کیمپ کی انتظامیہ میں نچلے درجے کے ملازمین تھے۔ متوسط قد و قامت، مضبوط کاٹھی اور چہروں پر درشتگی سجائے اینڈی اور مائیک یہاں موجود سبھی افراد کے لیے بے حد ناپسندیدہ تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے بہزاد اور مشتاق کی لاشیں بے پروائی سے گھسیٹیں تو سلیم خاموش نہ رہ سکا۔

’’اگر زندہ انسانوں کا احترام نہیں کر سکتے تو ان کے مردہ تن کی بے حرمتی تو مت کرو۔‘‘

’’اپنی زبان بند رکھو! اگر ہمت و جذبہ سلامت ہے تو ہماری زبان میں گفتگو کرو۔‘‘ اینڈی پلٹ کر غرایا۔

’’ہی سے ٹو یو ڈونٹ ڈسٹرب ڈیم!‘‘ مصطفیٰ نے اپنی نیم وا آنکھیں بمشکل کھولتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سن کر اینڈی اور مائیک کے لیے اپنے قہقہے ضبط کرنا محال ہو گیا۔

’’یہ زندگی کی قید سے آزادی پا چکے ہیں اس لیے ڈسٹرب ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔‘‘ مائیک نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

وہ حسبِ معمول کسی حد تک ان کا مدعا سمجھ رہے تھے لیکن روانی سے جواب دینے سے قاصر تھے۔ اینڈی اور مائیک بھی ان کی کمزوری سے آگاہ تھے اس لیے نشتر زنی کرنے سے چوکتے ہی نہ تھے۔ وہ نسلی تعصب کا شکار تھے جس کے باعث تیسری دنیا کے ان نیم خواندہ افراد کی اہانت کرنا ان کا من پسند مشغلہ تھا۔

’’ہماری سرزمین پر تم جیسے بھگوڑوں اور مجرمانہ ذہنیت کے حامل افراد کی جگہ زیرِ زمین بھی نہیں...... تم تیسری دنیا کے حشرات ہو اور تمہارا اصل ٹھکانا یہی ہے کہ ان کے پیٹ کا ایندھن بنو۔‘‘ اینڈی کا زہریلا لہجہ ان کی رگوں میں لہو منجمد کر گیا۔

ذلت اور برداشت کے اس سفر کا آغاز تو اسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے ’یونان‘ کی اس دھرتی پر قدم رکھا تھا۔ ہر گزرتا دن انہیں یقین دلاتا کہ جس قدر توہین آج برداشت کی ہے اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہ ہو گی لیکن یہ ان کی خام خیالی ہی ثابت ہوتی۔ صیاد کے ترکش میں تیروں کی کمی نہ تھی۔

سرما کی اس منجمد صبح میں ذلت کا تلخ جام نوش کرنے کے بعد ناشتے کی وصولی کا ’امتحان‘ ابھی باقی تھا۔ ہڈیوں میں گودا جماتی ٹھنڈک میں انہیں دانستہ طور پر کئی گھنٹے قطار میں کھڑا رکھنے کے بعد سوکھی لکڑی جیسے توس، لیس دار انڈے اور ابلے ہوئے پانی نما چائے تھما دی جاتی۔

اس ’فائیو اسٹار‘ ناشتے کے ساتھ ان کا نسلی سلسلہ کسی نہ کسی قابلِ اعتراض کڑی سے منسلک کرنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ معاش کے سلسلے میں یونان کے دارالحکومت میں آمد ان سے مکمل تاوان وصول کر رہی تھی۔

☆☆☆

خیمے میں اب محض تیرہ افراد ہی باقی رہ گئے تھے۔

ان میں اکثریت کا تعلق ایسے علاقوں سے تھا جہاں کے باسی قومی زبان پر بھی مکمل دسترس کے حامل نہیں ہوتے اور وہ یہاں ہفت رنگ خوابوں کی تعبیر تلاشنے غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئے تھے۔

محنت، لگن، جنون اور عزم سے اہلِ خانہ کی تقدیر میں انقلاب پیدا کر دینے کا تصور تو یہاں قدم دھرتے ہی اپنی موت مر گیا تھا۔ اب تو یہ عالم تھا کہ وہ صبح سے شام بے مقصد بیٹھے ’اغیار‘ کے ہاتھوں اپنی تقدیر کا کوئی حتمی فیصلہ جاننے کے منتظر خلاؤں میں تکتے نقوش ماضی میں کھوئے اپنے اس ’گناہ‘ کے متلاشی رہتے جس کی پاداش میں انہیں یہ سزا ملی تھی۔

سلیم، زین، مصطفیٰ اور عدنان کے سوا اب کوئی دوسرا فرد باہمی گفتگو کے قابل نہ رہا تھا اس لیے دیگر افراد کی لاتعلقی کے باعث ان کی موجودگی درحقیقت نابودگی ہی کے برابر تھی۔ ان کی حالت ڈربے میں مقید ان مرغیوں جیسی تھی جو اپنے سامنے ساتھیوں کو زندگی کی بازی ہارتے ہوئے دیکھ کر خوف کے عالم میں شور و غل برپا کرتی ہیں اور پھر اپنا وجود سلامت رہنے کی خوشی میں تمام دیگر زمینی حقائق فراموش کر دیتی ہیں۔

دو افراد کی موت کے بعد وہاں خاموشی کا راج تھا۔ ہلکی سنہری دھوپ اب شام کے سرمئی سایوں میں ڈھل رہی تھی جب ایک خلافِ معمول واقعے نے اس ڈربے میں ایک بار پھر ہلچل پیدا کر دی۔

گہری نیلی پتلون، قمیص میں ملبوس سرکاری افسران کی آمد کبھی بھی خوشگوار ثابت نہیں ہوتی تھی۔ گہرے سیاہ بال، ورزشی جسم، سرد و سپاٹ نظریں ان کے اعصاب پر ہمیشہ ایک دباؤ پیدا کرتی تھیں۔ ان افسران کے ساتھ ایک ہم وطن کی موجودگی وہاں موجود سبھی افراد کے لیے بہت حیران کن تھی لیکن اس سے بھی زیادہ منفرد امر وہ اعتماد اور بے نیازی تھی جو اس کے بشرے سے جھلک رہی تھی۔

وہ ایک کم عمر لڑکا تھا جس کے گھنگھریالے بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس کی صاف رنگت میں سرخی اور بادامی آنکھوں میں دبا دبا غصہ جھلک رہا تھا۔ ہلکی داڑھی اور مونچھوں کے باعث وہ اپنی عمر سے بھی بڑا دکھائی دیتا تھا۔

نکولس نے معنی خیز نظروں سے وہاں موجود افراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے شاہی محل میں رہائش کے لیے ایک اور مہمان چلا آیا ہے۔کیا تم اسے ویلکم نہیں کرو گے؟''

''ارے چھوڑو نک! کن پتھروں سے سر پھوڑ رہے ہو؟ ان میں اتنی سکت کہاں کہ ہماری کسی بات کا جواب دے سکیں۔'' جان نے اپنے تمباکو زدہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

''کہتے تو ٹھیک ہو! یہ تو مفت کی روٹیاں توڑنے یہاں چلے آئے ہیں۔ان کے اپنے وطن میں تو اتنی اہلیت بھی نہ تھی کہ انہیں زبان دانی میں ہی طاق کر دیتے۔'' نکولس نے ایک اور کچوکا دیا اور پھر براہِ راست مخاطب ہو کر بولا۔

''تمہارے مفلوک الحال ملک نے ایک اور تحفہ ارسال کیا ہے۔اپنی ضیافت میں اسے بھی شامل کر لینا۔''

''اپنی زبان سنبھال کر بات کرو آفیسر! میرے ملک کی بابت مزید کچھ کہا تو انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' ان کے ساتھ موجود شخص نے اٹکتے ہوئے کہا۔

جان کے چہرے کی سرخی آنکھوں میں بھی اتر آئی۔ اس کا یہ روپ اور طیش کیمپ کے رہائشیوں کے لیے نیا نہیں تھا۔وہ اس سے قبل مصطفیٰ کی ایسی درگت بنا چکا تھا کہ اس میں کئی روز ہلنے جلنے کی سکت نہ رہی تھی۔

''تم...... تمہاری یہ جرأت...... قانون شکنی کرتے ہو اور ہمیں ہی آنکھیں دکھاتے ہو۔'' جان نے اسے ٹھوکروں کی زد پر رکھ لیا۔

قانون کی اس بہترین پاسداری پر وہ اسے خاصا دندان شکن جواب دینا چاہتا تھا لیکن 'ذخیرۂ لغت' میں کمی کی بدولت تلملاتے ہوئے محض یہی کہہ سکا۔

''ہم مجرم ضرور ہیں آفیسر، لیکن حیوان نہیں!''

''چھوڑو جان! اس کے لیے اتنا سبق ہی بہت ہے۔'' نکولس نے نرمی سے کہا۔

''نہیں! میں اسے ایسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔اسے مجھ سے معافی مانگنی ہوگی۔'' وہ اس کے چہرے پر ثبت ہٹ دھرمی دیکھ کر مزید بے قابو ہو رہا تھا۔

''میں معافی نہیں مانگوں گا۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔

خیمے کے مکین اس پر پڑنے والی افتاد کا تصور کر کے اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔جان کے گھونسوں اور ٹھوکروں کی زد میں وہ شخص اب دہرا ہو کر کراہنے لگا تھا۔

''اے! کیا ہوا تمہیں؟ تم ٹھیک ہو؟'' نکولس نے تشویش سے پوچھا۔

''میں گُردے کا مریض ہوں۔'' اس نے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی دکھاتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا۔

جان نے استہزائیہ نظروں سے اُسے دیکھا اور زہریلے انداز میں بولا۔''گردوں میں درد کا تو محض بہانہ ہے۔اصل میں یہ چار چوٹ اس سے برداشت نہیں ہو رہی۔''

تاہم وہ کوئی جواب دیے بغیر ہولے ہولے کراہتا رہا۔

جان نے ایک توقف کے بعد اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔خیمے سے چند گز کے فاصلے پر جنگل کی حدود کا آغاز ہو جاتا تھا۔وہ اُسے گھسیٹتا ہوا ایک درخت کے پاس لے گیا اور معنی خیزی سے کہا۔

''تمہاری بہادری نے میرا دل موہ لیا ہے۔تمہاری جگہ اس خیمے میں نہیں ہے۔''

''تو پھر کہاں ہے؟'' وہ اس کی نظروں میں موجود شیطنت بھانپ گیا تھا۔

''میں تمہیں یہاں سے رہائی دلوا سکتا ہوں۔میری آفر پر غور کرنا۔'' وہ جان کی لغو گوئی نظرانداز کرتا ہوا ایک درخت کی آڑ میں چلا گیا۔

کچھ لمحوں بعد اس کی بلند کراہوں نے جان کو بوکھلا دیا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو اسی پل اس پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ مقابل نے اسے ایک جھٹکے سے وہاں موجود غلاظت میں پھینک دیا اور ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں رسید کرتے ہوئے اپنی لڑکھڑاتی انگریزی میں گویا ہوا۔

''میری قومیت، وطن اور شناخت کی بابت آئندہ سوچ سمجھ کر بات کرنا۔'' جان اس کی نظروں میں موجود تپش دیکھ کر ساری چوکڑی بھول گیا اور تلملاتا ہوا اسے واپس کیمپ میں لے آیا۔

اس کی حالتِ زار دیکھ کر نکولس ششدر رہ گیا اور کراہت سے بولا۔''یہ کیا ہوا ہے تمہیں؟''

جان نے خونخوار نظروں سے اپنے اصل مجرم کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اب بھی نقاہت اور کرب آمیز تاثرات طاری تھے۔

''جان صاحب نے شاید آج سرِ شام ہی چڑھا رکھی ہے اس لیے لڑکھڑا کر وہاں اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائے۔'' اس کی آواز اور اداکاری دیکھ کر جان کو اپنی پوزیشن صاف کرنا دشوار ہو گیا۔

''اس نے خود مجھے وہاں گرایا تھا انک! بہت مکار شخص ہے یہ۔'' وہ دیگر افراد کی آنکھوں میں تمسخر دیکھ کر اپنا طیش بمشکل منضبط کر پایا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟ میں تو پہلے ہی تمہیں اس کی درگت بناتے دیکھ کر مشکوک ہوگیا تھا کہ تم نے آج پھر 'بے احتیاطی' کی ہے۔'' نکولس نے اسے لتاڑا۔

''جھوٹ بول رہا ہے یہ! اس نے مجھے دھکا دیا تھا۔''

''کم آن جان! ان 'پاکیز' کی کیا مجال کہ ہمارے سامنے دم مار سکیں۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا۔'' وہ سر جھٹکتا ہوا اسے وہاں سے لے گیا۔

ان دونوں کے خیمے سے نکلتے ہی اس کے تاثرات بھی زائل ہو گئے اور وہ نہایت اطمینان سے اس خیمے کے ایک کونے میں نیم دراز ہوگیا۔ اس کا اعتماد اور اطمینان دیکھ کر دیگر افراد تجسّس اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔

سرکاری محافظوں سے ایسے سلوک کی توقع ان کے تصور سے بالاتر تھی۔ ایک باغی 'پنچھی' کی آمد پر ان کی بے چینی تو مسلمہ تھی لیکن ان سب کی کیفیات سے بے خبر اس کی نظریں ایک اور چہرے پر مرکوز تھیں۔

اس نے اپنی آمد کے ساتھ یہاں ایک 'بہروپیے' کی موجودگی تاڑ لی تھی اور اب اپنے ذہن میں آنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سوچوں میں گم ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد اس بہروپیے کو اپنے خول سے باہر نکلنے پر مجبور کر دے گا۔

☆☆☆

''کیا نام ہے بھئی تمہارا؟'' اس شام ہنگامہ آرائی تھمنے کے بعد مصطفیٰ اس کے پاس چلا آیا۔

''واجد۔''

''اداکاری ویسے اچھی کر لیتے ہو تم؟''

''اداکاری، وہ کیا ہوتا ہے بھئی؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''نا جگر نا! یہ فلم میرے ساتھ مت چلانا۔'' وہ رعونت سے بولا۔

واجد نے دزدیدہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ تیس کے عشرے میں تھا۔ اس کی رنگت قدرے سانولی تھی۔ سیاہ بال کبھی پُرکشش رہے ہوں گے لیکن اب تو نہیں ہفتوں سے پانی کی بوند بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے، ہلکی سوجن اور آنکھوں میں سرخی و گدلاہٹ کا جال واضح کرتا تھا کہ وہ ماضی قریب میں نشے کی علت کا شکار بھی رہا ہے۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ سے متجاوز تھا تاہم جسمانی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے عیش و طرب میں زندگی بسر کی ہے۔

''کہاں سے تعلق ہے تمہارا؟'' واجد نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں بھی پاکستان ہوں......تو بھی پاکستان ہے......کیا یہی حوالہ کافی نہیں؟'' اس نے گنگناتے ہوئے جواب دیا۔

''کافی دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ذہین بھی لگتے ہو پھر یہاں کیسے آ پھنسے؟'' واجد نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ذہین تو تم بھی بہت ہو۔ جی دار بھی ہو... زبان دانی بھی خاصی واضح ہے......سلیم کی طرح گلابی اردو نہیں بولتے۔ پھر یہاں کیسے آ پھنسے؟'' مصطفیٰ نے اسی کے انداز میں پوچھا۔

''اسی طرح جیسے تم آئے۔'' واجد اس کا گیم سمجھ چکا تھا۔

''میری تو قسمت ہی خراب تھی جو یہاں پہنچتے ہی دھر لیا گیا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''یہاں پہنچ کر بچاؤ کا تناسب صرف ایک فیصد ہوتا ہے۔ غالب امکان تو یہی ہے کہ سرحدی پولیس فوری طور پر دھر لیتی ہے۔''

''یہ جزیرہ تو ایک جنت ہے......ارضی جنت......زندگی نے موقع دیا تو ایک بار اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کی بھرپور تمنا ہے۔'' مصطفیٰ کا لہجہ حسرتناک تھا۔

''اتنے بیوقوف لگتے تو نہیں تم کہ محض یہاں کی خوبصورتی دیکھنے کے لیے غیرقانونی طور پر سرحد پار کر کے چلے آئے؟'' واجد نے برجستہ کہا تو وہ فوری طور پر سنبھل گیا۔

''جان سے تمہارے سلوک نے میرا دل خوش کر دیا۔'' اس نے موضوعِ گفتگو تبدیل کر دیا۔

''ہاں! میرے ملک کے بارے جو بھی لغوگوئی کرے گا، میں اپنی بساط کے مطابق اس سے یہی سلوک کروں گا۔''

''اس مردود نے ایک بار میرے ساتھ یونہی مار پیٹ کی تھی۔ آج حساب چکتا ہوگیا۔'' وہ تنفر سے بولا۔

''کیوں؟ کیا ہوا تھا؟''

''اس کا سگریٹ کیس اور لائٹر یہاں رہ گئے تھے۔ میں نے ایک آدھ سگریٹ پی لی تو آپے سے باہر ہوگیا۔''

''اور یقیناوہ ہمارے ملک کے خلاف بھی خوب بدگوئی کرتا رہا ہوگا۔''

''ہاں! کچھ ایسا ہی تھا۔''

"یعنی تمہارے نزدیک ملکی وقار کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم ذاتی بنیاد پر اس کی درگت بننے پر خوش ہو بس؟" واجد نے صاف گوئی سے کہا۔

"نن...... نہیں! آف کورس مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے بہت۔" وہ گڑبڑا گیا۔

واجد بظاہر بہت کم عمر اور معصوم صورت دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے تیور اور اعتماد ہرگز معمولی نہ تھے۔ مصطفیٰ مزید محتاط ہوگیا۔

"رات کا کھانا کب ملے گا۔ بہت بھوک لگی ہے مجھے۔" واجد نے اس کی اُلجھن بھانپ کر پوچھا۔ وہ فی الوقت اسے اپنی جانب سے کسی بھی طرح شکوک میں مبتلا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

"افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ یہاں ملنے والا کھانا انتہائی نامناسب اور ناکافی ہوگا۔ ہماری بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے لیے انتظامیہ کسی نہ کسی حرام جانور کے اجزا پر مشتمل خوراک رات کو یہاں دھر دیں گے۔"

"یہ تو بہت ناانصافی ہے، احتجاج کیوں نہیں کرتے تم لوگ؟"

"احتجاج؟ بہت بھولے ہو بھئی تم۔" مصطفیٰ اس کی بات پر ہنستے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔

رات کے سائے گہرے ہونے کے بعد انہیں کھانا نصیب ہوا تو واجد دانستہ طور پر ایک بار پھر انتظامیہ افسران سے اُلجھ گیا۔

"ایسا کھانا تو اصطبل کے جانور بھی نہیں کھاتے۔"

"خو یارا...... یہ دادا گیری ادر نہیں چلے گی۔ تمہاری وجہ سے امارا کھانا بھی بند کر دیں گے یہ لوگ!" سلیم خان اس کی حرکات پر بری طرح کوفت میں مبتلا ہو چکا تھا۔

"ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟"

"تمہیں یہاں آئے ہوئے چند گھنٹے ہوئے ہیں۔ ہم سے زیادہ واقف نہیں ہو اس سسٹم سے۔ یہاں سب ایسے ہی چلتا ہے۔" عدنان نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا تو واجد کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ کسی بھی طرح اس کی خاموشی ختم کرنا چاہتا تھا۔

"اگر یہ سب سسٹم غلط ہے تو پھر تم اسے تقویت کیوں دے رہے ہو؟"

"غلط ہو یا صحیح۔ اب سمجھوتے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"تمہارے جسموں کی طرح سوچ بھی نہایت بدبودار ہو چکی ہے۔"

"چند دن رہو یہاں! یہی بدبو تمہارا بھی اوڑھنا بچھونا بن جائے گی۔" عدنان غرایا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ میں یہاں رہتا ہوں کہ نہیں؟ لیکن اگر تم نے یہی زندگی گزارنی تھی تو اپنے ملک میں کیا برائی تھی۔ کم از کم اتنی ہمت تو پیدا کرو کہ بنیادی انسانی حقوق کی اس خلاف ورزی پر احتجاج ہی کر دو۔"

احتجاج کی صورت میں حرام اجزا کا کھانا کم از کم مجھے بالکل قبول نہیں۔ ورنہ کس مائی کے لعل میں اتنی جرأت کہ عدنان ملک کو دباؤ میں لا سکے۔" وہ بے ساختگی سے بولا۔

اس کی منطق سن کر واجد کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرا گئیں اور اس کا بہروپ ختم کرنے کے لیے ایک نئی راہ دکھائی دینے لگی۔

واجد خان نے لمحاتی سوچ بچار کے بعد خاموشی سے کھانا تھاما اور ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دینے لگا۔

☆☆☆

رات اپنے اختتامی پہر میں تھی۔

ایک ہنگامہ خیز دن کے اختتام کے بعد وہ سبھی تھکن سے بے حال تھے۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اس تھکاوٹ میں کسی بھی جسمانی مشقت کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ ذہنی دباؤ نے ان کے اعصاب منتشر کر دیے تھے۔ سلیم خان کی بدھرتانیں بھی کافی وقت سے دھیمے خراٹوں میں تبدیل ہو چکی تھیں لیکن واجد کی آنکھوں سے نیند اب بھی کوسوں دور تھی۔

آنکھیں بند کرتے ہی چند خونی مناظر پوری شدت سے اس کے پردۂ تصور پر غالب آگئے اور اس پر ایک تشنج کی کیفیت طاری ہوگئی۔

"خدایا! یہ بھیانک یادیں آخر کب میرا پیچھا چھوڑیں گی؟" وہ اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ، کچھ معصوم چیخ و پکار کی صدائیں، سرخ آنکھیں اور بھاری اسلحہ تھامے کرخت صورت افراد کے ہیولے اس کا سانس لینا دوبھر کرنے لگے اور پھر گردن کی عقبی سمت میں جلن کا احساس شدید تر ہونے لگا۔

واجد نے سر جھٹکتے ہوئے اپنا ارتکاز دانستہ طور پر ماہ گل کی جانب موڑ دیا۔ نتیجہ مثبت برآمد ہوا اور اس کا وجود پُرسکون ہونے لگا۔ خیمے کے روزن سے اُسے آٹھ سالہ ماہ گل اپنے ہم عمر بچے کے ساتھ کھیلتی ہوئی نظر آنے لگی۔

☆☆☆

"دھیان سے کودنا ماہی! کہیں پاؤں میں موچ نہ آجائے!" گیارہ سالہ واجد نے اپنی پھوپھوزاد ماہ گل سے کہا۔

وہ دونوں گھر کے آنگن میں موجود درخت سے پھل اتارنے کی مہم پر تھے۔

"میں بہت بہادر ہوں واجی! مجھے ان چوٹوں سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔" وہ ایک ہی جست میں نیچے اتر آئی۔ وہ پہاڑوں کی بیٹی تھی اور اس کی فطرت میں جنگجوئی اور بےخوفی فطری تھی۔

"اگر تم اتنی ہی بہادر ہو تو آج کھیلنے کے لیے انکار کیوں کر رہی تھیں؟"

"امی جان نے منع کیا ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"ایسا کیوں کیا انہوں نے؟" واجد مضطرب ہوا۔ "میں ابھی اُن سے پوچھتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں! وہ مجھ سے مزید خفا ہو جائیں گی۔" وہ بوکھلا گئی۔

"لیکن ہم تو بچپن ہی سے ایک ساتھ کھیلتے کودتے ہیں۔ پہلے تو ایسی کسی بھی پابندی کا سامنا نہیں ہوا۔"

"امی جان کہتی ہیں اب تم بچی نہیں رہیں۔ اس لیے لڑکوں کی طرح کڈکڑے لگانا بند کر دو۔"

واجد اس بات پر خاموش ہو گیا۔ لحاتی جوش سے قطع نظر وہ اپنی پھپھو کی بہت عزت و تکریم کرتا تھا۔ وہ بیوہ تھیں اور... ماہ گل کے ساتھ انہی کے گھر قیام پذیر تھیں۔ گلریز خان اور گلالئی دو ہی بہن بھائی تھے۔ کچھ عرصہ قبل واجد کی والدہ کی وفات کے بعد گلالئی کی ذمّے داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"تو کیا تم میرے ساتھ کھیلنا بند کر دو گی؟" واجد کے ننھے سے دل پر ایک دھچکا لگا تھا۔

"میں نے ایک اور ترکیب سوچی ہے۔"

"وہ کیا بھلا؟"

"تم مجھے اپنی کتابوں سے روز پڑھا دیا کرنا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" اس کی بات پر وہ گہری سوچ میں ڈوب ہو گیا۔

علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک ہی عمارت تھی جسے کچھ ماہ قبل چند افراد نے بمباری سے مسمار کر دیا تھا۔ اسکول کی واحد خاتون معلمہ بھی مختلف دھمکیوں اور نقصانات سے خائف ہو کر اپنے آبائی علاقے میں لوٹ گئی تھی۔ اس کا خدمتِ خلق اور فروغِ تعلیم کا جذبہ بالکل سرد پڑ گیا تھا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ماہی! بلکہ مجھے تو سچ میں بہت شرمندگی ہے کہ یہ تجویز میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟" واجد نے فوری فیصلے کے تحت کہا۔

اس کے بعد بےپروائی اور کھیل کود ایک قصۂ پارینہ بن گیا اور وہ دونوں سہ پہر کے بعد نہایت سنجیدگی سے پڑھائی لکھائی میں مصروف ہو گئے۔

واجد کے آباؤ اجداد ایک دوسرے صوبے سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔ یہ علاقہ قدرتی خوبصورتی اور دلکش مناظر میں اپنی مثال آپ تھا۔ مکین بہت ملنسار، مخلص، محبِ وطن اور دلیر تھے۔ یہاں عام طور پر سلسلۂ معاش باغات کی ٹھیکیداری پر مشتمل تھا۔ تین ہزار سے زائد نفوس پر مشتمل اس قصبے کی زمینیں اورنگ خان کی ملکیت تھیں۔ اس کے صاحبِ فراش ہونے کے بعد بیٹوں نے بیرونِ ممالک اپنی نئی دنیا بسالی تو ایک دیرینہ وفادار ملازم کی مدد سے باغات کی دیکھ بھال مقامی افراد کے حوالے کر دی گئی۔

گلریز خان بھی ایک طویل عرصے سے اسی کام سے منسلک تھا۔ وہ بہت محنتی انسان تھا۔ اورنگ خان بھی ہر ملازم کی محنت کا بھرپور معاوضہ ادا کیا کرتا۔ اس کے ماتحت سبھی ملازمین معاشی طور پر آسودہ تھے لیکن گلریز کے گھر میں غربت کا راج تھا۔

واجد کے لیے یہ قضیہ بہت غور طلب رہتا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں اور آس پاس سبھی افراد کی آسودگی کا موازنہ اپنے گھریلو حالات سے کرتا اور مزید الجھن کا شکار ہو جاتا تھا۔ گلریز کو ملنے والی رقم ان کی ضروریات پوری ہی نہ کر پاتی تھی۔ واجد کے دو بڑے بھائیوں سمیت گھر میں محض چھ افراد تھے لیکن سبھی اپنے اپنے طور حالات کی چکی میں پس رہے تھے جس کی وجہ وہ تا حال جاننے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

واجد شدید اضطراب میں مبتلا تھا۔

ماہی کے ساتھ پڑھائی کا سلسلہ جاری ہوئے دو ہفتے بیت چکے تھے اور اس کے پاس 'لکھائی' کا کام کرنے کے لیے کاپیاں اپنی میعاد پوری کر چکی تھیں۔

"تم فکر نہ کرو ماہی! میں آج ابی جان سے بات کروں گا۔" اس نے تشفی دی۔

"کوشش کر لینا واجی! لیکن انہیں مجبور نہ کرنا۔ وہ پہلے ہی بہت مشکل سے اخراجات پورے کرتے ہیں۔" ماہ گل کم عمری میں ہی بہت باشعور تھی۔

"میں اکثر ایک بات سوچتا رہتا ہوں۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا بھلا؟"

"اورنگ خان کے سبھی ملازم بہت خوش حال ہیں۔

ان کے بچے اچھا لباس پہنتے ہیں، اچھا کھاتے پیتے ہیں لیکن ہمارے گھر میں ایسا کچھ کیوں نہیں؟''

''ایک بات میں بھی اکثر سوچتی ہوں!''

''وہ کیا بھلا؟'' واجد متجسس ہوا۔

''تم اور ماجد لالہ تو صبح اپنے اسکول چلے جاتے ہو۔ میں نے اسکول ختم ہونے کے بعد دو مرتبہ کچھ عجیب دغریب لوگوں کو ماموں جان سے ملتے دیکھا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کس قسم کے لوگ؟''

''پتا نہیں! مگر مجھے وہ اچھے لوگ نہیں لگے۔ وہ کسی 'وصولی' کی بات کر رہے تھے اور میں یہی سوچتی ہوں کہ یہ وصولی آخر کیا ہے؟''

''تم نے اپنی امی سے نہیں پوچھا کیا؟''

''پوچھا تھا لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ بڑوں کی باتیں چوری چھپے سننا گناہ ہے۔''

''میں ضرور اس راز کو کھوج لوں گا۔'' اس نے اتراتے ہوئے کہا۔ وہ اکثر ماہ گل کے سامنے اپنی شخصی خوبیاں اجاگر کرنے کی لاشعوری کوشش کرتا رہتا۔ لڑکپن کی حدود سے نکلتے ہی ... ایک دوسرے کے لیے فطری کشش انہیں اپنے حصار میں لینے لگی تھی۔ لیکن اس جذبے کی حقیقت سے دونوں ہی بے خبر تھے۔

واجد کا تجسس اب پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی بھی طرح حقائق جاننے کے لیے بے تاب تھا اور یہ موقع اسے اگلے روز ہی مل گیا۔

اس دن گلریز خان کو ماہانہ آمدنی ملی تھی اور واجد کو قوی امید تھی کہ وہ ماہی کے لیے نوٹ بکس کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اپنے دل میں یہی حکمتِ عملی طے کرتے ہوئے وہ والد کے کمرے کی جانب بڑھا لیکن گلالئی کی آواز نے اس کے قدم ساکت کر دیے۔

''کیا اس ماہ ادائیگی روکی نہیں جاسکتی لالہ!''

''نہیں! یہ زہر تو ہمیں بہر صورت پینا ہے گل! ورنہ بوجھ مزید بڑھ جائے گا۔'' گلریز کے لہجے میں بے حد تھکن تھی۔

''یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا لالہ!''

''نجات کی دعا کرتی رہا کرو۔ اللہ پاک کی ذات بڑی قادرِ مطلق ہے۔ وہ چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا۔''

''عید قربان بھی نزدیک ہے۔ بچے اپنے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی جانور کی خریداری کی فرمائش کرتے ہیں۔'' گلالئی نے دبے لفظوں میں کہا۔

''انہیں سمجھاؤ گل کہ میرے محدود وسائل میں ایسا ممکن نہیں۔ اور اگر پھر بھی نہ مانیں تو کہنا کہ مجھے قربان کر لیں۔ میں اُف بھی نہیں کروں گا۔''

''اللہ رحم کرے۔ لالہ! ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں آپ؟ ہمارا آپ کے سوا اور کون ہے اس دنیا میں؟'' وہ تڑپ گئی۔ دہلیز پر کھڑے واجد کا دل بھی یک لخت کانپ گیا تھا۔

''بس کچھ عرصے کی بات ہے۔ ماجد کی نوکری لگتے ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ مجھے بڑی امید ہے۔'' گلریز نے گہری سانس لی۔

''اگر ساجد کے ساتھ وہ حادثہ نہ ہوتا تو آج حالات قدرے بہتر ہوتے۔ وہ آپ کا سہارا بن گیا ہوتا۔''

''اللہ کی مرضی بس! ان دنوں بھی وصولی کی تلوار سر پر نہ لٹک رہی ہوتی تو میرا بیٹا آج ایسی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوتا۔''

واجد کے ذہن میں سوالات کی آندھی چل رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بڑے بھائی کا معذور وجود گردش کرنے لگا۔ وہ افسردہ دل کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔

وہ ہر رات بلاناغہ ساجد کے ساتھ کچھ وقت گزارتا تھا۔

☆☆☆

سترہ سالہ ساجد کمزور جسامت کا لڑکا تھا۔

اس کا بچپن بھی امنگوں اور خوابوں کا مرکز تھا۔ وہ ایک ذہین طالبعلم تھا۔ گلریز خان اپنے تینوں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ پہلوٹی کی اولاد ہونے کے ناتے یہ خواب اور خواہشات ساجد سے کچھ زیادہ ہی وابستہ تھیں۔ ساجد کا شمار اپنے اسکول کے ذہین ترین طلبا میں ہوتا تھا۔

اسکول ان کی رہائش گاہ سے دس کلومیٹر دور تھا۔ آمدورفت کے لیے کسی بھی ذاتی یا عوامی سواری کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن موسم اور مسافت کی کوئی بھی سختی اس کے شوق کی راہ میں حائل نہ ہو پاتی۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے دو جماعتیں آگے تھا۔ وہ میٹرک سائنس کا طالبعلم تھا اور مستقبل میں مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد گلریز خان کی سبھی مشکلات ختم کرنے کے لیے پُرعزم تھا۔ اساتذہ کو بھی مکمل امید تھی کہ وہ ضلعی بورڈ میں بہر صورت پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا لیکن قسمت نے ان کے ارادے خاک میں ملانے کے لیے بھرپور تیاری کر رکھی تھی۔

ساجد نہم جماعت کے بورڈ امتحانات میں دل و جان سے معروف تھا۔ امتحانی سینٹر اسکول سے بھی کافی فاصلے پر تھا۔ آمدورفت ہنوز پیدل تھی۔ اس روز دوسرا پرچہ دے کر لوٹتے ہوئے وہ ایک تیز رفتار ٹرک کی زد میں آگیا۔

مرحبا جوشاندہ
نزلہ، زکام، فلو، بخار، کھانسی اور گلے کی سوزش کے لیے مفید و مؤثر
MARHABA
JOSHANDA
HERBAL TEA
مرحبا
قدرت کی حکمت
f /marhabalaboratoriespk
UAN: 111-152-152
www.marhaba.com.pk

ٹرک ڈرائیور نے پلٹنے کی زحمت نہ کی اور ساجد نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں پڑا رہا۔ چند گھنٹوں بعد کچھ راہگیروں نے اپنی مدد آپ کے تحت اسے مقامی اسپتال میں پہنچا دیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کے باعث اس کی رنگت زرد ہو چکی تھی۔ ڈاکٹرز نے دستیاب سہولیات کے تحت اسے حتی الامکان طبی امداد فراہم کی لیکن تقدیر اپنا وار بھرپور انداز میں کر چکی تھی۔

ساجد کی نہ صرف ریڑھ کی ہڈی بری طرح مضروب ہوئی تھی بلکہ دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں بھی چٹخ گئی تھیں۔ اسپتال انتظامیہ نے گلریز سے شہر کے کسی بڑے سرجن یا آرتھوپیڈک سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا لیکن غربت اور معاشی پسماندگی کسی بھی مہنگے علاج کی متحمل ہی نہ تھی۔

گلریز نے اورنگ خان سے رجوع کیا اور ساجد کے علاج کے لیے خاطر خواہ رقم کے انتظام کی کئی بار درخواست کی لیکن یہ وہ وقت تھا جب اورنگ کے مزاج کی فرعونیت سوا نیزے پر تھی لہٰذا انکار اور ذلت کے کوڑے کھانے کے بعد گلریز کے پاس محض اتنی رقم موجود تھی کہ اپنے جگر گوشے کے لیے ایک 'وہیل چیئر' کا بندوبست کر سکے۔ سابقہ بچت اس کی مہنگی ادویات اور علاج پر پہلے ہی صرف ہو چکی تھی۔

تین ماہ بعد جب نہم جماعت کے سالانہ نتائج کا اعلان ہوا تو صحت مند وجود کا حامل ساجد خان لاغر اور معذور روپ لیے ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں وہیل چیئر پر منتقل ہو چکا تھا۔ اس کی حالتِ زار دیکھ کر گلریز کا دل چاہتا کہ کسی بھی طرح اپنے وجود کی ساری قوت بیٹے کو عطا کر دے۔ اپنی ناکامی اور بیٹے کی دائمی معذوری کی اذیت سہنا اس کے لیے ہرگز آسان نہ تھا۔ ردِعمل کے طور پر اس نے ساجد کا سامنا ترک کر کے خود کو روز و شب محنت کی بھٹی میں جھونک دیا۔

اس حادثے نے گھر کا سارا انتظام بُری طرح تلپٹ کر دیا اور بچوں کی پڑھائی کا سلسلہ بھی وقتی طور پر رک گیا۔ گلالئی بھی اس موقع پر بہت پریشانی کا شکار تھی۔ اسے اپنا اور بیٹی کا وجود بھائی کے لیے ایک اضافی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ وہ اپنی محدود سمجھ بوجھ کے مطابق اسے صرف ایک ہی مشورہ دے سکی۔

''لالہ! ماجد اور واجد کو بھی اپنے ساتھ کام پر لے جائیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ ابھی سے ہی کوئی کام دھندا سیکھ لیں؟''

''نہیں! یہ ہرگز بہتر نہیں۔'' گلریز نے سختی سے کہا۔

''لیکن کیوں لالہ! آمدنی میں اضافہ بہت سے مسائل حل کر دے گا۔''

''میں ان بچوں کی تعلیم ہر صورت میں جاری رکھوں گا۔ یہ میرے گلشن کے پودے ہیں جو مستقبل میں شجر بن جائیں گے اور تعلیم یافتہ ہونے کی صورت میں ہی بہترین پھل فراہم کریں گے۔ میں ان پودوں کو زمانے کی کڑی دھوپ میں جھلسنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔''

''ابی جان ٹھیک کہتے ہیں پھپھو! میں اپنے خوابوں کی تعبیر تو حاصل نہ کر سکا لیکن اپنے بھائیوں کو یہی خواب پورے کرتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اچھی زندگی اور حالات میں تبدیلی تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔'' ساجد کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ تھی۔

''جیسے آپ مناسب سمجھیں!'' وہ محض یہی کہہ سکی۔

☆☆☆

ماضی قریب کے ان تلخ واقعات کی بازگشت ذہن میں لیے وہ ساجد کے کمرے میں پہنچ گیا۔

گزشتہ چار سال میں اس کی جسمانی حالت میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ ابتدا میں اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن دائمی معذوری اور گلریز کی بے پناہ مصروفیت کے باعث وہ کامیاب نہ ہو پایا جس کا حل بھی اس نے تلاش کر لیا تھا۔

نصابی کتابوں سے قطع نظر اس نے ماجد کے توسط سے علاقے میں موجود واحد لائبریری سے مختلف کتب منگوا کر مطالعہ کا آغاز کر دیا۔ اس کا ذہن اب یکسو ہو چکا تھا۔ اس کا شوق دیکھتے ہوئے دونوں بھائی بھی اسی نقشِ قدم پر چلنے لگے۔ مطالعہ کتب نے ایک جانب جہاں ان کی زبان دانی اور عام بول چال میں واضح فرق پیدا کیا وہیں ایک بے حد مربوط اور گہرا احساسِ محبت بھی پروان چڑھنے لگا۔

''کیا ہوا واجی! ایسے منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟'' ساجد نے پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں لالہ! بس یونہی۔''

''یہ بات غلط ہے! کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے معاہدہ کیا تھا کہ کبھی کوئی معاملہ ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں رکھیں گے۔'' ماجد بھی وہیں موجود تھا۔

''یاد ہے لالہ!''

''تو بتاؤ پھر شاباش!''

''لالہ! یہ وصولی کیا ہوتی ہے؟ ابی جان کس چیز کی ادائیگی کرتے ہیں؟ ہمارے گھر میں باقی سب کی طرح خوش حالی کیوں نہیں؟ ابی جان کی پریشانیوں کی آخر کیا وجہ ہے؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کیے۔

ساجد کے چہرے پر کئی رنگ لہرا گئے۔

''یہ بات تو میں نے بھی کئی بار سنی ہے لیکن حقیقت سے

واقف ہی نہیں ہو پاتا۔'' ماجد نے بھی دبے لفظوں میں کہا۔

''ابی جان تم لوگوں کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے ابھی۔ اسی لیے نہیں بتایا انہوں نے۔'' ساجد دھیرے سے بولا۔

''یعنی آپ کو علم ہے اس بات کا؟'' ماجد نے تیزی سے کہا۔

''ہاں! میرے حادثے کے بعد ابی جان کی بے بسی پر میں کافی منفی ردِّعمل دینے لگا تھا پھر ایک روز خود ہی سچائی میرے سامنے آ گئی۔'' وہ مناسب الفاظ میں تمہید باندھ کر انہیں بتانے لگا۔

ان کے دادا نے یہاں منتقلی کے بعد کئی سال قبل تبریز خان شخص سے کاروبار کے لیے سود پر پانچ لاکھ روپے ادھار لیے تھے۔ کاروبار پنپ سکا نہ ہی وہ کبھی اس قرض کی ادائیگی کے قابل ہو سکے۔ گلریز خان کو تعلیم سے دستبرداری کے بعد والد کی اس جہدِ مسلسل میں شریک ہونا پڑا۔

پہلے پہل قیمتی زیور فروخت ہوئے اور پھر نوبت گھریلو سامان تک آ پہنچی۔ ہر ماہ سود کی قسط ادا کرنے کے بعد بھی اصل قرض جوں کا توں برقرار تھا۔ تبریز کی وفات کے بعد یہ کارِخیر اس کی اولاد نے سنبھالا اور وہ اپنے والد سے کہیں زیادہ کامیابی سے یہ سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ قرض داروں سے وصولی میں شدید سختی در آئی تھی۔

گلریز کی ناکامی کے بعد یہ 'ذمّے داری' اب اس کی اولاد کی جانب منتقل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی تشنہ خواہشات اور ناکامی کے باعث تینوں بچوں کو 'سرکاری نوکری' پر فائز دیکھنے کا خواہشمند تھا تاکہ تیسری نسل تک پہنچنے والی اس عفریت کا خاتمہ ہو سکے۔

''میں اپنی پڑھائی اور اعلیٰ مستقبل کے بعد اس لعنت سے چھٹکارے کے لیے بہت پُرامید تھا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔'' ساجد نے ہونٹ کچلتے ہوئے کہا۔

''اس حادثے میں آپ کا بھلا کیا قصور لالہ؟'' ماجد نے فوراً بڑے بھائی کو دلاسا دیا۔

''میرے بعد یہ ذمّے داری تم دونوں پر آن پڑی ہے۔ ابی جان اور ہماری آئندہ نسل کو اس لعنت سے تمہی نجات دلوا سکتے ہو۔''

''ہمیں اپنی اس ذمّے داری کا مکمل احساس ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک روز میں اس قرض میں کمی اور پھر خلاصی کا سبب بنوں گا۔'' ماجد نے ایک عزم سے کہا۔

''میں تو ابھی چھوٹا ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں بھی اتنے طاقتور نہیں لیکن میں بھی وعدہ کرتا ہوں لالہ!'' واجد نے معصومیت سے جواب دیا۔

ساجد نے طمانیت سے سر ہلایا اور ان کی روانگی کے بعد اپنی ایک نئی کتاب کے مطالعے میں مگن ہو گیا۔ گلریز کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ ماجد ان کے درد کا درماں ضرور بنے گا۔

☆☆☆

تیرہ سالہ ماجد بھی ایک ذہین طالب علم تھا۔

بڑے بھائی کی معذوری اور گھریلو حالات نے اسے بہت حساس بنا دیا تھا۔ ساجد کا یہ نیا انکشاف ان دونوں کے لیے بہت مثبت تحریک ثابت ہوا اور وہ اپنی پڑھائی کے لیے مزید سنجیدہ ہو گئے۔ نتیجتاً اگلے چند سالوں میں وہ کامیابی کی کئی منازل طے کرتے چلے گئے۔

ماہ گل کی تعلیم بھی واجد کے توسط سے جاری تھی۔ وہ امتحان دینے کے قابل تو نہ تھی لیکن اس کی قابلیت کسی بھی طرح واجد سے کم نہ تھی۔ دو سال مزید گزرے تو ماجد نے کیڈٹ اسکول سے میٹرک کے امتحانات میں ضلعی بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کر کے گلریز کی پُرتپش زندگی کو یکدم نخلستان میں تبدیل کر دیا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔ میرے گلشن کے یہ پودے اپنی جڑیں پیوست کر چکے ہیں۔ اب وہ وقت دور نہیں جب یہ بھرپور سایہ دار درخت بن کر میرے لیے دائمی سایہ ثابت ہوں گے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا ابی جان! لیکن ابھی ایک اور خوشخبری بھی منتظر ہے آپ کی۔'' ماجد مسکرایا۔

''وہ کیا بھلا؟'' گلریز نے بے تابی سے پوچھا۔

''مجھے کیڈٹ کالج میں داخلہ کے لیے وظیفہ ملا ہے۔ ہاسٹل میں رہائش گاہ کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔''

''اللہ پاک تمہارے لیے ہر منزل آسان فرمائے۔'' ساجد کا لہجہ رندھ گیا۔ وہ ماجد کی اس کامیابی پر بے حد مسرور تھا۔

کالج کی پڑھائی میں مگن ہونے کے بعد بھی وہ اپنا عہد بھول نہ پایا تھا۔ وہ ایک بے حد پُرجوش اور جذباتی نوجوان تھا۔ جذبۂ حب الوطنی اور خود اعتمادی سے ہمہ وقت سرشار رہتا۔ کیڈٹ کالج نے اس کی ان شخصی خوبیوں میں مزید نکھار پیدا کیا۔ ماجد بڑے بھائی کی نسبت واجد سے زیادہ قریب تھا۔ گھر آمد کے بعد جب وہ اسے اپنی تربیت، پڑھائی اور اساتذہ کی بابت قصے سناتا تو واجد کے دل میں بھی جلد از جلد اس منزل تک پہنچنے کے لیے جذبات مچلنے لگتے۔

ماجد کا شوق دیکھتے ہوئے اس کے ایک دوست نے

اسے ربڑ کی گولیوں والی پستول دے رکھی تھی۔ وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ اکثر گھر کے عقبی میدان میں درختوں پر نشانے کی پریکٹس کرتے۔ تبریز خان کے بیٹوں اور دیگر خیالی دشمنوں کے ہیولے اس جذبے میں مزید شدت پیدا کرتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کا باہمی رشتہ بہترین دوستی میں تبدیل ہونے لگا۔ ماجد اس کے لیے ایک آئیڈیل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ واجد اب جلد از جلد اس کے مقام تک پہنچنا چاہتا تھا۔

لیکن پھر ان کی زندگی نے ایک ایسا موڑ لیا جو خوابوں، خواہشات اور ارادوں کا مدفن ثابت ہوا۔

☆☆☆

واجد کے اسکول میں سالانہ تقسیمِ انعامات کی تقریب تھی۔

ساجد کے حادثے کے بعد مالی مسائل کی وجہ سے اس کے تعلیمی سفر میں چند ایک وقفے آتے رہے تھے جس کی بدولت وہ میٹرک کرنے تک اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچ چکا تھا۔ اسکول انتظامیہ نے سالانہ تقسیم انعامات کے ساتھ واجد کی جماعت کے لیے ایک 'الوداعی تقریب' کا اعلان بھی کر دیا۔

زندگی کا ایک اہم ترین پڑاؤ مکمل ہونے پر وہ بے حد خوش تھا اور اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ بھی ماجد کی طرح کالج میں داخلہ لے کر اپنی منزل اور عہد کی تکمیل کی مزید مسافت طے کرلے گا۔

اس تقریب کے لیے رنگا رنگ پروگرام کی تیاریوں کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ واجد بھی اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک ملی نغمے پر علاقائی رقص کے لیے ریہرسل کرتا۔ اس نے ماجد کو بھی اس پرفارمنس کے متعلق ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بے حد اصرار کے بعد اسے وہاں آمد کے لیے رضامند کر چکا تھا اور اب ایک 'سرپرائز' دینے کے لیے مکمل تیار تھا۔

اسکول مرکزی سڑک پر واقع تھا جہاں کئی ایک نواحی قصبوں سے بچے حصولِ تعلیم کے لیے آتے۔ پرانے وقتوں کی یہ عمارت اچھی دیکھ بھال کے باعث بہت عمدہ حالت میں تھی۔ تقریباً اڑھائی سو بچوں پر مشتمل اس ادارے کی تعلیمی ساکھ بھی بہت اچھی تھی۔

پرنسپل محکمۂ تعلیم سے ریٹائرڈ ایک اولوالعزم انسان تھے۔ انہوں نے فراغت کی زندگی شہر میں واقع اپنے بہترین گھر اور آسائشوں میں بسر کرنے کے بجائے نواحی قصبوں کے سنگم پر واقع اس نیم سرکاری اسکول کی انتظامی ذمے داریاں سنبھالنے کو ترجیح دی۔ ان کی آمد کے بعد تعلیمی نتائج میں بھی بہترین تبدیلیاں آئی تھیں۔

تقریب کا اہتمام اسکول ہال میں تھا۔ عمارت کی تعمیر میں کشادگی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ مرکزی دروازے کے دائیں جانب پرنسپل کا دفتر اور ایک وسیع وعریض صحن تھا۔ صحن کے اختتام پر کمرائے جماعت واقع تھے جن کی عقبی جانب ایک کھیل کا میدان اور انتہائی کونے پر یہ امتحانی ہال واقع تھا جو بوقتِ ضرورت مختلف تقاریب کے انعقاد کے لیے بھی استعمال ہوا کرتا تھا۔

اسکول کی مرکزی عمارت کی نسبت اس ہال میں قدامت کا حسن جھلکتا تھا۔ شرقاً غرباً داخلی دروازوں کے علاوہ ہر دیوار میں روشندان اور رنگین شیشوں پر مشتمل کھڑکیاں بھی موجود تھیں تاہم انہیں موسم سرما میں مقفل رکھا جاتا تھا۔

پرنسپل عثمان احمد کی خصوصی کاوشوں کی بدولت اس سال تقریب میں والدین بھی شرکت کر رہے تھے۔ ماضی میں ذاتی اور پیشہ ورانہ مصروفیات کے باعث اکثر والدین کی آمد ممکن ہی نہ ہو پاتی تھی تاہم اس مرتبہ ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ہی ورائٹی شو اور دیگر منفرد پروگرامز کا انعقاد کیا گیا تھا۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ عثمان احمد کی شخصی خوبیوں کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ ان کے کم قیمت کپڑوں، کم علمی اور غریب معاشی پس منظر کے باوجود انہوں نے بھی ان کے احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

بچوں کے ساتھ والدین کی آمد کا تناسب توقع سے کم تھا۔ وہ سبھی ایک سرشاری میں مبتلا تھے۔ خواب، توقعات اور اپنے بچوں کی کامیابی کی امید چمک بن کر آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ اسٹیج پر ان کی پرفارمنس اور جماعت میں پوزیشن حاصل کرنے کی صورت میں انعام کی وصولی تو کئی ایک کی آنکھوں میں نمی بن کر چھلک جاتی۔ وہ خوابوں اور امنگوں کی تکمیل کا دن تھا۔ سب کچھ ایک منظم طریقے سے چل رہا تھا لیکن یکدم ایک عفریت نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

☆☆☆

اسٹیج پر اس وقت واجد اپنے تین دوستوں کے ساتھ ملّی نغمے کی مدھر موسیقی اور خون گرما دینے والے بول پر علامتی رقص کرنے میں مصروف تھا۔ اسے اسٹیج سے تیسری رو کی داہنی نشست پر بیٹھا ماجد بخوبی نظر آرہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوشی، فخر اور جوش کے دلکش رنگ پھیلے دیکھ کر واجد کی کارکردگی مزید مہمیز ہونے لگی۔

اسی دوران ہال کے تین مختلف کونوں میں ہلچل برپا ہو گئی۔ پچھلی رو میں بیٹھے ایک شخص نے عقبی دروازہ اندرونی

جانب سے مقفل کر دیا۔ ان کا ایک ساتھی دروازے کی بیرونی سمت مہمانوں کے استقبال کے لیے تکریمی انداز میں کھڑے گارڈ کو سائلنسر لگے پستول سے کچھ دیر پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

دروازہ مقفل ہوتے ہی اگلی رو میں بیٹھے ایک بھاری بھر کم شخص نے اپنے لباس سے بجلی کی سی سرعت سے پسٹل نکالا اور میوزک پلیئر پر فائر کر کے موسیقی کی صدا کا ماخذ ختم کر دیا۔ اس کے وجود میں بلا کی پھرتی تھی۔ وہ ایک جست لگا کر اسٹیج پر آیا۔ عثمان احمد کے علاوہ انہی کے ساتھ بیٹھے مہمانِ خصوصی کو اپنے نشانے پر رکھ کر اسے فوری نہتا کر دیا۔

اظہر بشیر ایک نوجوان سرکاری افسر تھا جو مقابلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد حال ہی میں اس عہدے پر تعینات ہوا تھا اور عثمان احمد کے سابقہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہاں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

''اوئے بچہ لوگ! فوراً ایک لائن بنا کر اِدھر ہی بیٹھ جاؤ۔'' اس نے دھاڑتے ہوئے واجد اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔

ہال میں شدید سنسنی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چار مختلف کونوں سے پسٹل تھامے افراد کی برآمدگی انہیں حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

''کیا چاہتے ہو تم؟ میں ان کھلونوں سے نہیں ڈرتا!'' اظہر نے دبنگ لہجے میں کہا۔

''ہم کیا چاہتے ہیں، یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' اس نے پستول کا دستہ اظہر کے منہ پر رسید کیا۔

''ظہیر! جلدی سے باقی ہتھیار نکالو۔ انہیں علم تو ہو کہ ہم پوری تیاری سے یہاں آئے ہیں۔'' اسی شخص نے ایک اور ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

درمیانی رو سے ایک اور شخص اٹھا اور اسٹیج کی پچھلی جانب لگے بینر کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس بینر پر اسکول کے نام اور مہمانوں کے لیے استقبالیہ کلمات لکھے تھے۔ بینر کے ہٹتے ہی وہ اسٹیج پر اوندھا لیٹا اور نچلی جانب سے ریگزین کا ایک بیگ نکال لیا۔

اس بیگ میں مختلف آتشیں ہتھیار موجود تھے۔ اس کے ہاتھ کسی مشین کے مانند حرکت کر رہے تھے۔ کلاشنکوف، زائد میگزین، واکی ٹاکی سیٹ اور ہینڈ گرینیڈ بم نکال کر اس نے سبھی ساتھیوں میں یکساں طور پر تقسیم کیے اور خاموشی سے ایک ٹرپل ٹو رائفل تھامے اپنے سرغنہ کی جانب نئے حکم کے لیے متوجہ ہو گیا۔

''آصف اور تم ان سب لوگوں کی تلاشی لو اور موبائل فون نکال کر ایک طرف رکھتے جاؤ۔''

''ٹھیک ہے باس!'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''اور اگر ان میں سے کوئی چیں پچر کرنے کی کوشش کرے تو اسے فوراً اُڑا دینا۔'' اس کا سفاک لہجہ اور خونخوار آنکھیں وہاں سبھی افراد کا پتا پانی کر رہی تھیں۔

''ان بے گناہوں نے آخر کیا بگاڑا ہے تمہارا؟'' عثمان احمد خاموش نہ رہ سکے۔

''بتاتا ہوں انگریزی بابو! سب بتاتا ہوں۔ ذرا دھیرج تو رکھو۔'' اس نے ایک زوردار ٹھوکر ان کے پیٹ میں رسید کی۔

اسٹیج پر بیٹھے بچے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ہال میں موجود دیگر افراد کی نسبت وہ زیادہ خوف اور دباؤ کا شکار تھے۔ واجد نے دزدیدہ نظروں سے بڑے بھائی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اعتماد اور بے خوفی جھلک رہی تھی۔ اسی پل ماجد نے ایک عجیب سی حرکت کر ڈالی۔ اپنے جوتوں کے تسمے ٹھیک کرنے کے لیے وہ ذرا سا جھکا اور پھر فوراً سیدھا ہو گیا۔

واجد اس کی حرکات و سکنات بالکل بھی سمجھ نہ پا رہا تھا تاہم وہاں موجود افراد اس قدر سرعت سے ہال میں چکراتے ہوئے حاضرین سے موبائل فون اور چھوٹا موٹا اسلحہ جمع کرنے میں مصروف تھے کہ ان کو دیکھتے ہوئے ذہن میں بگولے پیدا ہونے لگے۔

وہ درمیانی عمر کے قدرے طویل قد و قامت کے لوگ تھے۔ ان کے لباس مقامی افراد جیسے ہی تھے۔ داڑھیاں گھنی اور بال لمبے تھے۔ ان کے بشرے میں سب سے منفرد شے آنکھیں تھیں۔ لہو چھلکاتی، بے حس اور کسی بھی جذبے سے مبرّا۔ وہ صاف اور باتلفظ اردو بولتے تھے لیکن لہجہ کہیں نہ کہیں نامانوسیت کی چغلی کھاتا تھا۔

''باہر بھی نظر رکھو اور جو بھی چوں چرا کرے اس کی آواز بند کر دینا۔'' اس کی گرج سن کر وہاں ابھرنے والی دبی دبی سسکیاں اور بے چینی فوراً معدوم ہو گئی۔

''تم اپنی موت کو خود آواز دے رہے ہو۔ اس طرح دہشت پھیلا کے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' اظہر نے بے خوفی سے کہا۔

''ہم یہاں پھیلی ہوئی گندگی صاف کرنا چاہتے ہیں...... وہ گندگی جو تم لوگوں نے پھیلا رکھی ہے۔'' وہ بھڑک گیا۔

''کیسی گندگی؟'' عثمان احمد نے اظہر کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس معاملے کو ٹھنڈے دل و دماغ سے حل کرنا چاہتے تھے۔

''تم ان بچہ لوگوں کو بے حیائی سکھا رہے ہو...... یہ گندگی نہیں تو اور کیا ہے؟''

''دیکھو! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ تو محض ایک ورائٹی شو ہے۔''

''کان اس طرف سے پکڑو یا ہاتھ گھما کے۔ نتیجہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

''اگر تمہیں اس بات پر کچھ تحفظات تھے تو تم مجھ سے براہِ راست بات کر لیتے۔ میں نے اپنے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رکھے ہیں۔''

''تم جیسے لوگ صرف ایک ہی زبان سمجھتے ہیں...... ہتھیار کی زبان۔'' اس نے اپنی رائفل تھپتھپاتے ہوئے تکبّر سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم لوگ میرے متعلق کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہو۔'' وہ اُلجھ گئے۔

''نہیں! کوئی غلط فہمی نہیں ہے...... ہم بہت عرصے سے تم لوگوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔'' اس نے اطمینان سے ڈائس کے ساتھ موجود کرسی اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ تو پھر کیا نتیجہ نکلا تمہاری اس جاسوسی کا؟'' اظہر نے طنز کیا۔

''تم یہاں بے حیائی پھیلا رہے ہو...... کافر لوگوں کی زبان سکھاتے ہوناہیں۔''

''انگریزی زبان سکھانا وقت کا تقاضا ہے۔ ترقی کرنے کے لیے دنیاوی علم سیکھنے میں کیا حرج ہے؟'' عثمان احمد اس کی منطق سمجھ نہ پائے۔

''کافر ہر حال میں کافر ہے۔ لولے لنگڑے بہانے گھڑ لینے سے حرام شے حلال میں نہیں بدل جاتی۔''

''آخر برائی کیا ہے اس ذریعۂ تعلیم میں؟ کیا ہماری نئی نسل کو جدید دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا حق نہیں؟''

''تم لوگ غلامی سکھاتے ہوناہیں۔ یہ زبان سیکھ کر غلام طبقہ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' اس کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہوئے اظہر کے ذہن میں اب خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

''تمہارا یہ موقف درست نہیں! لیکن پھر بھی اگر ایک لمحہ کے لیے اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو اس میں ان بے گناہ بچوں اور والدین کا کیا قصور ہے۔ انہیں رہا کر دو۔ اسکول انتظامیہ تمہارے مطالبات اور تحفظات کے لیے ون ٹو ون بات چیت کرنے کے لیے تیار ہے۔'' عثمان احمد مسلسل بات سنبھالنے کی کوشش میں تھے۔

''یہ معاملہ انتظامیہ سے بہت اوپر کی بات ہے! اب تمہارے بڑوں سے بات ہوگی۔''

''اوہ! اب آئے ہو ناں اصل مدعا پہ...... بتاؤ کتنے مطالبات منوانا چاہتے ہو ان معصوم لوگوں کی اسیری کے بدلے میں؟'' اظہر نے کہا۔

''ہمارے مطالبات ان لوگوں کے بدلے نہیں! تم دونوں جیسے بڑے مگرمچھوں کی قید پورے کروائے گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔

عثمان کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

ملک میں اسکول عمارات کی تباہی اور تعلیم کے لیے ایسے منفی دلائل ان کے لیے کوئی نئی بات تو نہ تھی لیکن اس طرح اسلحے کی موجودگی اور خونخوار ارادے انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا مکمل احساس دلانے لگے۔ وہ یقیناً مجرمانہ ذہن کے حامل تھے اور کسی بھی اونچ نیچ کی صورت میں یہاں قیامت برپا کر سکتے تھے۔

ہر قسم کی احتیاط کے باوجود وہ نقب لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ گزشتہ رات اسٹیج پر ضروری تبدیلیوں اور اسپیکر سسٹم میں ترمیم کروانے کے لیے چند مقامی افراد کو طلب کیا گیا تھا جس کی آڑ میں یہ کھیل کھیلنے کے لیے انہیں مطلوبہ سہولیات میسر آ گئیں۔

ہال میں شدید سراسیمگی کا عالم تھا۔ خوشیوں اور امیدوں کی چہک خوف، تناؤ اور دہشت میں ڈھل گئی تھی۔ اسلحہ بردار سبھی افراد ...... کے پاس موجود اشیا اکٹھی کر چکے تھے۔ یہ درمیانے اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد تھے جن کے پاس سستے اور استعمال شدہ موبائل فون اور چند کرنسی نوٹوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

''ٹھیک ہے! ہم اسیری میں رہنے کے لیے تیار ہیں لیکن ان سب بے گناہوں کو رہا کر دو۔'' عثمان نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں...... اس کے لیے تمہارے حکم کی ضرورت نہیں...... یہاں سے کوئی بھی شخص باہر نہیں جائے گا...... اگر کسی نے اُلجھنے کی کوشش کی تو انجام کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔'' سرغنہ نے ایک بار پھر خونخوار انداز میں کہا۔

صورتِ حال اب مکمل طور پر واضح ہو چکی تھی۔ ہر فرد کے دل میں دھڑکن کے بجائے گولے پھٹ رہے تھے۔

چہروں پر مردنی چھا گئی اور سفید پڑتے ہونٹ مسلسل زیرِلب وظائف میں مصروف تھے۔

''اپنا سرکاری نمبر نکالو اور کسی 'بڑے' سے ہماری بات کرواؤ۔'' سرغنہ نے اظہر کو مخاطب کیا۔

اظہر کی آنکھوں اور چہرے پر بھی سوچ اور تفکرات کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں۔ اس نے اپنا آفیشل موبائل فون طلب کیا اور پیشانی مسلتے ہوئے رابطہ قائم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

دوسری جانب کال ملتے ہی اس نے سرغنہ کے اشارے پر فون اسپیکر آن کردیا۔

''میری بات غور سے سنو آفیسر! تمہارے دو اہم بندوں کے علاوہ اسکول کے بچّے اور ان کے والدین ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہمیں ہلکا مت لینا۔ اسکول کے گارڈ، چوکیدار وغیرہ سب مر چکے ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی بچانے نہیں آسکتا۔ اگر کوئی بہادری دکھانے کی کوشش کی تو وہ نادانی ہوگی۔''

''تمہارے مطالبات کیا ہیں؟'' دوسری جانب سے پُرتفکر انداز میں پوچھا گیا۔

''ہم بیس کروڑ روپے اور اپنے دو بندوں کی رہائی چاہتے ہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''بیس کروڑ...... کیا تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟''

''میرے ساتھ سودے بازی مت کرو...... میں بار بار ایک ہی بات کہہ رہا ہوں...... ہمیں ہلکا مت لینا۔'' اس کا سفاک لہجہ سن کر وہاں سبھی افراد کے بدن سنسنا اٹھے۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہاری پوزیشن اس وقت بہت اسٹرانگ ہے لیکن بہت سے معاملات اس وقت میرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔''

''ہمارے ہاتھ میں اس وقت دو سو سے زائد لوگوں کی زندگی ہے...... انگلی کی ایک حرکت سے یہ سب اپنی موت کو گلے لگالیں گے۔''

''کن دو بندوں کی رہائی چاہتے ہو تم؟''

''جنہیں دو ہفتے پہلے سزائے موت سنائی گئی ہے۔''

اس کا مطالبہ سن کر دوسری جانب ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

''وہ اس صوبے میں نہیں ہیں...... نامعلوم مقام پر منتقل ہوچکے ہیں۔''

''وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوں...... مجھے اُن کی واپسی ہر قیمت پر چاہیے۔''

''مجھے تھوڑا وقت درکار ہے۔ یہ صورتِ حال اعلیٰ قیادت کے سامنے رکھنے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔''

''موت کا فرشتہ جب جان نکالنے کے لیے آتا ہے تو وقت دیکھتا ہے نہ صورتِ حال اس لیے جو بھی کرنا ہے جلدی کرو۔''

''مجھے اس معاملے کی نزاکت کا پورا احساس ہے۔ تم پلیز اظہر سے میری بات کرواؤ۔''

''جو بھی بات ہوگی، وہ میرے سامنے ہی ہوگی۔''

''بالکل تمہارے سامنے ہی سب کچھ ہوگا۔'' انہوں نے زچ ہوکر کہا۔

''ہیلو اظہر! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

''یس سر!'' وہ چونکتا ہوا۔

''کیا وہاں سب کچھ ویسے ہی ہے جیسا کہ بیان کیا جارہا ہے؟'' وہ محتاط انداز میں بولے۔

''یس سر! یہاں صورتِ حال کافی نازک ہے۔''

''کیا ہمیں اپنوں سے جنگ درپیش ہے یا یہ غیر ملکی افراد ہیں؟''

''یہ مقامی افراد ہیں سر! سبھی مقامی لباس اور انداز و اطوار کے حامل ہیں۔'' وہ قدرے توقف سے بولا۔

''کسی قسم کا خون خرابا تو نہیں کیا گیا ابھی تک؟''

''نو سر! لیکن ان کے دماغ کے چاروں کونوں میں انتقام سمایا ہوا ہے۔ مجھے ان کا بالائی دماغ بالکل ہی فارغ دکھائی دیتا ہے۔'' اظہر نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا تو پسٹل کا دستہ اس کا مزاج پوچھ گیا۔

اس کے منہ سے بے اختیار ایک گالی برآمد ہوئی۔

''اپنی زبان سنبھال کر بات کرو۔ ورنہ اسے گدی سے کھینچ لوں گا۔''

''اپنا مزاج ٹھنڈا رکھنا آفیسر! کسی قسم کا کوئی رسک لینے کی ضرورت نہیں۔''

''یس سر! ڈونٹ یو وری!'' اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خون کا نمکین ذائقہ محسوس کیا۔

اسے قدرے اطمینان ہو چلا تھا کہ وہ اپنا 'پیغام' پہنچانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

''میں صرف چار گھنٹے انتظار کروں گا۔ اس کے بعد یہاں لاشیں گرنے کا عمل شروع ہوجائے گا۔ ہر لاش کو بہروز کی جانب سے اپنے لیے تحفہ سمجھ لینا۔'' اس نے تکبّر سے کہتے ہوئے فون آف کردیا۔

مطالبات کرنے والوں کی وحشت اور تکمیل کرنے والوں کی اس کنارہ کشی نے وہاں موجود افراد کو حواس باختہ کر

دیا تھا۔

☆☆☆

واجد اپنے دوستوں کے ہمراہ اسٹیج ہی پر ہی موجود تھا۔ مکالمے، مطالبے، نفرت اور وحشت کا ہر منظر اپنی مکمل شدت کے ساتھ اس کے سامنے عیاں تھا۔ خوشی و سرشاری سے جاری کچھ دیر پہلے کے لمحات اب اسے ایک خواب محسوس ہو رہے تھے۔

اس تناؤ زدہ ماحول میں اپنے ساتھیوں اور ان سے متعلقہ افراد کے سبھی محسوسات کسی موسم کے مانند اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے تھے۔ لمحہ کا ہزارواں حصہ بھی صدیوں کی سی مسافت لیے ہوئے تھا۔ گاہے بگاہے وہ ماجد کی جانب بھی اچٹتی نگاہ سے دیکھ لیتا۔ بڑے بھائی کی موجودگی اس کے لیے ایک بے عنوان تقویت تھی۔

ہال میں دبی دبی سرگوشیاں اور سسکیاں بھی یکدم ہوا کے دوش پر سنائی دینے لگی تھیں۔ بچوں اور والدین کے چہروں پر چھائے تفکرات، خونی رشتوں کی یاد اور غیر یقینی مستقبل کی پرچھائیاں دیکھ کر اسے یقین تھا کہ اس کا اپنا چہرہ بھی انہی جذبات کا واضح عکس بنا ہوگا۔ اپنی بقا سے قطع نظر اسے گلریز خان اور ساجد کا خیال بے چین کرنے لگتا تو دوسرے ہی پل بچپن سے اپنے ساتھ سائے کی طرح رہنے والی ماہ گل کا خیال بے کلی میں اضافہ کر دیتا۔

وہ عمر کے ایسے مقام پر پہنچ چکا تھا جب صنفِ مخالف کے لیے ایسے جذبات کی گہرائی اور سچائی سمجھنا بالکل مشکل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے امتحانات سے فراغت کے بعد اپنی خواہش بڑے بھائیوں کے گوش گزار کرنے کا ارادہ بھی کر چکا تھا۔ لیکن اس وقت سب سے بڑی سچائی یہ تھی کہ وہ ایک تنے ہوئے رستے پر ساکت کھڑے زندگی اور موت کی کشمکش میں جھول رہے تھے۔

واجد نے ایک بار پھر بے قراری کے عالم میں ماجد کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہنوز اطمینان اور خود اعتمادی کی چمک تھی۔ واجد کو علم تھا کہ کیڈٹ کالج میں داخلے کے بعد اس کے انداز و اطوار میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ وہ کسی بھی مخدوش صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر خاصی مضبوطی حاصل کر چکا تھا لیکن اس موقع پر ایسا پُرسکون انداز اسے مزید بیتابی میں مبتلا کرنے لگا۔

اس کے اور باقی سبھی دوستوں کے ہاتھ میں بھی ہتھیار موجود تھے لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ وہ علامتی اسلحہ دہشت پھیلا سکتا تھا نہ ہی انہیں رہائی دلوانے کا اہل تھا۔ اس نے بے بسی سے اس بے جان بندوق کو دیکھا اور زیرِ لب محض یہی کہہ سکا۔

”خدایا! ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔“

☆☆☆

وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا گیا۔

اسٹیج کے عقب میں دیوار پر موجود کلاک کی سوئیوں کی مدھم ٹک ٹک بھی اعصاب کے لیے صورِ اسرافیل سے کم ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ حملہ آوروں کی دی گئی مدت ختم ہونے میں کچھ ہی منٹ باقی تھے۔ یرغمالیوں کے دل آس، خوف اور امید کے پنڈولم میں جھولتے ایک ہی ’ٹانک‘ میں الجھے تھے کہ اعلیٰ حکام کی جانب سے کوئی بہتری کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

وہ ہر ممکن طور پر اپنی اضطراری حرکات و سکنات اور اندرونی خلفشار کو قابو میں رکھے ہوئے تھے تاکہ کسی بھی بے اختیار عمل سے ان پر مسلط افراد کو تشدد کا کوئی موقع نہ مل سکے لیکن ہونی ہر صورت ہو کر رہتی ہے۔ سب احتیاطی تدابیر کے باوجود وہاں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔

ہال کی درمیانی رو سے دبی دبی کراہوں کی آواز بلند ہونے لگی تھیں۔ ایک دس سالہ بچے کے مثانے پر دباؤ کی وجہ سے اس کی قوتِ برداشت ختم ہو گئی اور وہ گھٹی آواز میں ان سے التجائیں کرنے لگا۔

”انکل پلیز! مجھے واش روم جانے دیں۔“

”اپنا منہ بند رکھو چھوکرے!“ پچھلی جانب سے آصف چلّایا۔

”پلیز، انکل! مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا۔ آپ کے اپنے بچے بھی تو ہوں گے ناں۔ پلیز انہی کا خیال کر کے مجھے واش روم جانے دیں۔ چاہے خود ہی لے جائیں۔ پلیز انکل!“

”میرا بچہ اگر ایسے کافر ماحول میں ہوتا تو میں اس کا بھی نرخرا دبا دیتا۔“ آصف نے حقارت سے کہا۔

”انکل پلیز! آپ کو اللہ کا واسطہ!“ وہ منت سماجت کرنے لگا۔ اس کے ساتھ اہلِ خانہ میں سے بھی کوئی موجود نہ تھا غالباً والدین کسی مصروفیت کے باعث شریک نہ ہو پائے تھے۔

اس کی دبی کراہیں بلند ہوئیں تو بہروز کی برداشت کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

”اوئے آصف! اسے خاموش کرواؤ۔ ورنہ بہت بُرا ہو گا۔“ اس نے اپنی مخصوص بیزاری سے چنگھاڑ کر کہا۔ بہروز کی

آواز میں کرختگی اور سفاکی دل و دماغ میں بہت چبھن پیدا کرتی تھی۔

واجد کو ان کی سفاکی، بے حسی اور ہٹ دھرمی دیکھ کر بچپن میں پڑھی جانے والی ایک کہانی یاد آنے لگی۔ اس کہانی کے مطابق چند روبوٹ لوگ مشینیں دنیا پر قبضہ کرنے چلے آتے ہیں۔ وہ گوشت پوست کے انسانوں سے بہت نفرت کرتے ہیں۔ ان کی نفرت و حقارت انسانی زندگی کے خاتمے کے درپے ہوتی ہے۔

اس تحریر میں بیان کی گئی روبوٹس کی خوبیاں اسے انہی لوگوں سے مستعار لی گئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں انسانیت کی اک ذرا بھی رمق موجود نہ تھی۔ غیر انسانی آنکھیں کسی درندے کی سی معلوم ہوتی تھیں۔

واجد کے یہ خیالات ایک فائر کی آواز سے تھم گئے۔

اس نے تڑپ کر آواز کے ماخذ کی جانب دیکھا۔

آصف نے نہایت اطمینان سے اس بچے کو زندگی کی قید ہی سے آزاد کر دیا تھا۔

عثمان احمد اور اظہر بھی اس حرکت پر ہکا بکا تھے۔

”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو بہروز! آخر اس معصوم کا قصور ہی کیا تھا؟“ عثمان کا لہجہ رندھ گیا۔

”بزدلی! مجھے بزدلی سے سخت نفرت ہے اور وہ اس وقت بزدلی ہی دکھا رہا تھا۔“

”اور جو کچھ تم کر رہے ہو...... کیا وہ سب بہادری ہے؟“ اظہر نے کہا۔

”سرکاری بابو! اپنی زبان سنبھال کر بات کرو مجھ سے۔ ہمیں تمہاری سمجھداری کی ضرورت نہیں...... میرے سامنے جو بھی بزدلی دکھائے گا، وہ یونہی موت کو گلے لگائے گا۔“ تکبر اور انسانی حقارت نے اس کا وجود مزید بھیانک بنا دیا تھا۔

واجد نے اذیت سے آنکھیں میچ لیں۔

☆☆☆

ہال میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔

کم سن سفیان کی ہلاکت کے بعد دیگر افراد میں مزاحمت کا رہا سہا جذبہ بھی ختم ہو گیا۔

اسٹیج پر اس وقت صورتِ حال بہت کشیدہ تھی۔ بہروز اس تاخیر پر جھنجلاہٹ میں مبتلا ہونے لگا۔ وہ پُرشکن پیشانی لیے اِدھر اُدھر ٹہلتا اپنے کان کی لو بے چینی سے مسلنے لگتا۔ اس اثنا میں اس کے واکی ٹاکی پر بیپ سنائی دی۔

”ہاں! بولو۔ کیا حالات ہیں اوپر؟“

"مجھے لگتا ہے ہمارے ساتھ دھوکا ہونے والا ہے۔ اوور۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟ اوور۔"

"یہاں مشرقی جانب ایک مشکوک ہیلی کاپٹر دکھائی دیا ہے۔ اس نے دومرتبہ چکر کاٹا ہے۔ اوور۔"

"بے فکر رہو۔ میں راکٹ لانچر بھیج دوں گا۔ اُڑا دینا انہیں۔" اس کی بات سن کر اظہر کے چہرے پر سایہ لہرا گیا۔

اس نے اپنے افسران کو یہی اشارہ دیا تھا کہ ہال کی بالائی منزل اور چھت سے ان کے بچاؤ کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے لیکن اب ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ ہر طرف سے محصور ہو چکے ہیں۔ وہ اس کے اندازے سے کہیں زیادہ 'تیاری' سے آئے تھے۔

اظہر ان حملہ آوروں کی بے چینی اور اضطراب کی وجہ بھی بخوبی سمجھ رہا تھا۔ جن دو افراد کی رہائی کا مطالبہ انہوں نے کیا تھا، وہ بہت ہی خطرناک نوعیت کے الزامات میں حکومت کو درکار تھے۔ ان کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر کئی لاکھ روپے کے انعامات کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ اب ان کی یکا یک رہائی بظاہر ایک ناممکن امر ہی دکھائی دیتی تھی۔ تاہم اعلیٰ قیادت بے گناہوں کو بھی ان کے رحم وکرم پر تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

اظہر کو محض یہی خدشہ تھا کہ کسی بھی 'مس ہینڈلنگ' کی صورت میں معاملات مزید خرابی کی طرف جا سکتے تھے۔ اسے ان حملہ آوروں کے عزائم نہایت خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی چھٹی حس ایک ہی عندیہ دے رہی تھی کہ وہ 'مرنے اور مارنے' کے ارادے سے یہاں بھیجے گئے ہیں۔ تاہم ایسی صورتِ حال میں وہ ذہنی طور پر مزاحمت کے لیے مکمل تیار تھا۔

اس نے طائرانہ نگاہ اپنے سامنے بیٹھے افراد پر ڈالی اور بے چینی سے پہلو بدل کر سوچنے لگا؛

"ہتھیاروں کی موجودگی طاقت کا توازن کس بُری طرح بگاڑ دیتی ہے، یہ چند افراد صرف آتشیں اسلحے کی بدولت عددی تعداد میں زیادہ افراد کی نفسیات پر اس طرح حاوی ہیں کہ وہ اپنا حوصلہ ہی ترک کر بیٹھے ہیں۔"

لیکن اظہر اس بات سے لاعلم تھا کہ اسی کی طرح ایک اور 'سرفروش' بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے لیے بھی یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ بھی مزاحمت کا مکمل حق ادا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

ماجد، اظہر کی نسبت زیادہ پُراعتماد تھا۔

☆☆☆

ماجد ایک فطری جنگجو تھا۔

بچپن میں پرندوں کا... شکار دشمن کی سرکوبی کے جنون میں کب ڈھلا اسے خود بھی علم نہ تھا۔

کیڈٹ کالج میں داخلے نے اس کی انہی پوشیدہ صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا کیا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُراعتماد، بے خوف اور شہادت کا متمنی ہو چکا تھا۔ واجد کے اصرار پر وہ اس تقریب میں شریک ہوا تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اسے ایسی درندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بہروز کے اسٹیج پر پہنچنے اور ظہیر کو احکامات صادر کرنے کے درمیانی وقفے میں اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے شوق کو مدِنظر رکھتے ہوئے کالج میں اس کے ایک دوست نے اسے پسٹل فراہم کر رکھا تھا۔ نعمان نامی اس لڑکے کا تعلق ایک فوجی گھرانے سے تھا۔ ہتھیار گویا اس کے لیے کھلونا تھے۔

ماجد کی ذہانت اور آتشِ جنون سے وہ روزِ اول ہی سے بہت متاثر تھا اور اکثر اسے اپنے ہمراہ ہتھیار چلانے کی پریکٹس کروایا کرتا۔ ماجد کے لیے ہتھیار ایک محبوب شے بن چکے تھے۔ وہ عادتاً پسٹل اپنے ساتھ لیے گھومتا۔ ظہیر اور آصف کی جانب سے جامہ تلاشی کے آغاز سے قبل ہی اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیب سے پسٹل نکال کر غیر محسوس طریقے سے کرسی کے نیچے ایک جانب سرکا دیا تھا۔

کرسیوں کی مخصوص ساخت اور دونوں جانب سے زمین میں 'فکسنگ' اس کے لیے بہترین آڑ ثابت ہوئی تھی۔ اسٹیج پر موجود واجد اور انتظامیہ کی پریشانی بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ بہروز کی حرکات وسکنات سے اسے بھی یہی خدشہ تھا کہ وہ ابھی ترپ کے کئی پتے چھپائے ہوئے ہے اور اتمامِ حجت کے لیے حکام سے بات چیت کی کوشش کر رہا ہے وگرنہ یرغمالیوں کی قسمت کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

پھر چند ہی لمحوں بعد اس کے سبھی خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

☆☆☆

بہروز کی آنکھوں میں زہریلی چمک تھی۔

اس نے .... ایک جدید ساخت کا فون تھام رکھا تھا جس پر وہ مختلف نیوز چینلز کی سنسنی خیز رپورٹنگ بھی گاہے بگاہے سن لیتا۔

بہروز کی حسیات مکمل چوکنّا تھیں۔ اس نے کسی درندے کے مانند اپنے چاروں طرف نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

حکومتی احتیاط کے باوجود اس کی یہاں آمد کے ساتھ ہی ’مخصوص ذرائع‘ سے یہ خبر میڈیا تک پہنچائی جا چکی تھی لیکن یہ امر کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ’آقاؤں‘ نے ایک نیوز چینل کو رپورٹنگ کی آڑ میں ’خفیہ اطلاعات‘ ان تک پہنچانے کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔

عمارت کے باہر میڈیا رپورٹرز.... کیمرا مین اور والدین کا جم غفیر تھا۔ وہ ان کی تڑپ سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن اسی پل ایک خبر نے اس کی تنگ پیشانی مزید شکن آلود کر دی۔

”ناظرین! ہم آپ کو اس لحہ بہ لحہ تبدیل ہوتی صورتِ حال سے مکمل طور پر آگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ آج کی تازہ ترین خبر کے مطابق چند حملہ آوروں نے اسکول کے معصوم بچوں، والدین اور انتظامیہ کے علاوہ حساس ادارے کے ایک افسر کو بھی یرغمال بنا رکھا ہے۔ حملہ آوروں کی جانب سے تاوان کی وصولی اور دو افراد کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے نمائندے اسکول کے باہر موجود ہیں۔ آیئے! ان سے پوچھتے ہیں کہ وہاں اس وقت کیا صورتِ حال ہے؟“

”جی صمد! ہمارے ناظرین جاننا چاہیں گے کہ اسکول میں کتنے افراد موجود ہیں؟“ اینکر نے پوچھا۔

”جی اشعر! میں اس وقت اسکول کی عمارت کے پاس موجود ہوں جہاں آج دوپہر سے چند حملہ آوروں نے اسلحے کے زور پر سب کو نرغے میں لے رکھا ہے۔ ان افراد نے گزشتہ رات سے ہی سیکیورٹی گارڈز کا روپ لے رکھا تھا جس کی وجہ سے انہیں اپنے پلان پر عمل درآمد کرنے میں ذرا بھی دقت پیش نہ آئی...... جی!“

”کیا آپ ہمارے ناظرین کو بتا سکتے ہیں کہ اُن کے کیا مطالبات ہیں؟“

”ان کی جانب سے بیس کروڑ روپے اور سزائے موت کے دو مجرموں کی رہائی کے مطالبات سامنے آئے ہیں...... جی!“

”کیا وہاں کوئی حکومتی نمائندہ بھی موجود ہے؟ انتظامیہ ان کی تکمیل کے لیے کوئی اقدامات بھی کر رہی ہے کہ نہیں؟“

”جی ہاں! کسی حد تک تو ان اقدامات پر عمل جاری ہے لیکن انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا بھی ہے۔ چونکہ آج ہفتے کی وجہ سے بینک بند ہیں اس لیے رقم کی دستیابی میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ تاہم ہم نے اپنے خفیہ ذرائع سے ایک اور بات پتا لگائی ہے کہ جن دو افراد کی رہائی حملہ آوروں کو درکار ہے، انہیں آج صبح ہی پھانسی دی گئی تھی۔ ابھی یہ خبر میڈیا اور پریس تک نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے انتظامیہ سر جوڑے بیٹھی ہے...... جی!“

”ناظرین! آپ سن سکتے ہیں کہ اس وقت معاملات کس نوعیت پر ہیں۔ حکومتی نمائندوں کی غفلت، نامناسب سیکیورٹی اور بے احتیاطی کی بدولت کئی افراد کی زندگیاں داؤ پر لگی ہیں...... تعطیل کی بدولت رقم کا بندوبست ہو پایا ہے نہ ہی مطلوبہ افراد کی رہائی ممکن ہے۔ کیا یہ صوبائی حکومت کی بے پروائی اور انتظامی ناکامی ہے؟ اس بارے میں ہم اپنے ایک سینئر تجزیہ نگار سے بات چیت کرتے ہیں۔“ نیوز اینکر اب دوسرے شخص کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

بہروز کی آنکھیں لہو چھلکانے لگیں۔ یہی نیوز چینل اس کی دلچسپی کا خصوصی مرکز تھا۔ بنیادی طور پر یہ انہی کے لیے کام کرتا تھا۔ اپنی ریٹنگ بڑھانے اور سنسنی پھیلانے کے لیے وہ بہروز کے لیے ایک بہت بڑا انکشاف کر چکے تھے۔ لمحاتی طور پر وہ اس خبر کے زیرِ اثر ذہنی لحاظ سے گرد و پیش سے غافل ہو گیا۔ یہ غفلت محض چند سیکنڈز پر محیط تھی۔ اس نے فوری طور پر اپنی ’فائنل گیم‘ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا اور پہلے کی طرح چوکس ہو گیا۔

اسی لحہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

☆☆☆

اظہر خان لحہ بہ لحہ بہروز کے ساتھ ہی اس ’نیوز اپڈیٹ‘ سے مستفید ہو رہا تھا۔ اس کی عقابی نظروں سے بہروز کی بدلتی ہوئی رنگت اور ذہنی غفلت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے چیتے کی سی پھرتی سے اس پر جست لگائی اور کنپٹی پر ایک زوردار ضرب لگائی اور فوری طور پر اس کی گردن کو مخصوص جھٹکا دے دیا۔ ’کڑاک‘ کی آواز کے ساتھ اس کی تنومند گردن بے جان ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی۔

یہ سیکنڈز کا کھیل تھا۔ اس نے بہروز کی رائفل تھام لی۔ وہ دیگر افراد پر بھی کسی طرح قابو پانا چاہتا تھا لیکن اگلے ہی پل ظہیر کو تیورا کر گرتے ہوئے دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ اس کے فوراً بعد چار مزید فائرز سے ہال میں چیخیں گونجنے لگیں۔ بہروز کے ساتھی یکے بعد دیگرے زمین بوس ہوتے گئے۔

اظہر کے بدن میں سنسنی اور تشکر کی لہریں سرایت کر رہی تھیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا پسٹل تھامے پُرعزم نوجوان کو دیکھا جو نہایت اعتماد سے کسی ’سپاہی‘ کی طرح تیسری رو کی پہلی نشست پر چٹان کے مانند کھڑا تھا۔

اظہر پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ اس نوجوان کے ساتھ عملی طور پر شریک ہونا چاہتا تھا لیکن دروازے کے قریب ایک

منظر نے اسے منجمد کر دیا اور فوری طور پر اس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا کہ دشمن ہم سے دو ہاتھ آگے ثابت ہوا۔

☆☆☆

اظہر کی طرح ماجد بھی بہروز کی تبدیلی سے مکمل باخبر تھا۔ مطالبات میں ناکامی کی صورت میں یہاں کسی کا بھی بچنا محال تھا۔ اس نے بہروز کو زمین بوس ہوتے دیکھا تو فوری طور پر اپنے پاؤں کی زد میں رکھا ہوا پسٹل اپنے ہاتھ میں لیا اور ظہیر کو نشانہ بنا ڈالا۔

اسے فائر کرنے کے فوری بعد وہ اپنی نشست کی آڑ میں دبکا اور باقی چار افراد کے جسم میں دو سیکنڈز میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا۔ یہ مکمل طور پر 'ٹائمنگ' کا کھیل تھا جس میں وہ کلی طور پر کامیاب ہوا تھا۔ عقبی دروازہ اندر سے مقفل ہونے کی صورت میں ان حملہ آوروں کو بیرونی کمک نہیں مل سکتی تھی۔

اپنی اس کامیابی کا تاثر اسے اظہر اور واجد کے چہروں پر مسرت کی صورت میں نظر آرہا تھا لیکن اظہر کی یہ مسرت تشویش میں ڈھلتے دیکھ کر وہ فوری چوکنا ہو گیا۔

☆☆☆

اظہر کی نگاہیں اس وقت دروازے کے پاس ایک لمبے اور ڈھیلے ڈھالے عبایا نما لبادہ میں ملبوس عورت پر مرکوز تھیں۔

اس کے ہاتھ دستانوں سے ڈھکے تھے۔ وہ ان چاروں افراد کے شہتیر کی طرح گرتے ہی اپنی نشست سے اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔ بادی النظر میں اس کا ڈیل ڈول، چال ڈھال کسی بھی صنفِ نازک ہی کی طرح دکھائی دے رہا تھا لیکن اظہر کی مخصوص پیشہ ورانہ تربیت نے ایک 'سقم' دریافت کر لیا تھا۔

انہیں دورانِ تربیت خود کش حملوں سے بچنے کی مختلف تراکیب سکھائی جاتی تھیں۔ اکثر حملہ آور خواتین کے لبادے میں بھیڑ بھاڑ والے علاقوں میں خود کو دھماکے سے اُڑاتے رہے ہیں۔ اس صورت میں انہیں صرف ایک ہی نکتہ سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اگر مذکورہ فرد چلتے وقت 'بایاں' پاؤں آگے بڑھائے تو وہ واقعی خاتون ہوتی ہے۔

اظہر کے سامنے چند فٹ کے فاصلہ پر موجود انسان نے کھڑے ہو کر اپنا 'دایاں' قدم پہلے آگے بڑھایا تھا اور یہی جبلی چال اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ وہ بہروز ہی 'کا ساتھی' ہے۔

اس کی حیرانی اور لمحاتی غفلت رائفل سے نشانہ باندھنے میں تاخیر کا سبب بن گئی۔ مقابل نے اپنے لبادے سے ایک جدید ساخت کی گن نکالی اور اس کی پیشانی کا نشانہ لے لیا۔ ایک شعلے کی لپک کے ساتھ ہی اظہر کو پیشانی میں انگارا دھنستا ہوا محسوس ہوا اور پھر کیمرے کا شٹر بند ہونے کے مانند سبھی مناظر اس کی بصارت سے اوجھل ہو گئے۔

☆☆☆

ماجد نے اظہر کے بدلتے ہوئے تاثرات کا ماخذ جاننے کے لیے اس کی نگاہوں کا تعاقب کرنا چاہا لیکن اس کی پیشانی میں ایک سرخ روشندان نمودار ہوتے دیکھ کر اپنی نشست کی آڑ میں ہو گیا۔

اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ ماجد کی یہ پھرتی بھی اس کے کسی کام نہ آسکی۔ ہال سے اسی مخصوص لباس میں تین افراد اٹھے اور اسے گولیوں کی زد میں رکھ لیا۔ کرب کی ایک ناقابلِ بیان لہر اس کے وجود میں سرایت ہوئی۔ اس نے تڑپ کر واجد کی جانب دیکھ کر کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے اعصاب سے اختیار اب ختم ہو چکا تھا۔ اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔

موت کی آغوش میں سمانے سے قبل اس کی سماعت میں آخری آواز گولیوں کی شدید تڑتڑاہٹ کی تھی۔

☆☆☆

اظہر اور ماجد کی اس بے خوفی اور ان درندہ نما انسانوں کی ہلاکت نے واجد کے روم روم میں فخر و انبساط کے چشمے رواں کر دیے تھے۔

وہ بے ساختگی سے اٹھا۔ اتنی دیر سے ایک ہی انداز میں بیٹھے رہنے سے اس کے قدموں اور ٹانگوں میں لہو منجمد ہو چکا تھا۔ وہ لپک کر ماجد کی طرف بڑھا۔ چند قدم آگے بڑھتے ہی اس کے چہرے پر گرم لہو کی ایک تیز پھوار پڑی۔

اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بڑے بھائی کی جانب دیکھا۔ وہ زوردار چیخ سے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہ چیخ اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور محض چند کلمات برآمد ہو سکے۔

''لالہ!......نہیں......لالہ!''

عفریت کی طرح نمودار ہونے والی ان 'خواتین' نے اب وہاں 'قتلِ عام' شروع کر دیا تھا۔ قیامت کے اس منظر میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اب کوئی مسیحا تھا نہ ہی اس درد کا درماں۔

واجد کی سماعت مفلوج ہونے لگی۔ اسے اپنے اردگرد سبھی مناظر کسی سلو موشن فلم کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ بچوں کے تڑپتے وجود، والدین کی انہیں اپنے وجود میں چھپا کر اذیت سے بچانے کی کوشش، چیخ و پکار، التجائیں، اسلحہ کے بھیانک قہقہے سنتے اور دیکھتے آنکھوں میں دھند اترنے لگی۔

اس کی داہنی سمت ماجد کے لہو اُگلتے جسم کے نیچے دبی تھی اور بائیں سمت پر قیامت کے وہ مناظر اعصاب ریزہ ریزہ کر رہے تھے۔

موت کا وہ کھیل اب اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر جانب آڑے ترچھے وجود اور بے نور آنکھیں اس کے معدے میں گرہیں پیدا کرنے لگیں۔

''خدایا، اب ہی ان کے دل میں رحم پیدا فرما دے...... اگر یہ سب خواب ہے تو مجھے بیداری عطا فرما دے۔''

لیکن وہ لمحہ بھی قبولیت کا نہ تھا۔ فائرنگ کے بعد وہاں ایک نیا کھیل شروع ہو چکا تھا۔

واجد کے ہوش و حواس دھیرے دھیرے شدید دباؤ میں بیرونی عوامل سے بیگانہ ہونے لگے۔ اسی پل اسے چند گز دور جماعت ہفتم کا پوزیشن ہولڈر جہانزیب مچلتا ہوا دکھائی دیا۔ واجد کی ساری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں۔

جہانزیب کی گردن پر رائفل کی گرم نال لگائی گئی تھی جس کی جلن نے اس کے نیم بے جان وجود میں اذیت کی نئی لہر دوڑا دی تھی۔ لمحہ بھر میں واجد موت کے اس کھیل کا 'نیا راؤنڈ' سمجھ گیا۔

وہ کسی بھی فرد کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اس لیے نیم بے جان افراد کو رائفل کی گرم نال سے ٹٹولنے کے بعد کسی بھی جسم میں زندگی کی ذراسی رمق موجود پا کر اسے عدم کا پروانہ تھما رہے تھے۔ واجد کے اعصاب میں مزید بربریت دیکھنے کی سکت نہ رہی۔ اس کے ہوش و حواس سلب ہو گئے۔

بے ہوشی کی وادی میں قدم رکھنے سے قبل اسے اپنی گردن کی جانب بھی رائفل بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ موت کی رتھ اسے اپنے ہمراہ لینے چلی آئی ہے۔ بند آنکھوں کے پیچھے آخری بار گلریز اور ماہی کے ہیولوں نے اپنا عکس دکھلایا اور اس کے بعد اسے بالکل ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

واجد کو اپنے جسم میں کسی چبھن کا احساس ہوا۔

اس ہلکی سی چبھن نے اس کے وجود پر لرزہ طاری کر دیا۔ اس کا لاشعور اب بھی شدید دباؤ کے زیر اثر تھا۔ اسے سرخ چہروں، خوفناک آنکھوں، لہو رنگے ہاتھوں والے غیر انسانی ہیولے اپنی جانب بڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ شعور کا ایک حصہ اسی امر کے مطیع تھا کہ اگر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو وہ غیر انسانی ہیولے اپنی لمبی کانٹوں بھری زبان سے اسے نگل لیں گے۔

اس کیفیت میں اسے کسی کا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں دکھائی دیتا تھا۔ ذراسی کوشش سے وہ اس جانب دیکھتا تو ماجد کا متبسم چہرہ اور پُرعزم آنکھیں دکھائی دینے لگتیں۔ پھر منظر تبدیل ہو جاتا اور ماجد انہی ہیولوں کی جانب لپکنے کی کوشش کرتا۔ واجد اس کا ہاتھ پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے جکڑ لیتا۔

''نہیں لالہ! میں آپ کو اُن کے پاس نہیں جانے دوں گا......''

اور پھر اسے خود بھی علم نہ ہوتا کہ اس کی زبان سے بہ آواز بلند انہی الفاظ کی تکرار ہونے لگتی۔

''نہیں لالہ! نہیں جانا......نہیں لالہ!''

''یہ جب تک اس دباؤ سے آزاد نہیں ہوگا، اس کی حالت میں سدھار ناممکن ہے۔ اس کا ایک بار آنکھیں کھولنا اب بے حد ضروری ہو چکا ہے۔'' واجد کی سماعت میں ایک نامانوس آواز پڑی تو ذہن میں غصے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

''میں آنکھیں نہیں کھولوں گا...... میں ہرگز لالہ کو اُن کے پاس نہیں جانے دوں گا۔'' اس نے اپنے آپ کو یاددہانی کروائی اور ایک بار پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

واجد کی یہ کیفیت گزشتہ آٹھ ماہ سے برقرار تھی۔ اسے مسلسل مصنوعی طریقوں سے خوراک دی جا رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر بے خبر تھا کہ بیرونی دنیا میں کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔

اسکول ہال میں قتلِ عام کے دوران ہی 'اسپیشل فورس' کے ارکان نے بیرونی جانب متعین حملہ آوروں کو جہنم واصل کرنے کے بعد اندرونی حالات پر بھی قابو پا لیا تھا۔ ان کی درندگی نے بے شمار جانیں لی تھیں لیکن کئی ایک کی زندگیاں بچالی گئیں۔ وہ جسمانی طور پر تو وہاں سے بازیاب ہو گئے تھے لیکن ان کے دل و دماغ پر اژدھائی گھنٹے نقش ہو گئے تھے۔ نفسیات میں ان گنت گرہیں پیدا ہو چکی تھیں۔

ذہنی مفلوجی کا یہ سفر ان کے لواحقین کے لیے بھی کم اذیت ناک نہ تھا اور یہی اذیت گلریز کے لیے ایک اور قیامت ثابت ہو رہی تھی۔ برسوں پہلے اس نے اپنے خوابوں کی تکمیل اور مصائب سے رہائی کا محور ساجد کو بنایا تھا پھر ایک حادثے نے انہیں نابود کر دیا۔ یہی جذبات لامحالہ طور پر ماجد سے منسلک ہو گئے۔

ماجد کی بہادری، فطرت اور عزائم دیکھتے ہوئے اس کی امیدیں بھی ماضی کی نسبت بڑھ گئی تھیں کہ وہی اس خاندان کا

مسیحا ہوگا۔ وقت کی بے رحم گردش نے ثابت کیا کہ اس نے اپنا عہدِ زندگی کی قیمت پر ایفا کیا۔

حکومت کی جانب سے اس سانحے کے متاثرین کے لیے دو لاکھ روپے کی ادائیگی کا اعلان کیا گیا لیکن مختلف مراحل سے گزرتے انہیں محض 'اسّی ہزار' روپے ہی مل پائے تھے۔ گلریز خان کے پہاڑوں کے مانند مضبوط بیٹے کی زندگی کا یہ مول سود کی ماہانہ اقساط میں صرف ہوگیا۔ واجد کے علاج کی ذمے داری اورنگ خان نے اٹھالی جو موت سے قبل اپنی مشکلات میں آسانیاں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ڈاکٹرز اس کی جانب سے مایوس ہونے لگے تھے۔ واجد کی قوتِ ارادی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ ادویات، اہلِ خانہ کی محبت، وقت کا مرہم اور مشیتِ ایزدی نے اس کے ارادوں کو شکست دے دی اور گیارہ ماہ بعد وہ اس مخصوص ذہنی کیفیت سے جزوی طور باہر نکل آیا۔

گلریز کو محسوس ہوا کہ اب اس کے مسائل حل ہو جائیں گے لیکن واجد کے دل و دماغ پر اب بھی کچھ اثرات کسی آسیب کی طرح موجود تھے۔ ڈاکٹرز کی متفقہ رائے یہی تھی کہ کوئی اور بڑا سانحہ ہی اسے اس 'فیز' سے رہائی دلوا سکتا ہے اور پھر چار ماہ بعد یکے بعد دیگرے دو ایسے حادثات پیش آئے کہ واجد کو اپنی ذات کے سبھی کرب اور تکالیف پسِ پشت ڈال کر عملی زندگی میں ایک نئی اننگز کا آغاز کرتے ہی بنی۔

☆☆☆

سود کی لعنت گلریز خان کے وجود سے آکاس بیل کی طرح لپٹ چکی تھی۔

اپنا موروثی قرض چکاتے اس نے ایک جوان بیٹے کا لاشہ ڈھویا تھا اور دو بیٹے 'زومبی' بنتے دیکھے تھے۔ اولاد کی اس حالت سے وہ صدیوں کا بوڑھا دکھائی دینے لگا۔ جسمانی ناتوانی بھی اب ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی کہ کام کاج میں پہلے جیسی توانائی ناممکن ہوگئی تھی۔

آمدن میں کمی ہوئی تو قرض کی اقساط چکانے میں بھی رکاوٹیں آنے لگیں۔ نتیجتاً تبریز خان کی اولاد نے طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا۔

''مجھے تھوڑا سا تو وقت دے دو مشتاق! پہلے بھی دیر سے ہی سہی لیکن میں وصولی کی تمام قسطیں چکاتا رہا ہوں۔'' اس نے لجاجت سے اپنے سامنے 'کھاتہ' کھول کر کھڑے تندخو مشتاق سے کہا۔

''ام ایسے اپنا کاروبار نہیں کرتے۔ تم کو پہلے ہی بہت ڈھیل دی جا چکی ہے۔ اب اور کوئی رعایت نہیں ملے گی۔'' ارشد نے اس کا گریبان تھام لیا۔

''میرے حالات اور اولاد کے ساتھ پیش آنے والے حادثات نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے۔ تھوڑے عرصے کی مہلت دے دو مجھے بس!''

''ام کچھ نہیں جانتا، اولاد کے ساتھ حادثے امارا وجہ سے تو نہیں ہوئے ناں...... تم چاہے اپنا اولاد کو بیچو یا گروی رکھواؤ...... ام کو وصولی چاہیے بس۔ ارشد کی بے حسی نے گلریز کے دل پر دباؤ یک لخت بڑھا دیا۔

''یہ اپنے گھر میں ایک خزانہ چھپائے بیٹھا ہے اور ام کو گولی دیتا ہے کہ اس کے پاس وصولی چکانے کے لیے کچھ نہیں۔'' مشتاق نے کینہ توز نظروں سے اسے گھورا۔

''کیسا خزانہ؟ اگر میرے پاس کچھ وسائل ہوتے تو اپنے بچوں کا علاج ہی کروالیتا۔'' گلریز کی آواز بھینچنے لگی۔

''خزانہ تو آنکھوں کے سامنے ہے...... اسے امارے حوالے کر دو...... تو امارا قرضہ بھی معاپ کر دیں گے اور بیٹوں کا علاج بھی ممکن ہو جائے گا۔'' مشتاق نے مکاری سے کہا۔ ''اپنی بھانجی کو امارے حوالے کر دو۔ وہ سبھی قرضے سود سمیت چکا دے گی۔''

''اپنی زبان بند کرو مشتاق! ورنہ......!'' گلریز کے سینے میں درد کے گولے پھٹنے لگے۔

''ورنہ کیا! اگر یہ سودا منظور نہیں تو امارا سارا پیسہ ایک ہی وصولی میں ادا کرو...... ورنہ ایک مہینہ بعد ام لڑکی کو اپنے ڈیرے پر لے جائے گا۔'' ارشد نے ایک زوردار جھٹکے سے اس کا گریبان کھینچتے ہوئے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔

گلریز کا وجود پسینے میں نہا گیا۔ سینہ درد سے بے حال تھا۔ دھڑکنیں بہت خاموشی سے دل کا مکان خالی کر گئیں۔

☆☆☆

باپ کے شفیق وجود سے محرومی کے بعد مسائل اور مشکلات کی آکاس بیل نے واجد اور ساجد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

واجد کی ذہنی حالت اب بھی مکمل طور پر ٹھیک نہ تھی لیکن حالات کی سنگینی اور کندھوں پر پڑنے والی اس ناگہانی ذمے داری سے فرار بھی ناممکن تھا۔ اورنگ خان نے اسے گلریز کی جگہ ملازمت دے دی اور وقت کا سفر اسی انداز میں چلتا رہا۔

اس وقت مشتاق اور ارشد کے مطالبے کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔ چند ماہ بعد وہ ایک بار پھر ان کے گھر آدھمکے۔

''تومارا باپ نے ام سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس کے پوت (فوت) ہونے کے بعد وہ وعدہ نبھانا اب تم لوگوں

کی ذمے داری ہے۔"

"ہم بھر پور کوشش کریں گے...... لیکن فی الحال ہم اس بات چیت سے لاعلم ہیں۔"

"گلریز نے قرض کی معافی کے بدلے اپنی بھانجی کا ہاتھ امارے حوالے کر دیا تھا اس لیے اب یہ شرط تم پوری کرو گے۔"

"ناممکن!...... ابی جان ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔" واجد بھڑک اٹھا۔

"وہ ایسا کر چکا ہے...... اور تم وعدہ خلافی نہیں کر سکتے۔" ارشد نے سکون سے کہا۔

"اگر ابی جان نے ایسا کیا ہے تو کوئی لکھت پڑھت بھی ہوئی ہوگی...... ہمیں تحریری ثبوت دکھاؤ۔" ساجد نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔

"کاغذ تو امارے پاس نہیں ہے...... ڈھونڈنا پڑے گا۔" مشتاق بوکھلایا۔

"ٹھیک ہے جب ڈھونڈ لو گے تو یہ معاملہ جرگہ کے سامنے اٹھانا......" ساجد کا لہجہ دوٹوک تھا۔

وہ دونوں اُسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے چلے گئے۔

کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور ایک بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی ماہ گل اندر چلی آئی۔ وہ بے حد مضطرب تھی۔

"کیا ہوا ماہی؟ کچھ کہنا چاہتی ہو؟" واجد اسے دیکھ کر ہمیشہ اپنی ذہنی کلفت بھول جایا کرتا تھا۔

"ہاں! لیکن سمجھ نہیں آرہی کہ بات کیسے کروں؟" اس نے اپنی انگلیاں مسلیں۔ "تم ان کی بات مان لو...... اگر میری قربانی سے نسلوں پر محیط یہ لعنت ختم ہو سکتی ہے تو میں ایسی کئی قربانیوں کے لیے تیار ہوں۔"

اس کے الفاظ ایک ہولناک دھماکے کی طرح واجد کے اعصاب منتشر کر گئے۔ وہ بے قابو ہو کر اپنی نشست سے اٹھا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

"تم اگر کوئی گالی دے لیتیں ماہی تو اتنی تکلیف نہ ہوتی...... لیکن میں ان الفاظ کے لیے تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" وہ پھنکارا۔

ساجد بھی اپنی وہیل چیئر پر ساکت بیٹھا تھا۔ اسے بھی شدت سے اپنی معذوری کا احساس ستانے لگا۔

"لالہ! پہلے تو میں شاید یہ بات زبان پر نہ لاتا لیکن اب مزید خاموشی بھی مناسب نہیں۔ آپ پھپھو سے بات کیجیے۔ میرا نکاح ماہی سے آج ہی ہوگا۔"

"لیکن واجی! حالات کی ترشی تو ویسے ہی برقرار رہے گی۔" ساجد دھیرے سے بولا۔

"میں نے اس کا حل بھی سوچ لیا ہے۔ میں بیرونِ ملک نوکری کی کوشش کروں گا......" وہ ایک اور دھماکا کرنے کے بعد کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

واجد کے ذہن میں کسی بھی بیرونی ملک میں نوکری کے حصول کی خواہش کافی دنوں سے پنپ رہی تھی اور اس کی آبیاری کرنے والا اس کا نیا دوست نعیم تھا۔

نعیم بھی اورنگ ہی کے یہاں ملازم تھا۔ وہ ملکی حالات سے نالاں تھا اور مایوسی و بے زاری کی باتیں ہی کیا کرتا تھا۔ واجد پر گزرنے والی قیامت سے باخبر تھا اس لیے اکثر اسے ایک ہی مشورہ دیتا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں رکھا واجی! ساری زندگی بھی اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہو گے تو قرض نہ اتر سکے گا۔ اللہ بخشے گلریز خان کو کتنی کامیابی مل گئی؟"

"ہاں! کہتے تو ٹھیک ہو۔" والد کا ذکر اُسے افسردہ کر دیتا۔

"کسی یورپی ملک یا خلیجی ریاست کی طرف نکل جاؤ۔ چند سالوں میں اتنا کما لو گے کہ ساری زندگی یہاں رہ کر نہیں کما پاؤ گے۔"

"لیکن میرے اتنے وسائل بھی تو نہیں کہ ویزا پاسپورٹ کی فیسیں بھرتا پھروں...... اور پھر ان کی تیاری میں جتنی خواری ہے اس میں تنخواہ کا نقصان الگ۔ میں تو ایک روز کی چھٹی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"یہ سب مسئلے گھر بیٹھے حل ہو جائیں گے۔" نعیم نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو مستحق لوگوں کے لیے 'آوٹ آف وے' اس قسم کے کام کر دیا کرتا ہے۔ سرحد پار بھی اس کے بہت رابطے ہیں اور یہاں سے جانے والے لوگوں کے لیے اسی کے دوست نوکری اور رہائش کا بندوبست کر کے رکھتے ہیں۔"

"لیکن یہ تو غیر قانونی کام ہے یار!" واجد ہچکچایا۔

"تو قانونی طریقے اپنانے سے بھی یہ مسائل کب حل ہوتے ہیں۔ بحفاظت روانگی اور نوکری بھی وہاں پلیٹ میں رکھی ملے گی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تو خاصی ڈیمانڈ ہے وہاں۔" نعیم نے اسے مزید گھیرا۔

واجد کو کسی گہری سوچ میں مبتلا دیکھ کر اسے یقین ہو گیا

کہ تیر نشانے پر جا لگا ہے۔

عام حالات میں تو واجد اس پیشکش کو نظر انداز کر دیتا لیکن اب صورتِ حال اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی ذہنی قوت کھو چکا تھا۔ ارشد اور مشتاق کی دروغ گوئی کے بعد ماہ گل کی ایثار پسندی اس کی انا اور مردانہ وقار پر ایک تازیانہ تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی اہلیت ثابت کرنا چاہتا تھا اس لیے بلا سوچے سمجھے نعیم کی پیشکش قبول کرنے کا نہ صرف فیصلہ کر لیا بلکہ اسے مذکورہ فرد سے ملاقات کا بندوبست کرنے کا عندیہ بھی دے دیا۔

نعیم نے تین روز بعد ہی غلام قادر سے اس کی ملاقات کروا دی۔ وہ ایک ٹریول ایجنٹ تھا۔ قیمتی لباس اور خوشبودار سگار اس کی شخصیت کو مزید پُرکشش بنا رہے تھے۔ خود اعتمادی اس کے بشرے سے جھلکتی تھی۔ واجد اسے دیکھتے ہی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ویسے بھی آج تک دنیا محض ساجد کی کتابوں کے علاوہ ماجد کی آنکھوں اور تصورات ہی سے دیکھی تھی اس لیے غلام قادر کی ہر بات اس کے دل میں گھر کرتی چلی گئی۔

”دیکھو مائی بوائے! میں ذرا مختلف سوچ کا انسان ہوں۔ غربت کا عذاب میں نے بھی بہت جھیلا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک گاڈ فادر کی سرپرستی میسر آ گئی۔ وہ مجھے یہاں سے نکال کر ایک یورپی ملک میں لے گئے اور پھر میری قسمت ہی بدل گئی۔ بعض اوقات مقام کی تبدیلی آپ کو ایک نئی اُڑان بھرنے میں بہت مدد دیا کرتی ہے۔ میں نے کامیابی ملتے ہی سوچ لیا تھا کہ اس قرض کی ادائیگی ضرور کروں گا...... تم کو معلوم ہے کہ قرض کی ادائیگی کتنی اہم ہوتی ہے۔ میں نے اپنے ہم پلہ دوستوں سے یہ آئیڈیا شیئر کیا۔ انہوں نے بھی اوکے کا سگنل دیا۔ اب ہم اپنی ذمے داری پر ضرورت مند نوجوانوں کو بیرونِ ملک لیبر بھرتی کرواتے ہیں۔ دیکھو ینگ مین! مجھے نعیم سے علم ہوا تھا کہ تم بہت کرائسس میں ہو اس لیے تم سے ہمدردی سی ہو گئی۔ حالانکہ بزنس مین اور ہمدردی دو متضاد چیزیں ہیں لیکن میں اپنے ملک کے نوجوانوں کے لیے واقعی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تم نہیں تو کوئی اور سہی!“ غلام قادر کی حقیقت پسندانہ باتیں سن کر اس کا ارادہ مزید پختہ ہو گیا۔

رقم کے انتظام کی تلوار اب بھی سر پر لٹک رہی تھی۔ واجد کے تمام تر خدشات کے برعکس یہ انتظام ایسے عمل میں آیا کہ وہ مزید 'قرض دار' ہو گیا۔

☆☆☆

ساجد ان دنوں اپنے بچپن کے ایک دوست کے ہمراہ شہر کے اسپتال گیا ہوا تھا۔

اسے اپنی اعصابی کمزوری کے باعث چند ماہ بعد چیک اَپ کروانا پڑتا تھا۔ اس بار وہ اپنی تسلی کے لیے واجد کی کچھ رپورٹس بھی ہمراہ لے گیا۔ عمومی حالات میں وہ تین روز میں لوٹ آیا کرتا تھا لیکن اس بار ایک ہفتہ کی تاخیر نے واجد کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ وہ کسی بھی طریقے سے خود شہر جانے کا منصوبہ بنانے لگا لیکن اسی شام ساجد کی آمد ہو گئی۔ اس کی حالت بے حد خستہ تھی۔

”کہاں رہ گئے تھے لالہ! یہاں سب بہت پریشان تھے۔ اور آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“

”اپنے حصے کا قرض چکانے گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ کامیاب ہوا۔“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”کیسا قرض لالہ!“ وہ بے چین ہوا۔

”میں نے تمہاری روانگی کے لیے پیسوں کا انتظام کر دیا ہے۔“

”مگر کیسے لالہ؟“ ماہ گل بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھی۔

”میں نے اپنا ایک گردہ فروخت کر دیا ہے...... میرا معذور وجود ویسے تو کبھی کسی کام نہ آ سکا...... لیکن اس وقت مجھے بہت خوشی ہے کہ میں نے تبریز کے بیٹوں کو کافی اقساط کی ادائیگی کر کے بقیہ معاملات اسٹامپ پیپر پر لکھوا لیے ہیں۔ باقی رقم تمہارے سفری اخراجات کے لیے کافی ہو گی۔“ وہ نقاہت سے کہتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

واجد کا وجود بڑے بھائی کے اس فعل پر پارہ پارہ ہونے لگا۔ رقم ہاتھ میں آتے ہی ہر مسئلہ حل ہوتا چلا گیا۔ جس روز غلام قادر نے اسے روانگی کا عندیہ دیا، واجد کو یقین ہو گیا کہ پیسہ اور اختیار ہی ہر قفل کی کنجی ہے۔

اپنی آبائی سرزمین چھوڑتے وقت اس کے دل میں کئی خدشات تھے لیکن غلام قادر کے متعین کردہ آدمیوں نے معاملات اتنی خوش اسلوبی سے منظم کر رکھے تھے کہ وہ پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ اپنے جیسے کئی ہم وطن دیکھ کر اس کے تحفظات بالکل ختم ہو گئے۔ انہیں مختلف گاڑیوں پر سوار کر کے بذریعہ ایران، ترکی پہنچایا گیا۔ اس مقام پر ہم سفر تبدیل ہو گئے۔ بظاہر ناممکن دکھائی دینے والے اس سفر میں حیران کن طور پر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔

واجد کا اعتماد مزید بحال ہو گیا۔

☆☆☆

ترکی میں قیام ایک ماہ پر محیط تھا۔

یہاں سے پیش قدمی کے لیے بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ ذرا سی غفلت اور جلد بازی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ اناطولیہ میں رکنے کے بعد انہیں پیدل ہی سرحدی علاقوں کی جانب لے جایا گیا۔ ان کی منزل یورپ کا جنوب مشرقی ملک تھا۔ اس کی آبادی تقریباً گیارہ ملین تھی اور سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ اپنی قدرتی خوبصورتی کے علاوہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ سے بیک وقت منسلک تھا۔ یہ جزیرہ نما ملک سیاحوں کے لیے جنت تھا۔

اناطولیہ کی سرحد پر قیام مختصر تھا۔ واجد کے ساتھ اب سفر میں ایک جنگ زدہ ہمسایہ ملک کے افراد شامل تھے جو کسی حد تک اس کی مقامی زبان سے تو واقف تھے لیکن انگریزی سے بالکل نابلد تھے۔ اس قافلے میں واجد ہی کی تعلیمی قابلیت بہترین تھی۔ ان کے ہمراہ موجود ایجنٹ بات چیت اور ضروری ہدایات کے سبھی مراحل اسی کے گوش گزار کرتا رہا۔

وہ اپنی قسمت کی اس کایا پلٹ پر اب تک بہت مسرور تھا لیکن گرما کی اس چمکتی ہوئی صبح میں ایک تلخ حقیقت سے آگاہی نے اسے عرش سے فرش پر لا پھینکا۔

سرحدی علاقے میں پہنچتے ہی انہیں 'الرٹ' جاری کر دیا گیا کیونکہ اب منزل نزدیک تر تھی۔ رجب گل نے اسے ایک ربڑ بوٹ چلانے کا طریقہ سکھانا شروع کیا تو واجد کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہونے لگے۔

''گرما میں سمندر بہت مہربان ہوتا ہے اور اس کی آغوش مادر کی طرح پُرسکون ہوتی ہے۔ یہ موسم نقل مکانی کے لیے بہترین ہے۔ تم لوگ بہ آسانی اس بوٹ سے وہاں پہنچ جاؤ گے۔''

''ہماری آخری منزل کیا ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ جزیرہ...... وہیں پہنچنا ہے تمہیں۔'' رجب نے اپنی داہنی شہادت کی انگلی ...... ایک جانب کرتے ہوئے اشارہ کیا۔

ان کے سامنے سمندر کی نیلگوں رنگت طبیعت میں عجب سی فرحت پیدا کر رہی تھی۔ واجد کو اب تک درپیش سفر میں ایسے خوبصورت نظارے جابجا دیکھنے کو ملے تھے لیکن ہر لمحہ اس کے دل و دماغ میں زندگی سے منسلک تلخ حقائق غالب آجاتے اور خوبصورتی کہیں پس پشت رہ جاتی۔

اس نے ان لطیف جذبات کو ایک بار پھر جھٹکا اور رجب کی باتوں کی جانب اپنی توجہ مرکوز کر دی جو انہیں چار کلومیٹر دور ایک سرحدی علاقے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

''تم ساتھ نہیں چلو گے کیا؟''

''میرا وہاں کیا کام بھلا؟ میری ڈیوٹی یہیں تک تھی۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''غلام قادر کے دوست احباب سے نوکری وغیرہ کے لیے تمہی ملواؤ گے ناں۔''

''کون غلام قادر؟ یہاں کوئی تمہیں اپنے اصل نام اور شناخت سے نہیں ملا ابھی تک...... اگر نشے کی حالت میں ہو تو ہوش و حواس میں لوٹ آؤ...... اور ہاں واپسی پر اس بوٹ کو سمندر میں کھلا چھوڑ دینا ورنہ چند لمحوں میں سرحدی ایجنسیز کی گرفت میں نظر آجاؤ گے۔'' وہ اطمینان سے کہہ کر پلٹ گیا۔

اڑھائی میل کا وہ سمندری سفر واجد کے لیے کسی طوفان سے کم نہ تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی کم عقلی اور سادگی پر سمندر اوڑھ کر سو جائے۔ اپنی زندگی سے وابستہ افراد کا تصور اس خواہش کی تکمیل میں بھی رکاوٹ تھا۔ اسے بے اختیار اپنی نوبیاہتا بیوی سے ہونے والی آخری ملاقات یاد آنے لگی۔ اس نے بہت تیقن سے ماہی کو اپنے قرض کی ادائیگی کے بعد ازدواجی زندگی کے مکمل آغاز کا فیصلہ سنایا تھا۔

''کیا بات ہے لالے! اتنی گمبھیرتا کیوں؟'' اس کے ساتھ بیٹھے ایک شخص نے ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان میں کہا۔

''کیا تم باعلم تھے کہ یہ ایجنٹس ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟'' واجد نے پوچھا۔

''ہاں بالکل! کیا تم لاعلم تھے؟''

''مجھے تو بتایا گیا تھا کہ ہمارے لیے نوکری کا بندوبست کیا جا چکا ہوگا۔''

''بہت ہی بھولے ہو تم! غیر قانونی سرحد پار کرنے سے ایسی سہولیات کہاں ملتی ہیں برادر! تمہیں جی بھر کے بے وقوف بنایا گیا ہے...... تم اس بوٹ میں اکیلے پاکستانی ہو اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا ہوگا کہ تمہارے ہم وطنوں کو یہاں رجسٹریشن بھی بمشکل ملتی ہے۔''

واجد خاموش ہو گیا۔

''اب دو ہی صورتیں ہیں برادر! وہاں پہنچ کر سرحدی پولیس کے سامنے پیش ہو جانا، یا میرے ہم وطن بن کر رجسٹریشن حاصل کر لینا۔''

واجد نے ایک نظر اپنے ارگرد پھیلے بیکراں سمندر کو دیکھا اور گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔

فیصلہ پل بھر میں ہی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اس بوٹ پر موجود افراد کی قسمت عروج پر تھی۔

سرحدی محافظوں کے سامنے اپنے جنگ زدہ ملکی حالات بیان کرنے کے بعد وہ رجسٹریشن حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔ یہاں قانون کے مطابق چند مخصوص ممالک کے افراد کے لیے اقامتی سہولیات میں بہت نرمی تھی۔ بعض ممالک سے نقل مکانی کرنے والے افراد اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ ہی لے آتے لیکن واجد کے ہم وطنوں کے لیے وہاں نرمی تھی نہ ہی کوئی رعایت۔

واجد نے موسیٰ کے کہنے پر من وعن عمل کیا اور چند ہی ہفتوں میں انہیں عارضی بنیادوں پر ایک اسٹور میں سامان ڈھونے کی نوکری مل گئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ کام سخت اور ادائیگی معمولی سہی لیکن وہ ایک محفوظ مستقبل کے لیے پُرامید ہوتے ہوئے تقدیر کا وار ایک بار پھر فراموش کر گیا۔

واجد اپنی ذمّے داریاں بہت ایمانداری سے نبھانے میں مصروف تھا۔ اسے گردوپیش کے مناظر سے کبھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنی ذات میں مگن رہتا لیکن اس بے نیازی کے باوجود بابر نامی اس شخص کی حرکات پوشیدہ نہ رہ سکیں۔

بابر سامان کی ہیرا پھیری میں ملوث ہونے کی کوشش میں مگن نظر آتا تھا۔ اس نے مقامی افراد سے راہ رسم بہت تیزی سے بڑھائی تھی۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے وہ انہیں مدعا سمجھانے میں کامیاب رہتا۔ اس سے میل جول رکھنے والے افراد کسی صورت بھی قابلِ اعتبار نہ تھے۔

''یہ تم کن چکروں میں پڑے رہتے ہو آج کل؟'' واجد نے اس سے علاقائی زبان میں پوچھا۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' بابر بھڑک گیا۔

''تمہاری ایک غلط حرکت یہاں کئی افراد کا روزگار ختم کردے گی۔''

''مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں...... انسان۔'' اس نے واجد کی قومیت کو ایک نامناسب لفظ میں بیان کیا۔

اس گالی کو سننے کے بعد واجد کے لیے بھی برداشت ناممکن تھی۔ اس نے ایک زوردار گھونسا بابر کے منہ پر رسید کر دیا۔

''تمہاری حب الوطنی کی ایسی کی تیسی...... اس وقت یہ محبت کہاں چھپی تھی جب چند پیسوں کی خاطر اپنی شناخت چھپائے جھوٹ در جھوٹ بولتے چلے گئے۔ تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی...... تمہاری اصل جگہ یہاں صاف ستھرا معاش نہیں بلکہ جنگل اور شہری حدود سے باہر موجود وہ خیمے ہیں جہاں تمہارے ہم وطنوں کو رکھا جاتا ہے۔'' بابر آپے سے باہر تھا۔

اس کی دھمکی بھی محض گیدڑ بھبکی نہ تھی۔ اس نے اپنا عناد اس کی اصلیت چاک کر کے ظاہر کر دیا۔ واجد کے لیے اب وہاں کسی بھی روزگار سے منسلک رہنا ناممکن تھا۔

☆☆☆

سردی کی لہریں کسی برچھی کے مانند واجد کی ہڈیوں میں گویا جما رہی تھیں۔

ماضی کے مرغزاروں میں بھٹکتے ایک طویل رات کا اختتام ہوگیا۔ اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آمد کے بعد اس کے شب و روز کا یہی معمول بن چکا تھا۔ دن بھر اپنا وجود مشقت کی بھٹی میں جھونکنے کے بعد رات ہوتے ہی ماضی کے نقش آنکھوں میں اجاگر ہونے لگتے۔ حسین ترین لمحات کی خوبصورتی محسوس کرتے بھیانک یادیں کس وقت اس کے لاشعور سے نکل کر شعور کے افق پر گھٹاؤں کی طرح چھانے کے بعد دل کے موسم میں حبس اور گھٹن پیدا کرتیں، اسے علم ہی نہ ہو پاتا۔

صبح کا اجالا اب کائنات کی ہر شے کو تاریکیوں سے نجات دلانے لگا۔ وہ قرب و جوار سے دانستہ بے نیازی اختیار کیے خیمے کے فرش پر آنکھیں بازو سے ڈھانپے لیٹا تھا۔ اس کی حسیات بہر حال چوکنا تھیں۔ اپنے پاس کسی کی موجودگی اور خود پر مرکوز نظریں بھی محسوس ہو رہی تھیں لیکن وہ کسلمندی سے لیٹا رہا۔

''کافی دلچسپ کردار ہو تم!'' اسے عدنان کی آواز سنائی دی۔

''میوزیم میں رکھوا دو پھر!'' اس نے نیم بیزاری سے جواب دیا۔ رت جگے کے باعث آواز میں بوجھل پن اور لہجے میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی تھی۔

گزشتہ روز واجد خود اس سے بات چیت کرنے کا خواہشمند تھا لیکن اب اپنے دل و دماغ پر چھائی افسردگی کے باعث خاموشی میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔

''ایک تم ہی نہیں...... ہم سبھی یہاں میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔'' عدنان نے اس کی کیفیت کو گہری نظروں سے جانچا۔

''رات تم کسی اضطراب میں مبتلا لگ رہے تھے؟'' مصطفیٰ بھی وہیں چلا آیا۔

''ہواؤں میں تیر نہ چلاؤ۔'' واجد نے سر جھٹکا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے...... میں نے بھی تمہاری بے چینی محسوس کی تھی۔'' عدنان نے بھی اسے گھیر لیا۔

''کل رات تم نیند میں کسی کو پکارتے ہوئے مچل رہے

تھے۔ لالہ! نہیں جانا!'' مصطفیٰ کے انکشاف پر واجد کا ہاتھ بے اختیار اپنی گردن کی عقبی سمت بڑھ گیا۔

''سویا کون کم بخت تھا؟'' اس نے مزید مزاحمت ترک کردی۔

''میرا بھی یہی اندازہ تھا کہ تمہارے وجود میں کوئی کشمکش برپا تھی۔'' عدنان نے اس بار قدرے نرمی سے کہا۔

خاموشی ایک بار پھر ان تینوں کے مابین خاموشی سے آن موجود ہوئی۔

خیمے کے دیگر مکین بھی بیدار ہو چکے تھے۔ نیند کی نعمت کچھ گھنٹے سکون اور بے خبری دینے کے بعد رخصت ہو گئی۔ اب باقی تھیں تو پھر وہی تلخیاں اور فراغت کا ایک اَن چاہا سفر۔ عجب ستم ظریفی تھی کہ وطن میں وہ ایسی فرصت کے لیے بلکتے دکھائی دیتے تھے۔ کوئی بھی عوامی تعطیل ہفتہ وار تعطیل پر آنے کی صورت میں ان کی مظلومیت قابلِ دید ہوا کرتی۔ کام کاج کبھی ان کے لیے ایک بوجھ بھی بن جایا کرتا لیکن جب وہ اپنے خاندان کے لیے کچھ کرنے کی خواہش کے جگنو تھامے دیارِ غیر میں آئے تو فراغت کسی آسیب اور سزا کی طرح ان پر مسلط کردی گئی۔

واجد خالی نظروں سے ان مدقوق چہروں اور خستہ حال افراد کو دیکھنے لگا۔ ان کے چیتھڑے نما لباس، بدبودار جسم اور میل کی تہیں دیکھ کر اسے جھرجھری آ گئی اور چہرے پر اداسی کے مزید بادل چھا گئے۔

''کل کی بہادری کے بعد ایسی دیوداسی تم پر جچتی نہیں۔'' مصطفیٰ نے اپنی گدلی آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔

''بہادری..... نہیں وہ بہادری کہاں تھی؟..... بس ایک عمل کا ردِعمل تھا۔ میں ملک کی تذلیل کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اگر ملک سے اتنی ہی محبت تھی تو یہاں کیوں چلے آئے؟'' عدنان نے پوچھا۔

''واہ بھئی! آج تو ملک صاحب کی زبان کے قفل بھی ٹوٹ گئے ہیں۔'' مصطفیٰ نے قطع کلامی کی۔

عدنان نے اُسے سخت نظروں سے دیکھا اور واجد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''وہیں رہ لیتے۔ یہاں ایسے ردِعمل حماقت کے سوا کچھ نہیں۔'' وہ حقیقتاً اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس برتاؤ کررہا تھا۔

''معاشی ذمے داریاں لے آئیں بس.....''

''اتنی کم عمری میں ایسی بھی کیا ذمے داریاں..... ہم نے عموماً چالیس کے پیٹے میں موجود افراد کو معاش کے لیے یہاں آتے دیکھا ہے۔'' مصطفیٰ نے کہا۔

''اسے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ کالج لائف سے نکل کر اِدھر چلا آیا ہے۔'' عدنان نے بھی توثیق کی۔

''کالج لائف بھی کہاں دیکھی تھی؟..... خیر چھوڑو بس میں وہ سب کچھ نہیں دہرانا چاہتا۔'' واجد نے پہلو بدلا۔

''یہاں آئے کتنا وقت ہو گیا ہے تمہیں؟'' عدنان نے دریافت کیا۔

''چھ ماہ سے زائد۔''

''تو اب تک کہاں روپوش تھے؟'' مصطفیٰ حیران ہوا۔

''میری بوٹ میں ہمسایہ ملک کے افراد موجود تھے..... ہم سرحدی محافظوں کی نظر میں نہ آسکے اور ان کے ساتھ مجھے بھی کسی طرح رجسٹریشن مل گئی۔''

''ہاں! یہ نظام میری سمجھ سے بھی بالاتر ہے..... انہیں مہاجر قرار دے کر اہلِ خانہ سمیت بہتر سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ اور ہم طویلے کے جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔'' مصطفیٰ نے تنفر سے کہا۔

''میں نے بھی یہی کچھ دیکھا ہے اب تک.....'' عدنان نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''ان کے ساتھ برتاؤ بہت مختلف ہے۔ جنگ زدہ ملک کے رہائشی ہونے کی وجہ سے انہیں بہت مارجن ملتا ہے..... لیکن جب بات ہمارے ملک کی آتی ہے تو پالیسی، قانون، برتاؤ، اصول وضوابط سے انسانیت حذف کردی جاتی ہے۔''

''یہ فرق اگر جنگ کی وجہ سے ہے تو ہم سے زیادہ جنگ گزیدہ کون ہے؟ ہمیں تو ہر لمحہ، ہر آن ایک نئی جنگ درپیش رہتی ہے۔'' واجد کی سماعت میں اسلحے کے قہقہے اور بچوں کے بلکنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔'' دونوں نے تائید کی۔

''ہماری جنگ تو اور بھی اذیت ناک ہے..... اس میں مخالف بھی اپنے ہیں..... وہ اپنی ناسمجھی میں ایسے زخم دیتے ہیں کہ عمر بھر ان کی کسک ختم نہیں ہوتی۔'' واجد نے بوجھل سانس لی۔

''ارے! تم تو بالکل ہی ہیرو... بن گئے ہو۔ میں تو سرسری بات کر رہا تھا۔'' مصطفیٰ کے چہرے پر اس کی بات سے ایک واضح سایہ لہرایا تھا اس لیے وہ بات بدل گیا۔

''ناشتے کا وقت ہو چلا ہے۔ اگر یہ شاہی مینیو ابھی تناول نہ کیا تو بعد میں ایک طویل فاقہ کاٹنا پڑے گا اس لیے قطار میں لگنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' عدنان نے بھی پہلو بچایا اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ناشتا آج بھی انہی لوازمات پر مشتمل تھا جنہیں ہاتھ میں تھام کر ماضی قریب یا بعید میں وطن میں اپنی جانب سے کی گئی رزق کی بے حرمتی انہیں لازماً کچوکے دیتی تھی۔ واجد اب قدرے سنبھل گیا تھا۔ اس کا ذہن ان مخصوص معاملات پر سوچ رہا تھا جس کے لیے وہ 'بھیجا' گیا تھا۔

خیمے کے ماحول، وحشت اور بدحال افراد دیکھ کر اسے مایوسی اور بے چینی لاحق ہونے لگتی تھی۔ اسے یہ تو علم تھا کہ ہم وطن افراد ایجنسیوں کی نظر میں آنے کے بعد کس قسم کے مصائب میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن عملی مظاہرہ دیکھنے کے بعد کیفیات بہرحال مختلف تھیں۔

''اوئے ہیرو! یہاں سب کا ایکسرے کب تک کرتے رہو گے؟'' مصطفیٰ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تو وہ چونک گیا۔

''نہیں! میں بس یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔''

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم یہاں آئے نہیں...... بلکہ بھیجے گئے ہو۔''

''ہاں! بھیجا ہی تو گیا ہوں...... باس سے اُلجھا تو اس نے انتقامی طور پر مجھے گرفتار کروا دیا۔'' واجد سنبھل کر بولا۔

''اعتبار کر کے دیکھ لو واجد سائیں! ہم یاروں کے یار ہیں۔''

''فرار کی خواہش پیدا ہو رہی ہے دل میں...... اسی کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔''

''واہ سائیں! تم نے تو میرے دل کی بات چھین لی...... یہ خواہش تو اسی روز سے میرے وجود میں پنجے گاڑ کر بیٹھی ہے جب اس مصیبت میں گرفتار ہوا۔''

''کیا کسی نے ایسی کوشش کی ہے پہلے؟''

''ہاں! دو دفعہ تو میرے سامنے بھاگے تھے۔''

''کامیابی ملی کسی کو؟''

''ارے! کہاں سائیں؟ کیسے ملتی کامیابی بھلا؟ اناڑی تھے...... باہر کی دنیا کے بارے میں جانکاری نہیں تھی انہیں۔ اس لیے لوٹ کے بدھو یہیں بھیج دیے گئے۔ ہاں! اگر کوئی زیادہ بھاگ دوڑ کرنے کی کوشش کرے تو اسے ایک الگ جگہ پر منتقل کر کے زنجیروں میں قید کر دیتے ہیں...... کی اولاد۔'' مصطفیٰ نے ایک موٹی سی گالی دی۔

''تمہارے خیال میں ان کی ناکامی کی کیا وجہ ہوتی ہے؟''

''انگریزی جو نہیں سمجھ پاتے...... اور کچھ سمجھ تو لیتے ہیں لیکن بول نہیں پاتے۔''

''تمہارا اشمار کس کیٹیگری میں ہوتا ہے ویسے؟''

''میں...... میں بھی گزارے لائق سمجھ لیتا ہوں اور ٹوٹی پھوٹی بول لیتا ہوں۔'' وہ ہنسا۔ ''ایک مزے کی بات بتاؤں؟ انگریزی کا پوسٹ مارٹم ہوتے دیکھ کر یہاں انتظامی افسروں کی جو حالت ہوتی ہے، اسے دیکھ کر میرے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔''

''یہاں اور کون ہے جو اس فہرست میں آتا ہے؟'' واجد نے احتیاط سے اپنی گیم کا آغاز کیا۔

''کوئی ایک بھی نہیں...... تعلیمی لحاظ سے سبھی قلاش ہیں۔'' اس نے منہ بنایا۔

''اور اگر میں کہوں کہ تمہارا اندازہ غلط ہے...... تو؟''

''ناممکن! ایسی بات ہرگز چھپی نہیں رہ سکتی۔''

''اوہ! اچھا! پھر تو فرار اور بچاؤ ناممکن ہے۔'' واجد نے گہری سانس لیتے ہوئے دانستہ طور پر انگریزی میں کہا۔

نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ عدنان اپنی بے نیازی برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔

☆☆☆

سرمئی شام اپنے پر پھیلانے لگی۔

واجد ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس مختصر سی جگہ پر سر نہوڑائے بیٹھا تھا۔ وہ اس 'کھیل' سے اب اکتانے لگا تھا۔ آج بھی اگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہتا تو ایک اور رتجگے کے ساتھ یادوں کی اسی کڑی کا تصور اسے مزید بے حال کر دیتا۔

''کن سوچوں میں گم ہو ہیرو؟'' عدنان کی آواز سماعت میں پڑی۔

''کہیں نہیں...... اپنے گھر والوں کو یاد کر رہا تھا۔''

''مصطفیٰ سے بہت راز و نیاز ہونے لگے ہیں تمہارے؟''

''راز و نیاز تو خیر نہیں ہوتے...... بس یونہی ذرا معلومات لے رہا تھا۔''

''وہ کون سا پروفیسر یا انسائیکلو پیڈیا ہے؟'' عدنان اس سے خاصا بیزار معلوم ہوتا تھا۔

''انسائیکلو پیڈیا نہ سہی...... لیکن کافی مفید معلومات ملیں مجھے اُس سے۔''

''دیکھو شہزادے! میرے ساتھ فلم چلانے کی کوشش نہ کرو...... تمہارا چہرہ بالکل ایک پوسٹر ہے جس پر بے چینی، سوچ، فکر، منصوبے اور جھوٹ و سچ سب کچھ واضح نظر آتے ہیں۔''

''مجھے یہاں کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو فرار میں ہماری مدد کر سکے۔'' واجد نے اپنے پتے ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''کیسی مدد؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بیرونی معاملات میں پُراعتماد بات چیت اور زبان دانی کی فصاحت۔''

''تو پھر ملا کوئی ایسا شخص؟''

''ہاں! میرے سامنے موجود ہے۔''

اس بار چونکنے کی باری عدنان کی تھی۔

☆☆☆

سیاہ ہنڈا اکارڈ سبک خرامی سے سڑک پر رواں تھی۔ گاڑی میں چار نفوس موجود تھے لیکن سبھی کے ہونٹوں پر خاموشی کے قفل تھے۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ ہم اس منحوس جگہ سے نکل آئے ہیں۔'' مصطفیٰ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس بات پر یقین کرنا محال ہے کہ یہ بالشت بھر لڑکا اتنے وسیع اختیارات کا مالک کیسے ہو گیا؟ یہ گاڑی، ڈرائیور اور ہمیں وہاں سے نکالنے کی کاک ٹیل پارٹی کے روز ٹائمنگ...... یہ سب معلومات اسے کس نے دیں؟'' عدنان بھی الجھن میں تھا۔

''اور تم دونوں یقین کرو! مجھے تو بالکل یقین تھا کہ تم لوگ انتہائی چغد اور ناشکرے ہو...... آم کھانے کے بجائے پیڑ ہی گنو گے۔'' واجد نے دانستہ چڑچڑے انداز میں کہا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ان کے مزید سوالات کا جواب نہیں دے سکتا تھا اس لیے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے سیٹ کی پشت سے اپنا سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے ذہن میں شام کو ہونے والی گفتگو گردش کرنے لگی۔

''ہواؤں میں تیر چلا رہے ہو تم!'' عدنان نے اس کے انکشاف پر سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نادان ضرور ہوں! لیکن عقل سے پیدل نہیں۔'' واجد صاف گوئی سے بولا۔

عدنان خاموشی سے اس کے مزید انکشافات کا منتظر تھا۔

''تمہارے ہاتھوں کی بناوٹ، انگلیوں کی ساخت سے مجھے کل ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بہت آرٹسٹک مزاج شخص رہے ہو۔''

''یہ انتہائی احمقانہ دلیل ہے۔'' عدنان نے قطع کلامی کی۔

''میں نہیں جانتا کہ تم نے کم علمی یا غیر تعلیم یافتہ ہونے کا سوانگ کیوں بھر رکھا ہے...... میں یہ بھی نہیں کہتا کہ مجھے انسانوں کی بہت پرکھ ہے...... ہرگز نہیں...... میری دنیا تو میرا بھائی تھا۔ میں اسی کی نظر سے دنیا دیکھتا اور جیتا تھا۔ وہ وحشت کی نذر ہو گیا اور مجھے اس گرداب میں تنہا چھوڑ گیا...... اس کے ہاتھ بھی ایسے ہی تھے اور وہ مجھے بتایا کرتا تھا کہ ایسی انگلیوں کے حامل افراد مصور یا ڈاکٹر ہوتے ہیں...... تم کون ہو؟...... میں نہیں جانتا...... میری طرح یقیناً تمہارا بھی ایک ماضی ہو گا...... مجھے اسے کریدنے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں...... مجھے صرف دلچسپی ہے تو اس بات میں کہ مجھے دو تعلیم یافتہ اور باشعور بندے درکار ہیں...... کیوں درکار ہیں؟ اس کا جواب بھی تمہیں اس وقت ملے گا جب میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو گے۔''

''مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ تم یہاں آئے نہیں، بھیجے گئے ہو۔''

''یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔''

''اوکے! کوئی مسئلہ نہیں پیارے! فرار تو ہونا ہی تھا...... تیرے ساتھ ہی سہی...... لے چل جہاں لے جانا ہے...... لیکن اپنے دماغ میں ایک بات بٹھا لے ابھی سے...... عدنان ملک تر نوالہ نہیں ہے۔''

''تمہیں میرے ساتھ جا کر بالکل مایوسی نہیں ہوگی۔'' واجد نے کہا۔

''تیری پشت پر اس وقت جو بھی ہے، اس نے یقیناً کسی ذاتی فائدے کے لیے ہی یہاں بھیجا ہو گا تجھے؟'' عدنان نے ایک نئے زاویے سے سوال کیا۔

''آج رات تیار رہنا...... آج ویک اینڈ ہے۔ انتظامیہ کسی نہ کسی کاک ٹیل پارٹی میں مصروف ہوگی۔ یہ فرار کا بہترین موقع ہے۔'' واجد نے دوٹوک بات کی۔ وہ مزید کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''کتنا وقت لگے گا بھئی اور؟'' مصطفیٰ کا اضطراب ناقابلِ برداشت تھا۔

''اگلے دس منٹ میں ہم باس کے گھر میں موجود ہوں گے۔'' ڈرائیور نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

واجد کا ذہن اب خودکار انداز میں 'باس' کی جانب مڑ گیا۔ ذہنی اڑان اب اس مقام پر جا پہنچی جب وہ ایمانداری اور سچائی کے باوجود کسی مجرم کی طرح اسٹور انتظامیہ کے سامنے کھڑا تھا۔

اپنی قومیت چھپانے کا جرم ناقابلِ معافی بن چکا تھا لٰہذا اسے قانونی محافظوں کے سپرد کرنا تو اب واجب تھا۔ اس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے سامنے ایک مستطیل میز کے عقب میں اسٹور کا مالک اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''اس دھوکا اور لاقانونیت کی کیا وجہ تھی مسٹر واجد؟'' اس نے کرختگی سے پوچھا۔

''آپ کے قانون کا دہرا معیار!''

''شٹ اَپ! میں اپنے ملکی قانون کے خلاف کچھ بھی برداشت نہیں کروں گا۔'' وہ غرایا۔

واجد اس کے بین الاقوامی انگریزی تلفظ کی وجہ سے بدقت تمام مدعا سمجھ پا رہا تھا اس لیے ایک توقف سے بولا۔

''آپ برداشت نہیں کر سکتے...... تو میں کیسے برداشت کرلوں؟ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں کہ میں غیر قانونی طور پر یہاں آیا۔ مقصد بہرحال روزگار کا حصول تھا...... بدامنی اور انتشار پھیلانا نہیں...... ورنہ آپ کے اسٹور میں ہونے والی اس خیانت پر خاموش رہتا اور خود بھی فائدہ اٹھاتا رہتا......'' وہ اٹکتے ہوئے کہتا چلا گیا۔

واجد کی زبان دانی میں یہی کمی تھی کہ وہ اعتماد اور روانی سے جواب نہیں دے پاتا تھا۔ وہ ُاسّی فیصد' انہی ملکی نوجوانوں کی طرح تھا جو دیسی لہجے میں کسی خاص تلفظ کے بغیر انگلش بولتے ہیں۔

''میں تمہارے ان فلمی مکالموں کی پذیرائی نہیں کر سکتا...... قانون پسند شہری ہوں اس لیے تمہیں 'معاشی مہاجر' کے طور پر رجسٹرڈ کروانا میری ذمے داری ہے۔''

''سر! کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟'' واجد کی دائیں جانب کھڑے درمیانی عمر کے شخص نے کہا۔

وہ اس اسٹور کا منیجر تھا اور بابر نے اسی کے سامنے سب سے پہلے یہ راز افشا کیا تھا۔

''یس انتھونی!'' جیکب نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''آپ مالک ہیں۔ مختارِ کل ہیں...... یقینی طور پر مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن میں نے ذاتی طور پر اس شخص کو بہت صاف گو اور محنتی پایا ہے۔''

''اگر تم اسے واپس نوکری پر بحال کروانا چاہتے ہو تو یہ ناممکن ہے۔ اس کے ملک کے لیے قوانین بہت سخت ہیں۔''

''نو سر! ناٹ ایٹ آل!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسے براہِ راست پولیس کے حوالے مت کریں۔''

''کھل کر بات کرو انتھونی!''

''سر! ایک بات تو آپ خود بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ اس کے ملک کے لیے قوانین بہت سخت ہیں...... دوسرا یہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آیا ہے...... دھوکا دہی سے رجسٹریشن کروائی ہے...... یہ الزامات اسے ایک طویل عرصے تک عتاب میں مبتلا رکھیں گے۔''

''تو پھر اب؟'' جیکب نے بھویں اچکائیں۔

''اس کی ایمانداری کا ہم اتنا صلہ تو دے سکتے ہیں کہ اسے بہتر رہنمائی فراہم کرتے ہوئے محفوظ ہاتھوں میں سونپ دیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اسے 'سپائرس' کے حوالے کر دیا جائے۔'' جیکب کی پیشانی پر سوچ کی شکنیں ابھریں۔

''جی بالکل! میرا یہی مدعا اور التجا ہے۔'' انتھونی نے تسلیمی انداز میں سر خم کیا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے اور اپنے سیل فون پر ایک کال ملالی۔

واجد کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔ وہ ان دونوں کی بات چیت کے متن سے ناآشنا تھا اور یہی سمجھ رہا تھا کہ اسے قانون کے حوالے کرنے کے لیے جیکب پولیس طلب کر رہا ہے۔

''ڈونٹ وری ینگ مین! تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ میں ذاتی طور پر تمہارا قدرداں ہوں اس لیے اپنے تئیں تمہارے لیے بہتر فیصلہ کیا ہے۔'' انتھونی نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو سر!'' وہ محض یہی کہہ پایا۔

''میں تمہیں اپنے ایک دوست سپائرس کے حوالے کر رہا ہوں...... اسے خدمتِ خلق کا بہت شوق چرایا کرتا ہے...... ہوسکتا ہے تمہارے لیے کسی وکیل کا بندوبست بھی کر دے۔'' فون بند کرتے ہی جیکب نے واجد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''لو بیٹا واجد! جیکب سے گرے تو سپائرس میں اٹکے۔ اب یہ حضرت جانے اپنی پٹاری سے کیا برآمد کریں گے۔'' اس نے خودکلامی کی اور اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے بولا۔ ''تھینکس آلاٹ سر!''

☆☆☆

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو واجد بھی اپنے خیالات سے چونک گیا۔

''کیا ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے؟'' مصطفیٰ نے پوچھا۔

''یس سر!'' ڈرائیور نے مؤدبانہ جواب دیا اور مستعدی سے اتر کر واجد کے لیے دروازہ کھول دیا۔

واجد کے ساتھ عدنان بھی باہر آ گیا۔ مصطفیٰ اپنی جانب

والا دروازہ خود کھولنا چاہتا تھا لیکن ڈرائیور لپک کر اس کی طرف بڑھا۔

''پلیز سر! یہ میری ڈیوٹی ہے۔'' اس نے تعظیمی انداز میں کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

عدنان اور مصطفیٰ اس پروٹوکول پر بہت حیران تھے۔ مصطفیٰ کے چہرے پر ایک ہی پل میں کئی رنگ بکھر گئے۔

''لگتا ہے ماضی لوٹنے کی رت آ گئی ہے۔'' وہ خوابناک سے انداز میں بڑبڑایا۔

ڈرائیور اب ایک پُروقار گھر کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجانے کے بعد اسپیکر سے مدھم آواز ابھری۔

''جی، کون ہے؟''

''جی، میں ایڈم ہوں!''

''کیا مہمان آ گئے؟''

''جی! میرے ساتھ موجود ہیں۔''

سیاہ رنگ کا دروازہ خودکار انداز میں کھلا اور ایڈم انہیں لیے اندر چلا آیا۔ داخلی دروازے کے سامنے ایک پورچ تھا جہاں دو گاڑیاں موجود تھیں۔ پورچ کے بعد وسیع و عریض گراسی لان تھا۔ رات کے اس آخری پہر میں ٹھنڈک اور نمی کا تاثر مزید گہرا محسوس ہو رہا تھا۔ اُن کے ناکافی لباس کی وجہ سے جسم کپکپا کر رہ گیا۔

''تمہاری ڈیوٹی اب آف ہے ایڈم!'' لاؤنج کے داخلی دروازے پر کھڑے ایک شخص نے کہا۔

وہ چھریری جسامت اور طویل القامت کا حامل شخص تھا۔ چہرہ سپاٹ اور نقوش کھردرے تھے لیکن لب و لہجے میں نرمی اور تہذیب جھلکتی تھی۔

''بہت شکریہ برائن!'' ایڈم الٹے قدموں لوٹ گیا۔

اب وہ تینوں برائن کی ہمراہی میں ایک کشادہ لاؤنج میں داخل ہو گئے۔ رات کے اس پہر گھر کی آرائشی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ مدھم روشنی ماحول کو مزید خوابناک بنا رہی تھی۔ اس مدھم و خوابناک ماحول میں بھی انہیں گھر کے ہر کونے سے سادگی اور نفاست واضح جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ عمومی طور پر ایسے گھروں میں آرائشی اشیا کی بھرمار اور دولت کی نمائش نظر آتی ہے لیکن یہاں سادگی اور وقار کا بہترین ملاپ تھا۔ مکین کے دولت مند ہونے میں تو رتی بھر شبہ نہیں تاہم مزاج کی خوبصورتی کی یہ جھلک دیدۂ بینا کو مزید متاثر کرتی۔

لاؤنج عبور کرنے کے بعد دائیں جانب سیڑھیاں چڑھتے ہی ایک طویل راہداری ان کی منتظر تھی۔ راہداری کے انتہائی کونے پر انہیں ایک کمرے میں لے جایا گیا۔

''یہ کمرا خصوصی مہمانوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔'' برائن نے پہلی دفعہ انہیں مخاطب کیا۔

''مجھے تو یہ کوئی سویا ہوا محل معلوم ہوتا ہے۔'' عدنان نے شستہ رواں انگریزی میں اسے جواب دیا۔

مصطفیٰ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن کر ششدر تھا۔

''سر!! ذرا وقت بھی تو دیکھیں۔''

''بھئی! وہ تو مجھے علم ہے کہ شرفا کے گھروں میں یہ سونے ہی کا وقت ہوتا ہے لیکن میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر ہمیں یہاں بلوانے کے لیے اتنا لمبا چوڑا کھٹراگ پھیلایا گیا تھا تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ شاید ہمارے استقبال کے لیے اس گیم کا ماسٹر مائنڈ بینڈ باجے کے ساتھ کھڑا بہ آواز بلند گنگنا رہا ہوگا کہ بہارو... پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔'' عدنان نے اسے مزید رگڑا۔

برائن سپاٹ انداز میں کھڑا رہا اور ایک توقف سے بولا۔ ''ہمیں آپ لوگوں کی اتنی جلد آمد کی توقع نہیں تھی۔ ایڈم کو کم از کم ایک ہفتہ وہاں رہنے کی ہدایت تھی۔ خوش قسمتی سے یہ کام دو روز میں ہی مکمل ہو گیا۔ آپ چاہیں تو نہا دھو کر فریش ہو جائیں۔ میں ہلکے پھلکے لوازمات کا آرڈر کیے دیتا ہوں۔''

''ہم...... آئیڈیا بُرا نہیں ویسے۔'' عدنان نے نیم رضامندی سے کہا۔

''مجھے غسل وغیرہ کی ضرورت نہیں...... تم دونوں چلے جاؤ۔ ہر سائز کا لباس بھی وہیں موجود ہوگا۔'' واجد نے کہا۔

برائن انہیں پُرآسائش کمروں سے ملحقہ باتھ رومز کی طرف لے گیا۔ باتھ ٹب کے شاور میں گرم پانی کی موجودگی سے وہ بے اختیار کسمسا کر رہ گئے۔ میل کی تہوں میں چھپا وجود پانی کی ایک ایک بوند کے لیے مچل رہا تھا۔

برائن انہیں وہیں چھوڑ کر واجد کے پاس چلا آیا۔

''آپ کی کارکردگی ہماری توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔'' اس نے کھلے دل سے سراہا۔

''ہاں! مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کام اس قدر آسان ہوگا۔''

''آپ کھانے میں کیا لینا پسند کریں گے؟''

''کچھ بھی لے آؤ یار! دو دن سے سخت عذاب میں مبتلا رہا ہوں۔'' وہ نڈھال سے لہجے میں بولا۔

برائن تفہیمی انداز میں سر ہلاتا رخصت ہو گیا۔ واجد کی

نظریں کمرے میں موجود ایک تصویر پر گڑی تھیں اور ذہن کچھ عرصہ پہلے کے واقعات میں اُلجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

جیکب کے دفتر سے اپنے بقایا جات لینے کے بعد وہ بہت مایوس اور دل گرفتہ تھا۔

قسمت نے اسے ایک عجیب گرداب میں پھنسا دیا تھا۔ وقت نامہربان تھا اور تقدیر ترکش کے سبھی تیر سنبھالے بیٹھی تھی۔ سونا بھی ہاتھ ڈالنے سے مٹی ہونے لگا تھا۔ ایک پل کے لیے اسے نعیم پر بھی بے حد غصہ آیا لیکن پھر خیال آیا کہ اصل قصوروار تو وہ خود تھا۔ یہ نوسربازیاں تو ان کے لیے کاروبار تھیں۔ واجد کی عجلت، کم عقلی، نادانی ہی نے اسے اس مصیبت میں پھنسایا تھا۔

اسے ماجد کی کہی گئی ایک بات شدت سے یاد آرہی تھی۔ وہ اکثر اسے کہتا تھا کہ کوئی شخص دوسرے انسان کو بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ دھوکا تو ہم خود اپنے آپ کو دیتے ہیں۔ خُودفریبی ہی ناکامی کا پہلا زینہ ہوتی ہے۔

ریٹائرنگ روم میں بیٹھے واجد کا دل کسی نے زور سے مٹھی میں بھینچ لیا اور آنکھوں میں دھواں سا بھر آیا۔

''کہاں کھو گئے تم لالہ! مجھے اس دنیا میں جینے کا ڈھنگ تو سکھا گئے ہوتے۔ ایک تند و تیز ندی میں پڑے سوکھے خزاں رسیدہ پتے کی طرح بھٹک رہا ہوں۔ منزل کے سبھی نشان گمشدہ ہیں۔ میرے قدموں اور وجود سے وعدوں، ذمے داریوں کی جو زنجیر لپٹی ہے، وہ مرنے بھی نہیں دیتی اور جینے کا بھی تاوان مانگتی ہے۔'' اس کے حلق میں ایک پھندا سا موجود تھا جس کی اذیت سے رگیں چیخ رہی تھیں۔

تصور میں اپنے پیاروں کے چہرے دیکھتا وہ کتنی ہی دیر آنکھیں موندے وہاں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی سماعت میں انتھونی کی آواز نے صور پھونکا۔

''تیار ہو جاؤ واجد! مسٹر سپائرس نے تمہاری طلبی کے لیے اپنا ڈرائیور بھیجا ہے۔''

''میں تیار ہوں...... جہاں دل چاہے دھکیل دو۔'' واجد کے لب و لہجہ میں اداسی و تلخی بھانپ کر انتھونی بھی ملول ہو گیا۔

''آئی ایم رئیلی سوری! لیکن میں چاہ کر بھی تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا...... قانون نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں...... تمہارے ملک اور ہم وطنوں کے لیے قوانین......''

''بس کر دو یار!...... میرے کان پک گئے ہیں یہ دلیل سنتے ہوئے۔ سارے قصور اور جرم ہمارے ہی کھاتے میں ہیں۔''

''مسٹر سپائرس بہت اچھے آدمی ہیں۔ شہر کے نامور سماجی خدمت گزار ہیں۔ وہ تارکینِ وطن کی بہت مدد کرتے ہیں۔ تمہیں ان سے مل کر مایوسی نہیں ہو گی۔''

''مجھے اب کسی سے کوئی امید نہیں۔ ہر شخص مفاد کا پجاری ہے۔ تمہاری کوششوں کا بہرحال شکریہ!'' وہ کسی ایسے جواری کے مانند لگ رہا تھا جس نے ایک جیت کی آس میں اپنا وجود بھی گروی رکھوا دیا ہو۔

انتھونی اس کی تلخی نظرانداز کیے اس کے ہمراہ باہر چلا آیا۔ سیاہ گاڑی میں ایڈم اس کا منتظر تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی انتھونی نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے سینے پر صلیب بناتے ہوئے کہا۔

''خداوند تمہیں اپنے سائے میں رکھے۔''

سیاہ گاڑی اب ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گئی تھی۔

واجد کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ سڑکیں، مکانات، درخت اسے کسی حد تک مانوس نظر آرہے تھے۔ گھروں کی ساخت و ترتیب دیکھتے ہوئے بھی کئی بار اسے اپنے شہر کی عمارات یاد آئیں۔

''سب کچھ میرے دیس جیسا ہی تو ہے لیکن پھر بھی میرے لیے یہاں دھتکار اور ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

وہ اب شہر کی ایک مصروف کاروباری شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ قطار در قطار بنی دکانوں پر نامانوس زبان میں کندہ نام اور گلاس ڈورز سے نظر آتے ورکرز کی جھلک دیکھ کر اس کی یاسیت مزید بڑھنے لگی۔

ایک ذیلی سڑک پر مڑنے کے بعد اب مکانات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ ایک رہائشی کالونی تھی جس میں سبھی مکانات بہت خوبصورت لیکن قدرے فاصلے پر بنے تھے۔ گاڑی بالآخر ایک سیاہ آہنی گیٹ کے باہر رک گئی۔ تعارفی مراحل سے گزرنے کے بعد برائن ہی اسے نچلی منزل پر موجود ایک اسٹڈی روم میں لے آیا۔

''مسٹر سپائرس اندر آپ کے منتظر ہیں۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

واجد اندر داخل ہوتے ہی ایک منظر دیکھ کر بے ساختہ چونک اٹھا۔

☆☆☆

دروازے پر آہٹ کے بعد عدنان کو دیکھ کر وہ بے اختیار حیران ہوا۔

اس کے سامنے اب بے ترتیب، غلیظ حلیے کے بجائے پُرکشش، مردانہ وجاہت سے بھرپور شخص کھڑا تھا۔ سیاہ نم بال سلیقے سے سنوارے گئے تھے۔ جھاڑ جھنکار داڑھی بھی اب اپنا وجود کھو چکی تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں کئی چبھتے ہوئے سوال تھے۔

''واہ بھئی! تم تو پہچانے ہی نہیں جا رہے۔'' واجد نے اس کی نیلی ٹی شرٹ اور آرام دہ ٹراوزر کو توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے سیٹی بجائی۔

''بھئی! ہم عزت مآب واجد کے ریفرنس سے آئے ہوئے مہمان ہیں۔ یہ سبھی خدمتیں اسی کا تو اعجاز ہیں۔'' عدنان نے طنز کیا۔

''میں تمہارے اس جلنے بھننے کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔ بس تھوڑا سا انتظار کر لو۔ تمہارے سبھی گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔'' اس کے ٹھہرے ہوئے انداز پر عدنان کے چہرے کے زاویے مزید بگڑ گئے۔

اس نے سخت انداز میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک بھاری بھرکم، بے ہنگم آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

''تیری اونچی شان ہے مولا...... تو ہے سب کچھ جاننے والا...... میں ہوں تیرا ماننے والا...... تو نے ہی تو لفٹ کرا دی...... تھوڑی سی تو لفٹ کرا دی۔'' مصطفیٰ گنگناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ہی 'باتھ روم سنگرز' کو بھی مات دیتا تھا۔

اس کے جسم سے بھی میل کی تہیں اتر چکی تھیں۔

''خدا جانے کتنے عرصے بعد یہ غسل اور آسائشات نصیب ہوئی ہیں۔'' اس نے صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں پسار لیں۔ عدنان پر نظر پڑتے ہی اسے کچھ یاد آ گیا۔

''تم...... بہت بڑے ڈھونگی......''

''ہاں مجھے علم ہے ڈریکولا!...... اپنی انرجی مجھ پر ضائع مت کرو۔ اور اپنے کام سے کام رکھو بس۔'' عدنان نے درشتی سے اسے ٹوکا۔

واجد کے لیے اس کا یہ رویّہ شروع ہی سے ناقابلِ فہم تھا۔ عدنان کی مصطفیٰ کے لیے نفرت و حقارت کیمپ میں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔

''اوکے! ایز یو وش۔'' اس نے بھی سرد مہری سے جواب دیا۔

اسی اثنا میں برائن کھانے پینے کے لوازمات لیے چلا آیا۔ کرسٹل ٹرالی میں سینڈوچ، اُبلے ہوئے انڈے، چائے اور کافی موجود تھی۔

''ان میں حرام اجزا تو شامل نہیں؟'' عدنان نے پوچھا۔

''نو سر! اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔''

کھانے کے لوازمات دیکھ کر ان کی بھوک شدت سے مچل اٹھی اور وہ ندیدوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔

☆☆☆

واجد کمرے میں داخل ہوتے ہی بے ساختہ چونکا تھا۔ اس کے سامنے چند فٹ کے فاصلے پر ایک ضخیم کتاب میز پر اوندھی رکھی تھی۔ وہ اس کتاب کو دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق اس ملک میں 98 فیصد آبادی کٹر عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ ایک فیصد صیہونی اور باقی ماندہ آبادی مسلم تھی۔ اس صورت میں اسٹڈی ٹیبل پر کلام پاک کا انگریزی ترجمہ رکھے دیکھ کر حیرانی واجب تھی۔

''خوش آمدید مسٹر واجد! خوش آمدید!'' بائیں سمت میں کتابوں کے ایک بڑے ریک کے پاس موجود شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی لیکن اس عمر میں بھی اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ تروتازہ چہرہ، زندگی سے بھرپور چمکتی آنکھیں، فرنچ شیو اس کے شخصی تاثر کو مزید پُرکشش بناتی۔ بال سلیقے سے بنائے گئے تھے اور کاٹھی اس عمر میں بھی خاصی مضبوط دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چند کتابیں موجود تھیں جنہیں فوری طور پر ایک جانب رکھ کر وہ اس سے معانقہ کے لیے آگے بڑھ آیا۔

''امید ہے تمہیں یہاں پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ہوگی۔''

''ہرگز نہیں! آپ کا بھیجا گیا ہیلی کاپٹر مجھے اپنے محل سے بحفاظت یہاں لے آیا ہے۔''

''کافی تلخ معلوم ہوتے ہو۔ خیر! جیکب نے تمہیں میرے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتا دیا ہوگا۔''

''وہ اور انتھونی تو بتانا چاہ رہے تھے لیکن میں نے کان دھرنا ضروری نہیں سمجھا۔'' اس کے انداز پر سپائرس کے چہرے کی مسکراہٹ مدھم ہوگئی۔ وہ واجد کے 'اندازِ بیان' میں موجود کمی اچھی طرح بھانپ گیا تھا۔

''اگر تمہیں میرا مدعا سمجھنے میں کوئی دشواری ہے تو ہم تمہاری زبان میں بات چیت کیے لیتے ہیں۔'' اس کی زبان سے اپنی قومی زبان کی ادائیگی سن کر واجد کو آج کے دن دوسرا بڑا جھٹکا لگا تھا۔

وہ اس کی کیفیت دیکھ کر محظوظ ہوا اور بولا۔ ”حیران مت ہو! تمہیں میرے پاس یونہی نہیں بھیجا گیا۔ میں صرف اردو ہی نہیں بلکہ جرمن، فرنچ، چائنیز بھی اہلِ زبان کی طرح لول اور سمجھ لیتا ہوں۔ آج کل عربی زبان سیکھنے کے مراحل میں ہوں۔“

”اس دلچسپی کی کوئی خاص وجہ؟“

”میں دنیا کے مختلف مذاہب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس لیے عبرانی زبان کے بعد مسلم مذہب کی مکمل تفہیم کے لیے عربی زبان اور لغت سے آشنائی ضروری تھی۔“

اس کی آنکھوں میں نرمی اور لہجے میں شفقت تھی۔ واجد قابلِ رشک نظروں سے اس کی کتابوں اور اسٹڈی روم کی آسائشات دیکھتا رہا۔ سپائرس اس کی دلچسپی بھانپ گیا اور بڑی ملائمت سے بولا۔ ”لگتا ہے تمہیں کتابوں اور مطالعے کا بہت شغف رہا ہے۔“

”جی ہاں! میرے بڑے بھائی سے ہی یہ لت لگی تھی مجھے۔“ اس کی نظروں میں ساجد کا معذور سراپا گھوم گیا۔

”بڑے بھائی سے بہت پیار کرتے ہو تم شاید؟“

”رائٹ! اپنے خاندان ہی کے لیے یہاں آنے کا خطرہ مول لیا تھا میں نے۔“ پھر اس نے بعد کے مسائل اور غیر قانونی راستوں کا احوال بیان کر دیا۔

سپائرس پوری دلچسپی اور انہماک سے اس کے انکشافات سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مدوجزر کی سی کیفیت تھی۔ اپنی بات کے اختتام پر واجد یوں ہانپ رہا تھا جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آیا ہو۔ کمرے میں چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر سپائرس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

”تمہارے جیالے بھائی کی موت کا مجھے افسوس ہے..... میں نے کبھی اسے دیکھا نہیں لیکن اس کی بہادری اور وژن نے میرا دل موہ لیا ہے۔ ہی اِز اے ٹرو ہیرو! بلکہ میں ذاتی طور پر عالمی تشدد، بدامنی، سیاست کے اس کھیل میں بڑی طاقتوں کے کردار سے واقف ہوں۔ سیاست، مذہب اور بین الاقوامی حالات پر میرے کئی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ چند بڑی طاقتوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تمہارے ملک کو آکٹوپس کی طرح جکڑ رکھا ہے اور اسے دانستہ طور پر کھوکھلا بنایا جا رہا ہے۔“ واجد اس کے مدلل انداز اور دوٹوک موقف سے متاثر ہونے لگا۔

”چند سال قبل تمہارے ملک کے ایک تعلیمی ادارے میں خون کی ہولی کھیلی گئی تھی.....“

”ایسی ہولی کئی ایک بار کھیلی جا چکی ہے مسٹر سپائرس! جو کبھی منظرِ عام پر آجاتی ہے اور کبھی کسی نئے سانحے کی گونج میں دب جاتی ہے۔“ واجد نے قطع کلامی کی۔

”میں اسی طرف آرہا ہوں مائی ڈیئر!“ سپائرس نے متانت سے کہا اور میز پر رکھے ایک گلاس سے چند گھونٹ پانی پینے کے بعد سلسلہ کلام پھر سے شروع کیا۔

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ پہلی بار میں اس وقت وہاں گیا تھا جب ہولناک زلزلہ نے شمالی علاقوں کو تباہ کیا۔ وہاں قدرتی خوبصورتی دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا تھا۔ دوسری بار اس انسانیت سوز واقعہ کے بعد میں خود کو وہاں جانے سے روک نہ پایا۔ ان لوگوں کی ہمت، جذبہ اور مثبت رویّہ دیکھ کر مجھے اپنے وجود میں کئی خلا محسوس ہوئے اور خیال آیا کہ ایسی جانباز قوم کو بقا کا مکمل حق حاصل ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے واجد کہ جب ہم پانڈا، ڈائنا سار، برفانی چیتوں جیسے حیوانات کی نسل ناپید ہونے پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں تو کسی قوم کی بقا میں مدد کیوں نہیں دے سکتے؟ تمہیں میری بات شاید ناقابلِ یقین محسوس ہو لیکن تمہاری قوم اپنے جذبوں اور ہمت میں لاثانی ہے۔ میں اس قوم کی خوابیدگی میں مبتلا صلاحیتوں کا بہت معترف ہوں۔“

”میں واقعی ایک غیر ملکی کی زبان سے اس پذیرائی پر حیران ہوں۔“ واجد نے کہا۔

”ہونا بھی چاہیے.....لیکن تمہیں علم نہیں کہ حیران تو میں تب تھا جب ان متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ظلم کی راہ میں لڑنے کے لیے ایک کیا اپنی ساری اولاد قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ اس لمحہ میرے ذہن میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ آخر وہ کیا عنصر ہے جو اُن کے جذبات کو اس طرح شاداب رکھتا ہے۔ اسی کے بعد میں نے عالمی سیاست اور مذاہب کا نئے سرے سے مطالعہ شروع کیا اور پھر مجھے علم ہوا کہ تمہارے مذہب سے یہ تسلسل تو روزِ اول سے جاری ہے۔ میں تاریخی حوالوں یا ماضی کے قصے کرید کر تمہیں بور نہیں کروں گا۔ بس اتنا جان لو کہ ایک مخصوص لابی مکمل تیاری کے ساتھ تمہارے ملک کو افرادی قوت کے معاملے میں بنجر بنا رہی ہے۔ اس کے مقاصد دوررس ہیں اور وسائل لامحدود۔“

”میں آپ کے ہر ایک حرف سے متفق ہوں۔“ واجد اس کے تجزیے پر دنگ تھا۔

”میں اتنا طاقتور تو نہیں کہ کسی سپر ہیرو کے مانند سیاست کے بڑے بڑے ستونوں میں سرنگیں بناتا پھروں لیکن اپنی بساط کے مطابق کچھ اقدامات کا آغاز بہرحال میں کر چکا ہوں۔“

واجد اس غیر متوقع صورتِ حال اور اپنی زندگی میں اچانک نمودار ہونے والے کردار پر کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر تھا۔

''مجھے ابھی کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں...... تم... فی الوقت آرام کرو۔ میں آج رات چند اہم معاملات پر تم سے گفتگو کروں گا۔''

واجد کو ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کی سبھی ضروریات کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ ذہنی سکون میسر آتے ہی نیند بھی مہربان ہوگئی۔ سپائرس کی جانب سے اسے رات کے بجائے اگلی صبح طلب کیا گیا۔ وہ کافی تھکاوٹ کا شکار تھا۔

''میں تمہیں ایک اہم کام سونپنا چاہتا ہوں!'' اس نے کسی تمہید کے بغیر بات کا آغاز کیا۔

''یس شیور!''

''میں کئی دنوں سے ایک ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھا اور میری خوش قسمتی ہے کہ جیکب نے تمہیں یہاں بھیج دیا۔''

''میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' وہ الجھ گیا۔

''تمہیں میرا نمائندہ بن کر معاشی مہاجرین کے کیمپ میں کچھ وقت گزارنا ہوگا۔ وہاں پیش آنے والے حالات کی مکمل رپورٹ مجھے دینا ہوگی...... دوسرے مرحلے میں ایسے افراد کی نشاندہی کرنی ہوگی جو تعلیم یافتہ ہوں۔ میں یہ معاملہ انہی کے توسط سے انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کے علم میں لانا چاہتا ہوں تاکہ انہیں کم از کم بنیادی حقوق ہی مل جائیں۔''

''اور اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟''

''ویل! اگر مالی لحاظ سے پوچھ رہے ہو تو میری این جی او قومی سطح سے بین الاقوامی سطح پر آجائے گی...... فنڈز میں اضافہ تو ہوگا ہی...... دوسری جانب اس فورم سے آواز اٹھا کر ہم غیر قانونی تارکینِ وطن کو بہتر انسانی حقوق مہیا کرسکتے ہیں...... فیصلہ تم پر ہے...... اگر انکار بھی کرو گے تو مجھے کوئی ایشو نہیں...... اقرار کی صورت میں تمہیں معقول معاوضہ ملے گا۔ بااعتماد منی ٹرانسفر کے ذریعے تمہارے اہلِ خانہ کو رقم بھجوا دی جائے گی۔ ٹیلی فونک رابطہ بھی ممکن ہوگا۔ اگر میری آفر منظور نہیں تو قانونی جھنجٹوں سے محفوظ رکھتے ہوئے ڈی پورٹ کروا دیا جائے گا...... عجلت میں فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ چند دن آرام و سکون سے یہاں رہو اور سوچ سمجھ کر کسی حتمی نتیجہ سے آگاہ کردینا۔''

واجد شش و پنج میں مبتلا ہوگیا۔

واپسی کی صورت میں پیدا ہونے والے عوامل بھی اس کے ذہن میں اندیشوں کی طرح کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔ سپائرس کی جانب سے بیان کردہ حقائق بھی اس کے لیے کم ہولناک نہ تھے۔ وہ کئی روز تک تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا رہا۔ زندگی میں ہر موڑ، ہر فیصلے کے وقت اسے ماجد کی کمی بری طرح کھلتی تھی۔ اس بار بھی وہ بڑے بھائی کی سوچ اور نقطہ نظر سے سوچنے پر مجبور تھا۔

ماجد نے بے گناہوں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔ اسے ہر معاملہ میں اپنا آئیڈیل سمجھنے والے واجد کے لیے اب فیصلہ مشکل نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی اور دوستوں کو تو بچا نہیں پایا تھا لیکن اب شاید قدرت اسے ایک موقع اور فراہم کر رہی تھی۔ وہ اپنے مدار سے بھٹکے ہوئے ان لوگوں کی بہتری اور مشکلات سے رہائی کے لیے حصے دار بننا چاہتا تھا جن سے وطن میں جانے کتنی زندگیاں وابستہ تھیں۔

اس نے سپائرس کو اپنے مثبت فیصلے سے آگاہ کردیا۔

☆☆☆

ٹرالی میں موجود کھانے کے لوازمات ختم ہوچکے تھے۔

گرم گرم لذیذ کافی نے تھکاوٹ سے چور جسموں کو بہت سکون بخشا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سپائرس جاگنگ سوٹ میں ملبوس ان سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔

''سوری جنٹل مین! تاخیر کے لیے معذرت!'' اسے قومی زبان بولتے دیکھ کر عدنان اور مصطفیٰ کی حالت بھی دیدنی تھی۔

''کوئی بات نہیں سر! برائن ایک بہترین میزبان ہے۔'' واجد نے متانت سے کہا۔

''ہمیں اس طرح یہاں پُراسرار طریقے سے بلانے کا مقصد؟'' عدنان نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''مقصد بہرحال نیک ہے نوجوان!'' سپائرس مسکرایا۔

''کسی کو قتل وتل تو نہیں کروانا بھائی؟'' مصطفیٰ نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔

''آپ کے سینس آف ہیومر کا بھی جواب نہیں...... اس کام کے لیے ہزاروں مقامی افراد راضی ہوجائیں گے۔'' سپائرس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر؟ ایسا کیا کام ہے جو مقامی افراد نہیں کرسکتے بلکہ صرف ہم کرسکتے ہیں؟'' عدنان نے دریافت کیا۔

''مجھے بہت سے لوگوں اور ان سے جڑی زندگیوں کو ختم ہونے سے بچانا ہے۔ میں ایک مصروف کاروباری شخص ہوں اس لیے مختصراً بتائے دیتا ہوں کہ واجد کو میں نے ہی کیمپ میں بھیجا تھا۔ اس کے لیے مجھے ایک چھوٹا سا ناٹک بھی رچانا پڑا

تاکہ اسے 'معاشی مہاجر' قرار دیا جاسکے۔ میرا خصوصی ڈرائیور گاڑی سمیت جنگل کے باہر روزانہ انتظار کرنے پر مامور تھا۔ مجھے چند ایسے لوگوں کی تلاش تھی جو مکمل اعتماد اور سلیقے سے میری این جی او کے توسط سے اپنے مسائل انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں تک پہنچا سکیں اور اسی لیے مجھے تعلیم یافتہ نوجوان درکار تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ واجد نے میری توقعات سے بہتر اور جلد یہ کام کر دیا۔"

"آپ کی یہ آفر قبول کرنے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟" مصطفیٰ نے پوچھا۔

"قانونی جھنجٹ سے تحفظ اور بحفاظت ڈی پورٹ۔"

"اور اگر میں یہیں رہائش اختیار کرنا چاہوں تو؟"

"اس کے لیے بھی ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے...... ابھی آپ آرام کیجیے، ڈنر پر ملاقات ہوگی۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھا اور عدنان کی چبھتی ہوئی نظریں نظر انداز کرتا ہوا جاگنگ کے لیے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

مصطفیٰ اپنے کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر بہت پُرجوش تھا۔

جہازی سائز بیڈ، بہترین پردے، دبیز قالین اور آرام دہ فرنیچر میں نفاست نمایاں تھی۔ اسی پل دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس!! کم اِن!" اس نے تحکمانہ کہا۔

برائن اس کے سامنے ایک ٹرالی لیے موجود تھا۔

"باس نے آپ کے لیے ایک تحفہ بھیجا ہے۔" اس نے وہسکی کی ایک بوتل نکالی۔

"واہ!! سپائرس واقعی انسان شناس ہے۔" وہ قلقاری مار کر کہنے لگا۔

"کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے انٹرکام پر اطلاع کر دیجیے گا۔ میرے ایکسٹینشن کا نمبر 5 ہے۔"

اس کے جاتے ہی مصطفیٰ نے دونوں بازو پھیلائے اور نیم دائرے میں رقص کرنے لگا۔

"اتنے بڑے جیون ساگر میں...... تو نے ہمیں سپائرس دیا......"

وہ ایک جست میں نرم بستر پر چڑھا اور پنجوں کے بل میٹرس پر اچھلنے لگا۔ پھر جوش کے عالم میں تکیے اٹھا کر اچھالتے ہوئے وہی بول دہرانے لگا۔

رقص کرنے سے اس کا اندرونی خلفشار اب قدرے بہتر ہوگیا تھا۔ اس نے بوتل کھولی اور بنتِ انگور سے شغل کرنے لگا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر خمار کے زیرِ اثر تھا۔ نرم و گداز بستر، شکم سیری اور وہسکی نے اس کی ساری تھکاوٹ کیف و سُرور میں تبدیل کر دی تھی۔

لیٹے ہوئے اس نے کچھ لمحوں بعد ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ایل ای ڈی آن کر دی۔ مختلف چینلز سرچ کرتے ہوئے اس کی بیزاری اب غنودگی میں ڈھلنے لگی تھی۔ اسکرین پر اب کوئی انگریزی فلم چل رہی تھی۔ مار دھاڑ ایکشن سے بھرپور اس فلم میں قتل و غارت کے مناظر نے اس کی نیند ہوا کر دی۔ بہتا ہوا لہو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں گہری نشہ آور کیفیت طاری ہوگئی۔

لہو اس کی کمزوری تھا اور بہتا لہو دیکھنے کے لیے وہ ماضی قریب میں جانے کیا کیا جتن اختیار کیا کرتا تھا۔

اس کے بدن میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ خشک ہوتے ہونٹ 'پیاس' کی شدت سے چیخ رہے تھے۔ وہ بے تابی سے اٹھا اور ملحقہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ ایک کیبنٹ میں اسے کچھ بلیڈز پڑے نظر آگئے۔ اس نے احتیاط سے ایک بلیڈ تھاما اور اپنی بائیں انگشتِ شہادت پر بڑے اہتمام سے زخم لگا کر لہو کی ننھی بوندیں دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہونے لگا۔ خون کی مہک اپنے نتھنوں کے قریب لے جا کر محسوس کی اور ایک کٹ مزید لگانے کے بعد وہ بوندیں وہسکی کے گلاس میں ملا کر غٹاغٹ پی گیا۔

کچھ دیر پہلے کی کیفیت اب زائل ہوگئی تھی۔ نشہ دو آتشہ ہوگیا۔ اس کے پردۂ تصور پر صرف لہو سمایا تھا۔ گہرا سرخ...... سیاہ...... نارنجی مائل......

وہ آنکھیں موندے ان لمحات میں کھو گیا جہاں اس کی دستِ جنبش سے لوگوں کی زندگیوں کے فیصلے ہوا کرتے اور اسے انسانی لہو کی چاٹ لگی تھی۔

☆☆☆

مصطفیٰ قمر اپنی سلطنت کا نازوں میں پلا شہزادہ تھا۔ وہ ملک کے ایک اہم تجارتی و صنعتی صوبے کا رہائشی تھا۔ اس کا بچپن بہت شاندار گزرا۔ وہ علاقے کے بااثر شخص قمر علی کا بیٹا تھا اور حقیقی معنوں میں اس کی ناک کا بال تھا۔

ان کے محل نما گھر میں دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ نوکر چاکر ایک اشارے کے منتظر رہتے۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ہل کر پانی بھی نہ پیا تھا۔

دس سال کی عمر تک اسے بالکل نومولود کی طرح لاڈ پیار کیے گئے جس کے بعد اس کی فطرت میں ضد، ہٹ دھرمی اور منتقم مزاجی کے سوا کوئی اور عنصر پروان چڑھنا ناممکن تھا۔ اس

کی زندگی کھانے پینے اور آسائشات تک محدود تھی۔ کمرے میں دنیا جہان کے کھلونے، مشہور کمپنی کا ٹی وی، وی سی آر اور نت نئی فلموں کی کیسٹس موجود تھیں۔

قمر علی ایک مصروف کاروباری شخص تھا جسے بیرونی معاملات، علاقے کے لوگوں کی شکایات اور گھریلو ملازمین کو رعب و دبدبے میں رکھنے کی کوششوں کے علاوہ اگر فرصت ملتی تھی تو وہ مختلف محفلوں کے انعقاد پر صرف ہو جاتی۔

اس کی پرورش میں والدہ کا عمل دخل بہت کم تھا۔ رخسانہ کی حیثیت ویسے بھی گھر میں رکھے فرنیچر سے زیادہ نہیں تھی۔ کم عقلی اور غیر تعلیم یافتہ ہونا اس کی اضافی خوبیاں تھیں اس لیے جس عمر میں مائیں بچوں کو قومی اقدار اور اسلامی شعائر سے آگاہ کرتی ہیں، وہ مصطفیٰ کو 'آدابِ شہنشاہی' سے آگاہ کرتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب وہ اسے اپنی اطاعت کی طرف مائل کرنے پر متوجہ ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ڈھٹائی اور بے حسی میں اپنی مثال آپ تھا۔

اس کی نظر میں ماں کی رہی سہی عزت اور اہمیت اس روز ختم ہوئی جب قمر علی نے اسے بری طرح زدوکوب کیا۔

''تیری ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے کو ہاتھ لگانے کی؟'' وہ دہاڑا۔

''اس میں غلط عادات پیدا ہونے لگی ہیں۔'' رخسانہ منمنائی۔

''غلط یا صحیح کا فیصلہ کرنے والی تو کون ہوتی ہے؟ میرے پاؤں کی جوتی ہے تو اور ہمیشہ یہی تیری اوقات رہے گی۔''

رخسانہ اولاد کے سامنے اپنی یہ تذلیل برداشت نہ کر پائی اور ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دی۔

''آج یہ میری نافرمانی کرتا ہے...... اس کی یہی عادتیں تجھے لے ڈوبیں گی ایک دن۔''

مار پیٹ کا یہ سلسلہ اسے پہلی دفعہ پیش نہیں آیا تھا۔ تنہائی میں اکثر قمر علی نشے کی حالت میں اس کی ہڈیاں سینک دیا کرتا تھا لیکن اس روز معاملہ بہت بڑھ گیا تھا۔

''اچھا! تُو کون سی لاٹ صاحب کی بچی ہے جو تیرا ہر حکم وہ مانے۔''

''ماں ہوں میں اُس کی...... میں نے پیدا کیا ہے اسے...... تکلیفیں سہی ہیں اس کے لیے۔''

''تو دنیا کی ہر عورت یہی کرتی ہے......'' قمر نے گالی دی۔ ''تُو نے کون سا احسان کیا ہے مجھ پر؟''

مصطفیٰ باپ کی شہ پر مزید شیر ہو گیا۔ ''کل بھی انہوں نے مجھے تھپڑ لگایا تھا۔''

''کیوں؟ کل کیا ہوا تھا ایسا؟'' اس کے ماتھے کے بل گہرے ہوئے۔

''مجھے سیپارے کا سبق یاد نہیں ہو رہا تھا...... اس لیے۔''

قمر بیوی کی اس جسارت پر مزید آگ بگولا ہو گیا۔

''دل تو چاہتا ہے کہ تیرا گلا گھونٹ دوں۔'' اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے رخسانہ کی گردن دبوچ لی۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا...... ماں ہوں میں اس کی۔ سزا دینا میرا حق ہے...... اتنا بڑا ہو گیا ہے یہ لیکن نورانی قاعدہ تک مکمل نہیں کر سکا۔ اسکول کی تعلیم تو ابھی بہت دور کی بات ہے...... کسی بھی مولوی کو دو دن سے زیادہ ٹکنے نہیں دیتا یہ...... اس کی زندگی خراب کرنے پر کیوں تلے ہو؟'' رخسانہ بے قابو ہو گئی۔

''یہ قمر علی کی اولاد ہے...... جس کے ساتھ جو مرضی سلوک کرے، تم آئندہ اسے کچھ نہیں کہو گی۔''

''اپنی عاقبت تو برباد کر ہی چکے ہو...... اولاد کی دنیا اور آخرت کیوں خراب کر رہے ہو؟''

''یہ اس علاقے پر حکمرانی کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے اور حکمران کبھی کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔''

اس کے ہاتھ اور گھونسے بلا دریغ جاری تھے۔

''میرا منہ مت کھلوا قمرے! تیری اوقات اور اصلیت مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا...... بڑا آیا حکمران...... ذات دی کوڑ کلی تے شہتیراں نوں جپھے۔'' رخسانہ کے بے خوف انداز نے اسے بالکل ہی بے قابو کر دیا اور وہ بلا سوچے سمجھے اسے لہولہان کرتا گیا۔

وہ مدد طلب نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھتی اور کرب سے چیختی رہی لیکن وہ باپ کے اس روپ کو دیکھ کر اس قدر دم بخود تھا کہ ماں کی بے بسی دکھائی دے رہی تھی نہ ہی اس کی پکار سنائی دے رہی تھی۔

بالآخر رخسانہ نہایت زخمی حالت میں بے ہوش ہو گئی۔

☆☆☆

رات گہری ہو چکی تھی۔

مصطفیٰ اپنے کمرے میں وی سی آر پر ایک نئی فلم دیکھنے میں مگن تھا۔ قمر کی جانب سے پڑھائی لکھائی کے معاملات میں چھوٹ مل جانے کے عندیے نے اسے قدرے پُرسکون کر دیا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور ملازمہ کی جھلک نے اس کا مزاج برہم کر دیا۔

''کیا بات ہے؟ کیوں آئی ہو؟''

''چھوٹے مالک! آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔''

''کیوں؟'' وہ بدک گیا۔

''وہ بہت بُری حالت میں ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ صبح تک زندہ رہ پائیں گی۔ آپ ان سے ایک مرتبہ مل لیں۔'' ملازمہ نے التجا کی۔

قمر علی دو روز کے لیے شہر گیا ہوا تھا اس لیے زیرِ عتاب ماں سے ملنے میں مصطفیٰ کو کوئی مضائقہ محسوس نہ ہوا۔ اس نے چند لمحے حساب کتاب کیا اور پھر ایک توقف سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں پانچ منٹ تک آتا ہوں۔''

ملازمہ سر جھکائے اُلٹے قدموں لوٹ گئی۔

وہ بے دلی سے ماں کے کمرے میں جا پہنچا۔ کمرے کے وسط میں نواڑ کے ایک پلنگ پر رخسانہ لیٹی تھی۔ ڈھیروں ڈھیر آسائشات کے باوجود وہ اب بھی پرانے وقتوں کی چیزیں سنبھالے بیٹھی تھی۔

اس نے شنیل کی سرخ رضائی کندھوں تک اوڑھ رکھی تھی۔ پلنگ کے دائیں جانب ایک تپائی پر گلاس میں ہلدی ملا دودھ پڑا تھا۔ گلاس کے ساتھ مرہم والی چند ڈبیاں موجود تھیں۔ اس کے چہرے پر بے تحاشا نیل اور زخم تھے۔

اس نے گردن کا رخ ہلکا سا موڑا اور دہلیز پر کھڑے مصطفیٰ کی طرف دیکھا جو نہایت بیزار دکھائی دے رہا تھا۔ رخسانہ نے اسے اشارے سے اپنے قریب آنے کے لیے کہا۔

''تیرا باپ کہاں ہے؟''

''شہر گئے ہیں۔''

''ہونہہ!! جانتی ہوں میں...... کون سے شہر گیا ہے وہ۔''

''مجھے کیوں بلوایا ہے اِدھر؟'' وہ ماں کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا۔

''تجھ سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔'' اس نے زخمی ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تیری حالت ٹھیک نہیں ہے...... یہ باتیں پھر کبھی کر لینا۔''

''نہیں! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے...... میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ آج میں وہ سارا بوجھ اتار دینا چاہتی ہوں۔'' رخسانہ نے یکدم رضائی سے ہاتھ باہر نکالا اور اس کا بازو دبوچ لیا۔

''تو جانتا ہے کہ تیرا باپ کہاں جاتا ہے ہر مہینے؟''

''وہ اپنی فیکٹری کے ملازموں کو تنخواہ دینے اور ان کے حساب کتاب دیکھنے جاتا ہے۔''

''تیرے باپ کی فیکٹری کس چیز کی ہے بھلا؟''

''مچھلیوں کا تیل نکالنے کی۔''

''اور یہ فیکٹری اُسے کیسے ملی بھلا؟''

''دادا نے بنائی تھی۔'' مصطفیٰ اس کسوٹی نما کھیل سے اب بور ہونے لگا تھا۔

''جھوٹ! یہ ساری کہانی جھوٹ ہے۔ تیرا باپ بہت بڑا فراڈ ہے۔ اس کی کہی ہر بات جھوٹی ہے۔''

''تو پھر سچ کیا ہے؟''

''بتاتی ہوں...... سب کچھ بتاتی ہوں۔ آج سچ بتانے کے لیے ہی تو تجھے یہاں بلایا ہے میں نے۔'' وہ بات کرتے ہوئے ہانپنے لگی۔

مصطفیٰ کو اس کے زخمی چہرے، آنکھوں کی چمک سے اب واقعی خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

''تیرا باپ ایک اسمگلر ہے...... لٹیرا ہے...... مجرم ہے وہ۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا...... جھوٹ بولتی ہے تو۔'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ لیکن رخسانہ اس کی آواز سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی ہی لَے میں بولتی چلی جا رہی تھی۔ اگلے آدھے گھنٹے میں اس نے جو انکشافات کیے، وہ کسی فلمی الف لیلہٰ سے کم نہیں تھے۔

فلمیں تو یوں بھی مصطفیٰ کی کمزوری تھیں۔

☆☆☆

قمر علی کا خاندان ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ تھا۔

وہ اپنے والدین کی پانچویں اولاد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد پشتوں سے بنگال کے ایک ایسے ساحلی علاقے کی جھونپڑ پٹی کے رہائشی تھے جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات کا تصور ہی ناپید تھا۔

ہوش سنبھالتے ہی اُس نے اپنے اردگرد دو چیزیں دیکھی تھیں...... غربت اور غلاظت...... اس کی ماں ہر سال کیلنڈر کی طرح ایک نیا بچہ جنم دیتی اور اگلے بچے کے پیدا ہوتے ہی پچھلے کی پرورش و تربیت سے بے گانہ ہو جاتی۔

قمر کو والدین کی پروا تھی نہ محبت۔ سات سال کی عمر میں اس نے گھر چھوڑ دیا۔ جیب کتری سے جرائم کا آغاز کیا۔ اس کے دوست بھی اسی کے قبیلے سے تھے جن کے لیے پیسہ ہی سب کچھ تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ کھلتا گیا۔ بارہ سال کی عمر تک پہنچتے وہ چوری چکاری میں ماہر ہو گیا۔ اس کی زبان و بیان بھی لوفرانہ ہو چکی تھی۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ انہی

دنوں اس علاقے میں ایک سیٹھ کی آمد ہوئی۔ اس کا قیمتی لباس، ہاتھوں میں ہیرے جڑی انگوٹھیاں اور شاہانہ انداز اِن سبھی لونڈے لپاڑوں کے لیے بہت بڑی ترغیب تھی۔

قمر اور اس کے پندرہ سالہ دوست نے اس کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ دونوں اپنی چھوٹی موٹی کامیابیوں کے نشے میں ضرورت سے زیادہ خوداعتماد ہوچکے تھے اس لیے ایک رات سیٹھ کے گھر جا پہنچے۔ گیٹ پر رکھوالی کے لیے صرف ایک چوکیدار موجود تھا جو اپنی بندوق تھامے اونگھنے میں مصروف تھا۔

''دیکھ لے جمن!! کہیں مروانہ دینا!'' قمر نے سرگوشی کی۔

''ابے کچھ نہیں ہوتا یار! اس ایک واردات سے اتنا کما لیں گے کہ سالوں تک کچھ بھی کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔'' جمن نے دلاسا دیا۔

وہ دونوں پچھلی دیوار پھاند کر صحن میں کود گئے۔

یہ ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس تھا جسے اکثر کاروباری حضرات اپنی سہولت کے مطابق کرائے پر حاصل کرلیا کرتے تھے۔ جمن اور قمر دبے قدموں رہائشی کمروں کی طرف بڑھنے لگے۔ خوش قسمتی سے انہیں کوئی بھی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ ایک طویل برآمدے میں رہائشی کمروں کے دروازے موجود تھے جو گرم موسم کی بدولت غیر مقفل تھے۔ وہ اندازے سے آگے بڑھتے رہے اور پہلا دروازہ دھیرے سے کھول دیا۔

سیٹھ اندر ہی موجود تھا۔

بستر پر لیٹے اس کے بھاری بھرکم وجود میں سانس کا زیروبم واضح دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کی مغربی سمت میں موجود کھڑکی کے پٹ کھلے تھے جن سے اندر آتی چاند کی روشنی میں تپائی پر موجود انگوٹھیاں اور کچھ رقم مزید خوابناک دکھائی دے رہی تھیں۔

جمن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کر تپائی کی جانب لپکا۔ اگلے ہی لمحے اس کی کلائی موٹے سیٹھ کی گرفت میں تھی۔

''ابے سالو! مجھے چریا سمجھ رکھا ہے کیا؟ سیٹھ رحیم نام ہے میرا! کل سے تمہارے جیسے دسیوں لونڈے پکڑ چکا ہوں۔'' اس کے انکشاف پر اُن کی سٹی گم ہوگئی۔

سیٹھ رحیم انہیں بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ایک الگ تھلگ کمرے میں لے گیا جہاں انہی کی طرح کئی لڑکے پہلے سے موجود تھے۔ دروازہ مقفل کردینے کے بعد وہ خاموشی سے چلا گیا۔

اپنی اس بہادری پر خود کو جی بھر کر کوس لینے کے بعد وہ ساتھی قیدیوں کے تعارف سے بھی آگاہ ہوچکے تھے۔ لیکن رحیم تو انہیں یہاں بھیجنے کے بعد جیسے بھول ہی گیا تھا۔ تیسرے روز بالآخر دروازہ کھلا اور اس کی صورت نظر آئی۔

''کیسے ہو میرے بہادر بچو؟'' وہ طنزیہ مسکرایا۔ ''بس آج رات تک صبر کرلو...... پھر تمہیں بذریعہ کشتی یہاں سے پار کروادوں گا۔''

''ہمیں چھوڑ دو سیٹھ! غلطی ہوگئی بس۔'' کئی لڑکے رونے لگے تھے۔

''ابے او ہیجڑو! روتے کیوں ہو؟ یہاں رہ کر تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ حالات بہت خراب ہوچکے ہیں۔ کسی بھی وقت قتل وغارت شروع ہوجائے گی۔ میرے ساتھ رہو گے تو کم ازکم زندگی محفوظ رہے گی۔''

''کیسی قتل وغارت؟'' قمر نے بے خوفی سے پوچھا۔

''ملک اس وقت بہت بڑے بحران کی زد میں ہے...... مغربی والوں سے بٹوارا ہونے والا ہے۔''

''نہیں سیٹھ! اپن نے ایسا کچھ نہیں سنا۔ کیونکہ اپن کو جب بھوک لگتی ہے تو پیٹ کی کراہیں اور چیخیں اور کچھ سننے ہی نہیں دیتیں اور نہ ہی کچھ دیکھنے دیتی ہیں۔ ہر چیز میں روٹی دکھائی دیتی ہے اور نوالوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔''

سیٹھ رحیم اسے گہری نظروں سے دیکھتا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا۔

''تجھے نہیں پتا تو میں بتائے دیتا ہوں۔ تیرے بڑوں نے یہ ملک ہندو بنیے سے چھین تو لیا لیکن اسے سنبھال نہیں پائے۔ دونوں بھائیوں میں اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ اب چھوٹے بھائی نے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بڑا بھائی ابھی بھی اسی زعم میں ہے کہ وہ چھوٹے کو رعب دبدبے سے منالے گا لیکن نادان سمجھتا نہیں ہے کہ پانی سر سے اوپر ہوچکا ہے۔ ہندو بنیا بھی پرانے حساب چکتا کرنے چلا آیا ہے۔ مکتی باہنی کے منہ کو خون کی چاٹ لگ چکی ہے۔ ذبح خانوں میں لے جاکر نسلیں اجاڑی جارہی ہیں۔'' اس کی باتیں سن کر وہاں موجود سبھی لڑکوں کے رنگ فق ہوگئے۔ کئی ایک نے تو باقاعدہ رونا شروع کردیا۔

''اجڑنے دو نسلیں! اپن کیا کرے؟ جس نے جو بویا ہے کاٹ لے گا۔ اپن کیا کرے؟'' قمر نے بیزاری سے کہا تو سیٹھ کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔

سیٹھ رحیم بنیادی طور پر انتہائی ہوس پرست، کم ظرف اور مجرمانہ ذہنیت کا حامل شخص تھا۔ وہ پچاس کے پیٹے میں تھا۔

بے ضمیری اور بے حسی اس کی اضافی خوبیاں تھیں۔ بردہ فروشی اس کا پیشہ بن چکی تھی۔ وہ مسائل زدہ علاقوں میں جا کر غیر محسوس طریقے سے اپنی امارت کا جال پھیلاتا اور نادان پنچھی اس جال میں پھنسنے کے لیے بے تابی سے چلے آتے۔

ان پنچھیوں کے پر کترنے کے بعد وہ انہیں ملک کے مختلف حصوں میں ارسال کر دیتا۔ اس کام کے لیے اسے کبھی بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کیونکہ اس کا نیٹ ورک نہایت منظم تھا۔

اس نے قمر اور دو مزید لڑکوں کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا اور پھر آنے والے وقت میں قمر اس کے گروہ کا کامیاب رکن ثابت ہوا۔

☆☆☆

رخسانہ بات کرتے اب شدید ہانپنے لگی تھی۔

اس کے ہونٹ سفید ہو چکے تھے۔ مصطفیٰ اس انکشاف پر دم بخود تھا۔

''جھوٹ بولتی ہے تو! میرے ابو...... اور بھکاری......

نن...... نہیں...... جھوٹ بول رہی ہے تو۔'' وہ چلّایا۔

''یہ سچ ہے۔ وہ پیشہ ور بھکاری تھا...... میں بھی بھکارن تھی...... ہم نے شادی کر لی...... سن اتنی کی بات ہے......'' اس کے الفاظ بکھرنے لگے تھے۔

''پھر...... پھر کیا ہوا؟ یہ فیکٹری...... یہ عیش کیسے ملے تم لوگوں کو؟'' اس نے ماں کو جھنجھوڑ دیا لیکن اب وہ بولنے کے قابل نہ رہی تھی۔

اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ مصطفیٰ کو ماں کے مرنے کا دکھ تھا نہ ہی افسوس۔ وہ ایک گہرے صدمے میں مبتلا ہو چکا تھا۔ شاہانہ زندگی، حکمرانی کا نشہ، کروفر اور احساسِ برتری اب شدید کراہت میں ڈھلنے لگے۔ اسے والدین اور پھر اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔

قمر نے واپسی کے بعد رسمی سے انداز میں بیوی کی تدفین کر دی اور ایک بار پھر معمولات زندگی کی طرف مائل ہو گیا۔ بیوی کا کانٹا نکلتے ہی وہ بہت پُر سکون ہو گیا تھا لیکن اسے علم ہی نہ تھا کہ مصطفیٰ نامی آسیب اس کے تعاقب میں ہے اور اسے ہر قیمت پر کھوجنا چاہتا ہے۔

اور پھر بہت جلد اسے ایک موقع میسر آ گیا۔

☆☆☆

رخسانہ کے بعد قمر علی اپنے کچھ معاملات میں بے پروا ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے چند خصوصی مہمانوں کو گھر ہی بلانا شروع کر دیا تھا۔ مصطفیٰ کے لیے یہ بہت مثبت اور حوصلہ افزا بات تھی۔ ان مہمانوں کی وضع قطع میں اسے ایک اسرار پوشیدہ نظر آتا تھا۔ ان کے چہرے مہرے، چال ڈھال اور لباس مقامی ہی ہوتا تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں انہیں دیکھ کر ایک نامعلوم سی اجنبیت کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ ان کے چہرے قدرے روکھے پھیکے اور بے رونق لگتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں میں ایک عجیب سی سرخی جھلکتی دکھائی دیتی۔ لباس سے بہترین خوشبو پھوٹتی لیکن پھر بھی جانے کیوں ایک ناگوار سی مہک بھی محسوس ہوتی تھی۔

تجسّس تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ رخسانہ کی موت کے چھ ماہ بعد وہ اپنے مشن میں جزوی طور پر کامیاب ہو گیا۔

وہ گرما کی ایک ٹھنڈک بھری شام تھی۔ صبح سے آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سہ پہر کے بعد بارش نے اپنا کھیل کھل کر کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ حویلی کے احاطے میں ایک شاندار گاڑی داخل ہوئی۔ مصطفیٰ اس وقت اپنے کمرے کی قدِ آدم کھڑکی سے بارش کا رقص دیکھنے میں مگن تھا۔ اس کی حسیات اب گاڑی کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

ایک خصوصی ملازم نے فوری طور پر چھتری تانی اور دروازہ کھول کر مہمان کے سر پر تانے اسے اندر لے آیا۔ اسے قمر علی کی جانب سے پہلے ہی ہدایات مل چکی تھیں۔ وہ ایک حسین اور طرح دار عورت تھی۔ اس کا لباس قیمتی اور انداز قاتلانہ تھا۔ شفاف دودھیا رنگت میں گلابیاں گھلی تھیں۔

حساس لوگ

دیوبند کے مولانا سید اصغر حسین نے بڑی حساس طبیعت پائی تھی۔ ان کا ایک کچا مکان تھا جس کی ہر برسات سے پہلے لپائی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اپنا مکان پختہ کیوں نہیں کروا لیتے تاکہ ہر سال کی تکلیف سے نجات مل جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ واقعی آپ صاحبان کی یہ رائے نہایت معقول ہے، پھر کچھ دیر خاموش رہے اور آہستہ سے بولے:

''میں جس محلے میں رہتا ہوں، اس میں سارے مکان کچے ہیں۔ اگر میں اپنا مکان پختہ کراتا ہوں تو غریبوں کو اپنی ناداری کا احساس اور شدید ہو جائے گا اور میں یہ نہیں چاہتا۔''

اور مولانا نے اس وقت تک اپنا مکان پختہ نہیں کرایا جب تک کہ آس پاس کے تمام مکانات پختہ نہ ہو گئے۔

مرسلہ: پرویز اقبال، کراچی

تمکنت اور وقار اس کے انگ انگ سے جھلک رہا تھا۔ ملازم اسے اپنی معیت میں مہمان خانے کی جانب لے گیا۔

یہ مہمان خانہ رہائشی عمارت سے الگ تھلگ بنا تھا۔ شام کے سائے اب گہرے ہونے لگے تھے۔ مصطفیٰ نے اپنے ذہن میں ایک فوری حکمتِ عملی تیار کرلی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں اسی رات سے ایک کھلبلی مچی تھی۔ رخسانہ کی ادھوری باتوں کے بعد چند نتائج اس نے ازخود اخذ کرلیے تھے۔

شادی کے چند سالوں میں ایسا کیا ہوا تھا کہ قمر علی کی قسمت ہی بدل گئی۔ اس کی شادی بھی یقیناً بہت جلد ہوگئی تھی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ شاید رخسانہ نے اپنی اہانت اور اس تشدد کا بدلہ لینے کے لیے دانستہ طور پر باپ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہو لیکن جب ماں کی مذہب پرستی یاد آتی تو یہ خیال شدت اختیار کرنے لگتا کہ وقتِ نزع وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتی تھی۔

اسی گومگو کی کیفیت میں اندھیرا اپنے پَر پھیلانے لگا تو وہ اپنے کمرے سے نکلا اور دبے قدموں مہمان خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازہ مقفل تھا۔ عقبی جانب کھڑکی پر دبیز پردے موجود تھے لیکن شومئی قسمت اس وقت موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہ صرف پردے سرکے ہوئے تھے بلکہ دروازہ بھی نیم وا تھا۔ اندرونی منظر اس کے سامنے مکمل عیاں تھا۔ قمر اور نئے مہمان کی داہنی سمت وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

اس طرح دار خاتون نے اپنی قیمتی شال ایک جانب رکھی ہوئی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر شراب کی بوتل کھلی تھی۔ سنہری محلول بلوریں گلاس میں بھی جھلک دکھا رہا تھا۔ قمر نثار ہوجانے والی نظروں سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ مصطفیٰ نے ایسی نگاہوں سے فلموں کے ہیروز کو کسی نہ کسی ہیروئن کو تکتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے یہ 'انداز' اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

''یہ تو کسی بھی ہیروئن سے زیادہ خوبصورت ہے۔'' اس نے دل میں اعتراف کیا اور ذرا دبک کر سراپا سماعت بن گیا۔

''تم نے ابھی تک میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' قمر کی بھاری آواز سے اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس کی آمد سے قبل بھی اسی شغل میں مصروف تھا۔

''ہم نے بہت سوچا ہے اس بات کے متعلق...... لیکن پھر ایک پوائنٹ پر پہنچ کر فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔'' وہ عورت ایک ادا سے بولی۔

''تم اپنی ہر سوچ کھل کر مجھے بتاسکتی ہو۔''

''دیکھیے ناں! ہم تو اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے عیاں کرچکے ہیں لیکن آپ نے ابھی تک ہمیں غیر ہی سمجھا ہے۔''

''نہیں! بالکل بھی تو نہیں...... تم نے ایسا کیسے سوچ لیا بھلا؟''

''تو پھر بتایئے ناں کچھ اپنے بارے میں! آپ تو اب بھی اتنے ہینڈسم ہیں۔ بالکل ینگ لگتے ہیں...... پھر شادی کیسے اور کن حالات میں ہوئی؟'' اس نے نامحسوس طریقے سے شال کے نیچے کسی چیز کو حرکت دی۔

''شادی بہت عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔'' قمر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانا شروع کیا۔ مصطفیٰ مزید متوجہ ہوگیا۔

''سیٹھ رحیم کے ساتھ میں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ اس نے مجھے پیشہ ورانہ زندگی کے سبھی گُر سکھا دیے۔ پھر میں گداگری کی آڑ میں گاڑیوں میں رکھے بیگ، رقم اور پُرزے چوری کرنے لگا۔ تھوڑا وقت اور گزرا تو میرے قد کاٹھ کی وجہ سے 'فیلڈ' میں کام کرنا ممکن نہ رہا۔ سیٹھ نے مجھے لڑائی بھڑائی کی تربیت دے کر ایک چھوٹی سی کھیپ کا انچارج بنا دیا۔ میں ان سے سارا دن کی کمائی اکٹھی کرتا اور 'روٹ' پر ان کا دھیان رکھتا۔ زندگی بہت دھانسو گزر رہی تھی لیکن پھر ایک غلطی نے رخسانہ کو میرے گلے کا ڈھول بنا دیا۔''

''اوہ...... ویری سیڈ! کون سی غلطی؟''

''وہ بھی اسی کھیپ میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ بھی چند لڑکیاں اور تھیں۔ میرے ایک اشارے پر کوئی بھی لڑکی کھنچی چلی آتی۔ اس کم بخت کی خوبصورتی نے میری عقل پر پردے ڈال دیے۔ پہلے پہل تو نخرے دکھاتی رہی پھر راضی ہوگئی اور میں اسے لیے ایک ہوٹل میں پہنچ گیا...... بس میری قسمت خراب تھی کہ اس روز وہاں پولیس کا چھاپا پڑ گیا۔ ان دنوں حکومت نے بھی بڑی سختی کی ہوئی تھی۔ حدود کے کیس کی سزا سے بچنا بہت مشکل ہوتا تھا لیکن یہاں سیٹھ نے اپنے تعلقات استعمال کیے۔ اس نے ایمرجنسی میں ہم دونوں کا پچھلی تاریخوں میں نکاح نامہ بنوایا اور کسی بھی طرح یہ معاملہ رفع دفع کیا۔ تھانے سے تو خلاصی ہوگئی لیکن رخسانہ نے ضد پکڑلی۔ وہ پہلے ہی شادی کی نیت سے میری طرف آئی تھی۔ مجبوراً اس سے شادی کرنی پڑی۔''

''تو اسے آف کردیتے...... یہ کوئی اتنا بڑا ایشو تو نہیں تھا۔''

''تب میں بھی اتنا 'سمجھدار' کہاں تھا جانِ من؟ یہ تو میرے دوستوں کی مہربانی تھی جو میں اپنی اصل قوت پہچان

گیا۔'' قمر کے ذومعنی انداز پر سونیا نے ایک دلبرانہ قہقہہ لگایا۔
''پھر سیٹھ رحیم کے انتقال کے بعد اس کی اولاد سب کچھ سمیٹ کر امریکا چلی گئی۔ میں نے اپنی جمع پونجی سے اس کا یہ گھر خرید لیا۔'' اس نے مزید انکشاف کیا۔
''زبردست...... لیکن یہ گھر تو بہت شاندار ہے۔ کیا اتنی قوتِ خرید تھی تمہاری؟'' سونیا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔
''نہیں! بچپن ایک تنگ و تاریک کھولی میں گزرا اور تبھی سے اپنا گھر بنانے کی خواہش دل میں موجود تھی۔ اس وقت یہ ایک عام سی حویلی تھی بس۔ جلد بازی میں اسے خرید تو لیا لیکن بعد میں خود دیوالیا ہو گیا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا جب میں اپنا سابقہ پیشہ اختیار کرنے کا سوچنے لگا۔ میں آج بھی خواری میں مبتلا ہوتا اگر چودھری صاحب سے میری ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔'' قمر کی نشے سے بوجھل مشین کی طرح چلتی زبان نے مصطفیٰ کے تمام سوالات کے تشفی جواب دے دیے تھے۔
وہ دم سادھے اس کے انکشافات کی رو میں بہتا چودھری نامی شخص کے پاس جا پہنچا جو کئی روز سے اسے اپنی نظر میں رکھے ہوئے تھا۔
''کیا بات ہے، بہت پریشان معلوم ہوتے ہو؟ سیٹھ رحیم کی زندگی میں تو تمہارے ٹشن ہی اور تھے۔''
''اپن کو کام کی تلاش ہے۔''
''اور مجھے ایک جی دار بندے کی۔'' چودھری نے معنی خیزی سے کہا۔
''کرنا کیا ہے؟''
''ایک پیکٹ مطلوبہ بندے تک پہنچانا ہے۔''
''دام کتنے دوگے؟''
''تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''
''روکڑا آدھا ایڈوانس لوں گا۔''
''پہلی ڈلیوری پر لے لینا...... لیکن پولیس سے بچنا تمہاری ذمے داری ہوگی۔''
''نہیں دھوکا دینا اپن کو بچپن سے آتا ہے۔'' قمر نے اعتماد سے کہا۔
اس کے بعد پیکٹس کی ترسیل کا کام باقاعدگی سے جاری ہو گیا۔ قمر نے عقلمندی اور دوراندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیسے بچانے شروع کر دیے لیکن مطلوبہ عیش و آرام اب بھی کسی خواب کے مانند تھے۔
چودھری کے ساتھ کام کرتے ہوئے تین سال بیت گئے۔ اس دوران میں مصطفیٰ کی پیدائش ہو چکی تھی۔ قمر اب بھی اپنے مالی حالات سے مطمئن نہ تھا۔ وہ ستاروں پر کمند ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کی کارکردگی بہرحال نکھرتی جا رہی تھی اور چودھری کے ذریعے 'اعلیٰ انتظامیہ' تک بھی پہنچ چکی تھی۔ انہی کی ہدایات کے بموجب اسے ایک روز خصوصی طور پر طلب کیا گیا۔ چودھری اس کے ساتھ ہی موجود تھا۔
''تیری کارکردگی نے سردار صاحب کو بہت متاثر کیا ہے۔ سچے نگینے وہ خاص اپنی ماتحتی میں رکھتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔
''اپن کو روکڑے سے غرض ہے۔۔ چاہے جو مرضی دے۔''
سردار نامی وہ شخص بہت متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا لباس قیمتی تھا۔ گہرا سانولا رنگ اور بھاری بھرکم چہرہ سفاکی کا تاثر بھی دیتا۔ اس نے ملاقات کے لیے ایک پبلک پارک کا انتخاب کیا تھا اور وہاں پہنچنے پر چودھری کو واپس بھیج دیا۔
''قمر علی! میں زیادہ گھما پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں۔۔ تمہاری کارکردگی پہلے دن سے ہی میری نظروں میں تھی۔ تم نے اب تک خود کو مکمل طور پر ہمارا وفادار ثابت کیا ہے۔ اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں 'ترقی' دے دی جائے۔''
''اپن تیار ہے سیٹھ!''
''سب سے پہلے تمہیں اپنی زبان بدلنی ہوگی۔''
''کیا سیٹھ؟ ابھی تو کام چالو بھی نہیں کیا اور تو نے پابندیاں لگانی شروع کر دیں۔''
''جس دن تم میری رمز سمجھ جاؤ گے اس دن یہاں میری جگہ بیٹھے ہوگے...... میرے ساتھ کام کروگے تو تمہاری نسلیں سنوار دوں گا۔''
''ٹھیک ہے...... منظور ہے اپن کو...... بتا کرنا کیا ہے؟''
''تجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ پیار کس سے ہے؟'' سردار نے اچانک کہا۔
''روکڑے سے۔''
''تیرا مذہب کیا ہے؟''
''جب کھولی چھوڑی تھی تو مذہب اور قومیت سب کچھ وہیں اچ چھوڑ آیا تھا...... روکڑا ہی میرا مذہب ہے۔''
''اس ملک سے تیری وفاداری کیسی ہے؟''
''کون سا ملک اور کیسا ملک سیٹھ؟ میرا ملک تو بچپن اچ میں کھو گیا تھا...... میں تو اِدھر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا

ہوں۔"

"کیا تم اپنے ماں باپ، بچپن، یار دوست چھن جانے کا بدلہ نہیں لو گے؟"

"بدلہ طاقت سے لیا جاتا ہے سیٹھ!"

"طاقت میں تمہیں دوں گا......"

"تو پھر اپن یہاں رہنے والوں کے لیے قہر بن جائے گا۔"

سردار کے چہرے اور آنکھوں میں ایک انوکھی چمک پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد قمر علی کی خصوصی تربیت کا آغاز ہو گیا۔ زبان، رنگ ڈھنگ، لباس سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ اسے انڈسٹریل ایریا میں ایک فیکٹری خرید دی گئی۔ اس تبدیلی کے بعد اصل کام شروع ہو گیا۔

وہ پڑوسی ملک کا کارندہ تھا۔ ساحلی علاقے سے منشیات لا کر مقامی نوجوانوں میں پھیلائی جاتی تھیں۔ قمر اپنی حویلی ہی کے باعث ان کی نظروں میں آیا تھا۔ انہیں علم تھا کہ ایسی عمارتوں میں تہ خانہ کی موجودگی لازم جزو ہوتی ہے۔ اس کی وفاداری کے بعد 'ترقی' ایک طے شدہ امر تھی۔ فیکٹری ایک بہترین آڑ تھی۔ سیٹھ کا نیٹ ورک بہت بڑا تھا۔ سمندری حدود سے مچھلیوں اور دیگر آبی مخلوق کے مردہ جسم میں ڈرگز لائی جاتیں اور فیکٹری میں محفوظ کر لی جاتیں۔

سیٹھ اس پر بہت مہربان تھا۔ وہ آئے روز شراب و شباب کی محفلیں منعقد کرواتا۔ پڑوسی ملک سے اس کے دوست بھی اس محفل میں شریک ہوتے۔ بظاہر وہ کسی نہ کسی مہذب پیشے سے ہی منسلک ہوتے تھے۔ یہیں اس کی ملاقات سونیا سے ہوئی۔ وہ گلیمر کی دنیا کی ایک تتلی تھی جس کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ وہ فلمی دنیا میں بھی قدم رکھ چکی ہے۔ قمر اسے دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور شادی کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔

آج سونیا اسی سلسلے میں یہاں موجود تھی۔

☆☆☆

ان سنسنی خیز انکشافات پر مصطفیٰ کے بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔

رخسانہ کی موت کے بعد وہ پنڈولم کی طرح جس کیفیت میں جھول رہا تھا، آج قمر نے خود ہی اس پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔ اُسے باپ پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔ سونے پہ سہاگا سونیا کے سامنے بھی ماضی کے اعترافات نے مزید برگشتہ کر دیا۔

"اب یہ اٹھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مارے گی اور ماضی کا طعنہ دے کر چلتی بنے گی۔ پھر سارے زمانے میں ہماری اصلیت کے اشتہار لگاتی پھرے گی۔" اس نے اپنی محدود عقل کے مطابق سوچا۔

لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سونیا اٹھلاتی ہوئی اس کے پاس گئی اور ایک ادا ... سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"ہم تو آپ کی اسٹرگل اور صاف گوئی کے مرید ہو گئے سرکار!! آپ واقعی ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ ماضی میں جو ہوا اسے دہرانے سے کیا فائدہ؟ اپنے مستقبل کو محفوظ بنائیے بس!"

مصطفیٰ کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اسٹرگل اور سیلف میڈ کس چڑیا کے نام ہیں۔ اس کا دل سونیا کے قدموں سے لپٹنے لگا کیونکہ اس نے ماضی کو 'بیکار' قرار دیا تھا۔

"تو کیا تم راضی ہو؟" قمر نے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کر دیا۔

"آپ کو کون کافر انکار کر سکتا ہے سرکار؟ ہم تو پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئے تھے لیکن میں اپنا مذہب نہیں بدلوں گی۔"

"مذہب کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔"

"آپ کو میرے کچھ خواب بھی پورے کرنے ہوں گے۔"

"حکم کرو جانِ من!"

"اپنا بزنس مزید پھیلائیے......بہتی گنگا میں سبھی ہاتھ دھونے میں مصروف ہیں تو پھر آپ کیوں نہیں؟"

"کھل کر بات کرو......کیا کہنا چاہتی ہو؟" قمر کی آواز بوجھل ہونے لگی۔

سونیا دھیرے دھیرے اُسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگی۔ مصطفیٰ کی دلچسپی اب اس ملاقات میں ختم ہو گئی۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔ رخسانہ کا متبادل سونیا اُسے غیر مشروط طور پر قبول تھی۔

☆☆☆

پانچ سال کا عرصہ بیت گیا۔

سونیا اب گھریلو معاملات پر مکمل حاوی تھی۔ قمر تو پہلے ہی اس کی مٹھی میں تھا۔ بلاچون وچرا اس کی ہر بات تسلیم کرتا۔ اس رات کے انکشافات کے بعد بھی مصطفیٰ نے اپنے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ان دونوں کی کھوج میں رہتا اس لیے اکثر ان کے پوشیدہ معاملات سے 'باعلم' ہو جایا کرتا تھا۔

قمر کی آڑ میں کھیلا جانے والا کھیل اب اُسے زیادہ بہتر طور پر سمجھ آنے لگا تھا۔ سونیا نے جعلی کاغذاتِ نامزدگی جمع کروانے کے بعد ایک سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کروا دی۔ علاقے پر اس کا دباؤ پہلے بھی کم نہ تھا۔ اب تو وہ اَن داتا بن چکا تھا۔ سونیا مصطفیٰ پر بھی خصوصی توجہ دیتی تھی۔ حیرن کن بات تو یہ تھی کہ ماضی میں رخسانہ کو وحشیانہ زدوکوب کرنے والا قمر اب سونیا کے سامنے بالکل بھیگی بلی تھا۔

آغاز میں اس نے مصطفیٰ کی پڑھائی پر خاصی ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''کیا ضرورت ہے اس جنجال میں پڑنے کی؟ میں بھی تو چٹا اَن پڑھ ہوں لیکن آج کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔''

''آپ کو اس کہاں سے کہاں پہنچانے کے سفر میں کس کا ہاتھ ہے؟ میرا...... میرے مشوروں پر عمل نہ کرتے تو زندگی کی ریس میں کب کے کچلے گئے ہوتے۔''

''لیکن اس کے باپ کا کاروبار ہے...... سنبھال لے گا...... پڑھا لکھا کر کون سی افسری کروانی ہے؟''

''زمانہ بدل رہا ہے قمر صاحب! اب ایسی سوچ کے ساتھ گزارا ممکن نہیں۔ آپ نے تو اسے بالکل ہی ڈل بنا رکھا ہے۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے لیکن اے۔ بی۔ سی تک نہیں جانتا۔ اس پر بہت محنت کی ضرورت ہے۔ مستقبل میں یہ آپ کے کاروبار کی 'سپورٹ' کیسے بنے گا یہ مجھ پر چھوڑ دیں...... بھروسا رکھیں مجھ پر۔ ہم اپنے فیصلوں میں بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! جیسا تم مناسب سمجھو!'' قمر اس کے سامنے بالکل بھی مزاحمت نہیں کر پاتا تھا۔

اس کے بعد وہ ہر شام مصطفیٰ کو اپنی نگرانی میں پڑھانے لگی۔ لیکن اسے انگریزی سمجھ آ کے ہی نہ دیتی۔ وہ سیکھنے کے معاملے میں بہت غبی اور کند ذہن تھا۔

''اس کی رفتار سے میں بہت عاجز آ چکی ہوں! یہ بالکل کوآپریٹ نہیں کرتا۔'' ایک روز اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہوا تو قمر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

مصطفیٰ اس کے تیور دیکھ کر خائف ہونے لگا کیونکہ جانتا تھا کہ مقابل رخسانہ نہیں بلکہ سونیا ہے جو اس پورے گھر کی حکمران ہے۔

''علاقے کے باقی بچے بھی تو تعلیم سے کورے ہیں...... کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟'' قمر نے بے پروائی سے کہا۔

''فرق پڑتا ہے قمر علی! بالکل فرق پڑتا ہے...... وہ تعلیم سے کورے ہیں کیونکہ انہیں ہم نے ایسا رکھا ہے...... ہمیں ان پر حکمرانی کرنی ہے...... لیکن یہ اُن سے مختلف ہے...... یہ صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر کی اولاد ہے...... اسے اُن غیر تعلیم یافتہ افراد پر حکمرانی کرنی ہے...... کوئی تو فرق ہو حاکم اور محکوم میں...... اگر تم دونوں اب بھی سنجیدہ نہ ہوئے تو ہاتھ میں کٹورا لے کر بھیک مانگنے نکل جانا...... ابھی سے پریکٹس شروع کر دو تو بہتر ہے کل کلاں کو بھی تو یہی نوبت لانے والے ہو تم باپ بیٹا!'' وہ سرد مہری سے کہتی چلی گئی۔

ان دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔

''میں آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' مصطفیٰ نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی زبان و بیان اور شخصیت گروم کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ گزارا ایک سال تمہارے ایجوکیشن سسٹم کے تین سالوں سے بہتر ہو گا۔'' وہ تکبّر سے بولی۔

''میں اسکول نہیں جانا چاہتا۔'' اس نے اپنے خدشات بیان کیے۔

''فائن! اس کی تمہیں ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ مین سبجیکٹس میں خود ہی گھر میں پڑھایا کروں گی۔ قمر ایک مخصوص ادارے میں انرولمنٹ درج کروادیں گے اور کاغذات کے مطابق تم ہر سال کامیاب ٹھہرتے جاؤ گے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' قمر نے بھی فوری تائید کی تو سونیا نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔

وہ خود بھی فی الوقت اسے کسی تعلیمی ادارے میں بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ وہ اسے اسی طریقے سے پروان چڑھانا چاہتی تھی جس 'کارِخیر' کے لیے وہ یہاں اپنے افسران کی جانب سے تعینات کی گئی تھی۔

سونیا.... ایک ایسی خفیہ ایجنسی کی قابل اور بااعتماد 'فیلڈ ورکر' تھی جو اس ساحلی علاقے میں منشیات کے بعد اب 'اسلحہ سازی' کا ایک محفوظ نیٹ ورک قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ایک بدنام ماضی کے حامل شخص کو ٹریپ کرنے کے بعد اپنی بااعتماد ورکر کو اس کے گھر پہنچانا 'صوبائی اسمبلی سے قومی اسمبلی کا سفر طے کروانا' علاقے کا ڈان بنا کر ایک مکمل نسل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا ان کی 'لانگ ٹرم پلاننگ' تھی جس کے ثمرات انہیں اس ملک میں دہشت گردی' بدامنی' انتشار اور جہالت کی صورت میں برآمد ہوتے۔ تاخیر اور انتظار ان کے لیے ثانوی اہمیت رکھتے تھے کیونکہ مرکزی اہمیت تو بہر حال اس نفرت اور انتقام کی تھی جس کے باعث وہ کئی عشروں سے اس ملک کی جڑیں کاٹنے

میں مصروف تھے۔

سونیا گزشتہ پانچ سال کی کڑی محنت کے بعد اس قابل ہوئی تھی کہ اُسے ہجے کروا کے الفاظ کے تلفظ کی ادائیگی سکھا سکے۔ دھیرے دھیرے مصطفیٰ ٹریک پر آنے لگا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں غیر ملکی زبان کی ادائیگی کر لیا کرتا تھا۔

اسی کے ساتھ سونیا نے اسے قومی اقدار سے متنفر کرنے کے مشن پر بھی بھرپور توجہ کر رکھی تھی۔ اسے علم تھا کہ مصطفیٰ کا ذہن 'صاف سلیٹ' کے مانند ہے اس لیے ابھی سے اس پر جو نقش واضح کر دیے جائیں گے' تاعمر اَن مٹ ثابت ہوں گے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے پڑھائی کے دوران اسے اکثر بتایا کرتی کہ ان کے آباؤ اجداد نے علیٰحدہ ملک حاصل کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اس ملک کو سنبھال پانا ان کے اختیار سے باہر تھا۔

اس کے علاوہ وہ مصطفیٰ کو اخلاقی طور پر دیوالیا بنانے میں بھی بھرپور توجہ دینے لگی تھی۔ سونیا کی جانب سے برین واشنگ کے بعد اب مار دھاڑ اور مخصوص نظریات پر مبنی فلمیں قومی حمیّت سے مزید دور کرتی چلی گئیں۔ اسکول جانے کی کبھی نوبت ہی پیش نہ آئی تھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق وہ ایک تعلیمی ادارے کا باقاعدہ حصہ تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ سونیا ہی اس کی درس گاہ اور اتالیق تھی۔

وہ اپنا زہر مکمل طور پر اُن باپ بیٹے کے ذہن میں انڈیل چکی تھی۔ وہ اسی کے دماغ سے سوچتے اور اسی کی آنکھوں سے سب دیکھتے تھے۔

☆☆☆

سونیا اپنی کارکردگی سے صد فیصد مطمئن تھی۔

وہ انتہائی زیرک اور منجھی ہوئی آلہ کار تھی۔ اس کے صائب مشوروں کی بدولت قمر علی صوبائی حکومت کی ناک کا بال بن چکا تھا۔ گزشتہ چند سالوں میں ملک میں تین حکومتیں تبدیل ہوئی تھیں۔ قمر علی کی وفاداری ہر نئی حکومت سے وابستہ ہو جاتی۔ وہ اپنے اختیارات کا مکمل فائدہ اٹھاتا۔

سونیا ہی کے مشورے سے اس نے اپنی حویلی میں مہمان خانہ کے نیچے خفیہ طور پر ایک گودام بنوایا۔ اس کے بعد قمر کی ملاقات اسلحے کے ڈیلر سے کروائی گئی۔ اصل میں یہ ملاقات پہلے ہی سے طے شدہ تھی۔ سونیا 'احتیاطاً' قمر کے ساتھ ہی تھی۔

''ہم اس فیلڈ میں نئے بندے پر کم ہی اعتماد کرتے ہیں۔'' بہترین تھری پیس سوٹ میں ملبوس اس شخص نے رعونت سے کہا۔

''ہم سے بہترین پارٹنر آپ کو کہیں نہیں ملے گا.....''

سونیا بااعتماد تھی کیونکہ اس کے 'بڑے' ان معاملات کو پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

تھوڑے سے بحث و مباحثے کے بعد ڈیل طے پا گئی۔

حویلی کے علاوہ فیکٹری میں بھی گودام اس مقصد کے لیے تیار تھے۔ قمر علی کی اب پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ اس نے سونیا ہی کے مشورے سے غیر ملکی بینکوں میں بینک اکاؤنٹس کھلوائے۔ مختلف جائدادیں خریدی گئیں۔

اب وہ نہایت ہوشیاری سے اپنے منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کرنے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

حویلی کے دیوانِ عام میں کچھ پریشان حال بوڑھے افراد اور نوجوان اپنا مسئلہ لے کر آئے تھے۔

''سرکار!! ہم بہت پریشان ہو کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہماری مدد کیجیے۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

''میں تم لوگوں کی مدد اور خدمت ہی کے لیے ... یہاں بیٹھا ہوں...... بولو! کیا مسئلہ ہے؟'' قمر نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''علاقے میں ڈاکے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ آئے روز ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں اسلحے کے بل پر اٹھا لی جاتی ہیں۔ ہم بے بس کچھ بھی نہیں کر پاتے۔'' اسی ادھیڑ عمر نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اگر یہی حال رہا تو ہم بھی ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' ایک نوجوان جوشیلے انداز میں بولا۔

''میں تمہارا درد سمجھ سکتا ہوں میرے بھائیو!''

''تو سرکار! کوئی حل بھی تو بتایئے۔'' وہ بے حد آزردہ تھے۔

''مقامی پولیس سے بات کی تم لوگوں نے؟'' قمر نے ایک توقف سے پوچھا۔

''سب کچھ کر چکے ہیں سرکار! لیکن غریبوں کی کون سنتا ہے؟ وہ تو خود ان لٹیروں سے باقاعدہ حصہ وصول کرتے ہیں۔''

''تو پھر اس کا ایک ہی حل ہے لیکن تھوڑا ٹیڑھا ہے۔'' قمر نے گہری سانس لی۔

''آپ بتایئے سرکار! ہم ہر مشکل سہنے کے لیے تیار ہیں۔'' ایک اور نوجوان نے چہرے پر سرخی لیے کہا۔ دو روز قبل جوان بہن اور نو بیاہتا بیوی کے اغوا نے اسے آتش فشاں بنا دیا تھا۔

''اپنی مدد آپ کرو...... ہتھیار خریدو ۔ اپنے گھروں کی حفاظت خود کرو۔ گھروں میں ہتھیار رکھو گے تو کوئی مائی کا لعل تمہیں میلی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔'' قمر نے نرم لیکن مضبوط لہجے میں انہیں ایک نئی راہ دکھائی۔

''لیکن ہمیں یہ ہتھیار کہاں سے ملیں گے؟ اور اسے چلانا کیسے سیکھیں گے؟'' اسی نوجوان نے نیم رضا مندی سے پوچھا۔ ناخواندگی اور شعور سے محرومی یہ حقیقت جاننے سے قاصر تھی کہ ان کی بہو بیٹیوں کے اصل مجرم انہی کے سامنے موجود ہیں۔

''میں اس کا بندوبست کروا دوں گا اور رہی بات استعمال کی، تو میرے سکیورٹی گارڈز یہ کام بھی کر دیں گے۔ عوام کی خدمت سے بڑھ کر تو میرے لیے کچھ بھی نہیں۔'' قمر کی دردمندی سے متاثرین اس کے مزید معتقد ہو گئے۔ وہ اپنا وجود گروی رکھ کر بھی ہتھیار خریدنے کے لیے تیار تھے۔ آتشِ انتقام نے ان کے سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیت بھی ختم کر دی تھی۔

☆☆☆

ملک میں ان دنوں ایک آمر کی حکومت تھی۔

اندرونِ خانہ لاقانونیت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہتھیاروں کی آسان فراہمی اور استعمال نے عوام میں تشدد کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔ انہیں اپنے مسائل سے نمٹنے کا ایک نیا طریقہ آ گیا۔ قانون بے بس تھا اور عوام اپنے نئے مشغلے میں مگن۔

سونیا اور اس کا نیٹ ورک اس صورتِ حال سے پوری طرح خوش اور مطمئن تھا۔ انہوں نے اپنی 'لانگ ٹرم پلاننگ' کے ساٹھ فیصد نتائج حاصل کر لیے تھے اور اب باقی ماندہ کامیابی کے لیے شطرنج پر ایک نئی بازی جما دی گئی تھی۔

سونیا کا اگلا ٹارگٹ مصطفیٰ تھا۔ اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ تا حال سیکھنے کے مراحل میں مطلوبہ ہدف تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود وہ بلاتکان اپنی محنت جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ اپنے اس مشن کو کسی فریضہ عبادت کی طرح سرانجام دے رہی تھی۔ قمر کے بعد مصطفیٰ بھی مکمل طور پر اس کے ٹرانس میں تھا۔ وہ قمر علی کے کاروبار سے آگاہ تھا اور مستقبل میں اسے تقویت پہنچانے کے لیے مکمل تیار بھی۔

اسی دوران مصطفیٰ کو سگریٹ کی اچھی خاصی لت لگ گئی۔ حلقۂ احباب مزید بڑھا تو شراب اور شباب کی علتیں بھی پیدا ہو گئیں۔ دولت ہاتھ کا میل تھی۔ دوستوں پر بے دریغ لٹاتا۔ اپنے ہم مزاج افراد کے ساتھ مختلف تفریحی منصوبوں کے علاوہ دوسرے شہروں میں سیاحت کے دورے بھی جاری رہتے۔ ایڈونچر کے مرض میں مبتلا یہ نوجوان مختلف نوعیت کی منشیات بھی استعمال کرتے تھے۔ مصطفیٰ کے لیے ان کی ترسیل تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس نے سونیا کی ہدایات کے مطابق دھیرے دھیرے اپنے تعلیمی ادارے میں 'طلب و رسد' کے اصول پر کام کرنا شروع کر دیا تھا تاہم احتیاط ابھی پہلی ترجیح تھی۔

زندگی کیف و سُرور کا ایک مکمل نمونہ تھی۔

☆☆☆

مصطفیٰ کو مجموعی ملکی صورتِ حال سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کی زندگی میں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ سونیا اس پر پہلے کی نسبت مزید مہربان ہو چکی تھی۔ عیش و طرب کی رُت نے ذہنی کیفیت کو ایک نقطے پر مرکوز کر رکھا تھا۔

سونیا اس کے مستقبل کی بابت خاصی فکرمند رہتی۔ اکثر ان کی بات چیت کا محور مصطفیٰ کی پیشہ ورانہ زندگی ہی ہوا کرتا تھا۔

''تمہیں اب اپنی کوئی پہچان بنانی چاہیے طفی!''

''لگی بندھی نوکری میں کیونکر کروں بھئی؟ ؟ قمر علی کی اولادہوں میں...... اسی کی گدی سنبھالوں گا ناں!''

''لیکن میں نے تمہارے لیے کچھ اور سوچا ہے۔'' سونیا نے متانت سے کہا۔ ''ذرا سوچ کے بتاؤ کہ تم اپنی کون سی خواہش تا حال تشنہ سمجھتے ہو؟''

مصطفیٰ نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر چہکتے ہوئے بولا ...''مجھے بہتا ہوا لہو بہت پسند ہے...... میں زندگی اور موت کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں۔''

''ایسا ممکن ہو سکتا ہے!'' وہ معنی خیزی سے بولی۔

سونیا اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ یا کسی حساس ادارے میں تعینات کروانا چاہتی تھی تاکہ ایک اور قومی ادارے کی نبض اپنے ہاتھ میں لی جا سکے۔ قمر علی کی مضبوط پوزیشن ان کے لیے بہت سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ دو سال اسی عیش و طرب میں گزر گئے۔ ان کا منصوبہ اب کامیابی کے بہت نزدیک آ چکا تھا لیکن پھر تقدیر کے ایک ہی وار نے اُن کے ارادے خاک میں ملا دیے۔

☆☆☆

ملکی سیاسی صورتِ حال بے حد تبدیل ہو چکی تھی۔

پشت ہا پشت سے سیاسی اکھاڑے میں براجمان افراد کے لیے ایک مخصوص تعلیمی ڈگری لازم قرار دے دی گئی جس کا

نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ قمر علی کا سیاسی کیریئر بے موت انتقال کر گیا۔ سونیا کے لیے یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ سالہا سال کی سرمایہ کاری کے بعد جب ثمرات کے حصول کا اصل وقت قریب آیا تھا تو یہ حادثہ پیش آ گیا اور بہت سے 'اہم پروجیکٹس' ادھورے رہ گئے۔

مصطفیٰ کے ذریعے حساس سرکاری ادارے کی نبض اپنے ہاتھ میں لینے کا خواب بھی ایک خواب ہی ثابت ہوا۔ اب محض ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ کسی بھی طرح اسے مطلوبہ ڈگری کا حصول ممکن کروائے اور قمر کے متبادل سیاسی سفر کا آغاز کروایا جائے۔

سونیا وقتی طور پر مایوس تھی لیکن اپنی بچھائی گئی بساط سے نا امید نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مصطفیٰ اس کے لیے کہیں زیادہ سودمند ثابت ہوگا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وقت نے ان کی بساط لپیٹنے کا آغاز کر دیا ہے اور اب ہر بازی الٹنے کی رُت آ گئی ہے۔

☆☆☆

قمر علی اپنی زندگی میں آنے والی اس اچانک افتاد پر بہت پریشان تھا۔

اقتدار اور حکمرانی کے نشے نے کسی آکٹوپس کی طرح اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ موجودہ صورتِ حال نے فشارِ خون میں اضافہ، ذہنی تناؤ اور کارخانۂ دل میں بغاوت پیدا کر دی۔ اعصابی سکون کی ادویات کے استعمال نے ذہن پر غنودگی طاری کرنی شروع کر دی۔

مصروفیت کا ایک طویل دور اب ختم ہو گیا تھا۔ فراغت اپنے ساتھ کئی اندیشے بھی لے آئی تھی۔ بیشتر وقت گھر پر گزارنا شروع کیا تو اپنی ناک کے نیچے کھیلے جانے والے کھیل کا احساس ہوتے ہی دل و دماغ میں مزید حشر برپا ہو گیا۔

آغاز میں اُسے صرف شک تھا اس لیے تصدیق کے لیے سونیا کو مزید مارجن دینا شروع کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ کوئی غلطی ضرور کرے گی۔

اور ہوا بھی یہی......

☆☆☆

سونیا ایک زیرک آلۂ کار تھی اور بلاشبہ کئی سالوں سے انتہائی کامیابی سے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھی لیکن انسانی فطرت و جبلت سے بہرحال مبرّا نہ تھی۔

قمر علی کی بیماریوں اور بڑھاپے سے وہ خاصی بددل ہو چکی تھی۔ سونے پہ سہاگا اس کی سیاسی میدان سے دوری کے بعد اس کی توجہ اور محنت کا مرکز مصطفیٰ بن گیا تھا۔ وہ اس کی جانب مزید مائل ہوتی چلی گئی۔

نفس جب بے قابو ہوتا ہے تو انسان ہمیشہ اپنی تربیت و اہلیت فراموش کر کے ایک خاص متعین کردہ منزل کی جانب اندھا دھند دوڑنے لگتا ہے۔ سونیا بھی اپنی تربیت و اہلیت پسِ پشت ڈالے صرف ایک 'عورت' بن چکی تھی۔

قمر اکثر و بیشتر مسکن ادویات کے استعمال اور کثرتِ مے نوشی کے بعد سرِشام ہی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہ معمول کافی عرصے سے جاری تھا اس لیے وہ دونوں بے فکری سے اپنا کھیل جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس روز بھی سونیا، مصطفیٰ کے کمرے میں موجود تھی۔

رات کی سیاہی گناہ و نفس کے جانے کتنے ہی بدبودار کھیلوں پر تاریکی کا پردہ تانے دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ قمر کی اچانک آمد ان کے لیے کسی بم دھماکا سے کم نہ تھی۔ وہ آنکھوں میں طیش اور غضب کی گہری سرخی لیے بے یقینی اور صدمے کی کیفیت میں مبتلا دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں 'ماسٹر کی' دبی تھی۔

''تت...... تم...... یہاں کیسے؟'' سونیا پہلی بار حواس باختہ ہوئی۔

قمر طیش کے عالم میں آگے بڑھا اور اُسے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے نیچے قالین پر پٹخ کر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

''تو...... سالی...... بدذات عورت...... مجھے پہلے سمجھ کیوں نہ آئی کہ تو اس گھر میں صرف کھیل کھیلنے ہی آئی ہے......''

مصطفیٰ سے سونیا کی یہ ذلت برداشت نہ ہوئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور باپ کو ایک دھکا دے کر بولا۔

''خبردار...... خبردار جو اس دفعہ بھی کوئی مار پیٹ کرنے کی کوشش کی...... اب میں خاموش نہیں رہوں گا۔''

''یہ تو نہیں...... تیرے منہ میں اس حرافہ کی زبان بول رہی ہے۔'' قمر کے وجود میں بجلی بھر گئی۔

مصطفیٰ شدید نشے کی حالت میں تھا۔ وہ جسمانی طاقت کے باوجود باپ کی اس وحشت کا سامنا نہ کر سکا اور لڑکھڑا کر بستر پر جا گرا۔ قمر نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچی اور پوری قوت سے دبانے لگا۔

مصطفیٰ کی حالت خستہ ہونے لگی۔ اُسے سانس لینے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس نے اپنا منہ کھول کر ہوا اندر کھینچنی چاہی لیکن ایک گرم سیال مادّے نے اس کا چہرہ، زبان اور حلق کو بھگو ڈالا اور اس کے ساتھ ہی دباؤ ختم ہو گیا۔

سازشی ذہنوں کی چالاکیوں اور عیاریوں کی داستان کا آخری حصہ اگلے ماہ پڑھیے

نام

سرور اکرام

کہتے ہیں کہ نام شخصیت پر اثرانداز ہوتے ہیں... اس شخص کی بدقسمتی یہ تھی کہ والد صاحب نے اس کا نام بڑا ہی عجیب رکھ دیا تھا... جس کی وجہ سے اسے ہر دم ہر جگہ شرمندگی اور شرمساری کا سامنا کرنا پڑتا تھا... وہ اپنے نام سے اس حد تک عاجز آچکا تھا کہ بدلے بغیر چارہ نہیں رہا...

ہنستے مسکراتے پیرائے میں ایک سنجیدہ نکتہ بیان کرتی کہانی......

منگو نام تھا اس کا۔ وہ ایک عام سا آدمی تھا۔ اس قسم کے نام عام ہی لوگوں کے ہوتے ہیں۔ آپ نے خاص لوگوں کے نام اس طرح کے نہیں سنے ہوں گے۔ منگو، شیدے، بھلے، چنکو وغیرہ۔ خاص لوگوں کے نام بھی خاص ہوتے ہیں۔ ان میں ایک طرح کی شان ہوتی ہے۔ ایک دبدبہ ہوتا ہے۔ وقار ہوتا ہے۔

منگو اکثر اپنے نام کی وجہ سے شرمندہ رہا کرتا تھا۔

حالانکہ وہ ایک کاروباری آدمی تھا۔ ایک بزنس مین۔ ایک چھوٹی سی فرم تھی اس کی جس میں چالیس کے قریب لوگ کام کیا کرتے تھے۔ نوجوان ماڈرن قسم کے لڑکے اور لڑکیاں۔ جن کے نام بھی ان ہی کی طرح خوبصورت ہوتے تھے۔ جبکہ منگو اپنے نام کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتا تھا۔

پروفیسر کا کمرا بھی شاندار تھا۔ اس کی شخصیت بھی متاثر کن تھی۔ تھری پیس سوٹ میں اس کی پرسنالٹی ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی فرم کا ایم ڈی بیٹھا ہو۔

اس نے مسکرا کر منگو سے ہاتھ ملایا۔ ''تشریف رکھیں۔'' اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

منگو اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروفیسر کچھ دیر تک غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک ہنکاری لی۔ ''مسٹر منگو۔ آپ کے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ آپ کا نام آپ کی پرسنالٹی اور پروفیشن سے میچ نہیں کرتا۔''

''جی جناب۔ یہی بات ہے۔'' منگو نے کہا۔

''اور اس کی وجہ سے آپ رفتہ رفتہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، کیوں؟''

''بالکل یہی بات ہے۔'' منگو نے کہا۔

''آپ نے عقلمندی کی جو میرے پاس آگئے۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''میرے پاس ایسے ناموں کی ورائٹی ہے۔۔ جو آپ کو سوٹ کرتے ہوں۔ ویسے آپ کے والد کا کیا نام ہے یا تھا؟''

''نہ پوچھیں تو بہتر ہوگا۔''

''بتا دیں اس سے کیس سمجھنے میں آسانی ہوگی۔''

''ان کا نام تھا لڈن۔ اور دادا کا نام تھا گھسیٹا۔'' منگو نے بتایا۔

''سمجھ گیا تو یہ جینیٹک پرابلم ہے۔ خیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اسی لیے تو آیا ہوں۔ آپ کے پاس۔''

''آپ کا نام تجویز کرنے سے پہلے بہت سی باتیں معلوم کرنی ہوں گی، مثال کے طور پر آپ کا سن پیدائش۔ کس دن اور کہاں پیدا ہوئے۔ فیملی بیک گراؤنڈ وغیرہ۔ تب جا کر ستاروں کے حساب کتاب سے آپ کا نام نکالا جائے گا۔''

''آپ جو کہیں۔'' منگو نے پروفیسر کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ پروفیسر نے سب کچھ نوٹ کرلیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اب آپ جائیں۔ پرسوں آ جائیے گا۔ نام مل جائے گا۔''

''پرسوں کیوں جناب؟''

پروفیسر مسکرا کر بولا۔ ''منگو صاحب۔ یہ نام کوئی گھر کو فرد یا محلے کا بزرگ نہیں نکال رہا کہ جو سمجھ میں آیا بتا دیا۔ آپ ایک پروفیشنل کے پاس آئے ہیں۔ پورا حساب کتاب دیکھنا ہوگا۔ تب جا کر نام نکلیں گے۔ ان ناموں کے بھی اثرات دیکھنے ہوں گے۔ یہ ایک مشکل کام ہے جناب۔''

''سمجھ گیا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

''اور ہاں۔ شاید میری سیکریٹری نے بتا دیا ہوگا کہ دوسری وزٹ کے دس ہزار ہوتے ہیں۔'' پروفیسر نے کہا۔

''اس نے یہ بات تو نہیں بتائی تھی لیکن کوئی بات نہیں۔''

''ایک بات اور سن لیں۔ یہ سمجھ لیں کہ یہاں آتے ہی آپ پر برکتیں نازل ہونی شروع ہوگئی ہیں۔''

''وہ کس طرح جناب۔'' منگو نے پوچھا۔

''سامنے کی بات ہے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ کا نام اس ملک کے ایک مشہور پروفیسر بوکاڑو نے رکھا ہے تو لوگ کتنی حیرت اور حسرت سے آپ کو دیکھیں گے۔''

''یہ بات تو ہے۔'' منگو نے اعتراف کیا۔

''آپ کی آنے والی نسلیں تک فخر کیا کریں گی۔''

''پروفیسر صاحب۔ فی الحال تو کسی نسل کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔'' منگو نے بتایا۔

''وہ کیوں؟ کیا آپ نے شادی نہیں کی؟''

''کوئی بھی معقول لڑکی اس نامعقول نام کے ساتھ مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔''

اس کا یہ نام اس کے باپ نے رکھا تھا۔ جب اسے شعور نہیں تھا۔ تب تک تو اس نے اس نام پر کوئی احتجاج نہیں کیا لیکن باشعور ہوتے ہی اس نے واویلا شروع کر دیا۔ ''ابا۔ یہ تم نے میرا کیسا نام رکھ دیا ہے، منگو۔ یہ بھی کوئی نام ہوا؟''

''کیوں اس نام میں کیا برائی ہوگئی؟'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''ابا یہ نام کسی بھکاری کا ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اسکول میں میرا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ منگو چلا آ رہا ہے۔ اس کو کچھ دے دو۔''

''بیٹا یہ نام تیرے باپ دادا کی نشانی ہے۔'' اس کے باپ نے بتایا۔ ''خود دیکھ لے۔ تیرے دادا کا نام گھسیٹا تھا۔ خود میرا نام لڈن ہے۔ اب اگر تیرا نام منگو ہوگیا تو اس میں کیا ہے؟ پھر دوسری بات یہ ہے کہ میرے پیر و مرشد نے تیرا یہی نام تجویز کیا ہے۔ کہا تھا کہ بہت بابرکت نام ہے۔''

''ابا تمہارے پیر و مرشد نے تو اپنا بہت اچھا نام رکھا ہوا تھا۔ نسیم الدین اور مجھے منگو کر دیا۔''

''بس ان کی شان میں کچھ نہیں کہنا۔ تیرا یہی نام رہے گا۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ باپ پھر باپ ہی ہوتا ہے۔ دن گزرتے گئے۔ یہ اتفاق تھا کہ اس نے اچھی تعلیم حاصل کر لی اور ترقی کرتا چلا گیا۔ ورنہ اس کے باپ نے اس کا بیڑا غرق کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی۔

اب سب کچھ تھا اس کے پاس۔ ایک اچھا بزنس۔ اپنا گھر۔ گاڑی بینک بیلنس۔ بس ایک نام کی گڑبڑ تھی۔ اگر نام بھی کوئی اچھا سا مل جاتا تو زندگی میں جو کمی تھی، وہ پوری ہو جاتی۔ بہت سوچ کر اس نے کسی نجومی سے نام کے سلسلے میں مشورے کا فیصلہ کیا۔

آج کل ماڈرن قسم کے نجومی ٹی وی شو میں آ کر طرح طرح کے مشورے دیا کرتے ہیں۔ اس نے کسی ڈھنگ کے نجومی کی تلاش میں ٹی وی چینلز پر مارننگ شوز دیکھنے شروع کر دیے۔ اس قسم کے باکمال نجومی اور ماہرین مارننگ شوز ہی میں آیا کرتے ہیں۔

ایک ہفتے تک ایک چینل سے پروفیسر بوکا ڑو دکھائی دے گیا۔ منگو نے اس کا نام پہلے نہیں سنا تھا لیکن میزبان کی تعریفوں سے پتا چلا کہ وہ ایک عالمی شہرت یافتہ نجومی تھا اور اس سے مشورہ لینے والوں کی تقدیر بدل جاتی تھی۔ اسے اپنی تقدیر تو نہیں بدلوانی تھی۔ اس کا کام تو بہت چھوٹا سا تھا اور پروفیسر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ٹی وی اسکرین پر پروفیسر کا فون نمبر بھی آ رہا تھا۔ اس نے وہ نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

اس نے فون کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ دوسری طرف سے کسی لڑکی نے فون ریسیو کیا تھا۔ وہ شاید پروفیسر کی سیکریٹری تھی۔

”جی فرمائیں۔“ اس نے پوچھا۔

”مجھے پروفیسر بوکا ڑو سے ملنا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کس سلسلے میں؟“

”کیا آپ کو بتانا ضروری ہے؟“

”جی ہاں۔ میں ان کی سیکریٹری ہوں۔ میرے علم میں ہونا چاہیے۔ تب میں اپائنٹمنٹ دیتی ہوں۔“ سیکریٹری نے کہا۔

”مجھے اپنا نام بدلنا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ بدل جائے گا۔ آپ پرسوں شام پانچ بجے آ جائیں۔ معلوم ہے نا پروفیسر صاحب کی فیس بیس ہزار ہوتی ہے؟“

”بیس ہزار۔ نام بدلوانے کے؟“

”جی یہ بہت مشکل کام ہے۔ بہت حساب کتاب کرنا پڑتا ہے۔ آپ بتائیں۔ وقت خراب نہ کریں۔ دوسرے فون پر کسی اور کا فون آ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ میرا اپائنٹمنٹ کنفرم کر دیں۔“ اس نے کہا۔

اس سے کئی سوالات کیے گئے۔ اس کا نام۔ مصروفیات۔ عمر۔ وغیرہ۔ اس کے بعد کہا گیا کہ وہ پرسوں شام کو آ سکتا ہے۔

منگو وقتِ مقررہ پر پروفیسر کے دفتر پہنچ گیا۔ کیا شاندار دفتر تھا۔ ایسا دفتر تو خود منگو کا بھی نہیں تھا۔

ریسیپشن کے ساتھ آرام دہ صوفے رکھے ہوئے تھے جن پر کلائنٹس بیٹھا کرتے۔ اس نے آج تک ان نجومیوں کو دیکھا تھا جو بے چارے فٹ پاتھوں پر دری بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک خستہ حال بورڈ ہوتا ہے۔ جس پر ستاروں کے نام لکھے ہوتے ہیں اور کچھ الٹا سیدھا حساب کتاب ہوتا ہے۔ اور وہ بے چارے لیتے بھی کیا ہیں۔ صرف بیس روپے۔ یا بہت زیادہ ہوا تو پچاس لے لیے۔

ریسیپشن پر جو لڑکی بیٹھی تھی، وہی پروفیسر کی سیکریٹری تھی۔ وہ خاصی خوش شکل اور جوان لڑکی تھی۔ اس نے منگو کا نام پوچھ کر اس کو ایک ٹوکن دے دیا۔ منگو بھی جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی باری ایک گھنٹے بعد آئی تھی۔ سیکریٹری نے بیس ہزار پہلے لے لیے تھے۔

عربوں کا جوشِ انتقام

دورِ جاہلیت میں عرب، کسی سے انتقام لینے میں ناکام رہنا، گویا اپنے لیے انتہائی بدبختی کی علامت سمجھتے تھے۔ امرا القیس، شعرائے معلقات میں ایک بلند پایہ شاعر مانا جاتا تھا۔ جب اس نے بنی اسد سے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کی ٹھانی تو شگون حاصل کرنے کے لیے ذوالخلاصہ نامی بت کے مندر میں گیا۔ وہاں بت کے قریب ہی ایک جھولی لٹک رہی تھی۔ اس نے تین ایسے تیر بت کی جھولی میں ڈالے جن پر الگ الگ الفاظ۔ اقدام۔ تاخیر اور ترک لکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر کے ان میں سے ایک تیر نکالا۔ اس پر لفظ ”ترک“ لکھا، اس نے دوسری اور تیسری بار یہی عمل دہرایا مگر ہر مرتبہ...... ”ترک“...... ہی نکلا۔ اس پر شاعر نے جل بھن کر تیر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بت کے منہ پر دے مارے اور کہا۔ ”بدبخت! اگر تیرا باپ قتل ہو جاتا، تو تو مجھے کبھی انتقام لینے سے منع نہ کرتا۔“

مرسلہ: اقبال: ہوف، ڈرگ کالونی، کراچی

''چلیں۔ کوئی بات نہیں۔ اب تو آپ بالکل صحیح جگہ آ چکے ہیں۔'' پروفیسر نے کہا۔

منگو جب گھر پہنچا تو ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہونے والا تھا۔ شام کے وقت اس کی پھوپی کا فون آ گیا۔ وہ کسی اور شہر میں رہتی تھیں۔ ''بیٹا! میں پرسوں آ رہی ہوں۔'' پھوپی نے بتایا۔

''جب چاہے آ جائیں پھوپی۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟''

''میں تیرے لیے ایک تحفہ بھی لا رہی ہوں۔'' پھوپی نے بتایا۔ ''اب وہ کیا ہے۔ یہ میں تیرے پاس آ کر بتاؤں گی۔''

''ارے پھوپی۔ آپ کا آنا ہی میرے لیے تحفہ ہے۔''

پروفیسر کی کہی ہوئی برکتیں اس پر نازل ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ اس کی پھوپی بہت دنوں کے بعد آ رہی تھیں۔ اس کے خاندان میں اب صرف وہی تو رہ گئی تھیں۔ منگو کو بھی ان سے بہت محبت تھی۔

شام کے وقت اسے پیغام مل گیا کہ پھوپی آ چکی ہیں لیکن ان سے ملنے سے پہلے اسے پروفیسر سے ملنا تھا۔ وہ دفتر سے سیدھا پروفیسر بوکاڑو کے پاس پہنچ گیا۔ اسے دس ہزار اور دینے پڑ گئے۔

پروفیسر اس کے انتظار ہی میں تھا۔

وہ منگو کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ ''آئیں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے دو راتیں آپ کے لیے جاگ کر گزاری ہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''یہ میری عادت ہے۔ میں اپنے کلائنٹس کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کرتا۔ پورے خلوص کے ساتھ کام کرتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے میرا کوئی نام تلاش کر لیا ہے؟''

''ایسا ویسا۔'' پروفیسر مسکرا دیا۔ ''دل خوش ہو جائے گا آپ کا۔ بڑی محنت کے بعد یہ نام سامنے آیا ہے۔''

''بتا دیں کیا نام ہے؟''

''امتیاز۔ امتیاز لڈن۔ کتنا بارعب نام ہو جائے گا آپ کا۔''

''لیکن امتیاز تو ایک عام سا نام ہے پروفیسر صاحب۔'' منگو نے کہا۔

''بے شک یہ عام سا نام ہے لیکن ستاروں کے حساب سے بالکل درست ہے۔ میں نے اس نام کو نکالنے میں علمِ نجوم کے ساتھ علمِ جفر کی مدد بھی لی ہے۔ اس کے علاوہ دو راتیں مراقبے میں گزاری ہیں۔ تب جا کر یہ نام سامنے آیا ہے۔''

اب منگو خوش ہو گیا۔ اچھا لگ رہا تھا۔ امتیاز لڈن۔ ایک بارعب سا نام بن گیا تھا۔ لوگ لڈن پر دھیان کم دیں گے۔ امتیاز پر زیادہ دیں گے۔

''پروفیسر صاحب! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے والد کا نام بھی بدل دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کا نام بھی بدل دیتا لیکن وہ مر چکے ہیں۔ لہٰذا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ اسی نام پر گزارا کریں۔''

''بہت بہتر۔''

وہ واپس آ گیا۔ اس کے تیس ہزار تو اس چکر میں خرچ ہو گئے تھے۔ لیکن ایک ایسا نام مل گیا تھا جس کی تائید ستاروں نے بھی کر دی تھی۔

گھر پہنچا تو پھوپی اس کے انتظار ہی میں بیٹھی تھیں۔ منگو سے ملتے ہی اسے گلے لگا لیا تھا۔

''بیٹا! مجھے تیری فکر رہتی ہے۔ اب تو میں یہ سوچ کر آئی ہوں کہ اسی وقت واپس جاؤں گی جب تیری شادی ہو جائے گی۔ تیرا اکیلا رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

پہلے بھی پھوپی کئی بار اس قسم کی باتیں کر چکی تھیں لیکن اپنے نام کی وجہ سے منگو انکار کرتا چلا آیا تھا لیکن اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

''میں تیار ہوں پھوپی۔'' اس نے کہا۔

''ارے خدا تجھے خوش رکھے۔'' پھوپی بھی خوش ہو گئی تھیں۔ ''اب میں تجھے وہ تحفہ دے رہی ہوں جس کے بارے میں کہا تھا۔''

''جی پھوپی بتائیں کیا تحفہ ہے؟''

''بیٹا! میں نے تیرا نیا نام سوچ لیا ہے۔'' پھوپی نے کہا۔

''بتائیں پھوپی کیا نام ہے؟''

''بہت سیدھا سا نام ہے امتیاز۔ اور جب بھائی صاحب کا نام ساتھ میں لگا لے گا تو بارعب نام بن جائے گا۔ امتیاز لڈن۔ بتا کیسا نام ہے؟''

منگو اس سوال کا جواب دینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ جو کام پروفیسر بوکاڑو نے تیس ہزار لے کر کیا تھا، وہ کام اس کی پھوپی نے فری میں کر دیا تھا۔

اس دن کے بعد سے منگو نے مارننگ شوز دیکھنے چھوڑ دیے اور اس نے نئے نام پر بھی لعنت بھیج دی ہے۔ وہ منگو ہی کے نام سے زندگی گزار رہا ہے اور بہت کامیاب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کھانا گرم کھانے کے بجائے ٹھنڈا کر کے کھایا جائے... تو زیادہ مزہ دیتا ہے... اسی طرح انتقام بھی ایسا جذبہ ہے جو کبھی سرد نہیں ہوتا... اس کی آگ بھی ٹھنڈی نہیں ہوتی... بعض افراد ایسی فطرت لے کے پیدا ہوتے ہیں جن کے قول و فعل سے کبھی کسی کو سکون... راحت اور فرحت نہیں ملتی... ان کا ہر عمل اور ہر لفظ محض ایذا ہی پہنچاتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی دوغلی اور دہری شخصیت... اس کی موت کے خواہش مندوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا...

انتقام...... احتساب اور پرانے حساب کا نیا کھاتہ......

پرانا حساب

تنویر ریاض

میجر پائن ملٹری کلب کے اسموکنگ روم میں آتش دان کے نزدیک بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ تبھی کیپٹن جینر وہاں داخل ہوا اور میجر کو دیکھ کر بہ آوازِ بلند بولا۔ ”تم ہی وہ شخص ہو جس سے میں ملنا چاہ رہا تھا۔ اُمید ہے کہ تم بہت زیادہ مصروف نہیں ہو گے؟“

”نہیں، بہت زیادہ تو نہیں۔ البتہ مصروفیت تو رہتی

ہے۔'' میجر پائن نے خوش مزاجی سے کہا۔
''کیا تم ایک تجسس آمیز کہانی سننا پسند کرو گے؟''
''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس میں کتنا تجسس ہے۔''

جنیر کلب کا سیکریٹری تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس کا تعلق تمہاری سڑک سے ہے۔''
''ایسی صورت میں تو ضرور سننا چاہوں گا۔''
جنیر نے چاروں طرف دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہیں ہے تو رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''کل ایک عجیب تجربہ ہوا جو مجھے ڈراؤنے خواب کی طرح لگتا ہے۔ میں گزشتہ شب ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا۔ اور اسی بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے تو قتل کا شبہ ہو رہا ہے۔''
''قتل؟''

کیپٹن جنیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جانتا تھا کہ تم اس میں دلچسپی لو گے۔ اس کے علاوہ میں اس کی کوئی اور وضاحت نہیں کر سکتا۔ میری قوتِ متخیلہ تم دونوں میاں بیوی کی طرح طاقتور اور عجیب نہیں ہے۔ دراصل میری بیوی ڈولسی نے ہی تم سے رجوع کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اخبارات میں تمہارے بارے میں پڑھتی رہی ہے اور تم سے بہت زیادہ متاثر ہے۔''
''یہ اس کی مہربانی ہے لیکن اخبارات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔'' میجر پائن بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''قتل۔ کیا تمہیں اس کی اطلاع پولیس کو نہیں دینی چاہیے تھی؟''

''جانتا ہوں لیکن پہلے مجھے خود یقین ہونا چاہیے۔ اس لیے تمہاری رائے لینی ضروری ہے۔ کیونکہ صورتِ حال بہت ہی عجیب ہے۔''
''قتل کے معاملے میں کبھی انکار نہیں کرتا۔ بتاؤ کیا معاملہ ہے؟''
جنیر کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔
''کہاں سے شروع کروں؟''
''شروع سے سناؤ۔''
''کبھی تم نے ٹی وی پروگرام where are they now دیکھا ہے۔ یہ ایک ہفتہ پہلے بی بی سی فور پر دکھایا گیا تھا۔''
''نہیں۔ آج کل ہم لوگ بہت کم ٹی وی دیکھتے ہیں۔ شاید یہ سابق قاتلوں سے متعلق ہو گا۔''

''نہیں، یہ سابق چائلڈ اسٹارز کے بارے میں تھا۔ اس میں ان بچوں کے بارے میں بتایا گیا جنہوں نے ساٹھ اور ستر کی دہائی میں گلوکاری شروع کی۔''
''مجھے چائلڈ اسٹارز سے ہمدردی ہے۔'' پائن نے کہا۔ ''بعد میں انہیں کوئی خوشی نہیں ملتی اور ان کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ وہ بحالی کے مرکز یا ذہنی امراض کے اسپتال میں چلے جاتے ہیں یا پھر خودکشی کر لیتے ہیں اور پھر لوگ اظہارِ افسوس کر کے کہتے ہیں۔ 'کتنا پیارا بچہ تھا۔ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟''
''کیا تمہیں وہ دس سالہ لڑکی ایڈن سوان یاد ہے؟'' کیپٹن جنیر نے اچانک پوچھا۔ ''اس نے ساٹھ کی دہائی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی خاص طور پر برطانیہ میں بہت مقبول تھی۔''
''ایڈن سوان؟''
''ہاں اس کے گائے ہوئے گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ خاص طور پر نانی نربی، کے تو پانچ لاکھ ریکارڈ فروخت ہوئے تھے۔''
''ہاں مجھے یاد آ گیا، کیا اس پروگرام میں اس کا انٹرویو کیا گیا تھا؟''
''اس سے کامیابی کے دنوں کی یادیں تازہ کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔''
''اب تو وہ ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔''
''وہ تریسٹھ سال کی ہے۔ کافی موٹی ہو گئی ہے۔ بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔''
پائن نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری کہانی میں ایڈن سوان کہاں سے آ گئی؟''
''وہ میری آنٹی ہے۔''
''تمہاری آنٹی؟ کیا واقعی؟''
''ہاں، میں سنجیدہ ہوں۔ وہ میرے چچا کی دوسری بیوی ہے۔ جب ان کی شادی ہوئی تو ایڈن سوان اٹھارہ اور میرے چچا تینتیس سال کے تھے۔ اس کا کیریئر ختم ہو چکا تھا گو کہ وہ کافی پیسے بنا چکی تھی۔ میرے چچا یقیناً جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کی پہلی شادی کا خاتمہ طلاق پر ہوا تھا۔ چچا کا سلوک اس سے اچھا نہیں تھا پھر اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ غالباً اس کا نام روبی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والدین کو ایڈن سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ انہیں اس شادی کا علم اخبارات سے ہوا۔''
''کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہارے باپ کے بھائی سے

تعلقات اچھے نہیں تھے؟‘‘

’’ہاں، میرے والد ان سے نفرت کرتے تھے۔ میرے چچا غیر ذمّے دار، بے پروا، دھوکے باز اور مجرمانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ ان میں دکھاوا بہت تھا۔ دوسروں کو تکلیف دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہوں نے دادا کے اکاؤنٹ سے جعلی چیک کے ذریعے رقمیں نکلوائیں۔ گھر کی قیمتی اور نادر اشیا بغیر پوچھے بیچ دیں جن میں نایاب تصاویر اور آرٹ کے نمونے بھی تھے۔ یہاں تک کہ دادی کا زیور بھی بیچ دیا۔ لیکن ان کی تمام حرکتوں پر پردہ پڑا رہا کیونکہ اگر پولیس میں رپورٹ کرتے تو خاندان کی بدنامی ہوتی۔‘‘

’’گویا تمہارے چچا صحیح معنوں میں کالی بھیڑ تھے۔‘‘ پائن نے کہا۔

’’وہ بُرے کاموں سے لطف اندوز ہوتے اور خوشی محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ یہ بھی سنا گیا کہ وہ کسی گینگ میں شامل ہو گئے ہیں جو منشیات کا دھندا کرتا ہے۔ انہوں نے گالف کھیلتے ہوئے ایک بچے کو بھی مار ڈالا۔ انہوں نے سڑک کی طرف ہٹ لگائی اور گیند ایک چھوٹی بچی پنکی کو جا کر لگی جو اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ وہاں سے گزر رہی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔ یہ واقعہ آج سے پانچ چھ سال پہلے سننگ ڈیل گالف کورس پر پیش آیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں ایک اخبار میں پڑھا۔ ایک تماشائی کا کہنا تھا کہ وہ بڑی بے پروائی سے گیند کو ہٹ لگا رہے تھے اور جب بچے اس سے بچنے کے لیے جھکتے تو وہ زور زور سے قہقہے لگاتے۔ ان پر کوئی الزام نہیں آیا اور اسے حادثاتی موت قرار دے دیا گیا۔ پروگرام میں بھی ایڈن نے اس کا ذکر بڑی حقارت سے کیا تھا۔‘‘

’’اگر وہ اتنا ہی بُرا تھا تو کیا وہ اس سے طلاق لے کر دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی یا وہ اس کے مرنے کا انتظار کر رہی تھی؟‘‘

’’یہیں سے تو یہ معما شروع ہوتا ہے۔‘‘ جینر نے آہستہ سے کہا۔ ’’اس نے اپنے شوہر کا حوالہ ’بینٹ‘ کہہ کر دیا جو انکل بنجمن کا پیار کا نام تھا۔ میرے والد بچپن میں انہیں اس نام سے پکارتے تھے لیکن فوراً ہی ایڈن نے تصحیح کر دی اور بولی۔ نہیں بینٹ نہیں۔ میرا مطلب ہے اسٹیوارٹ۔ ایک لمحے کے لیے وہ خوف زدہ دکھائی۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ میرا خیال تھا۔‘‘

’’اس سے تمہیں اندازہ ہوا کہ وہ ابھی تک تمہارے چچا کی بیوی ہے لیکن اس میں کوئی عجیب بات ہے۔ یعنی تمہارے چچا ایک طرح سے دُہری زندگی گزار رہے تھے۔‘‘

’’ہاں، اس سے میرے اندر تجسس پیدا ہوا، اور میں نے چچا کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔‘‘

کیپٹن جینر نے ایک سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ’’میں غالباً بتا چکا ہوں کہ میں نے اپنے چچا کو کبھی نہیں دیکھا۔ جب میں بڑا ہوا تو وہ ہم سے دور جا چکے تھے لیکن میرے ذہن میں ان کی شخصیت کا ایک خاکہ تھا۔ وہ مجھے بالکل ناولوں کے بُرے انکل جیسے لگتے تھے۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے کئی نام گنوا دیے۔ انہیں سن کر پائن بولا۔ ’’تم نے جتنے نام گنوائے ہیں، اتفاق سے وہ سب قاتل تھے۔ تم نے کہا کہ تمہیں کسی کے قتل کا شبہ ہے۔ تمہارے چچا نے بھی تو ایک لڑکی کو مارا تھا۔ جسے حادثاتی موت قرار دیا گیا تھا لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہ وہی قتل ہو سکتا ہے جس کا تم نے شبہ ظاہر کیا تھا۔‘‘

’’اوہ نہیں، وہ قتل نہیں تھا۔ لگتا ہے کہ میں نے تمہیں گمراہ کر دیا۔ مجھے چچا کے قتل کا شبہ ہے۔ میں نے اس کے انٹرویو سے نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ہائی گیٹ قبرستان کے آس پاس ہی رہتی ہے گو کہ مجھے پورا یقین نہیں تھا لیکن میں نے سوچا کہ کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے۔ میں اپنی کار میں ہائی گیٹ گیا اور اس مکان کی تلاش شروع کر دی اور بالآخر وہ مجھے مل گیا۔ وہ اس علاقے کا حصہ نہیں بلکہ قدرے الگ تھلگ تھا۔

’’میں نے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی۔ اندر سے کچھ آوازیں سنائی دیں، میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ بالآخر دروازہ کھلا اور ایڈن سوان نمودار ہوئی۔ میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ اس سے کیا کہنا ہے۔ میں نے اپنا تعارف ایک میوزک پروڈیوسر کے طور پر کروایا اور کہا کہ میں اس کے تمام پرانے گانوں کو یکجا کر کے ایک نئی سی ڈی پر منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے گھبرائی ہوئی لگی اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ اسے یہ سن کر خوشی ہوئی لیکن ابھی وہ اس پر بات نہیں کر سکتی۔ وہ مجھے بعد میں فون کرے گی۔ کیا میں اسے اپنا موبائل نمبر دے سکتا ہوں۔‘‘

’’وہ کاغذ اور قلم لینے اندر گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے ایک مرد کے چلانے کی آواز سنی پھر میں نے اسے کہتے سنا ’بینٹ۔ بینٹ ڈارلنگ۔ یہ ایک اچھا

موقع ہے وہ میرے انکل کا نک نیم استعمال کر رہی تھی۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ ایڈن کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے۔ اس کے برابر میں ایک مرد کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کرنے آیا ہوں۔ وہ میرے بہت قریب آ گیا تھا۔ میں نے اس کی انگلی میں مہر سے جڑی ہوئی انگوٹھی دیکھی جس پر بی جے کے حروف کندہ تھے۔ یوں لگا جیسے وہ مجھے مارنے والا ہے لیکن اس نے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔''

''بی جے یعنی بنجمن جینر......''

''ہاں لیکن وہ شخص میرا چچا نہیں تھا۔''

''اس نے یہ بات بڑے وثوق سے کہی۔'' شام کو میجر پائن نے اپنی بیوی انتونیا کو کیپٹن جینر کے عجیب و غریب تجربے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔'' حالانکہ وہ پہلے بتا چکا تھا کہ اس نے کبھی اپنے چچا کو نہیں دیکھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ اسے بخوبی اندازہ ہے کہ اس کا چچا دیکھنے میں کیسا ہوگا۔ اس نے اس کی جوانی کی تصویر دیکھی تھی اور وہ اس کے والٹ میں موجود تھی بلکہ اس نے مجھے بھی دکھائی۔''

''عمر زیادہ ہو جائے تو لوگ پہلے سے مختلف لگنے لگتے ہیں۔ خاص طور پر مخصوص حالات میں۔ بنجمن غیر روایتی اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گزار رہا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ پولیس یا گینگ ممبرز سے بچنے کے لیے بھاگتا رہا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ عادی شرابی یا بہت زیادہ بیمار ہو۔ ایسی صورت میں بھی آدمی کی ظاہری شکل بدل جاتی ہے۔''

''جینر کو یقین تھا کہ وہ شخص اس کا چچا نہیں ہے بلکہ اس نے ان کی انگوٹھی پہن رکھی تھی اور بینٹ بن کر بول رہا تھا۔ اس کی ناک، ٹھوڑی اور کان بالکل مختلف تھے۔''

''پھر وہ کیا سمجھ رہا ہے؟'' انتونیا نے پوچھا۔'' کیا وہ ایڈن کا بوائے فرینڈ تھا اور ان دونوں نے مل کر اس کے چچا کو قتل کر دیا پھر اس بوائے فرینڈ نے چچا کی جگہ لے لی اور خود بنجمن جینر بن گیا۔''

''ہاں، وہ انہی خطوط پر سوچ رہا ہے۔'' پائن نے کہا۔'' حالانکہ کسی دوسرے کی شخصیت اختیار کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً جعلی کاغذات بنوانا، دستاویزات پر جعلی دستخط کرنا اور تصویر کی تبدیلی وغیرہ جو کہ اس زمانے میں بہت مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ شخص بنجمن بن کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جینر کا خیال ہے کہ اس کے چچا کی لاش مکان کے عقبی باغ یا پھر قبرستان میں دفن کر دی گئی۔''

''مجھے تو یہ بات ناممکن لگتی ہے، اگر اسے اتنا ہی یقین ہے تو وہ پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کرتا؟''

''اس بارے میں اس کی متضاد سوچ ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ قاتلوں کو سزا ہو گو کہ انہوں نے ایک گھناؤنا جرم کیا ہے۔ دراصل اس کے چچا نے اپنی فیملی اور تمام ملنے والوں کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی اور وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔ دوسری طرف وہ ایک روایتی اور قانون پسند شخص بھی ہے جسے اس کے ضمیر نے پریشان کر رکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم یہ فیصلہ کرنے میں اس کی مدد کر سکتے ہیں کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ایک مشکل صورتِ حال ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' انتونیا بولی۔'' کیا اس نے یہ کہا ہے کہ ہم وہاں جا کر وہ مکان دیکھیں؟''

''ہاں بشرطیکہ اس میں کوئی پریشانی نہ ہو۔'' پائن بولا۔'' بلکہ اس نے وہاں کا نقشہ بھی بنا کر دیا ہے تاکہ اس مکان کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ لگے...... تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔'' اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان معاملات سے دور رکھیں جن کا ہمارے کام سے کوئی تعلق نہیں۔''

''ہم کسی طویل اور تھکا دینے والے سفر پر نہیں جا رہے۔ وہ مکان گولان کی پہاڑیوں پر نہیں بلکہ یہیں ہمارے پڑوس میں ہائی گیٹ پر ہے۔''

دوسرے دن وہ صبح گیارہ بجے گھر سے نکلے۔ انتونیا خلافِ معمول خاموش تھی۔'' لگتا ہے کہ تم نے پہلے سے کوئی نظریہ قائم کر لیا ہے۔'' پائن نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیپٹن جینر نے تمہیں اپنے انکل کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کا کسی گینگ سے تعلق تھا اور یہ کہ اس نے ایک بچی کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ٹیڑھا اور گندہ آدمی ہے اور بہت سے لوگ اس کے خون کے پیاسے ہوں گے۔''

''اس سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟''

''یہ تم خود دیکھ لوگے۔'' انتونیا نے کہا۔

انہوں نے اپنی کار ایک چھوٹے سے سرسبز میدان کے برابر میں کھڑی کی جو پھولوں سے گھرا ہوا تھا اور درختوں کی قطار کے درمیان سے گزرنے لگے۔ پائن کے ہاتھ میں کیپٹن کا دیا ہوا نقشہ تھا۔

''تمہیں وہ ایکشن پلان یاد ہے جو ہم نے طے کیا

تھا؟‘‘

’’کیا تم ڈرامائی انداز کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتے؟‘‘ انتونیا نے کہا۔

’’تمہارے خیال میں یہ ڈرامائی ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم بے ہوش ہونے کی اداکاری کرو۔ میں بیرونی دروازے کی گھنٹی بجا کر ایک گلاس پانی مانگوں گا اور ان سے تمہیں اندر لے جانے کی درخواست کروں گا تاکہ تمہیں لٹا کر ڈاکٹر کو فون کرسکوں، پھر ان کا فون استعمال کرنے کے لیے کہوں گا کیونکہ ہم اپنے موبائل گھر چھوڑ آئے ہیں۔‘‘

’’مجھے یقین نہیں کہ یہ طریقہ کامیاب رہے گا۔‘‘ انتونیا بولی۔ ’’شاید وہ دروازہ ہی نہ کھولیں۔ کیپٹن جینر کے آنے کے بعد وہ محتاط ہوگیا ہوگا اور وہ کبھی بھی ایڈن کو دروازہ نہیں کھولنے دے گا۔‘‘

’’ہم دوسرا طریقہ بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ میں چھتری کی مدد سے ان کی ایک دو کھڑکیاں توڑ دوں گا اور وہ باہر آنے پر مجبور ہوجائیں گے۔‘‘ پائن نے کہا۔

’’وہ پولیس کو فون کرکے بلالیں گے اور ہمیں توڑ پھوڑ کے الزام میں گرفتار کرلیا جائے گا۔‘‘

’’وہ پولیس کو فون نہیں کریں گے جن کے پاس چھپانے کے لیے کچھ ہوتا ہے وہ پولیس کو نہیں بلاتے۔‘‘

’’اگر وہ گھر میں نہ ہوئے تو؟‘‘

’’پھر ہم واپس چلے جائیں گے لیکن کل دوبارہ آئیں گے۔ ہمیں معاملے کی تہ تک پہنچنا ہے آیا کوئی قتل ہوا بھی ہے۔‘‘ پائن نے نقشے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ’’یہ مکان کہاں ہے۔ ہمیں اب تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا...... یہ آوازیں کیسی ہیں؟‘‘

’’لگتا ہے کہ چھوٹے کتے بھونک رہے ہیں۔‘‘

اگلے لمحے وہ تین کتے بھی نمودار ہوگئے۔ ان کی زنجیریں ایک درمیانی عمر کی عورت نے تھام رکھی تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں دستی بیگ اور دوسرے میں چھتری تھی۔ اس نے چھتری لہراتے ہوئے کہا۔

’’بہت پیارا موسم ہے۔‘‘

پائن نے سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’ہم ایک مکان ڈھونڈ رہے ہیں جو مونگوس، کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟‘‘

’’نہیں، میں اس علاقے میں اجنبی ہوں۔‘‘ اس عورت نے جواب دیا۔

’’اسے یہیں کہیں ہونا چاہیے۔ پرانا عشقِ پیچاں سے گھرا ہوا مکان ہے۔‘‘

وہ عورت رکتے ہوئے بولی۔ ’’اوہ ہاں، میں ایک قدیم طرز کی عمارت کے سامنے سے گزری تھی۔ اسے بھی عشقِ پیچاں کی بیلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ دیکھنے میں وہ کوئی متروکہ پناہ گاہ لگتی ہے۔‘‘

’’وہی مکان ہوگا......‘‘ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ایک کتا رسی تڑا کر اس کی جانب لپکا اور اپنے نکیلے دانت اس کی پنڈلی میں گاڑ دیے۔

’’فوراً واپس آؤ، رولینڈ۔‘‘ وہ عورت چلائی اور مدد کے لیے لپکی۔ ’’مجھے افسوس ہے۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔‘‘ انتونیا نے غور کیا۔ اس نے جو سینٹ لگایا ہوا تھا۔ اس میں سے دارچینی، اورنج اور ونیلا کی ملی جلی مہک آرہی تھی۔

ایک لمبے قد کا نوعمر لڑکا سائیکل پر سوار ان کے پاس سے گزرا۔ وہ بھی اسی طرف سے آرہا تھا جہاں وہ لوگ جارہے تھے۔ انتونیا اس کے چہرے کی زردی اور سرخ ہونٹ دیکھ کر چونک گئی۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اس نے گرم موسم میں بھی اونی ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے انہیں بدتمیزی سے دیکھا اور ان کے آگے سے گزرتا چلا گیا۔

اس عورت نے غصے سے اس لڑکے کو دیکھا اور پائن سے بولی۔ ’’تم زیادہ زخمی تو نہیں ہوئے؟‘‘

’’بالکل نہیں۔‘‘ پائن نے کہا۔ ’’شکر ہے کہ خون نہیں نکلا۔‘‘

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے ایک زوردار آواز سنی۔

تینوں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ عورت بولی۔ ’’یہ کیسی آواز تھی؟ کہیں گولی تو نہیں چلی؟‘‘

’’ہاں، یہ فائر کی آواز ہی ہے۔‘‘ پائن نے کہا۔

’’تم نہیں سمجھتے کہ یہ آواز اسی مکان سے آئی ہے؟‘‘

’’ہمیں وہاں جاکر دیکھنا چاہیے۔ کیا وقت ہوا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اسے نوٹ کرلیں۔‘‘

’’بارہ بج کر بارہ منٹ۔‘‘ انتونیا نے کہا۔

’’مجھے جانا چاہیے۔‘‘ وہ عورت بولی۔ ’’ایک جگہ پہنچنا ہے۔‘‘

’’پلیز، ہمارے ساتھ چلو۔‘‘ انتونیا نے کہا۔ ’’ہمیں تمہاری مدد چاہیے شاید گواہی کی ضرورت پیش آجائے۔‘‘

تھوڑی ہی دیر میں وہ مکان پر پہنچ گئے۔ اس کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک موٹی عورت باتھ روم گاؤن پہنے پورچ میں نمودار ہوئی اور انہیں دیکھ کر قریب آنے کا اشارہ کیا۔

''ایڈن سوان۔'' انتونیا نے سرگوشی کی۔

''جینر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔'' پائن بولا۔ ''واقعی یہ بڑی خوفناک لگ رہی ہے۔''

وہ عورت اچانک پیچھے ہٹی اور اس کے ہاتھ سے کتوں کی زنجیر نکل گئی۔ ''دیکھو، اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔''

''اپنی جگہ کھڑی رہو۔'' پائن نے کہا۔

انہوں نے کتوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا لیکن کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی نظریں ایڈن پر تھیں جس نے اپنے ہاتھ میں ایک گن پکڑی ہوئی تھی۔

''مس سوان؟ مس ایڈن سوان؟'' پائن نے آواز لگائی۔

''کیا تم موسیقی کے کاروبار سے وابستہ ہو؟ آجاؤ، اس گن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میں نے ہنگامی حالت میں استعمال کی تھی۔''

انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی البتہ پائن آہستہ سے آگے بڑھا اور اونچی آواز میں بولا۔ ''پہلے تم یہ گن زمین پر پھینک دو۔''

اس نے گن پھینک دی۔ پائن چلتا ہوا اس کے نزدیک گیا اور وہ گن اٹھالی۔ انتونیا اور وہ عورت بھی اس کے پاس آگئیں۔

''کیا تمہارا تعلق میوزک بزنس سے ہے؟'' ایڈن نے دوبارہ پوچھا۔

''تم نے اس گن سے فائر کیا تھا؟''

''فون کام نہیں کررہا تھا۔ اس لیے ہنگامی حالت میں اس کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ شاید یہ میرے شوہر کی گن ہے۔ اس کے پاس کئی گنز ہیں لیکن وہ انہیں مقفل رکھتا ہے لیکن تم کون ہو؟''

''میرا نام ہگ پائن ہے۔ یہ میری بیوی انتونیا ہے اور یہ......''

''بیرل فلیچر۔'' عورت نے اپنا تعارف خود کرادیا۔

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟'' انتونیا نے پوچھا۔

''وہ اندر ہے۔''

''ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''میں واپس جانا نہیں چاہتی۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہارے شوہر سے ضرور ملنا چاہیں گے۔'' پائن نے سختی سے کہا۔

یہ کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ ''میں اندر جانا نہیں چاہتی، مجھے کچھ سوچنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ میرا ہمیشہ سے ہی قسمت پر یقین رہا ہے اور میرا ماننا ہے کہ جو ہونا ہے وہ ہوکر رہے گا اور یہ ہونا تھا۔ بینیٹ ہال میں ہے۔ میں اسے دوبارہ نہیں دیکھوں گی۔ مجھے خون پسند نہیں۔''

وہ ہال کے وسط میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر اونی گاؤن تھا اور زرد آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا، اس کے گنجے سر کے گرد سیاہ خون جمع ہوگیا تھا جو اس کی داہنی کنپٹی میں ہونے والے سوراخ سے بہہ رہا تھا۔

''اوہ میرے خدا۔'' مس فلیچر نے سرگوشی کی۔

پائن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل وہی حلیہ ہے جو جینر نے بیان کیا تھا۔ چپٹی ناک، چھوٹے کان اور انگلی میں بی جے کے نام کی انگوٹھی۔''

''اسے گولی ماری گئی ہے...... یہ کون ہے؟'' مس فلیچر نے پوچھا۔

''اس کا نام اسٹیوارٹ ہے لیکن یہ بنجمن جینر بنا ہوا تھا۔'' پائن نے وضاحت کی۔ بنجمن اس عورت کا شوہر تھا جو باہر کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا نام ایڈن سوان ہے۔''

''کیا اس نے ہی اسے گولی ماری؟ وہ فائر کرنے کا اعتراف کرچکی ہے۔ کیا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟''

''ہاں، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' پائن نے کہا پھر اس کی نظر اپنی بیوی پر گئی جو گھٹنوں کے بل لاش پر جھکی ہوئی تھی۔

''یہ تم کیا کررہی ہو؟ اس کے کانوں کے پیچھے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''وہی جو میرا خیال تھا۔'' انتونیا نے کہا۔ ''اور وہ درست نکلا۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا کیپٹن غلط کہہ رہا تھا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''اسٹیوراٹ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ اس کے چچا بنجمن جینر کی لاش ہے جو بینیٹ کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی شکل بنجمن سے نہیں ملتی۔''

''اس کی بھی ایک وجہ ہے۔'' انتونیا بولی۔ ''اس نے اپنی شکل تبدیل کرلی تھی۔ یہ دیکھو اس کے کانوں کے پیچھے

ٹانکے لگے ہوئے ہیں۔“

پائن نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”پلاسٹک سرجری؟“

”ہاں، اس نے پلاسٹک سرجری کروائی تھی۔“ یہ ایڈن سوان کی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے اپنا ذہن تبدیل کرلیا اور مکان کے اندر چلی آئی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ ”اس نے مجھے پلاسٹک سرجری نہیں کروانے دی اور میرے پیسوں سے خود کروالی۔ بہت ہی گھٹیا انسان تھا۔“

”اس نے پلاسٹک سرجری کیوں کروائی تھی؟“ پائن نے پوچھا۔

”وہ نہیں چاہتا تھا کہ دشمن اسے پہچان لیں۔ وہ کچھ انتہائی خطرناک لوگوں کے ساتھ کام کر چکا تھا اور اس پر ان کی کچھ رقم واجب الادا تھی۔ اس نے اپنے حصے سے زیادہ وصول کرلیا تھا اور اپنے ہی ساتھیوں سے بے ایمانی کررہا تھا۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بڑبڑاتا رہتا اور میں اس کی باتیں سن لیتی۔ پھر اس بچی کا واقعہ پیش آیا اور اسے دھمکی آمیز خطوط ملنا شروع ہوگئے جن سے وہ بہت خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے اپنا نام بدل کر کے اسٹیوارٹ رکھ لیا۔ ہم خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔ ہر بار ہم جب بھی کوئی مکان خریدتے تو وہ اسے مونگوز کا نام دے دیتا۔ یہ ماضی سے اس کا واحد تعلق رہ گیا تھا۔ میں اسے چھوڑنا چاہتی تھی لیکن مجھے ڈر لگتا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ مجھے تلاش کرکے زندہ دفن کردے گا۔“

”تم نے پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟“

”میں ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں نے زبان کھولی تو میں بھی اس کی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار ہوجاؤں گی اگر وہ جیل چلا گیا اور میں گرفتار ہونے سے بچ گئی تب بھی اس کا کوئی ساتھی میرا گلا کاٹ دے گا۔ میں نے اس کی بات کا یقین کرلیا۔ وہ مسلسل جھوٹ بول کر مجھے بہلاتا رہا۔ اس کی نظریں میرے پیسے پر تھیں لیکن اب اس کا اعصابی نظام بُری طرح متاثر ہوچکا تھا۔ وہ سو نہیں سکتا تھا اور رات کو اٹھ کر گھر سے باہر نکل جاتا۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے سانپوں نے گھیر رکھا ہے۔ کبھی کہتا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی چیز نہیں لیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے زہر دے رہی ہوں۔“

”کیا تم اسے زہر دیتیں؟“ مس فلیچر نے اچانک پوچھ لیا۔

”نہیں، میں اس سے ڈرتی تھی۔ وہ مجھے سزا دے کر خوش ہوتا تھا۔ مکے مارنا، نوچنا، بازو مروڑنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ جس دن میں ٹی وی پر آئی، اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ وہ بالکل پاگل ہوچکا تھا۔ بہرحال اب سب کچھ ختم ہوگیا۔ میں اپنے آپ کو اداس یا حیران ظاہر نہیں کرسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔“

”ہمیں پولیس کو فون کرنا چاہیے۔“ مس فلیچر نے میز پر رکھے ہوئے فون کو دیکھ کر کہا۔

”یہ کام نہیں کررہا۔“ ایڈن بولی۔ ”نہ جانے اس میں کیا خرابی ہوگئی ہے۔“

پائن میز تک گیا اور اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ ”اس کا تار نکلا ہوا ہے۔ کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں تھی؟“

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کبھی میز کے نیچے نہیں دیکھا۔ بڑی عجیب بات ہے، یہ ضرور بینٹ نے نکالا ہوگا۔ اس نے میرا موبائل بھی لے کر کہیں چھپا دیا تھا۔ جب سے وہ میوزک پروڈیوسر یہاں آیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ ہو۔ اس نے مجھے کمرے میں بند کرنے کی دھمکی دی اور انٹرنیٹ کا موڈیم نکال کر پھینک دیا۔ اس طرح میں بالکل الگ تھلگ ہوگئی۔“

”اب ہم کیا کریں گے۔ میرے پاس تو موبائل بھی نہیں ہے۔“ مس فلیچر نے کہا۔

”ہم بھی اپنے موبائل کار میں چھوڑ آئے ہیں۔“ انتونیا بولی۔ ”یہاں سے دس منٹ کا فاصلہ ہے، پائن کیا تم جا سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ پائن بولا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ ان کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔ ان میں سے کوئی نہیں چاہتا تھا کہ جب تک وہ یہ معما حل نہ کرلیں۔ اس وقت تک پولیس نہ آئے۔ انتونیا جانتی تھی کہ یہ خودغرضی اور غیر ذمے داری ہے۔ وہ اپنے آپ کو پولیس سے زیادہ ہوشیار سمجھ رہے تھے۔ یہ کوئی کھیل نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو قائل کیا کہ ایک سنگین جرم کی اطلاع نہ دینا خلافِ قانون ہے۔

ایڈن سوان، میجر پائن سے کہہ رہی تھی۔ ”تم دیکھ سکتے ہو کہ اس گن سے دو فائر ہوئے ہیں۔ میں باتھ روم میں نہا رہی تھی جب میں نے گولی کی آواز سنی۔ میں نے فوراً

گاؤن پہنا اور باتھ روم کا دروازہ کھول کر بینٹ کو آواز دی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت بارہ بجنے میں پانچ منٹ تھے پھر میں نیچے آئی اور میں نے بینٹ کی خون میں لت پت لاش دیکھی۔ گن اس کے برابر میں پڑی ہوئی تھی۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے آگے بڑھ کر وہ گن اٹھائی۔ بیرونی دروازہ کھولا اور ایک ہوائی فائر کیا۔''

''ہوائی فائر، وہ کیوں؟''

''لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے۔ یہ ایک طرح سے خطرے کا سگنل تھا۔ اس کے علاوہ کوئی بات میرے دماغ میں نہیں آئی۔ فون خراب ہے اور قریب میں کوئی پڑوسی بھی نہیں اور نہ ہی انٹرنیٹ چل رہا ہے۔ اگر میں پورچ میں کھڑے ہو کر چلاتی تو بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ مجھے کار چلانا بھی نہیں آتی۔ حالانکہ ہمارے پاس کار ہے لیکن اسے بینٹ ہی چلاتا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہم نے جو آواز سنی، وہ دوسرے فائر کی تھی؟''

''ہاں، شاید تمہیں اس کا خول کہیں مل جائے۔''

''جب تم نیچے آئیں تو کیا بیرونی دروازہ بند تھا؟''

''ہاں، یہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تمام کھڑکیاں بھی بند رہتی ہیں۔ اسی لیے تمہیں پہلی گولی کی آواز نہیں آئی۔''

میجر پائن گن اٹھا کر اسے چیک کرنے لگا۔ اسے اس بارے میں کافی معلومات تھیں۔ ''اس گن سے صرف ایک فائر ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔

''واقعی جبکہ دو فائر ہوئے تھے۔ تم سے غلطی ہوئی ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔''

ایڈن کی آواز بلند ہوگئی۔ ''بینٹ نے خود اپنے آپ کو گولی ماری۔ اس نے خودکشی کی ہے۔''

''میرا نہیں خیال کہ اس نے خودکشی کی ہے۔'' انتونیا نے کہا۔ وہ ٹوٹے ہوئے کافی کپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایک ہی ہاتھ میں کپ اور گن نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ زخم کی نوعیت بتا رہی ہے کہ گولی کم از کم پانچ فٹ کے فاصلے سے چلائی گئی ہے۔ اس نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے کسی نے گولی ماری ہے۔''

انتونیا ہال کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک دروازہ کچن میں کھل رہا تھا جسے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا اور جب وہ تھوڑا سا بائیں جانب ہوئی تو اس کی نظر عقبی دروازے پر گئی۔ وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے اسے باغ صاف نظر آ رہا تھا۔

''تم گن سے لگنے والے زخموں کے بارے میں اتنا زیادہ کیسے جانتی ہو؟'' ایڈن نے پوچھا۔

''میں نے اس پر ریسرچ کی ہے۔ یہ میرے کام کا حصہ ہے۔''

''کیا تم فارنسک ڈپارٹمنٹ میں کام کرتی ہو؟ نہیں، تم وہاں نہیں ہوسکتیں۔ پھر کیا کرتی ہو؟'' اچانک اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''اب یہ مت کہنا کہ تم جاسوسی کہانیاں لکھتی ہو۔''

انتونیا خاموش ہوگئی۔ اسے یہ اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی کہ واقعی وہ جاسوسی کہانیاں لکھتی ہے۔

ایڈن نے اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی اور بولی۔ ''اس گن پر میری انگلیوں کے نشانات ہیں اور اس سے ایک ہی فائر ہوا ہے جو میں نے باہر نکل کر ہوا میں کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بینٹ کو کسی دوسری گن سے نشانہ بنایا گیا۔ یقیناً قاتل دو گنز لے کر آیا ہوگا۔''

''تم نے کہا تھا کہ یہ گن تمہارے شوہر کی ہے۔'' پائن بولا۔ ''اور تمہارا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کے پاس کئی گنز تھیں۔''

''کیا تم مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ میرا خیال تھا جو غلط بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی گنز تالے میں بند کر کے رکھتا تھا۔''

''اسے اس وقت گولی ماری گئی جب وہ یہاں کھڑا کافی پی رہا تھا۔'' انتونیا نے کہا۔ ''اس کا ڈریسنگ گاؤن بے ترتیب نہیں ہے اور کسی قسم کی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آتے۔ وہ بے خبری میں مارا گیا۔ کچن کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جب تم فائر کی آواز سن کر نیچے آئیں تو کیا یہ اس وقت بھی کھلا ہوا تھا؟''

''کیا کچن کا دروازہ کھلا ہوا ہے؟'' ایڈن نے گھوم کر اس جانب دیکھا۔ ''واقعی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''باہر سے تمہارے گارڈن تک کیسے رسائی ہوسکتی ہے؟'' پائن نے پوچھا۔

''بیرونی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو عموماً مقفل رہتا ہے۔ بینٹ نے باغ کے گرد اونچی دیوار بنانے کے لیے ایک بڑی رقم خرچ کی تھی۔ اسے اپنی جان کا بہت خطرہ تھا۔''

''کیا ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟''

''بالکل۔''

''اوہ ڈیئر۔ اس طرح ہمارے قدموں کے نشانات ہر جگہ آ جائیں گے۔ شاید اس طرح ہم اہم ثبوت ضائع کر رہے ہیں۔'' مس فلیچر بولی۔ ''کاش میں ہائی گیٹ نہ آتی۔ اب نہ جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا۔''

''تم کہاں رہتی ہو؟'' انتونیا نے پوچھا۔

''ساؤتھ کنگسٹن۔ عام طور پر میں کنگسٹن گارڈن یا ریجنٹ پارک جاتی ہوں لیکن کسی نے مجھے بتایا کہ جانوروں کو کسی اور جگہ بھی لے جانا چاہیے۔ میں نے اپنی کار ہائی گیٹ ولیج میں ہی چھوڑ دی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے کتے واپس کار کی طرف ہی گئے ہوں گے۔'' انتونیا نے کہا۔

''تم پہلے اس مکان کے پاس سے گزر چکی تھیں؟''

''ہاں، لیکن میں نے کچھ دیکھا اور نہ سنا۔ سوائے اس لڑکے کے جو سائیکل پر تھا۔''

''وہ بعد میں آیا تھا۔'' انتونیا نے اسے یاد دلایا۔ ''جب ہم بھی تمہارے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔''

''میں نے اسے پہلے بھی مکان کے باہر ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتے دیکھا تھا۔'' مس فلیچر سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلانا بہت خطرناک ہے لیکن لگتا ہے کہ اسے خطرات سے کھیلنا پسند ہے۔''

کچن کی حالت بہت خراب تھی۔ جگہ جگہ گندے برتن پڑے ہوئے تھے اور فضا میں ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایڈن نے بتایا کہ پہلے ایک صفائی والی عورت آتی تھی لیکن بینیٹ نے اس سے بھی جھگڑا کیا۔ لان میں آ کر انہیں کچھ سکون ہوا گو کہ اس کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ دیوار کے دروازے میں ایک چابی لٹک رہی تھی لیکن وہ بھی کچن کے دروازے کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''یہاں سے قاتل مکان میں داخل ہوا اور چلا گیا۔'' ایڈن کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یقیناً دروازے کا تالا کھلا رہ گیا ہوگا۔ یہ میری ذمے داری نہیں تھی، بینیٹ خود ہی تمام دروازے اور کھڑکیاں چیک کرتا تھا۔''

میجر پائن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہارے شوہر کو کس نے قتل کیا؟''

''زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ کام اس کے کسی سابق ساتھی کا ہو سکتا ہے۔''

''تم نے دھمکی آمیز خطوط کا ذکر کیا تھا۔ تمہارا اشارہ

کس بچے اور کن خطوط کی طرف تھا۔''

''جس بچی کو اس نے گالف کی گیند مار کر ہلاک کیا تھا لیکن اسے حادثاتی موت قرار دیا گیا جس پر بچی کی ماں اور بارہ سالہ بھائی مطمئن نہیں تھا۔ تفتیش ختم ہونے کے بعد ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا۔ وہ لڑکا جو اپنی بہن کو بہت چاہتا تھا' وہ بینٹ سے الجھ گیا۔ پہلے تو وہ چپکے چپکے روتا رہا پھر اچانک ہی غصے میں آ گیا اور اس نے ایک تیز نوکدار پنسل سے بینٹ پر حملہ کر دیا جو اس کے بائیں گال پر لگی۔ بینٹ کو مرہم پٹی کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ گیا۔ محافظوں نے بمشکل لڑکے کو ہٹایا لیکن وہ مسلسل چلا چلا کر کہتا رہا کہ بینٹ کو قتل کر دے گا۔ ''میں قاتلوں کو مارتا ہوں۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' اس واقعے کے تین دن بعد پہلا دھمکی آمیز خط ملا اور اس کے فوراً بعد بینٹ نے وہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم اسکاٹ لینڈ چلے گئے لیکن وہاں بھی خط آتے رہے۔ ان میں صرف ایک ہی جملہ ہوتا تھا۔ 'میں قاتلوں کو مارتا ہوں'۔

''یہ تحریر ہاتھ کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اخبارات سے حروف کاٹ کر بنائی جاتی تھی۔ ان میں سے کچھ خطوط دستی بھی آئے۔ ان خطوں نے بینٹ کو پاگل کر دیا۔ شاید پلاسٹک سرجری کروانے کی بھی یہی وجہ ہو لیکن پھر بھی اسے سکون نہیں مل سکا۔ ہمیں ایک بار پھر مکان تبدیل کرنا پڑا۔ ہم ولٹ شائر چلے گئے لیکن وہاں بھی خط آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد ہم لندن آ گئے اور تین ماہ قبل اس مکان میں آئے۔ یہاں بھی خط آتے رہے۔''

''وہ کیا سمجھ رہا تھا کہ خط بھیجنے والا کون ہے؟ وہ لڑکا؟''

''ظاہر ہے کہ وہی تھا۔ وہ بینٹ کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی بہن کی موت کے صدمے سے باہر نہیں آ سکا۔ اب وہ غالباً سترہ سال کا ہو گا اور یہ بہت خطرناک عمر ہوتی ہے۔ مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہو گی اگر بعد میں یہ معلوم کہ بینٹ کو اسی لڑکے ڈینی نے قتل کیا ہے۔''

انتونیا کی نظروں کے سامنے وہ سائیکل والا لڑکا آ گیا۔ اس نے مس فلیچر کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ میں بھی یہی بات چل رہی ہے۔

پائن جھلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ لڑکا تمہاری نقل و حرکت سے باخبر تھا اور اسے تمہارا ہر ایڈریس معلوم ہو جاتا تھا لیکن یہ کیسے ممکن ہے جبکہ تم کہہ رہی ہو کہ کچھ خطوط دستی بھی آئے؟''

''ہاں بظاہر یہ ناقابلِ یقین بات لگتی ہے۔'' ایڈن نے کہا۔

انتونیا نے سوچا کہ ایڈن جھوٹ بول رہی ہے بلکہ وہ شروع سے ہی جھوٹ بول رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے یا پھر وہ قاتل کو جانتی ہے۔

''ہاں واقعی یہ ناقابلِ یقین ہے۔'' پائن نے کہا۔ ''بلکہ ناممکنات میں سے ہے۔''

''شاید اس کے ان اسٹیٹ ایجنٹس سے رابطے ہوں جن کی ہم نے خدمات حاصل کی تھیں۔''

''یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ تم لوگ کبھی ایک شہر میں نہیں رہے۔ وہ کس طرح دوسرے شہر کے ایجنٹوں سے رابطہ کر سکتا تھا۔''

''تمہارے شوہر نے پولیس کو ان خطوط کے بارے میں کیوں نہیں بتایا اگر وہ ان کی وجہ سے پریشان تھا؟'' انتونیا نے پوچھا۔

''اسے یہ پریشانی تھی کہ اگر پولیس اس معاملے میں پڑی تو اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کا پول کھول جائے گا۔ بینٹ پولیس سے بھی اتنا ہی خوف زدہ تھا جتنا کہ اپنے پرانے ساتھیوں سے لیکن سب سے زیادہ وہ اس لڑکے سے ڈر رہا تھا۔'' پھر وہ اچانک ہی پھٹ پڑی۔ ''تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا میری بات پر یقین نہیں آ رہا؟ یہاں آنے کے بعد بھی ہمیں دس مزید خط مل چکے ہیں۔''

''کیا وہ خط تمہارے پاس ہیں؟''

''ان میں سے کچھ ہیں۔ زیادہ تر بینٹ نے ضائع کر دیے۔ اس نے مجھ سے ان خطوط کو جلانے کے لیے کہا تھا لیکن میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیے۔ وہ اوپر میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ہیں، تم دیکھنا چاہو گے؟''

لیکن جیسے ہی ایڈن اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ انہوں نے ڈور بیل کی آواز سنی۔ باہر دروازے پر تین پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ اس مکان سے گولی چلنے کی آواز آئی ہے اور وہ اسی کی تفتیش کرنے آئے تھے۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے اطلاع دینے والے کو بھی دیکھ لیا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بائیسکل پر تھا اور اس نوعمر لڑکے کے نے سر پر اونی ہیٹ پہن رکھا تھا۔

دو دن بعد پائن اور کیپٹن جنیر ملٹری کلب میں بیٹھے

باتیں کررہے تھے۔ پائن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکے کا نام نکولس ہے اور اس کا موگوز میں ہونے والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ مقامی لڑکا ہے۔ یہ میں اس لیے بتارہا ہوں کہ انتونیا اسے پنکی کا بھائی سمجھ رہی تھی۔ پولیس والوں نے پوچھا کہ ہم نے انہیں بروقت اطلاع کیوں نہیں دی لیکن جب انہیں فون کی عدم دستیابی کے بارے میں بتایا گیا تو وہ مطمئن ہوگئے۔

''اخبارات نے بڑی تفصیل سے یہ خبر شائع کی ہے۔'' جینر نے سنڈے ٹیلی گراف کا شمارہ لہراتے ہوئے کہا۔ ''اس میں یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ دھمکی آمیز خطوط اس کی بیوی ایڈن بھیجا کرتی تھی۔ پولیس نے اس کے بستر کے نیچے سے میوزک میگزین کے پرانے کٹے پھٹے شمارے برآمد کیے جن سے وہ حروف کاٹا کرتی تھی اور انہیں جوڑ کر دھمکی آمیز پیغام بناتی تھی۔ جب اسے یہ شمارے دکھائے گئے تو اس نے اعتراف کرلیا کہ وہ اپنے شوہر کو پریشان کرنے کے لیے یہ خطوط بھیجا کرتی تھی جس نے اس کی زندگی جہنم بنادی تھی۔ اسے یہ خیال اس وقت آیا جب پنکی کے بھائی نے اس کے شوہر پر حملہ کیا اور دھمکیاں دیں۔ وہ پانچ سال سے اسے یہ خط بھیج رہی تھی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی لیکن اس نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کا الزام یکسر مسترد کردیا اور کہا کہ یہ کسی باہر والے کا کام ہے اور بظاہر لگتا بھی یہی ہے۔''

جینر نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''فارنسک والوں نے تصدیق کردی ہے کہ جس گن سے اس نے ہوائی فائر کیا اس سے انکل کو گولی نہیں ماری گئی۔''

''یہ بڑی عجیب بات ہے۔'' پائن بولا۔

''پولیس نے گھر اور آس پاس کا پورا علاقہ چھان مارا لیکن وہ گن تلاش نہ کرسکی جس سے انکل کو قتل کیا گیا۔ ان کی اپنی گنز اپنی جگہ موجود تھیں۔ یقیناً قاتل دو گنز لے کر آیا ہوگا۔ لیکن کیوں؟ جبکہ پولیس بھی اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ ایڈن بے گناہ ہے۔''

''نہیں، وہ بے گناہ نہیں ہے۔'' پائن نے کہا۔ ''اس نے اپنے شوہر کے قتل میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نے قاتل کو اپنے گھر آنے اور شوہر کو قتل کرنے کی دعوت دی۔''

جینر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس نے دعوت دی، وہ کیسے؟''

''یہ دعوت اس نے اپنے ٹی وی پروگرام where are they now کے ذریعے دی۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے انٹرویو کے دوران کئی غیر متعلقہ باتیں کیں۔ درحقیقت وہ غیر متعلقہ نہیں بلکہ واضح اشارے تھے۔ اس نے قاتل کو تمام ضروری معلومات فراہم کردیں۔ اس نے کہا کہ وہ اکثر کچن اور باغ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس نے مکان کا نام بھی بتادیا کہ یہ ہائی گیٹ میں قبرستان سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا شوہر اونی چارخانے کا ڈریسنگ گاؤن پہنتا ہے تاکہ قاتل اس کے بدلے ہوئے چہرے سے دھوکا نہ کھا جائے۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر قتل ہوجائے۔''

''کیا وہ قاتل کو جانتی تھی؟''

''نہیں، اس نے صرف یہ سوچ کر دعوت دی کہ شاید قاتل یہ پروگرام دیکھ رہا ہو اور ان اشاروں کے ذریعے وہ اس کے شوہر تک پہنچ جائے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کے بہت سے دشمن ہیں اور وہ اسے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔''

''کیا وہ خود اسے قتل نہیں کرسکتی تھی؟''

''نہیں، وہ اس سے خوف زدہ تھی۔'' پائن نے کہا۔ ''اگر وہ گولی چلاتی تو شاید اس کا نشانہ خطا ہوجاتا۔ اس کا شوہر اس کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں لیتا تھا۔ وہ اپنی حدود سے واقف تھی اور یہی توقع کررہی تھی کہ اس کے دشمنوں میں سے کوئی اس کا خاتمہ کردے۔''

کیپٹن جینر نے کہا۔ ''وہ قاتل کون تھا۔ کیا تم جانتے ہو۔ پنکی کا بھائی تو نہیں ہوسکتا کیونکہ اخبار کی اطلاع کے مطابق اس وقت وہ بچوں کی جیل میں ہے۔ وہ یقیناً اس کے پرانے ساتھیوں میں سے کوئی ہوگا۔''

''نہیں، وہ کوئی اور ہے۔ بالکل غیر متوقع۔'' پائن نے کہا۔

''لیکن وہ کون ہے جس کا پولیس ابھی تک سراغ نہیں لگا سکی؟'' جینر نے پوچھا۔ ''تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''تم اس قاتل کو جانتے ہو جینر؟'' پائن نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''میں...... میں اسے کیسے جان سکتا ہوں۔ اس سے میرا کیا تعلق؟''

''تعلق ہے، اسی لیے کہہ رہا ہوں۔'' پائن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہ تمہارے انکل کی سابق بیوی ہے۔ تمہاری چچی......''

''میری چچی......'' جینر ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ البتہ والدین سے سنا

ہے کہ انکل کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ وہ حاملہ تھی لیکن انکل کی بدسلوکی کی وجہ سے اس کا حمل ضائع ہو گیا۔ طلاق کے بعد وہ نظر نہیں آئی۔ البتہ ایک دفعہ میری ماں کو کلینک میں ملی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ بینٹ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

''تم نے اس کا نام روبی بتایا تھا؟''

''غالباً یہی تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔''

''نہیں۔ اس کا نام ببرل فلیچر ہے۔'' پائن نے کہا۔ ''وہ ہمیں راستے میں ملی تھی۔ اس کے ساتھ تین کتے بھی تھے۔'' پائن نے اپنی بات جاری رکھی۔ دوسرا فائر جب ہوا تو وہ ہمارے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ اس مکان کے آگے سے گزری تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے بھی اس مکان میں جا چکی تھی۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''اس کے سینٹ کی خوشبو سے۔'' انتونیا نے بتایا کہ اس میں سے دارچینی، اورنج اور ونیلا کی ملی جلی مہلک آرہی تھی جو کیک یا بسکٹ کی خوشبو سے ملتی جلتی تھی۔ جب ہم تینوں نے ایڈن سے اپنا تعارف کروایا تو وہ بے ساختہ بولی۔ ''مجھے وہ بسکٹ کی خوشبو دوبارہ محسوس ہورہی ہے۔'' اس نے دوبارہ کا لفظ استعمال کیا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جب وہ شوہر کے قتل کے فوراً بعد ہال میں آئی تو اس وقت بھی اس نے مس فلیچر کے سینٹ کی خوشبو محسوس کی تھی۔ سینٹ کی یہ خاصیت ہے کہ بند جگہ پر اس کی مہک دیر تک رہتی ہے۔''

پائن نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایڈن کا پروگرام دیکھنے کے بعد مس فلیچر کے دل میں دبی ہوئی نفرت کی چنگاری بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے سابق شوہر سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے پاس دو گنز ہیں۔ اس نے انہیں بیگ میں رکھا۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور کتوں کو لے کر ہائی گیٹ کے لیے روانہ ہو گئی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ہتھیار اس کے نام پر نہیں تھے اور اس نے غیر قانونی طور پر کہیں سے حاصل کیے ہوں گے۔''

''لیکن وہ دو ہتھیار لے کر کیوں آئی؟''

''ایک سے اس نے اپنے سابق شوہر کو قتل کیا اور دوسرا لاش کے پاس چھوڑ دیا تا کہ ایڈن سوان پر قتل کا الزام نہ آئے اور ایسا ہی ہوا۔ ایڈن نے اس سے ہوائی فائر کیا جبکہ پہلا فائر پولیس کے لیے ابھی تک معما بنا ہوا ہے۔''

جینر کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''اگر وہ قتل کرنے کے ارادے سے آئی تھی تو کتوں کو ساتھ لے کر کیوں نکلی؟''

''یہ بھی اس کا ایک نفسیاتی حربہ تھا تا کہ کتوں کی موجودگی میں کوئی اس پر شبہ نہ کرے اور یہی سمجھا جائے کہ وہ انہیں سیر کرانے کے لیے لائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے ان کتوں کو کسی درخت سے باندھا ہوگا۔ اسے باغ اور کچن کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ وہ ہال میں داخل ہوئی۔ اس کا سابق شوہر وہاں کھڑا ہوا کافی پی رہا تھا۔ مس فلیچر نے اس کے سر میں گولی ماری اور گن واپس بیگ میں رکھ لی اور دوسری وہیں لاش کے پاس پھینک دی پھر وہ جس راستے سے آئی تھی، اسی سے واپس چلی گئی۔''

''اس کی بدقسمتی کہ راستے میں ہم اسے مل گئے۔ جب ہم نے ہوائی فائر کی آواز سنی اور اس سے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ انکار نہ کرسکی ورنہ اس پر بھی شک کیا جاسکتا تھا۔ تاہم اس نے اس لڑکے کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔'' جینر بیزاری سے بولا۔ ''آخر اسے اتنے عرصے بعد انکل کو قتل کرنے کا خیال کیوں آیا؟''

''کیا اس نے تمہاری ماں سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ کبھی تمہارے انکل کو معاف نہیں کرے گی؟''

''ہاں لیکن وہ بہت پرانی بات ہے۔ اس کے اسقاط حمل کو پچاس برس ہو چکے ہیں۔'' جینر چلاتے ہوئے بولا۔ ''کیا کوئی عورت اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنے سابق شوہر سے بغض رکھ سکتی ہے؟''

''انتقام وہ ڈش ہے جسے ٹھنڈا کر کے کھانے میں مزہ آتا ہے۔ ویسے تو یہ ایک کہاوت ہے لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ انتقام کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوتی۔''

''کیا تم نے پولیس کو اپنی تحقیقات کے نتیجے سے آگاہ کیا؟'' کیپٹن جینر نے پوچھا۔

''نہیں، تمہاری طرح ہمارے بھی اس معاملے میں ملے جلے جذبات ہیں۔ تمہارے انکل اسی انجام کے مستحق تھے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے چھڑی کا الٹا سرا پکڑ رکھا ہو ویسے بھی ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے، صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ایڈن نے اس کے سینٹ کی مہک دو مرتبہ محسوس کی تھی۔ اس لیے ہمیں بھی ایڈن کی طرح قسمت کے لکھے کو قبول کر لینا چاہیے۔''

ناگزیدہ

عمران قریشی

کچھ لوگ نیکی کرتے ہیں... اور پھر یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کب شرانگیزی پر اتر آئیں گے... ایسے ہی ایک گھرانے کی داستاں... وہ نیکی کے خوگر تھے... اور ان کو ایسے نیک پرور لوگ مل بھی گئے... اور ان کی زندگی پُربہار ہو گئی... لمحوں میں باطن بدل لینے والوں کی احسان فراموشی...

بظاہر دوست نظر آنے والے موقع پرستوں کا اقدامِ جرم......

مشتاق احمد نے موبائل پر ڈاکٹر مہر النسا کا نمبر ملایا اور صوفے پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ چائے کی چسکیاں لینے میں مصروف تھا۔ موبائل پر بیل جا رہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر مہرو کال ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ وہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہیں تھیں۔ انہیں کال ریسیو کرنی چاہیے تھی۔ وہ شخص

اب اپنی پگڑی کو درست کر رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر تھی لیکن قابلِ رشک صحت کی بدولت اپنی عمر سے کم دکھائی دیتا تھا۔ موبائل میں ڈاکٹر مہرو کی آواز سنائی دی۔

''احمد صاحب خیریت تو ہے؟ آپ اس وقت تک جاگ رہے ہیں۔ رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔''

احمد صاحب عجلت کے عالم میں بولے۔ ''تم جہاں بھی ہو۔ ہر قسم کی مصروفیات کو ترک کر کے میرے بنگلے میں چلی آؤ۔ معاملہ نہایت گمبھیر ہے۔'' انہوں نے جواب سنے بغیر موبائل آف کر دیا اور اس شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے خان؟''

اس نے جیب میں سے نسوار کی ڈبی باہر نکالی اور چٹکی بھر کر مسوڑھوں کے پاس احتیاط کے ساتھ رکھنے کے بعد بولا۔ ''سربلند خان، منڈی چاوڑہ میں امارا چارے کا دکان تھا۔ سب ادھار کا نذر ہو گیا۔ امارا پاس ادھر آنے کا کرایہ نہیں تھا۔ کل ام نے اکلوتا بکرا قریبی منڈی میں جا کر بیچ دیا اور تمہارا پاس آ گیا۔''

احمد صاحب اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولے۔ ''شیریں گل کیسی ہے؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئی؟''

سربلند خان نے تاسف بھرے لہجے میں بتایا۔ ''اس کو مرے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ وہ بے چارہ بہت بیمار تھا۔ مرنے سے پہلے تیمور خان کو یاد کر کے روتا تھا۔ اور خدا سے اپنا گناہوں کا معافی مانگتا تھا۔''

احمد صاحب بولے۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ تم یہیں بیٹھو میں کھانا بھجواتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے آئے اور نوکر کو کھانا بھجوانے کا کہہ کر اپنی خواب گاہ میں آ گئے۔ ان کی بیوی تہمینہ بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ ان کے پہلو میں لیٹا ہوا تیمور احمد گہری نیند سویا ہوا تھا۔ احمد صاحب کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر تہمینہ نے پوچھا۔

''آپ کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہیں۔ خیریت تو ہے؟''

احمد صاحب نے جواب دیا۔ ''شیریں گل کا چھوٹا بھائی منڈی چاوڑہ سے آیا ہے اور تیمور کے متعلق بات چیت کا خواہش مند ہے۔ میں نے ڈاکٹر مہرو کو فون کر دیا ہے۔ وہ کچھ دیر میں آ جائیں گی۔ ہم معاملات طے کر لیں گے۔''

تہمینہ نے کمبل میں لیٹے ہوئے تیمور کو گود میں اٹھا کر سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور پریشان لہجے میں بولیں۔ ''وہ یقیناً تیمور کو واپس لے جانے کی نیت سے آیا ہو گا۔ اگر ایسا ہوا تو یاد رکھیے گا۔ میں تیمور کو واپس دینے سے صاف انکار کر دوں گی۔''

احمد صاحب جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''تمہاری وہمی طبیعت کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ سو جاؤ۔ اسے کچھ رقم درکار ہے۔ وہ لے کر واپس چلا جائے گا۔''

تہمینہ نے تیمور کو بیڈ پر لٹا دیا اور کمبل اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگیں۔ احمد صاحب کمرے سے باہر نکل آئے۔ نوکر نے انہیں ڈاکٹر مہرو کے آنے کی اطلاع دی اور وہ سٹنگ روم کی طرف چلے آئے۔ ڈاکٹر مہرو صوفے پر بیٹھی ہوئی سربلند خان کو کھانے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ احمد صاحب کو دیکھ کر انہوں نے اس کے متعلق دریافت کیا۔

احمد صاحب بولے۔ ''یہ سربلند خان ہے۔ منڈی چاوڑہ سے آیا ہے اور کہتا ہے کہ شیریں گل کا بھائی ہے۔''

ڈاکٹر مہرو نے حیرت بھری نگاہوں سے سربلند خان کے سراپا۔۔کا جائزہ لیا پھر غصیلے لہجے میں بولیں۔ ''بچے کی پیدائش کے بعد میں نے خود شیریں گل سے پوچھا تھا کہ اس کے آگے پیچھے کوئی والی وارث ہے تو اس کا نام معاہدے نامے میں تحریر کروا دے۔ لیکن شیریں گل نے انکار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کا خاندان لڑکی کی موت کے بعد ختم ہو گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم چھ مہینے گزرنے کے بعد یہ کہاں سے اٹھ کر چلا آیا ہے۔''

سربلند خان نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے سامنے رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے گلاس کو میز پر رکھ دیا اور احمد صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''صاحب امارا کام کر دو۔ ام واپس منڈی چاوڑہ جانا چاہتا ہے۔ ادھر رہنے کے لیے امارا پاس جگہ نہیں ہے۔''

احمد صاحب نے ڈاکٹر مہرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کو جانتے ہو خان؟''

سربلند خان نے انکار میں سر ہلایا۔

''شیریں گل کی لڑکی بی بی گل کا لڑکا تیمور ڈاکٹر مہر النسا کے میٹرنٹی ہوم میں پیدا ہوا تھا۔ پیدائش کے فوراً بعد بی بی گل کا انتقال ہو گیا۔ بچے کی نانی شیریں گل اسے پالنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے اس نے بچہ ہمیں دے دیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ وہ بچے کو واپس لینے کی کوشش نہیں کرے گی۔ کیونکہ بی بی گل کی وفات کے بعد

اس کے خاندان کی کفالت کرنے والا اور کوئی فرد باقی نہیں بچا۔''

سربلند خان بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے بولا۔ ''شیریں گل نے ایسا غصے میں کہا ہوگا۔ ایک سال پہلے ام دونوں کا درمیان لڑائی ہوا۔ ام ناراض ہوکر پشاور سے باہر چلا گیا اور بی بی جان کے مرنے پر بھی واپس منڈی چاوڑہ نہیں آیا۔ لیکن یہ ہونہیں سکتا کہ بہن کے مرنے پر بھی ہم شہر سے باہر ناراض ہوکر بیٹھا رہتا۔ پچھلے ہفتے جب ام واپس آیا تو شیریں گل کے گھر میں بچوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ان کے ذریعے ام کو تمہارا متعلق معلوم ہوا اور ام ادھر چلا آیا۔''

ڈاکٹر مہرو نے پوچھا۔ ''تمہیں احمد صاحب کا پتا کس سے معلوم ہوا؟''

''بی بی گل کے بچوں کو کلینک کے متعلق معلوم تھا۔ ادھر سے احمد صاحب کے گھر کا پتا معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔''

ڈاکٹر مہرو نے احمد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میٹرنٹی ہوم میں میرے علاوہ صرف میری ماتحت نرسیں اس بات سے آگاہ ہیں کہ آپ نے میرے میٹرنٹی ہوم سے بچہ گود لیا ہے۔ میں کل ان سے جواب طلب کروں گی، ابھی تو خان سے جان چھڑا کر دوسرے معاہدے کو تشکیل دینا ہوگا کہ اس مطالبے کی وصولی کے بعد وہ دوسرا مطالبہ کرنے کی کوششیں نہیں کرے گا۔''

احمد صاحب نے سربلند خان سے پوچھا۔ ''خان یہاں آنے کا مقصد بیان کرو تاکہ بات کو آگے بڑھایا جا سکے۔''

سربلند خان بولا۔ ''ام تم کو بتا چکا ہے کہ امارا چارے کا دکان ختم ہو گیا ہے۔ اگر ام اکیلا ہوتا تو غم نہیں تھا۔ لیکن شیریں گل کی وفات کے بعد اب بی بی گل کا چاروں بچوں کا ذمے داری ام پر ہے۔ ان کا پرورش کے لیے ام کو رقم درکار ہے۔''

ڈاکٹر مہرو نے پوچھا۔ ''تمہیں کتنی رقم درکار ہے۔''

خان نے جواب دیا۔ ''ایک لاکھ کا قریب۔''

احمد صاحب کے منہ سے اطمینان بھرا طویل سانس نمودار ہوا اور وہ بولے۔ ''میں تمہیں رقم دینے کے لیے تیار ہوں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم آئندہ مطالبہ لے کر بنگلے کا رخ نہیں کرو گے؟''

سربلند خان مستحکم لہجے میں بولا۔ ''یہ پٹھان کا زبان ہے۔ اگر تم اعتبار کر سکتا ہے تو ضرور کرو۔ رقم ملنے کے بعد ام دوبارہ تمہارے بنگلے کا رخ نہیں آئے گا۔''

احمد صاحب نے استفہامیہ نگاہوں سے ڈاکٹر مہرو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سربلند خان سادہ اور کھرا انسان دکھائی دیتا ہے۔ ہم اس کی زبان پر اعتبار کر سکتے ہیں۔''

احمد صاحب نے جیب میں سے چیک بک نکالی اور رقم لکھنے کے بعد چیک سربلند خان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ سربلند خان نے تشکر بھری نگاہوں سے احمد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور باہر جانے کی اجازت طلب کی۔

احمد صاحب نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی بولے۔ ''خان آج کی رات بنگلے کے کوارٹر میں ہی بسر کرلو، صبح بینک سے رقم نکالنے کے بعد منڈی چاوڑہ چلے جانا۔'' پھر ڈاکٹر مہرو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''بارہ بجنے والے ہیں۔ تم بھی آج رات بنگلے میں ہی ٹھہر جاؤ۔ صبح یہیں سے میٹرنٹی ہوم چلی جانا۔''

ڈاکٹر مہرو نے اثبات میں سر ہلایا اور احمد صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی کم رقم میں معاملہ طے ہو جائے گا۔ وہ لاکھوں کی امید رکھتے تھے۔ ایک لاکھ کی رقم پر تو بی بی گل کے بچوں کا حق بنتا تھا۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد انہوں نے نوکروں کو ڈاکٹر مہرو اور سربلند خان کے بنگلے میں رہنے سے متعلق ہدایات دیں اور اپنی خواب گاہ کی طرف چلے آئے۔

☆☆☆

دوسری صبح تہمینہ کے چیخنے چلانے کی آواز سے احمد صاحب کی آنکھ کھلی۔ انہوں نے ہڑبڑا کر تہمینہ کی خواب گاہ کا رخ کیا۔ بچہ گود لینے کے بعد احمد صاحب نے علیحدہ کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا۔ تیمور تمام رات روتا تھا۔ اس کے رونے سے احمد صاحب کی نیند میں خلل پیدا ہوتا تھا۔ حالانکہ چھ مہینے گزرنے کے بعد اب اس نے تنگ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تاہم احمد صاحب اب بھی علیحدہ کمرے میں ہی سوتے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے پر انہوں نے تہمینہ کو بیڈ پر بے ہوش پڑے ہوئے پایا۔ تیمور کمرے میں نہیں تھا۔ انہیں اپنے پیچھے ڈاکٹر مہرو کی آواز سنائی دی۔

''کیا معاملہ ہے احمد صاحب، تہمینہ کیوں چلائی تھی۔''

احمد صاحب بولے۔ ''تیمور کمرے میں نہیں ہے اور تہمینہ بیڈ پر بے ہوش پڑی ہے۔''

ڈاکٹر مہرو نے حیرت بھری نگاہوں سے بیڈ پر

آڑے ترچھے پڑے ہوئے تہمینہ کے وجود کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں۔ احمد صاحب کمرے سے باہر نکل کر سرونٹ کوارٹروں کی طرف آ گئے۔ بچے کی گمشدگی میں سربلند خان کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ سرونٹ کوارٹر کے قریب انہیں نوکر اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ انہوں نے اس سے سربلند خان کے متعلق دریافت کیا۔

نوکر بولا۔ ''میں کوارٹروں کی طرف سے ہو کر آ رہا ہوں۔ وہ وہاں نہیں ہے۔ کوارٹر خالی پڑا ہے۔''

احمد صاحب کو اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ خان ایک لاکھ کے چیک کے ساتھ بچے کو بھی ہمراہ لے کر فرار ہو گیا تھا۔ انہیں اپنی بے وقوفی پر غصہ آنے لگا۔ سربلند خان کو رقم دینے میں انہیں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ واپس سٹنگ روم میں آ گئے اور فون پر پولیس تھانے میں رپورٹ درج کروانے لگے۔

ڈاکٹر مہرو کی طرح انسپکٹر شیراز سے بھی ان کی دیرینہ شناسائی تھی۔ حالات سے آگاہی کے بعد اس نے جلد از جلد بنگلے کی طرف آنے کی ہامی بھری۔ احمد صاحب نے موبائل آف کر دیا اور خواب گاہ میں چلے آئے۔ ڈاکٹر مہرو، تہمینہ کو دلاسا دینے میں مصروف تھیں۔ وہ غم سے نڈھال تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بارش کے قطروں کی طرح برس رہے تھے۔ احمد صاحب ڈاکٹر مہرو کی طرف دیکھتے ہوئے پریشان لہجے میں بولے۔

''سربلند خان بچے کو لے کر فرار ہو گیا ہے۔ میں نے انسپکٹر شیراز کو فون کر دیا ہے۔ اس نے جلد آنے کا وعدہ کیا ہے۔''

ڈاکٹر مہرو بولیں۔ ''بنگلے میں اس کے لیے کچھ زیادہ نہیں رکھا۔ اسے فون کر کے کہیے کہ منڈی چاوڑہ میں جا کر اسے تلاش کرے۔ وہ یقیناً وہیں جانے کی کوشش کرے گا۔''

احمد صاحب بولے۔ ''میرے خیال میں وہ اب تک وہاں سے آگے نکل گیا ہو گا۔ انسپکٹر شیراز کو اپنی تفتیش کا آغاز بنگلے سے کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر مہرو بولیں۔ ''وہ بچے کے ساتھ زیادہ دور نہیں جا... پائے گا۔ اس کی تلاش میں مدد منڈی چاوڑہ سے ہی مل سکتی ہے۔''

احمد صاحب نے دوبارہ انسپکٹر شیراز کا نمبر ملانا شروع کیا اور رابطہ ہونے کے بعد اسے منڈی چاوڑہ کے متعلق بتانے لگے۔ پھر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ پندرہ منٹ گزرنے کے بعد نوکر نے انسپکٹر شیراز کے آنے کی اطلاع دی۔ احمد صاحب سٹنگ روم سے نکل کر گیٹ کی طرف چلے آئے۔ گیٹ کے پاس پولیس کی جیپ سے انسپکٹر شیراز نیچے اتر رہا تھا۔ اس کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان تھی۔ روایتی پولیس والوں کی طرح جسم موٹا اور بھدا نہیں تھا۔ وہ دبلا پتلا اور خوب صورت شخصیت کا مالک تھا۔ احمد صاحب سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ سٹنگ روم میں آ گیا۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد اس نے بچے کے اغوا کے متعلق دریافت کیا۔

احمد صاحب بولے۔ ''گزشتہ رات بچے کی نانی کا بھائی بنگلے میں آیا اور اس نے رقم کا مطالبہ کیا۔ میں نے رقم ادا کرنے کے بعد اسے بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں رات گزارنے کی اجازت دے دی۔ صبح وہ بچے کے ہمراہ فرار ہو گیا۔''

انسپکٹر شیراز نے پوچھا۔ ''اسے فرار ہوتے ہوئے کسی نے دیکھا؟''

احمد صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔ ''چونکہ سربلند خان اور بچہ بنگلے سے ایک ساتھ غائب ہوئے ہیں اس لیے بچے کے اغوا میں خان ملوث ہو سکتا ہے۔''

انسپکٹر نے پوچھا۔ ''بچے کا سربلند خان کے علاوہ اور کوئی سرپرست یا والی وارث جو اسے واپس لینے کا خواہشمند ہو؟''

اس دفعہ ڈاکٹر مہرو نے جواب دیا۔ ''بچے کی ماں کی وفات سے چھ ماہ قبل اس کا شوہر روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا تھا۔ ڈلیوری کے دوران ماں بھی مر گئی اور بچوں کی ذمے داری کا بوجھ ان کی نانی کے کاندھوں پر پڑ گیا۔ اس نے مالی حالات سے دلبرداشتہ ہو کو تیمور کو مستحق گھرانے کے سپرد کرنے کی رضامندی کا اظہار کیا۔ اس وقت تک سربلند خان کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ کل رات اس نے انکشاف کیا کہ وہ بچے کی نانی کا بھائی ہے اور ناراض ہو کر منڈی چاوڑہ سے باہر چلا گیا تھا۔ بہن کی وفات کے بعد اسے بحالتِ مجبوری منڈی چاوڑہ آنا پڑا۔''

ڈاکٹر مہرو کے خاموش ہونے پر انسپکٹر بولا۔ ''میں بنگلے کے تمام نوکروں، چوکیدار اور ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں سٹنگ روم میں بلا لیجیے۔''

احمد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد چار عدد نوکروں کے علاوہ چوکیدار اور

ڈرائیور سٹنگ روم میں انسپکٹر کے سامنے کھڑے تھے۔ انسپکٹر نے ان سے معمول کے سوالات پوچھے اور مایوس ہونے کے بعد واپس جانے کا حکم دے دیا۔ تہمینہ کی آرام گاہ سے بھی کوئی خاص ثبوت دستیاب نہ ہو سکا۔ انسپکٹر نے فنگر پرنٹ کے عملے کو کال کیا اور انہیں آرام گاہ کے دروازے پر سے نشانات لینے کی ہدایات دیں۔ اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اس کا ماتحت تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ سربلند خان بی بی گل کے بچوں کو ساتھ لے کر منڈی چاوڑہ سے فرار ہو گیا ہے۔ انسپکٹر نے اسے حکم دیا کہ وہ مکان کے اردگرد رہنے والے رہائشیوں سے پوچھ گچھ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے اسے فرار ہوتے ہوئے دیکھا ہو۔ اس کا بیان سربلند خان کی تلاش میں معاون ہو سکتا ہے۔'' ہدایات دینے کے بعد انسپکٹر نے موبائل بند کر دیا اور سامنے بیٹھے ہوئے احمد صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔'' کل رات آپ نے سربلند خان کو رقم نقدی کی صورت میں ادا کی تھی یا پھر چیک لکھ کر دیا تھا؟''

احمد صاحب نے بتایا۔'' ایک لاکھ کا چیک دیا تھا۔''

انسپکٹر نے دوبارہ پوچھا۔'' کیا آپ نے بینک والوں سے اس بات کی تصدیق کی کہ سربلند خان چیک کیش کروانے کے لیے بینک گیا تھا؟''

احمد صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

انسپکٹر بولا۔'' یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ آپ کو فون کر کے بینک منیجر کو مطلع کر دینا چاہیے تھا۔ اس صورت میں وہ رقم لے کر فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر مناسب وقت پر کارروائی کی جاتی تو اسے بہ آسانی گرفتار بھی کیا جا سکتا تھا۔ بہرکیف آپ فون کر کے بینک منیجر سے رقم کے متعلق دریافت کیجیے۔ اس کے بعد مزید پیش رفت کی جائے گی۔''

احمد صاحب نے موبائل پر بینک منیجر کا نمبر ملانا شروع کیا اور رابطہ ملنے کے بعد اس سے سربلند خان کے متعلق دریافت کیا۔ منیجر نے انہیں بتایا کہ وہ بینک کھلنے سے قبل باہر بیٹھا ان کا منتظر تھا اور چیک کیش کروانے کے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب واپس چلا گیا تھا۔ احمد صاحب نے موبائل بند کر دیا اور انسپکٹر کو تفصیل سے آگاہ کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد فنگر پرنٹ کی رپورٹ موصول ہو گی۔ دروازے پر احمد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر مہرو اور نوکروں کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے لیکن سربلند خان کے ہاتھوں کے نشانات نہیں تھے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ واردات کرنے سے قبل اس نے ہاتھوں پر دستانے پہن لیے ہوں۔ ایک دفعہ پھر انسپکٹر کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اس کا ماتحت تھا۔ اس نے چونکا دینے والے لہجے میں بتایا کہ سربلند خان کو بچوں سمیت گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن تیمور اس کے پاس سے دستیاب نہیں ہو سکا۔ سربلند خان کو پولیس اسٹیشن لایا جا رہا ہے۔ انسپکٹر شیراز نے موبائل آف کر دیا اور احمد صاحب کو سربلند خان کی گرفتاری کے متعلق بتانے لگا۔ احمد صاحب کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات تھے۔ وہ سربلند خان کو مجرم گردانے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ محسوس نہیں کر رہے تھے لیکن سب کچھ ان کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ انسپکٹر شیراز کے ہمراہ پولیس اسٹیشن آ گئے۔ ڈاکٹر مہرو، تہمینہ کے پاس رک گئیں۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے کے کچھ دیر بعد سربلند خان اور چاروں بچوں کو ان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ سربلند خان کے چہرے پر شرمندگی بھرے تاثرات تھے اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

انسپکٹر شیراز نے تلخ لہجے میں پوچھا۔'' خان بچہ کہاں ہے؟''

سربلند خان نے حیرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ '' اس کا متعلق ام کو کیا معلوم؟ احمد صاحب بہتر بتا سکتا ہے۔''

'' کل رات تم احمد صاحب کے بنگلے سے بچہ لے کر فرار ہوئے۔ فرار کے بعد تم نے بینک میں سے ایک لاکھ روپے کا چیک کیش کروایا اور منڈی چاوڑہ کے قریبی علاقوں میں روپوش ہونے کی کوشش کی۔ تمہاری بدقسمتی کہ بی بی گل کے بچوں نے تمہارے فرار کے منصوبے سے ہمسائیوں کے بچوں کو آگاہ کر دیا۔ اس لیے تمہیں بہ آسانی گرفتار کر لیا گیا۔ اب فوراً سے بیشتر تیمور کو ہمارے حوالے کر دو۔''

سربلند خان نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ '' صاحب تم جو بول رہا ہے۔ امارا سمجھ سے باہر ہے۔ اگر ام نے بچے کو اغوا کرنا ہوتا تو اغوا سے پہلے رقم کا مطالبہ کیوں کرتا۔ اغوا کے بعد ام جتنا رقم احمد صاحب سے مانگتا اس کو دینا پڑتا۔ ایک لاکھ تو معمولی رقم ہے۔'' اس کی بات میں سچائی تھی لیکن فرار ہونے والی حرکت مشکوک تھی۔

انسپکٹر نے پوچھا۔'' تم کل رات احمد صاحب کو بتائے بغیر بنگلے سے چلے گئے تھے۔ اگر بچے کے اغوا میں ملوث نہیں تھے۔ تب تمہیں یوں خاموشی کے ساتھ منڈی چاوڑہ جانے کی کیا ضرورت تھی۔''

سربلند خان بولا۔'' احمد صاحب کے گھر میں رات

گزارنا امارا لیے شرمندگی کا باعث تھا۔ اگر امارا پاس رہائش کا بندوبست ہوتا تو ام کبھی بھی اس کا گھر میں رات نہیں گزارتا۔ اس لیے صبح سویرے بنگلے کو چھوڑ کر منڈی چاوڑہ چلا گیا۔''

انسپکٹر شیراز نے غیر مطمئن انداز میں احمد صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سربلند خان کا بیان مشکوک دلائل پر مشتمل ہے۔ میں اسے تفتیشی ٹیم کے حوالے کیے دیتا ہوں۔ سچ جلد از جلد سامنے آجائے گا۔''

احمد صاحب پریشان لہجے میں بولے۔ ''میری تم سے درخواست ہے کہ خان پر تشدد نہ کرنا۔ یہ مجھے بے گناہ دکھائی دیتا ہے۔ اگر تفتیش بول چال تک محدود رہے تو بہتر ہوگا۔''

انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ بوڑھوں پر تشدد کرنا ہمارا شیوہ نہیں ہے لیکن میرے خیال میں خان کسی نہ کسی حد تک جرم میں ملوث ہے۔ اس لیے پوچھ کچھ ضروری ہے۔'' احمد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور پولیس اسٹیشن سے واپس بنگلے میں چلے آئے۔ ڈاکٹر مہرو میٹرنٹی ہوم جا چکی تھیں۔ روانگی سے قبل انہوں نے تہمینہ کو نیند کا انجکشن لگا دیا تھا۔ وہ آرام گاہ میں نیم بے ہوش پڑی تھی۔

دوسرے دن احمد صاحب کو انسپکٹر شیراز کی فون کال موصول ہوئی۔ اس نے انہیں تھانے آنے کے لیے کہا۔ تہمینہ کی طبیعت ناساز تھی۔ احمد صاحب اسے بنگلے میں تنہا چھوڑ کر باہر نہیں جانا چاہتے تھے لیکن حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے انکار کرنا مناسب نہیں جانا۔ اس لیے نوکروں کو ہدایات دینے کے بعد تھانے چلے آئے۔ انسپکٹر شیراز ان کا منتظر تھا۔ انہیں دیکھتے ہی بولا۔

''احمد صاحب آپ کے لیے میرے پاس کچھ اچھی خبر نہیں ہے۔ سربلند خان نے جرم کا اقرار کرلیا ہے۔ آج صبح اس نے جو بیان دیا ہے۔ اس کے مطابق ایک لاکھ کی رقم بہ آسانی ملنے کے بعد اس کے دل میں مزید رقم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے بچے کو اغوا کیا اور چیک کیش کروانے کے بعد منڈی چاوڑہ چلا گیا۔ چھ مہینے کے بچے کو معقول انتظام کیے بغیر اپنے پاس رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بچے کو ہلاک کر کے اس کی لاش کو منڈی چاوڑہ کے قریب واقع کھائی میں پھینک دیا اور قریبی شہر کی طرف فرار ہونے کی کوشش کی۔ لیکن راستے میں ہی دھر لیا گیا۔ بیان ریکارڈ کرنے کے بعد میں نے اپنے ماتحتوں کو منڈی چاوڑہ کی طرف روانہ کیا۔ اب سے کچھ دیر پہلے بچے کی لاش کو کھائی سے دریافت کرلیا گیا ہے۔''

احمد صاحب حواس باختہ انداز میں انسپکٹر شیراز کی باتیں سن رہے تھے۔ بچے کی ہلاکت کی اطلاع ان کی توقع کے برخلاف تھی۔ اس لیے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئے۔

انسپکٹر شیراز تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ''احمد صاحب حوصلہ کیجیے۔ اگر آپ ہمت ہار گئے تو تہمینہ کو کون سنبھالے گا۔ بچے کی لاش اس قابل نہیں ہے کہ اسے آپ کے سامنے لایا جائے۔ جسم پر موجود کپڑے اور گلے میں پہنی ہوئی چوسنی آپ کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں۔ آپ انہیں پہچان کر سربلند خان کے بیان پر تنقید اور تردید کر سکتے ہیں۔''

اس نے میز کے نیچے پڑے ہوئے ڈبے میں سے تیمور کے خون آلود کپڑے، زنجیر سے بندھی ہوئی چوسنی اور گلے میں پہنا ہوا تعویذ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ احمد صاحب اس تعویذ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ تعویذ کے اندر بچے کے نام سے لکھا ہوا قرآنی آیتوں کا مجموعہ سربند تھا۔ چوسنی اور کپڑے بلاشبہ تیمور کے تھے۔ خون آلود کپڑوں کو دیکھ کر احمد صاحب کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''تیمور کی موت کے متعلق تہمینہ کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ وہ دل کی مریضہ ہے، اس صدمے کو جھیل نہیں پائے گی۔''

انسپکٹر شیراز نے انہیں دلاسا دیا۔ ''سب کچھ آپ کے حسبِ منشا ہوگا۔ سربلند خان سے ایک لاکھ کی رقم حاصل کر لی گئی ہے۔ جاتے وقت ساتھ لیتے جایئے گا۔ کچھ قانونی کارروائیوں کے لیے آپ کو ایک دو دفعہ مزید تھانے میں آنے کی زحمت گوارا کرنا ہوگی لیکن میں کوشش کروں گا کہ کیس کی فائل کو جلد از جلد مکمل کرنے کے بعد سربلند خان کو حوالات میں بھجوا دوں۔''

احمد صاحب نڈھال قدموں کے ساتھ تھانے سے باہر آگئے۔ بنگلے میں تہمینہ کے پاس ڈاکٹر مہرو موجود تھیں۔ احمد صاحب نے انہیں بچے کی موت کی خبر سے مطلع کیا۔ ڈاکٹر مہرو نے بتایا کہ تہمینہ کا شوگر لیول حد سے تجاوز کرتا جا رہا ہے اس لیے اسے ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے موت کی خبر کو اس سے پوشیدہ رکھنا بہتر ہوگا۔ احمد صاحب بچے کی ہلاکت کے بعد خود بھی نڈھال دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر مہرو نے انہیں نیند کی گولیاں دیں اور اپنے میٹرنٹی ہوم چلی گئیں۔

دوسری صبح احمد صاحب کو موبائل پر غیر معروف نمبر

ناگزیدہ

IN

OUT

اس لڑکے کا مطلب ہے کہ مجھے نکال دیا گیا ہے؟

سے پیغام موصول ہوا۔

''تیمور زندہ ہے۔ اس کی بازیابی کے لیے ہمارے اگلے پیغام کا انتظار کرو۔ پولیس کو مطلع کرنے کی صورت میں بچے کی جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔''

احمد صاحب نے نمبر ملا کر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پیغام بھیجنے کے فوراً بعد نمبر بند کر دیا گیا تھا۔ تاہم پیغام کے ملنے سے احمد صاحب کو خوشی محسوس ہوئی۔ تیمور زندہ تھا اور سربلند خان کا بیان جھوٹ پر مبنی تھا۔ انسپکٹر شیراز کے تشدد سے بچنے کے لیے اس نے مجبوراً یہ بیان دیا تھا۔ وہ اگلے پیغام کا شدت کے ساتھ انتظار کرنے لگے۔ چار بجے کے قریب انہیں دوسرا پیغام موصول ہوا، لکھا تھا۔

''پچاس لاکھ کی رقم بڑے بیگ میں بند کر کے منڈی چاوڑہ چلے آؤ۔ مزید ہدایات کے لیے وہاں پہنچ کر انتظار کرو۔''

پچاس لاکھ بہت بڑی رقم تھی اور تیمور کے زندہ ہونے کی کوئی حتمی دلیل ابھی تک واضح نہ ہوسکی تھی۔ تاہم دل کو مطمئن کرنے کے لیے وہ اندھا جوا کھیلنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ تہمینہ کو نیند کی گولیاں دینے کے بعد انہوں نے بینک منیجر کو فون کیا اور اسے بڑے نوٹوں پر مشتمل پچاس لاکھ کی رقم کو بیگ میں منتقل کرنے کی ہدایت دی۔ پھر چیک لکھنے کے بعد بینک کی طرف روانہ ہو گئے۔ منڈی چاوڑہ کا شہر سے فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا لیکن شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ انہیں رات ہونے سے قبل یہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس لیے مختصر بینک کارروائی کے بعد انہوں نے عجلت کے عالم میں سفر کا آغاز کیا اور سوچنے لگے۔

'ہوسکتا ہے کہ پیغام جھوٹ پر مبنی ہو۔ وہ تیمور کے خون آلود کپڑوں کو پولیس اسٹیشن میں دیکھ چکے تھے۔ اگر وہ واقعی ہلاک ہوگیا تھا تو پھر یوں جذباتی ہو کر ان کا منڈی چاوڑہ کی طرف جانا عقلمندی کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ اس کے علاوہ مجرموں کا منڈی چاوڑہ کا انتخاب کرنے کے بعد سربلند خان کی شخصیت ایک دفعہ پھر مشکوک ہوگئی تھی۔ تیمور کے اغوا میں تربیت یافتہ گروہ کے ملوث ہونے کا امکان تھا اور سربلند خان ان کا معمولی مہرہ ہوسکتا تھا۔ ان کی سوچوں کا سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا اور موبائل پر پیغام موصول ہوا۔ انہوں نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دیا اور چھت پر لگی ہوئی لائٹ کو آن کر کے پیغام پڑھنے لگے۔ لکھا تھا۔

''تمہاری گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اگلے موڑ پر واقع پل کے پاس بیگ کو ہاتھوں میں تھام کر کھڑے ہو جاؤ۔ رقم وصول کرنے کے بعد بچہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔''

پیغام پڑھنے کے بعد احمد صاحب نے بیک مرر پر نگاہ دوڑائی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھومتی ہوئی سڑک کو عبور کر کے پہاڑی پل کی طرف بڑھنے لگے۔ سورج غروب ہوگیا تھا اور اب ملگجا اندھیرا طاری ہونے لگا تھا۔ موڑ مڑتے ہی پل دکھائی دینے لگا۔ انہوں نے پل کے قریب گاڑی روک دی اور رقم سے بھرا ہوا بیگ ہاتھوں میں تھام کر نیچے اتر آئے۔ اسی وقت ان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر نگاہ دوڑانے پر انہیں تہمینہ کا نمبر دکھائی دیا۔ پریشانی کے عالم میں انہوں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف تہمینہ کی متوحش آواز سنائی دی۔

''مشتاق میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاتا چلا جا رہا ہے۔ جلدی بنگلے کی طرف

آؤ۔"

احمد نے اسے تسلی دی اور جلدی آنے کی حامی بھرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب انہوں نے ڈاکٹر مہرو کا نمبر ملانا شروع کیا۔ اتنی جلدی بنگلے تک واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر مہرو کا میٹرنٹی ہوم بنگلے کے قریب تھا۔ انہیں تہمینہ کی طبیعت کے متعلق مطلع کرنے کے بعد بنگلے کی طرف جانے کی گزارش کی جاسکتی تھی۔ فون پر بیل جانے لگی۔ اسی وقت انہیں اپنے پیچھے گاڑی کے ٹائروں کی ہلکی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ شیشوں والی ٹیوٹا آہستگی سے رینگتی ہوئی ان کے قریب آکر رک گئی۔ گاڑی کے اگلے دروازے کا شیشہ نیچے ہوا۔ پچھلی سیٹ سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ آواز بلاشبہ تیمور کی تھی۔ اسی وقت ڈاکٹر مہرو کے موبائل پر بیل جانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیوٹا کے اندر کا ماحول موبائل کی گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نقاب پوش نے ہڑبڑا کر کار کے ڈیش بورڈ سے موبائل اٹھایا اور بٹن دبا کر اسے آف کر دیا۔ احمد صاحب کے موبائل سے جاتی ہوئی بیل بھی یکلخت منتشر ہوگئی۔ گاڑی کے اندر پرفیوم کی زنانہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو جانی پہچانی تھی۔ انہیں زیادہ سوچنے کا موقع نہ مل سکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نقاب پوش کے ہاتھوں میں ریوالور دکھائی دینے لگا۔ وہ ہاتھوں میں سیاہ دستانے پہنے ہوئے تھا۔ آنکھیں سیاہ چشمے کے پیچھے پوشیدہ تھیں۔ اس نے اشارے سے احمد صاحب کو بیگ اگلی سیٹ پر رکھنے کے لیے کہا۔ احمد صاحب نے حکم کی تعمیل کی۔ پرفیوم کی خوشبو نے ایک دفعہ پھر انہیں بے چین کیا۔ لیکن نقاب پوش نے پچھلے حصے میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے اٹھانے کے لیے کہا۔ احمد صاحب نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور کمبل میں لپٹے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا کر دروازہ جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ ٹیوٹا تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ بچہ لگاتار روئے جا رہا تھا۔ انہوں نے کمبل ہٹا کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور مطمئن ہونے کے بعد سرخوشی کے عالم میں اپنی گاڑی کی طرف چل دیے۔

اگلی صبح انہوں نے نادرا کے آفس کا رخ کیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر توقیر اسلم کے ساتھ ان کی گہری شناسائی تھی۔ توقیر نے ان کے آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب انہوں نے کاغذ پر لکھا ہوا موبائل نمبر ان کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس نمبر کی بائیومیٹرک تصدیق کے متعلق معلومات درکار ہیں۔ یہ نمبر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہے۔"

توقیر نے نمبر چپراسی کے حوالے کیا اور اسے معلومات کے لیے کمپیوٹر سیکشن کی طرف روانہ کر دیا پھر احمد صاحب سے معاملے کے متعلق دریافت کیا۔

احمد صاحب بولے۔ "صرف شک کی بنا پر کوئی حتمی بات کہنے کے قابل نہیں ہوں۔ ثبوت دستیاب ہونے کے بعد تمہارے ساتھ تفصیلی بات چیت کروں گا۔"

کچھ دیر بعد چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں پرچی پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے پرچی توقیر صاحب کے سامنے رکھ دی۔

احمد صاحب نے عجلت کے عالم میں پرچی کو اٹھایا اور اس پر لکھے ہوئے نام پر نگاہ دوڑائی۔ ان کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹنے لگیں۔ پرچی پر وہ نام تحریر تھا جس کے لیے سم رجسٹرڈ کی گئی تھی۔ اور وہ نام خلافِ توقع انسپکٹر شیراز کا تھا۔ لیکن یہ نمبر رقم کی وصولی کے وقت ڈاکٹر مہرو کے پاس تھا۔ یعنی ڈاکٹر مہرو بھی اغوا میں ملوث تھیں۔ احمد صاحب کو درحقیقت شبہ ڈاکٹر مہرو پر ہی تھا۔ انسپکٹر شیراز کا نام غیر متوقع طور پر سامنے آگیا تھا۔ گزشتہ روز رقم دینے سے قبل اور تہمینہ کی طبیعت خراب ہونے کے بعد جب احمد صاحب نے ڈاکٹر مہرو کو فون کرنے کی کوشش کی تب وہ رقم کی وصولی کے لیے تیمور کے ہمراہ کار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ چہرے کو سیاہ کپڑے سے ڈھانپے، آنکھوں پر چشمہ لگائے اور ہاتھوں میں دستانے پہننے کی وجہ سے وہ نقاب پوش کی جنس کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگا پائے تھے۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی کی بدولت ڈاکٹر مہرو کے موبائل پر احمد صاحب کا رابطہ اس وقت ممکن ہوا۔ جب وہ احمد صاحب کے سامنے ٹیوٹا کار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تب انہوں نے عجلت کے عالم میں موبائل کو آف کر دیا۔ لیکن ان کی مخصوص پرفیوم کی خوشبو نے راز فاش کر دیا۔ پچھلے دن موصول ہونے والے تمام پیغام احمد صاحب کے موبائل میں ثبوت کے طور پر موجود تھے اور جس نمبر سے انہیں بھیجا گیا تھا۔ وہ نمبر انسپکٹر شیراز کے نام رجسٹرڈ تھا۔ انسپکٹر شیراز سے ڈاکٹر مہرو کے مراسم کے متعلق معلوم کرنے کے لیے کسی بڑے محکمے کا تعاون ضروری تھا۔ ایف آئی اے میں ان کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ احمد صاحب نے توقیر کے ساتھ مصافحہ کیا اور ایف آئی اے کے آفس کی طرف چل دیے۔

▲▲▲

بڑے لوگ

منظر امام

ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی اپنی ایک الگ شناخت ہو... دور سے دیکھتے ہی لوگ اسے پہچان لیں... ایسے ہی چند دوستوں کی بیٹھک... بیٹھے بٹھائے ایک خواہش نے ان کے دل و دماغ میں جنم لیا... اور وہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے...

لبوں پر تبسم بکھیر دینے والی کہانی کے پرمزاح موڑ......

تینوں سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اکبر، بالے اور شیدے۔ ایک بہت بڑی پرابلم تھی جوان کے سامنے تھی۔

پرابلم یہ تھی کہ جس گاؤں کے وہ لوگ رہنے والے تھے، اس گاؤں میں ابھی تک کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوا تھا۔ سب کے سب عام سے لوگ تھے۔ کھیتی باڑی کرنے والے، یا چھوٹے موٹے دکاندار۔ جن کو صرف گاؤں کے لوگ ہی جانتے تھے۔

اکبر بتارہا تھا۔ ”بھائیو! میں جب ہری پور گیا تو پتا چلا کہ وہاں تو ایک سے ایک بڑے لوگ پیدا ہو چکے ہیں۔ جیسے غلام کمہار۔ جس کے بنائے ہوئے مٹی کے برتن شہر تک جاتے تھے۔ اور بھی بہت سے لوگ۔ بس ایک ہمارا گاؤں ہے۔“

”لیکن اکبر بھائی، ہم کو تو برتن بنانا نہیں آتا۔“ بالے نے کہا۔

”ابے ہم کوئی اور کام تو کر سکتے ہیں نا جس سے گاؤں کا

نام روشن ہو۔ اور ہمیں بھی عزت ملے۔"

"میری سمجھ میں ایک بات آ رہی ہے۔" شیدے نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"کیوں نا ہم سلطانہ ڈاکو بن جائیں۔" شیدے نے کہا۔

"کیا پاگل ہو گیا ہے۔ ہم سلطانہ ڈاکو کیسے بن سکتے ہیں۔" اکبر بھنّا کر بولا۔ "ہمارے نام الگ الگ ہیں۔ سلطانہ ڈاکو تو ایک ہی تھا۔ میں نے بھی اس کی کہانی پڑھی ہوئی ہے۔"

"پوری بات تو سُن لو۔ ہم تینوں مل کر ایک نام رکھیں گے۔ جیسے کمپنی ہوتی ہے۔"

"ترکیب تو اچھی ہے لیکن کمپنی کیا ہوگی؟" شیدے نے پوچھا۔

"اس کا نام ہوگا۔ چراغ کا جن۔"

"کیسی بے تکی بات کر رہا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ چراغ کا جن۔"

"پوری بات تو سنو۔ میں نے شہر جا کر دیکھا ہے۔ وہاں لوگ انوکھے نام رکھتے ہیں۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کی طرف دھیان دینے لگتے ہیں۔ چراغ کا جن بھی ایک انوکھا نام ہوگا۔ ہماری کمپنی مشہور ہو جائے گی۔"

"ابے ہم کوئی سامان بیچنے کا پروگرام نہیں بنا رہے۔" اکبر نے کہا۔ "سلطانہ ڈاکو بننے جا رہے ہیں۔ تو ایسی ترکیب بتا رہا ہے کہ دوسرے ہی دن ہم پولیس کی نظروں میں آ جائیں۔"

"ایک تو تم میں یہ بُری عادت ہے اکبر بھائی کہ تم پوری بات نہیں سنتے۔" شیدا جھلا کر بولا۔ "دیکھو اس کا فائدہ کیا ہوگا۔ جب ہم تینوں چراغ کے جن کے طور پر مشہور ہو جائیں گے تو سب پر ہماری دہشت ہو جائے گی۔ پھر ہم جس کو بھی لوٹنے کا پروگرام بنائیں گے، اس کو بس ایک خط بھیج دیں گے۔ وہ ڈر جائے گا۔"

"ابے تو کیا ہم باقاعدہ خط و کتابت کر کے لوٹا کریں گے؟"

"اور کیا؟ ہمیں سلطانہ ڈاکو کی روایت کو زندہ رکھنا ہے۔"

"لیکن ہم لوٹیں گے کس کو؟ گاؤں میں تو سب کنگلے ہی ہیں۔"

"آس پاس کے لوگوں کو۔" شیدے نے بتایا۔

"لیکن سلطانہ ڈاکو تو لوٹنے کے بعد سارے پیسے غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔" بالے نے کہا۔

"ہم بھی یہی کریں گے۔"

"ابے تو کیا ہمارا دماغ خراب ہے جو اتنی محنت بھی کریں اور جو ملے اسے بانٹ بھی دیں۔" اکبر جھلّا کر بولا۔

"اکبر بھائی! ذرا ٹھنڈے ہو کر سوچو۔ کیا اس طرح ہمارے گاؤں کا نام روشن نہیں ہوگا؟ ہر جگہ کہا جائے گا کہ ہمارے گاؤں میں ایک ایسا گروہ ہے جو لوٹی ہوئی رقم غریبوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ہر طرف واہ واہ ہوگی۔ غریبوں کی دعائیں ملیں گی۔"

"نام روشن ہونے کے ساتھ ساتھ اسی روشنی میں پولیس ہمیں تلاش کرتی ہوئی ہمارے گھروں تک پہنچ جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" شیدے اطمینان سے بولا۔ "کیونکہ ہم سارا کام پولیس کی مرضی سے کریں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تو بالکل ہی پاگل ہو چکا ہے۔"

"نہیں اکبر بھائی، بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" شیدے نے کہا۔ "ہم تھوڑا حصہ پولیس کو بھی دیں گے۔ اس طرح وہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی۔"

تینوں پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ترکیب اچھی تھی۔ اس طرح گاؤں کا نام روشن ہو سکتا تھا۔

کئی سوالات ان کے سامنے تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ پولیس والوں سے کیا کہا جائے۔ دوسری بات یہ تھی کہ کیا پولیس والے اس بات کے لیے راضی ہو جائیں گے؟ اور تیسری بات یہ تھی کہ ان کے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ کس طرح لوٹا کریں گے۔

طے یہ پایا کہ پہلے پولیس والوں سے بات کی جائے۔ تینوں دوسرے دن تھانے پہنچ گئے۔ یہ تھانہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر بنایا گیا تھا۔

اس دن تینوں نے صاف کپڑے پہن رکھے تھے۔ تھانے کے گیٹ پر پہنچ کر ان کی ہمت جواب دے گئی .... اکبر نے کہا۔ "بالے پہلے تو اندر جا۔"

"اکبر بھائی! مجھے تو ڈر لگتا ہے ....۔" بالا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ "یہ مشورہ شیدے نے دیا تھا، پہلے اس کو بھیج دیں۔"

شیدے بھی پھیل گیا تھا۔ وہ اکیلے جانے کو راضی نہیں تھا۔ پھر طے ہوا کہ تینوں ہی ایک ساتھ اندر جائیں گے۔

تینوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی دو خون خوار شکل کے پولیس والے بیٹھے تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ "آؤ...... آؤ...... بسم اللہ...... بسم اللہ۔"

تینوں ان پولیس والوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''ہاں جی کس کو مار کر آئے ہو؟'' ایک نے پوچھا۔
''نہیں جی ہم تو کسی کو مار کر نہیں آئے۔'' اکبر نے کہا۔
''تو پھر کیوں آئے ہو؟''
''جناب عالی۔ ہم لوگوں نے اپنے گاؤں کے نام کو مشہور کرنے کی ایک ترکیب سوچی ہے۔'' شیدے نے کہا۔
اتنی دیر میں وہاں دو چار پولیس والے اور آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ''ہاں جی بتاؤ، کیا ترکیب ہے گاؤں کو مشہور کرنے کی؟''
''جناب! ہم سلطانہ ڈاکو کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔'' اکبر نے کہا۔
''کھل کر بتاؤ، کیا کرو گے؟'' پولیس والوں کو اب ان کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔
''جناب! جس طرح سلطانہ ڈاکو پیسے والوں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ ہم بھی وہی کریں گے۔'' بالے نے بتایا۔
پولیس والوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ انہیں ایک مسئلے کا حل نظر آنے لگا تھا۔
اس دوران تھانہ انچارج بھی وہاں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''اس سے کیا ہو گا؟''
''جناب! اس سے اپنے گاؤں کا نام دور دور تک مشہور ہو جائے گا کہ اس ملک میں ایک ایسا بھی گاؤں ہے جہاں کے ڈاکو امیروں سے دولت لوٹ کر غریبوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ اپنا گاؤں... ہر جگہ جانا جائے گا۔''
''واہ، واہ! یہ تو بہت اچھی ترکیب ہے۔'' ایک پولیس والے نے مذاق اڑایا۔
''سر جی۔'' ایک پولیس والے نے انچارج کو متوجہ کیا۔ ''ہم لوگ کب سے شانی نگر کے ڈاکوؤں کو تلاش کر رہے ہیں نا جنہوں نے بہت بڑا ڈاکا ڈالا تھا۔''
''ہاں، یہ تو ہے جس میں لاکھوں روپے لوٹ لیے گئے تھے اور ابھی تک ڈاکوؤں کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ اوپر والے بھی ناراض ہو رہے ہیں۔''
''سر کیوں نہ ان بندوں کا امتحان لے لیا جائے۔'' وہ پولیس والا مکارانہ انداز سے بولا۔
''ہاں۔'' انچارج کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''میں ان لوگوں کو اس ڈاکے میں اندر کروا دیتا ہوں۔''
انچارج ان تینوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''دیکھو، تم تینوں کے ارادے بہت نیک ہیں۔ تم بہت اچھا کام کرنے جا رہے ہو۔''

''جی جناب۔'' وہ تینوں خوش ہو گئے تھے۔
''چونکہ یہ کام بہت بڑا ہے۔ اسی لیے اس کا امتحان بھی بہت بڑا ہو گا۔''
''ہم ہر طرح حاضر ہیں جناب۔'' شیدے جلدی سے بولا۔
''تم تینوں نے ایک ڈاکا ڈالا تھا اور جو کچھ ملا وہ غریبوں میں بانٹ دیا۔''
''لیکن ہم نے تو ابھی تک کوئی ڈاکا نہیں مارا۔'' اکبر بوکھلا کر بولا۔
''یہی تو سمجھانا ہے تمہیں۔'' انچارج نے کہا۔ ''وہ ڈاکا ڈالا جا چکا ہے اور وہ ڈاکا تم تینوں نے مل کر مارا تھا۔ خود سوچو، تمہاری کتنی شہرت ہو جائے گی۔''
''وہ تو ہو جائے گی جناب لیکن وہ دولت جو لوٹی گئی تھی، اس کا کیا ہو گا؟''
''وہ تم تینوں نے شہر جا کر بانٹ دی ہے۔''
''ہم نے تو ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔'' شیدے نے کہا۔
''ارے بے وقوف، تمہاری اور تمہارے گاؤں کی شہرت ہو جائے گی۔''
''لیکن ہمیں کرنا کیا ہو گا؟''
''کچھ نہیں بس عدالت کے سامنے جا کر بیان دینا ہو گا کہ تم تینوں سلطانہ ڈاکو کے پیروکار ہو۔ امیروں کو لوٹتے ہو اور غریبوں کی مدد کرتے ہو۔ یہی ہے نا تمہارا مشن؟''
''جی جناب، مشن تو یہی ہے لیکن ہم تو بلاوجہ اندر ہو جائیں گے جبکہ ہم نے ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے۔''
''یہی تو کمال ہو گا تمہارا۔ تم اپنے گاؤں کا نام روشن کرنے نکلے ہو تو اس قسم کی دشواریاں تو ہوں گی لیکن تم اپنے گاؤں کے ہیرو کہلاؤ گے۔''
تینوں آپس میں مشورہ کرنے لگے... پھر تینوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے جیسا کہا جا رہا ہے۔ ان تینوں نے انچارج سے کہا۔ ''جناب، آپ جو کہیں گے، ہم وہ ماننے کو تیار ہیں۔''
''شاباش۔'' تھانے دار نے تھپکی دی۔ ''یہ ہوئی نا عقلمندی کی بات۔ اب تم تینوں ترقی کرنا شروع کر دو گے۔ کل صبح ہی تمہیں عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔''
انچارج کے حکم پر ان تینوں کو لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔
''یارو، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے گاؤں کی شہرت کے چکر میں پھنس گئے ہوں۔'' بالے نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہاں بھائی، مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' اکبر نے کہا۔

''تو پھر ایسا کرتے ہیں اس چکر سے جان چھڑا لیتے ہیں۔'' شیدا... بھی بول اٹھا۔ ''اگر عدالت پہنچ گئے تو لمبے جائیں گے۔کیا کچھ بھی نہیں اور سال دو سال کی قید الگ بھگتنی ہوگی۔'' ان تینوں نے فیصلہ کر کے شور شروع کر دیا۔

ان کا شور سن کر دو پولیس والے آ گئے۔ ''اوئے، کس بات کا شور ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

''بھائی صاحب، ہمیں اس امتحان میں نہیں پڑنا، جہنم میں گئی گاؤں کی شہرت۔ ہمیں جانے کی اجازت دی جائے۔''

''اجازت تو ہم نہیں دے سکتے۔''

''پھر کون دے سکتا ہے؟''

''تھانہ انچارج۔'' بتایا گیا۔ ''وہ دو دن کی چھٹی پر چلے گئے ہیں۔''

''پھر ہم دو دنوں تک کیا کریں گے؟''

''اسی لاک اپ میں رہو گے۔ اور تیسرے دن خود اعلان کرو گے کہ وہ ڈاکا تم تینوں نے ہی ڈالا تھا۔''

اس وقت تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی لیکن رات بھر کی ٹھکائی کے بعد سمجھ میں آ گئی تھی۔

ان تینوں سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اس تھانے میں کئی پولیس والے تھے جو رات بھر باری باری تینوں کی ٹھکائی کرتے رہے تھے۔

صبح ان کے چہرے سوجے ہوئے تھے۔ ان کی آوازیں بھیک مانگ رہی تھیں۔ ایک پولیس والا ان کے لیے چائے لے کر آ گیا تھا۔ ''یہ لو چائے۔'' اس نے کہا۔ ''یقین کرو کہ اس تھانے میں ہم سارے پولیس والے بہت مہربان اور ہمدرد ہیں۔ ہم انسان کو انسان سمجھتے ہیں۔ ان سے جانوروں والا سلوک نہیں کرتے، ہم بھی انسان ہیں۔''

''بھائی۔'' اکبر کراہتا ہوا بولا۔ ''اگر تمہاری ہمدردی ایسی ہے تو تمہارا غصہ کیا ہوتا ہوگا؟''

پولیس والا ہنس پڑا۔ ''جلدی سے چائے ختم کرو، صاحب بلا رہے ہیں۔''

''کون صاحب؟''

''انچارج صاحب......اور کون؟''

''تم نے تو بتایا تھا کہ وہ دو دنوں کی چھٹی پر گئے ہیں۔'' شیدے نے کہا۔

''ہاں چلے گئے تھے لیکن تم تینوں کی ہمدردی میں واپس آ گئے ہیں۔''

ان تینوں نے کسی نہ کسی طرح چائے ختم کی اس کے بعد انہیں انچارج کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ان سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایک ہی رات میں ان کی حالت خراب ہو چکی تھی۔

انچارج ان تینوں کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ ''ہاں بھائی، رات تو آرام سے رہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''صاحب! ہم نے کیا قصور کیا تھا...؟'' بالا باقاعدہ رونے لگا تھا۔ ''ہم نے تو آپ سے صرف مشورہ مانگا تھا۔ اس کی یہ سزا ملی ہے ہمیں۔''

''او ہو لگتا ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔'' انچارج نے کہا۔ ''خیر یہ بتاؤ وہ ڈاکا تم لوگوں نے ہی ڈالا تھا نا؟''

''ہاں، صاحب ہم نے ہی ڈالا تھا۔'' اکبر فرفر بولنے لگا تھا۔ ''ہم تینوں کا گروپ ہے۔ ہمارا کام ہی یہی ہے۔''

''شاباش، اب یہ بھی بتا دو کہ تم نے اپنے گروپ کا کیا نام رکھا ہے؟''

''سلطانہ ڈاکو گروپ۔'' بالے نے بتایا۔

''بہت اچھے جا رہے ہو، شاباش۔ اب یہ بتاؤ، مدن پور میں جو سونے کی دکان پر ڈکیتی پڑی تھی وہ کس نے کی تھی؟''

''ہم ہی لوگوں نے کی تھی صاحب۔'' شیدے نے کہا۔

''بہت اچھے۔'' انچارج مسکرا دیا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ صبح تم تینوں اپنے ہر جرم کا اقرار کرنے لگو گے۔''

''کچھ جرم اور بھی ہیں صاحب۔'' اکبر نے کہا۔

''چلو وہ بھی بتا دو۔''

''بوسنیا میں مسلمانوں پر جو ظلم ہوا تھا' اس میں بھی ہمارا ہاتھ تھا۔'' شیدے نے کہا۔

''ونڈرفل اور بتاؤ۔''

''برما میں جو اتنے مسلمان مارے جا رہے ہیں، اس میں بھی ہماری سازش ہے۔''

''نہیں اب ہم اتنے بھی بے رحم نہیں ہیں کہ اس قسم کی واردات میں تمہارا نام شامل کر دیں۔'' انچارج نے کہا۔ ''بس اتنا ہی ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ کل عدالت میں جا کر اپنا بیان لکھوا دینا اور بیان وہی ہونا چاہیے جو میں نے بتایا ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا صاحب۔'' شیدے لرزنے لگا تھا۔

ان تینوں کو پھر لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔ تینوں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''بھائی، یہ گاؤں ... کی شہرت کی کہانی کس نے شروع کی تھی؟'' اکبر نے پوچھا۔

''اکبر بھائی، کیوں بھول رہے ہو؟'' شیدے نے کہا۔ ''تم نے ہی شروع کی تھی۔ کہہ رہے تھے کہ ہر جگہ بڑے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں کیوں نہیں ہوتے؟''

''اور یہ پولیس والوں کے پاس آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟''

''یہ شیدے نے دیا تھا۔'' بالے نے بتایا۔

''ارے بھائی، میں نے تو احتیاطاً کہا تھا کہ پولیس والوں کو بھی ساتھ ملالیں تو اچھا ہوگا۔''

''دیکھ لیا ساتھ ملانے کا انجام۔''

''اکبر بھائی، اب کیا ہوگا؟''

''وہی ہوگا جو ان کی مرضی ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''اب ہم کو ہر حال میں جیل ہی جانا ہوگا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''کیا ہم بیان بھی وہی دیں گے جو ہم سے کہا گیا ہے؟''

''مجبوری ہے۔'' اکبر بولا۔ ''میرا تو جوڑ جوڑ درد کررہا ہے۔ لگتا ہے جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔''

شام کے وقت گاؤں ـــــ کے کچھ لوگ ان کی مدد کرنے آگئے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ ان کے کچھ بے وقوف نوجوان تھانے میں بند ہوگئے ہیں۔ ان میں سے ظہور کاکا کو ان سے ملنے کی اجازت دے دی گئی تھی... ظہور کاکا کو دیکھتے ہی وہ تینوں رونے دھونے لگ گئے۔ ''کاکا، ہمیں یہاں سے نکالو۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔ ساری رات ہماری ٹھکائی ہوئی ہے۔''

''لیکن کیوں؟ تم تینوں نے کیا جرم کیا ہے؟''

''کاکا! ہم اپنے گاؤں کا نام روشن کرنے چلے تھے۔'' اکبر نے کہا۔

''نام روشن کرنے چلے تھے؟ وہ کیسے؟''

''کاکا! بات یہ ہے کہ ہم نے سوچا کہ گاؤں ... میں اب تک کوئی مشہور بندہ نہیں گزرا ہے۔ اسی لیے ہم نے سوچا کہ کیوں نا ہم تینوں ہی کوئی ایسا کام کرجائیں کہ پورے ملک میں ہمارا اور گاؤں ... کا نام روشن ہوجائے۔''

''یہ تو چلو نیک خواہش ہے لیکن تم تینوں تھانے میں کیوں بند ہوگئے؟''

ان تینوں نے روتے کراہتے ہوئے ساری کہانی سنا دی۔ ظہور کاکا بھی یہ داستان سن کر حیران رہ گیا تھا۔ ''بے وقوفو! یہ تم نے کیا کیا۔ اب کسی طرح کوئی راستہ نکالنا ہوگا۔ اگر عدالت پہنچ گئے تو لمبے ہی جاؤ گے۔''

''نہیں کاکا، ہم کو عدالت ہی جانے دو۔'' اکبر نے کہا۔ ''ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہم عدالت میں پیش ہوں گے۔''

''بے وقوفو، عدالت میں تمہیں سزا ہوجائے گی۔''

''ہونے دو کاکا، ہم نے یہی سوچا ہے۔ اپنی بے وقوفی کی سزا تو ملے۔''

دوسرے دن انہیں عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کردیا گیا۔ عدالت کو بتایا گیا۔ ''جناب! یہ تینوں انتہائی خطرناک مجرم ہیں۔ انہوں نے سلطانہ ڈاکو کے نام سے ایک گروہ بنا رکھا ہے... گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ لیکن اس ـــــ کے علاوہ آس پاس کے نہ جانے کتنے گاؤں میں ڈاکے ڈال چکے ہیں۔ اندازہ ہے کہ انہوں نے اب تک پچاس ساٹھ لاکھ کی ڈکیتی ڈال دی ہے۔''

''کیا تم تینوں کو اپنے جرم کا اعتراف ہے؟'' عدالت نے پوچھا۔

''جی ہاں، جناب والا۔'' شیدے نے کہا۔

''تم نے جو پچاس ساٹھ لاکھ ڈاکے میں حاصل کیے تھے، وہ کہاں ہیں؟''

''کیا بتاؤں جناب والا۔ اگر ہم نے بتا دیا تو ہماری جانوں کو خطرہ ہوجائے گا۔ ہم کہیں کے نہیں رہیں گے، ہم کو مار دیا جائے گا۔''

''یہ عدالت اس بات کی ذمے داری لیتی ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''جناب! اگر ایسی بات ہے تو ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ سارے پیسے ایس ایچ او صاحب نے ہم سے لے لیے۔'' اکبر نے کہا۔

''اتنا ہی نہیں جناب والا۔'' شیدے بولنے لگا۔ ''ہمارے پاس کوئی بیس پچیس لاکھ کے زیورات بھی تھے۔ وہ ان پولیس والوں نے ہتھیا لیے۔ محنت ہم نے کی اور سب کچھ ان لوگوں کے پاس چلا گیا۔''

عدالت میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ایس ایچ او اور دوسرے پولیس والے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی کہ ....

ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک گروپ کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔ مقامی تھانے دار اور کچھ پولیس والے اس گروپ کی سرپرستی کرتے تھے۔ لاکھوں کی رقم تھانے کو دی جاتی تھی۔ اس گروپ نے اپنا نام سلطانہ ڈاکو رکھا تھا۔ عدالت کے حکم سے تھانے دار اور دوسرے پولیس والوں کو گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلایا جارہا ہے۔ اس دن پہلی بار کسی اخبار میں گاؤں ... کا نام شائع ہوا تھا۔ گاؤں والے اب یہ بات فخر سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے گاؤں میں بھی بڑے لوگ پیدا ہوچکے ہیں۔

انگارے

طاہر جاوید مغل

بتیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ناقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا

پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی شیخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ویسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرزمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرزمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پیرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کردی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارا قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کردیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آ چکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسنہ آ چکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کردیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ اجنبی چہرے کے ساتھ ہی سیف کے گھر تک آ پہنچا تھا۔ اصل مقصد میرا تاجور کا حصول تھا میں اس تک پہنچنا چاہتا تھا اس کے گھر والوں نے داراب فیملی میں اس کا رشتہ طے کردیا تھا مگر اہلِ خاندان اس سے ناخوش تھے۔ آہستہ آہستہ میں سیف کے گھر والوں کے دل میں جگہ بنا رہا تھا بالآخر وہ وقت آ گیا تھا کہ سیف کے گھر پر اس کی موت کا انکشاف کردیا جائے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرے سینے میں عجیب ہلچل مچ گئی تھی۔ تاجور کا نکاح اور رخصتی...... اور وہ بھی بس ایک دو روز کے اندر؟ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ داراب طاقت کے نشے میں کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائیں گے۔ انہوں نے تاجور کے والد دین محمد صاحب کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں کرلیا تھا۔ رہی سہی کسر دین محمد صاحب کی اپنی ضد نے پوری کردی تھی اور وہ اپنی بیٹی اور اپنے دیگر اہلِ خانہ کی مرضی کے بالکل خلاف، آناً فاناً اس رشتے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔

تو کیا...... تاجور بالآخر ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ محبت کا وہی انجام جو طے شدہ ہوتا ہے اور آخرکار محبت کرنے والوں کو دبوچ لیتا ہے؟

نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اسے پانے کے لیے آخری حد تک جاؤں گا۔ بے شک وہ بہت کھل کر اظہار نہیں کرتی لیکن مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے اردگرد کی دیواریں ڈھا دوں اور اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنالوں۔ اس سے پہلے اگر ہماری محبت کی کشتی کو کنارہ نہیں مل سکا تھا تو اس کی سب سے بڑی وجہ میں خود تھا۔ مجھے اپنے مستقبل کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ میں ہر وقت ان وحشی قدموں کی چاپ سنتا تھا جو میرے جسم کو روندنے اور پامال کرنے کے لیے میری طرف بڑھ رہے تھے لیکن اب ایک کرشمہ ہوا تھا۔ میں اپنے ماضی کی خونخوار پرچھائیوں سے دور ہو گیا تھا۔ میرے اور ان پرچھائیوں

کے درمیان ایک دبیز پردہ آ گیا تھا۔ اب میں ایک نئے روپ میں ایک نئی زندگی جینے کی آس اپنے اندر پال سکتا تھا۔

''نہیں تاجور...... میں تمہیں اس طرح دارج دارابی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

چند ہی منٹ بعد میں دوبارہ مولوی حبیب صاحب کے حجرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ابھی رات کے دس ہی بجے تھے اور مجھے مسجد کے خادم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ مولوی صاحب حجرے میں ہی ہیں اور نوافل وغیرہ پڑھ رہے ہیں۔

میری دوسری دستک پر مولوی صاحب نے اپنی دستار درست کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے طویل سانس لی، بولے۔ ''میں سمجھا پولیس والے مجھے اپنا مہمان بنانے کے لیے، لینے آ گئے ہیں۔'' ان کے لہجے میں ایک تشویش آمیز کیفیت تھی۔

میں نے کہا۔ ''مولانا، ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ شاید میں نے آپ کی عبادت میں خلل ڈالا ہے۔''

وہ بولے۔ ''چلو اب خلل ڈال ہی دیا ہے تو اندر آ جاؤ۔ ویسے خیریت ہی ہے ناں؟''

''جی مولانا، خیریت ہی ہے۔ بس ایک سخت الجھن تھی اور یہ الجھن ہی مجھے اس طرح بے وقت اٹھا کر آپ کے پاس لے آئی۔ ایک بار پھر معافی کا خواستگار ہوں۔''

انہوں نے میرا کندھا تھپکا اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نرم چٹائی پر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر تسبیح اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہے تھے، کہنے لگے۔ ''جب تم پر نظر ڈالتا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ تم کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہو۔ اپنا درد چھپاتے ہو لیکن وہ لہر مار مار کر تمہاری آنکھوں تک آتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''مولانا! گستاخی معاف، میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں آپ سے کچھ رہنمائی لینا چاہتا ہوں۔''

''بولو...... بولو۔'' انہوں نے حوصلہ بخش انداز میں کہا۔

''مولانا، یہ دارابیوں اور دین محمد صاحب والے حالات دیکھ کر میرے اپنے دکھ میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے اپنے حالات بھی ان حالات سے بے حد ملتے جلتے ہیں۔''

''کھل کر بتاؤ۔'' انہوں نے کہا۔ ''جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ شاید اسی طرح جب کسی سے کوئی شرعی مسئلہ پوچھا جائے تو اس کو مکمل بات بتانی چاہیے۔''

میں نے چند لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ''میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں جی...... بالکل پاک اور کھری محبت...... اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ پانچ چھ برس گزر چکے ہیں، وہ بھی دل و جان سے مجھے چاہتی ہے۔ لیکن یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا ہے جو دین محمد صاحب کی طرف ہو رہا ہے۔ لڑکی کا والد ایک امیر گھر میں اس کی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ حالانکہ جانتا بھی ہے کہ وہ اچھے لوگ نہیں۔ لڑکا سخت آوارہ ہے اور خر دماغ ہے۔ نشہ بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں بھی لگتا ہے کہ لڑکی کا باپ اس غنڈہ صفت فیملی سے ڈرتا بھی ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ لڑکی کی والدہ کا رویّہ بھی وہی ہے جو یہاں دین محمد صاحب کی بیوی صاحبہ کا ہے۔ وہ رشتے کے سخت خلاف ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ان کا شوہر بچی کو جہنم میں دھکا دے رہا ہے لیکن شوہر کے خلاف چلنے کی اس میں ہمت نہیں ہے بلکہ گھر میں سے کوئی بھی اتنی مجال نہیں رکھتا۔''

مولانا حبیب اللہ نے تسبیح کو اپنی انگلیوں پر گردش دیتے دیتے ذرا توقف کیا اور بولے۔ ''ابھی تم نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی کا والد ان زور والے لوگوں سے ڈرتا بھی ہو، اس صورت میں تو وہ بھی قابلِ ترس ہوا۔ اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کہ اسے اس دباؤ سے نکالا جائے۔''

''میں نے بہت کوشش کی ہے جی...... اور اللہ کے فضل سے میں کر بھی سکتا ہوں، لیکن بات صرف دباؤ ہی کی نہیں ہے۔ لڑکی کے باپ میں ہٹ دھرمی بھی آ چکی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب جو کچھ بھی ہو مگر وہ رشتہ وہاں کر کے چھوڑے گا۔ لڑکے کا کریکٹر کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے ہے مگر وہ اپنی بات منوانے پر تُلا ہوا ہے۔''

''لڑکی بالغ ہے؟''

''بالکل جناب! چوبیس سال کے لگ بھگ عمر ہے۔ اپنی والدہ کی طرح پردہ دار اور نماز، روزے کی پابند ہے۔ اس کی والدہ اور دیگر گھر والوں کا رو رو کر بُرا حال ہے۔''

مولوی جی نے گہری سانس لے کر تسبیح کو جیب میں ڈالا اور بولے۔ ''دیکھو میاں! بچوں پر ماں باپ کی

اطاعت فرض ہے لیکن کبھی کبھی ماں باپ بھی آپس میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون حق پر ہے اور تقویٰ اور پرہیزگاری کس میں زیادہ ہے۔ یوں تو کئی معاملات میں والد کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ گھر کا سربراہ بھی ہوتا ہے لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ وہ صریحاً اللہ رسولؐ کے احکامات کے خلاف جارہا ہے تو پھر معاملات کو اور طرح سنبھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''مولانا! میں مسجد کی حدود میں بیٹھا ہوں۔ بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، جس جگہ اس لڑکی کا ناتا جوڑا جارہا ہے، وہ لڑکا گردن تک آوارگی اور بے حیائی کی دلدل میں ڈوبا ہوا ہے اور لڑکی کے والد نے جانتے بوجھتے اپنی آنکھیں بند کررکھی ہیں۔''

مولوی حبیب اللہ بولے۔ ''اللہ تبارک تعالیٰ نے اسلام کو دینِ فطرت بنایا ہے۔ یہ زندگی کے ہر گوشے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ عمل کیا ہوسکتا ہے مگر ہمارا دین کہتا ہے کہ اگر ایک عورت کسی عادی زانی، شرابی کے پلّے بندھ گئی ہے اور اس شخص کی تبدیلی کے کوئی امکانات نہیں ہیں تو پھر اس کے گھر رہ کر مزید مخدوش مستقبل والے بچے پیدا کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ وہ اس سے علیحدگی اختیار کرلے...... اور جو بات تم بتا رہے ہو، اس میں تو ابھی عقد والا معاملہ ہی موجود نہیں ہے، ایسی شکل میں خود کو گڑھے میں گرانے کے بجائے اپنے قدموں کو روک لینا ہی بہتر ہے۔ ایسی صورت میں خاندان کے بڑے بزرگوں کو اپنا ہمنوا بھی بنایا جاسکتا ہے۔''

''یہ سارے جتن کرکے دیکھے جاچکے ہیں جناب! بچاؤ کی کوئی صورت نہیں نکل رہی۔ آپ بتایئے ایسی شکل میں عاقل بالغ لڑکی کا اپنی والدہ اور دیگر بزرگوں کی خواہش کے مطابق نکاح کرلینا جائز ہے؟''

مولانا نے اس حوالے سے سیرحاصل گفتگو کی اور آخر میں کہا کہ اتفاق رائے کے لیے آخری حد تک جایا جائے اور اگر پھر بھی مثبت نتیجہ نہ نکل سکے اور لڑکی کی زندگی برباد ہونے کا خوف ہو تو اس کے لیے واضح احکامات موجود ہیں۔ اصل اہمیت تو بالغ و عاقل مرد عورت کی رضامندی کو حاصل ہے۔ ہم خیال بزرگوں کی معاونت سے وہ کوئی فیصلہ بھی کرسکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مولانا! اگر وہ دونوں حالات کے سخت نرغے میں ہوں تو اس نرغے سے نکلنے کا حق بھی ان کو حاصل ہے؟''

مولانا حبیب اللہ نے کچھ قواعد و ضوابط سے مشروط کرنے کے بعد اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔

رات...... ایک سرد رات دھیرے دھیرے آگے کو سرک رہی تھی۔ حجرے کے بلب کی زرد روشنی میں مولانا حبیب اللہ میرے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔

اسی دوران میں ان کے فون کی مدھم بیل ہوئی۔ انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف ان کا کوئی عزیز ہی تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ ان کے چھوٹے بھائی صاحب تھے۔ انہوں نے مولانا کو اطلاع دی کہ دین محمد اور اس کے گھر والے شادی میں شریک نہیں ہوئے بلکہ سننے میں آیا ہے کہ وہ لاہور آئے ہی نہیں، بلکہ اسلام آباد چلے گئے ہیں۔

''استغفراللہ۔'' مولانا نے غصے کے عالم میں کہا۔ ''ایسی غلط بیانیاں...... ایسی حیلہ سازیاں، پتا نہیں یہ دین محمد کیا کرتا پھر رہا ہے۔ ربّ کریم اس کے گھر والوں کو اور ہم سب کو اس کی ہٹ دھرمی اور شر سے بچائے۔''

دوسری طرف سے مزید کچھ کہا گیا، جس کے جواب میں مولانا بولے۔ ''کیا کہا جاسکتا ہے۔ جب اللہ بندے سے ناراض ہوتا ہے تو بندے کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

جو اطلاع مولانا کو اب مل رہی تھی وہ مجھے دو گھنٹے پہلے ہی مل چکی تھی اور زیادہ تفصیل کے ساتھ ملی تھی۔ بہرحال میں نے اس سلسلے میں مولانا سے کوئی بات نہیں کی۔ مزید چند فقروں کے تبادلے کے بعد مولانا نے کال منقطع کردی، ان کے سرخ و سپید چہرے پر گہری تشویش تھی مگر انہوں نے مجھ سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کی۔ میرے پوچھنے پر صرف اتنا بتایا۔ ''دین محمد واقعی لاہور نہیں آیا۔ کہا جارہا ہے کہ اسلام آباد چلا گیا ہے۔ پتا نہیں، کیا ارادے ہیں اس کے۔ بندہ بھاگتا تو اس وقت ہے جب اس کے پاس دلیلیں اور جواز ختم ہوجاتے ہیں۔ اللہ کریم خیر کرے، ہم سب پر رحم فرمائے۔''

وہ ایک دم خاموش سے ہوگئے۔ تھے۔ جیسے کہیں کھو گئے ہوں۔ انہوں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور غم زدہ سی آواز میں بولے۔ ''کبھی تو سوچتا ہوں کہ جس طرح تم اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو اور اسے اس کے حالات سے نجات دلانا چاہتے ہو، کوئی دین محمد کی لڑکی کے بارے میں بھی سوچنے والا ہوتا۔ اسے اس عذاب سے نکال کر کہیں دور لے جاتا۔'' ان کے چہرے پر حزن آمیز تاسف تھا۔

میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ''مولانا! میں نے سنا تھا کہ آپ کی محترمہ بھانجی (تاجور) کی منگنی وغیرہ بھی ہوئی تھی۔ شاید اسحاق نام تھا ان کے منگیتر کا۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... یہ تو پرانی بات ہے، اور وہ بھی کوئی اچھا بندہ نہیں تھا۔ بہت بری صحبت کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی شامتِ اعمال اسے لے ڈوبی۔ رب اس کی مغفرت کرے، اب وہ زندہ نہیں ہے۔''

میں نے دل میں سوچا...... مولانا! آپ نہیں جانتے، آپ جس شخص کے ہونے کی خواہش کر رہے ہیں، وہ ہے...... موجود ہے...... اور آپ کے سامنے ہے۔ وہ آپ کی بھانجی سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی کوئی کسی سے کر سکتا ہے۔ وہ اپنی جان دے کر بھی اس کی جان اور آبرو کی حفاظت کر سکتا ہے...... اور اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ دیکھنے کے لیے وہ خود کو آگ اور برف کے سات سمندروں میں سے گزار سکتا ہے۔ وہ ہے...... اور وہ آپ کی آرزو کے مطابق اپنے ہونے کا ثبوت بھی دے گا۔ آپ کی پیاری بھانجی، آپ کی بہن اور آپ بے بس نہیں ہیں...... لیکن میں یہ سب کچھ اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

اگلے روز صبح کے وقت میں نے فردوس کو دوبارہ فون کیا۔ اس مرتبہ چوتھی پانچویں کوشش میں کامیابی ہو سکی۔ فردوس نے ایک خوف زدہ سی سرگوشی میں کہا۔ ''کیا بات ہے وقاص بھائی! میں واش روم کے اندر سے بول رہی ہوں۔ یہاں بہت سخت خطرہ ہے...... مجھے اب اپنا فون بند کرنا پڑے گا۔''

''کہاں ہو تم؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گاؤں سے یہاں پہنچی ہوں۔''

''یہاں کہاں؟'' میں نے بھنا کر پوچھا۔

''اسلاماں...... باد۔'' وہ ہکلائی۔ ''پپ...... پرسوں نکاح ہے۔ کل رات مہندی کی چھوٹی سی رسم ہے۔ یہاں کئی کام ہیں، اسی لیے مجھے اور انوری کو سکھیرا سے یہاں لایا گیا ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ فردوس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اسی جگہ پر ہے جہاں دین محمد صاحب اپنے گھر والوں کو لے کر پہنچے ہیں۔ میرے نقطہ نظر سے یہ مثبت خبر تھی۔ میں نے ایک توقف کے بعد فردوس سے کہا۔ ''فردوس! کیا تم کسی طرح تاجور سے میری بات کرا سکتی ہو؟''

''توبہ کریں جی توبہ...... کانوں کو ہاتھ لگاؤ وقاص بھائی! تاجور بی بی کی ہونے والی نندیں یہاں ہیں۔ اور وہ ایک دو نہیں پوری پانچ ہیں۔ اس کے علاوہ اس گھر کی نوکرانیاں ہیں۔ بڑی ہوشیار اور چالاک چلتر ہیں سب کی سب...... یہ لوگ تاجور بی بی کو دومنٹ کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ رہے...... اچھا باہر کھڑاک ہو رہا ہے۔ اب میں فون بند کر رہی ہوں......''

''نہیں فردوس۔'' میں نے سخت لہجے میں جلدی سے کہا۔ ''اگر تم نے فون بند کیا تو جو کچھ ہوگا تمہارے ساتھ وہ بہت برا ہوگا۔''

''پر میں کیا کروں؟ کسی کو پتا چل گیا کہ میں اس طرح یہاں چھپ کر مخبریاں کر رہی ہوں تو یہ لوگ میرے ٹوٹے کر دیں گے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے فون بند کرنے سے باز رکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس علاقے میں ہے اور تاجور اس وقت کس کمرے میں موجود ہے۔

فردوس ٹھیک مقام تو نہیں بتا سکی۔ تاہم اس نے کہا۔ ''یہ بڑے صاف ستھرے علاقے میں ایک، دو منزلہ کوٹھی ہے۔ یہاں بہت سے چوکیدار بھی ہیں نیلی وردیوں اور رائفلوں والے...... کئی وڈی وڈی گڈیاں سامنے ویہڑے میں کھڑی ہوئی ہیں۔ گھر زیادہ وڈا تو نہیں ہے پر بہت زیادہ سجا ہوا ہے۔ تاجور بی بی کا نکاح اسی گھر میں ہونا ہے اور اسی گھر سے وہ رخصت ہو کر اپنے سورے گھر (سسرال) جائیں گی۔''

''تاجور اس وقت کہاں ہے؟''

''ان کا کمرا اوپر والی منزل پر ہے...... سیڑھیوں کے بالکل ساتھ...... پر اس ویلے تو بی بی نیچے ہے۔ اپنی ہونے والی نندوں اور ان کی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ ان کی ہونے والی سس صاحبہ بھی تھوڑی دیر کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ وہ بڑی رعب والی زنانی ہیں۔ کوئی ان کے سامنے اُچی آواز میں گل نہیں کر سکتا۔''

فردوس بہت ڈری ہوئی تھی...... تاہم میں نے حکمتِ عملی کے ساتھ اس کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس جگہ کا محل وقوع جاننے کی کوشش کرے۔ میں نے اسے ہاشو کے ساتھ اس کی نازیبا وڈیو کے حوالے سے ڈرایا بھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے بڑے اعتماد کے ساتھ تحفظ کا یقین بھی دلایا۔

فردوس سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے فون پر

سجاول سے رابطہ کیا اور اسے ساری صورتِ حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ اپنی بھاری پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''شاہی یہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن مجھے یہ بتا کہ مجھے کرنا کیا ہے؟''

''تم آج کل پیار محبت والی فلم بنے ہوئے ہو۔ تمہیں پھر تھوڑا سا ایکشن کی طرف واپس لانا ہے۔ بلکہ بہت تھوڑا سا۔''

''زیادہ چلنے والی مشین کو بالکل روک دیا جائے اور وہ رکی ہی رہے تو اس کو زنگ شنگ لگ جاتا ہے۔ اسے تھوڑا بہت تو چلنا ہی چاہیے۔''

''پر ہماری بھابی کو بالکل پتا نہ لگے، ورنہ وہ جو تھوڑی بہت عزت مجھے دیتی ہے اس کا سوا ستیاناس ہو جائے گا۔''

''تھوڑی بہت تو نہیں، بہت زیادہ عزت دیتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو میں سڑنا شروع ہو جاتا ہوں۔ جاماجی میں قسطینا، ابراہیم اور اس لمبے فارس جان وغیرہ نے بھی تمہاری ''موت'' کا بڑا سوگ منایا ہے۔ ایک دو بار فون پر خورسنہ کی وہاں بات ہوئی ہے۔''

''بس ایک بات کا دھیان رکھنا سجاول۔ یہ سب کچھ ٹاپ سیکرٹ ہے۔ اگر میرے زندہ ہونے والا بھید کھل گیا تو پھر سمجھو کہ بیڑا ہی غرق ہو جانا ہے۔ ٹیکساری والا شیطانی ٹولا اب بھی آس پاس ہی ہے۔ مجھے اور میرے ارد گرد والوں کو کھوجتا پھر رہا ہے۔''

سجاول نے کہا۔ ''میں بھی ایک بار پھر کہتا ہوں کہ بے فکر رہو۔''

دو گھنٹے بعد میں نے فردوس کو دوبارہ فون کیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے میری کال ایک واش روم میں بند ہو کر اور شاور وغیرہ کھول کر سنی۔ وہ صرف اتنا بتا سکی کہ اس جگہ کو چار نمبر چھوٹا سیکٹر کہتے ہیں اور مکان کے گیٹ پر 210 نمبر لکھا ہوا ہے۔ نیچے انگریزی میں بھی کچھ حرف لکھے ہیں۔

یہ معلومات مکمل تو نہیں تھیں لیکن ان سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت لالہ موسیٰ میں سجاول کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی یونس پمپ والے کو حرکت میں لائے۔ وقت کم تھا اور مجھے جو بھی ہاتھ پاؤں مارنے تھے ذرا جلدی مارنے تھے۔ میں نے آٹھ دس گھنٹے پہلے محترم مولانا حبیب سے جو گفتگو کی تھی وہ بڑی کارآمد تھی اور یہ گفتگو میرے سیل فون کے وائس ریکارڈر میں بھی محفوظ ہو چکی تھی۔

پروگرام کے مطابق سجاول وغیرہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ سہ پہر کوئی چار بجے کے لگ بھگ میں بھی بذریعہ بس لاہور سے اسلام آباد کے لیے چل پڑا۔ میں اسی ڈرائیور وقاص والے حلیے میں تھا۔ شلوار قمیص اور آستینوں کے بغیر ایک جرسی۔ میں نے قمیص کے نیچے چمڑے کی پیٹی کے ذریعے ریوالور لگا رکھا تھا۔

میری ایک نئی شناخت تھی، نیا حلیہ تھا۔ میں آزادانہ راولپنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر گھوم پھر سکتا تھا۔ یہ ایک نیا اور تسلی بخش تجربہ تھا۔ میں نے ٹیکسی کے ذریعے سفر کیا اور فیض آباد سے تھوڑا آگے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں سجاول اور اس کے ساتھی یونس سے ملاقات کی۔ یونس مجھے وقاص کی حیثیت سے ہی جانتا تھا۔ میرے اور سجاول کے درمیان طے ہو چکا تھا کہ یونس کے سامنے سجاول مجھے وقاص کے نام سے ہی بلائے گا۔ کلین شیو سجاول پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس لمبے چوڑے بابو کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ماضی قریب کا خونخوار ڈکیت سجاول سیالکوٹی ہے۔ (اس کے باوجود عام شخص اسے دیکھ کر یقیناً کچھ ہیبت محسوس کرتا ہوگا)

سجاول کے ساتھی یونس پمپ والا نے بڑی تیزی سے کام کیا تھا۔ یونس وہ بنگلا نما کوٹھی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ ہائی سیکیورٹی والا علاقہ تھا۔ تاہم سجاول اور یونس وغیرہ اس کا محل وقوع دیکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ یونس کا ایک پوٹھوہاری دوست ایک ایسی الیکٹرک کمپنی میں ملازم تھا جو اس رہائشی علاقے میں سروس مہیا کرتی تھی۔ اپنے اس دوست کی مدد سے یونس نے دو عدد وردیاں حاصل کر لی تھیں۔ ان پر الیکٹرک کمپنی کے مونوگرام بنے ہوئے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ میں چائے پی رہے تھے جب یونس کا ایک ساتھی اندر آیا اور اس نے بتایا کہ وہ گارڈ والی وردی لے آیا ہے اور دوسرا سامان بھی۔ (اس کا نام بعد میں شرافت معلوم ہوا)

ہم اس شخص کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر آئے۔ سڑک کے کنارے سفید رنگ کی ہائی روف سوزوکی کھڑی تھی۔ اس پر بھی الیکٹرک کمپنی کا مونوگرام موجود تھا۔ ہم گاڑی کے اندر بیٹھ گئے۔ یونس نے مجھے یونیفارم دکھائی، بولا۔ ''وہاں علاقے میں جو گارڈ موجود ہیں ان کی وردی تقریباً ایسی ہی ہے۔ تھوڑا بہت فرق ہے بھی تو اندھیرے میں پتا نہیں چلے گا۔''

''اور اس ڈبے میں۔'' میں نے لکڑی کے ایک باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہی ڈائنامائٹ کے ڈنڈے (اسٹکس)۔“ اس نے جواب دیا۔

یو پی ایس کا ایک خالی ڈبا بھی یہ لوگ ساتھ لائے تھے۔ ڈائنامائٹ کی اسٹکس کو اسی خالی ڈبے میں رکھ کر موقع پر لے جایا جانا تھا مگر ڈائنامائٹ سے کسی کو نقصان پہنچانا مطلوب نہیں تھا۔ یہ صرف توجہ ہٹانے کا ایک حربہ تھا۔ یہ ڈائنامائٹ اسٹکس، یونس ہی اپنے ساتھ لالہ موسیٰ سے لایا تھا۔ یونس کا ایک بھائی بجری بنانے کا کام کرتا تھا اور دیسی ساخت کی یہ ڈائنامائٹ اسٹکس پتھروں میں چھوٹے موٹے بلاسٹ کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

اسٹکس تعداد میں دس کے قریب تھیں۔ میں نے سجاول سے کہا۔ ”یہ زیادہ ہیں...... میرا خیال ہے کہ کچھ میں اپنے پاس رکھ لوں، ہوسکتا ہے کہ کام آجائیں۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ بولا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے ہم نے ڈائنامائٹ کی تین اسٹکس ایک مضبوط شاپر میں لپیٹیں اور ان کو آپس میں کنیکٹ کر کے ان کا فلیتہ اس طرح شاپر سے باہر نکال دیا کہ ماچس یا لائٹر سے اسے فوری آگ دکھائی جاسکے۔

اب پلاننگ کے مطابق ہماری تیاری پوری تھی۔ میں نے یونس سے کہا۔ ”کسی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ گولی تب ہی چلاؤ جب کوئی اور راستہ نہ ہو۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ یونس نے کہا۔

”سجاول بھائی، تم کہاں ہوگے؟“

”وہاں پاس ہی ایک پارک ہے...... میں ابھی تمہیں وہ بھی دکھا دیتا ہوں۔ میں اس گاڑی پر وہیں کھڑا رہوں گا۔“

”کوٹھی سے فاصلہ زیادہ تو نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں، آدھے منٹ میں، میں کوٹھی کے دائیں طرف والے گیٹ تک پہنچ سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے تو پھر ہم ایک بار موقع کا معائنہ کر لیں۔“

یونس کے الیکٹریشن دوست نے سوزوکی ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم چند ہی منٹ میں اسلام آباد کے ایریا میں داخل ہوگئے۔ ہمارے مطلوبہ سیکٹر میں واقعی سیکیورٹی نظر آرہی تھی۔ بہرحال ہماری گاڑی کو کہیں بھی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جلد ہی میں وہ شاندار بنگلا نما کوٹھی دیکھ رہا تھا جہاں تاجور موجود تھی اور اس کے گھر والے موجود تھے۔ 210 نمبر اس کوٹھی کو جانے والے راستے پر روڈ بلاک موجود تھے۔ اردگرد چند پولیس اہلکار بھی دکھائی دیتے تھے۔ گیٹ پر دو گارڈ نظر آرہے تھے۔ وہ تقریباً ویسی ہی ہلکی نیلی وردیوں میں تھے، جیسی ایک میرے پاس موجود تھی۔ کوٹھی کے باہر تین چار بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں، ان میں سبز نمبر پلیٹ والی دو گاڑیاں بھی تھیں۔

کل تاجور کی مہندی کی رات تھی۔ کل یقیناً یہاں موجود گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوجانا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کوٹھی پر تھوڑی بہت لائٹنگ بھی کی جاتی۔ بہرحال آج تو یہاں خاموشی ہی دکھائی اور سنائی دیتی تھی۔ یہ رات کے قریباً بارہ بجے کا عمل تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے حرکت میں آنے سے پہلے قریباً دو گھنٹے مزید انتظار کرنا چاہیے۔ ہم واپس چلے گئے اور اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے جہاں رات کا کھانا کھایا تھا اور چائے پی تھی۔ اسلام آباد کی یہ خنک رات دھیرے دھیرے آگے کو سرک رہی تھی اور عمل کا وقت قریب آرہا تھا۔

☆☆☆

سجاول نے پارک کے قریب گاڑی روک لی۔ یونس اور اس کا ساتھی الیکٹرک فرم کی یونیفارمز میں تھے۔ میں نے گارڈز والا ہلکا نیلا لباس پہن رکھا تھا۔ میرا ٹراؤزر چھ پاکٹس والا تھا۔ ایک بڑی جیب میں، میں نے اسٹکس والا شاپر اڑس رکھا تھا۔ ریوالور اب میری کمر سے بندھا ہوا تھا۔

”اوکے یونس! تم کوٹھی کی پچھلی سڑک پر پہنچ جاؤ...... اور میری کال کا انتظار کرو۔“ میں نے کہا۔

وہ اور اس کا دوست درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ میں نے تین چار منٹ بعد نیلی پی کیپ پیشانی پر جھکائی اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔ انداز چہل قدمی والا ہی تھا۔ مجھے پورچ میں دین محمد صاحب کی نئی گاڑی بھی نظر آئی۔ دائیں طرف باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا ایک گارڈ متجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر شاید وہ مجھے دھیان سے دیکھنے اور جانچنے کے لیے میری طرف بڑھا۔ مزید انتظار بے کار تھا۔ میں نے موبائل فون پہلے ہی ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر یونس کا نمبر ملایا اور کہا۔ ”بلاسٹ کرو۔“

قریباً تین چار سیکنڈ بعد کوٹھی کے بالکل قریب درختوں میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ تیز چمک کے ساتھ میں نے اشوکا کی سبز ٹہنیاں ہوا میں بلند ہوتے دیکھیں۔

کوٹھی کے سامنے کھڑے پولیس اہلکار اور گارڈز چند لمحے کے لیے پتھرا سے گئے۔ پھر وہ بے ساختہ دھماکے والی جگہ کی طرف لپکے۔ کوٹھی کے مختصر پورچ میں بھی زبردست

ہلچل نظر آئی۔ مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔ میں گیٹ کے چھوٹے دروازے سے کوٹھی کے اندر گھسا اور اندرونی حصے کی طرف لپکا، کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ میں بہ آسانی کوریڈور سے گزر کر گھر کے کامن روم میں پہنچ گیا۔ یہاں مجھے ایک عمر رسیدہ خاتون اور ایک ملازمہ نظر آئی۔ دونوں شاید نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تھیں۔ وہ چلّا رہی تھیں۔ ''کیا ہوا؟'' کیسے ہوا؟''

میں ان کے قریب سے گزرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ کسی اندرونی کمرے سے بھی ملی جلی مردانہ و زنانہ آوازیں سنائی دیں۔ دھماکے نے ہر کسی کو ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ دھیان یقیناً سب کا باہر کی طرف ہی تھا۔ لیکن میرا دھیان سیڑھیوں کے سرے پر واقع کمرے کی طرف تھا جہاں میرے اندازے کے مطابق اس وقت تاجور موجود تھی۔

سیڑھیاں طے کر کے میں پانچ چھ قدم آگے بڑھا۔ مجھے وہ دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی جہاں میرے قیافے کے مطابق تاجور کو ہونا چاہیے تھا۔ میرے سامنے پہنچتے ہی دروازہ ایک دم کھلا اور مجھے تاجور کی پریشان صورت نظر آئی۔ اس کے بال منتشر تھے اور دوپٹا ندارد تھا۔ ابھی وہ مجھے ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہیں پائی تھی کہ میں اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ ''میں شاہ زیب ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا تھا۔

وہ چلّانے کے لیے منہ کھول چکی تھی مگر چلّانے کی حماقت اس نے نہیں کی۔ میں نے تیزی سے دروازہ بولٹ کر دیا۔ وہ جیسے پتھرا کر رہ گئی تھی۔ باہر سے شور بلند ہو رہا تھا اور دھماچوکڑی مچی ہوئی تھی۔ ''گھبراؤ نہیں تاجور، یہ میں ہوں۔'' میں نے پی کیپ بھی اتار کر بیڈ پر پھینک دی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں بیڈ پر کوئی لیٹا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا یہ تاجور کا بڑا بھائی راحیل تھا۔ وہ ابھی تک دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ غالباً تاجور نے سہارے کے طور پر اسے اپنے ساتھ ہی لٹایا ہوا تھا۔

''آپ...... یہاں...... کس طرح...... اور...... اور یہ دھماکے کی آواز......؟'' وہ بری طرح ہکلائی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں تاجور...... ذرا یہ باہر والا ہنگامہ ٹھنڈا پڑ لینے دو۔''

وہ رونے لگی۔ ''اچھا ہوتا میں چاند گڑھی میں ہی مر گئی ہوتی۔ نہ میں ہوتی نہ ہم سب پر یہ عذاب آتے۔ آپ کو کچھ پتا نہیں، آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ اوروں کی بھی جان جائے گی۔'' وہ تھرتھر کانپنا شروع ہو گئی تھی۔

قرب و جوار میں ابھی تک بھاگ دوڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر چند فائر سنائی دیے۔ میرا قیافہ تھا کہ یہ فائر محافظوں یا پولیس اہلکاروں نے کیے ہیں اور یہ ہوائی فائر ہیں۔ دل سے دعا بھی نکلی کہ یہ ہوائی فائر ہی ہوں اور یونس پمپ والا اور اس کا ساتھی محفوظ رہے ہوں۔

''خدا کے لیے شاہ زیب! یہاں سے چلے جائیں۔ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر رحم کریں۔ میں ان کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتی...... اگر آپ......''

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آرہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ دین محمد صاحب ہی ہوں۔ میں نے تاجور کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ ''میں واش روم میں چلا جاتا ہوں، جو بھی آئے اس کی بات سن لو لیکن کوشش کرنا کہ آنے والا کمرے میں رک نہ جائے۔''

تاجور نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور لرزاں ہاتھوں سے اوڑھنی اٹھا کر اپنا سر اور سینہ ڈھانپا۔ میں جلدی سے واش روم میں چلا گیا۔ تاہم اندر کی لائٹ آن نہیں کی اور دروازے میں تھوڑی سی جھری رکھی۔

تاجور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا کیونکہ مسلسل دستک ہو رہی تھی۔ اندر آنے والی فردوس تھی، اس کا چہرہ بھی فق ہو رہا تھا۔ بولی۔ ''تاجور بی بی! تم سوئی پڑی ہو باہر پتا ہے کیا ہوا ہے؟''

''کیا ہوا ہے؟''

''بڑی زور کا دھماکا ہوا ہے، کہہ تو یہی رہے ہیں کہ ایک گڈی کا گیس کا سلنڈر پاٹا ہے۔ اتنی زور کی آواز آئی ہے کہ اللہ مافی۔ گڈی کا بھی ستیاناس ہو گیا ہے۔''

''کس کی گاڑی تھی؟''

''پتا نہیں، پر اس کا پچھلا حصہ بالکل کباڑا ہو گیا ہے۔ شکر ہے کہ اس کے آسے پاسے کوئی تھا نہیں۔''

''ابھی گولیوں کی آواز بھی تو آئی ہے۔'' تاجور نے دریافت کیا

''وہ تو پولیس والوں نے چلائی ہیں۔ میاں جی کہہ رہے تھے کہ انہوں نے گھبرا کر چلائی ہیں۔ ویسے خیر خیریت ہے۔''

فردوس جسے سلنڈر کا دھماکا کہہ رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ

ڈائنامائٹ کا دھماکا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یونس اور اس کے ساتھی نے دھماکا کسی گاڑی کے قریب کیا اور اس سے گاڑی کا سلنڈر بھی پھٹ گیا۔ دھماکے کے وقت مجھے بھی اس کی شدت توقع سے زیادہ محسوس ہوئی تھی۔

تاجور نے روہانسی آواز میں فردوس سے پوچھا۔ ''اسپتال سے کوئی فون آیا ہے؟''

''نہیں، ابھی دو گھنٹے پہلے آپ کے سامنے ہی آیا تھا۔ بڑی بی بی جی بالکل ٹھیک ہیں، تم دیکھ لینا ایک دو دن میں چنگی بھلی ہو جائیں گی، تم فکر نہ کرو۔''

میں ذرا چونکا۔ مجھے لگا کہ یہ شاید تاجور کی والدہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فردوس جب واپس چلی گئی تو تاجور نے دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس نے قریب ہی ہونے والے ''سلنڈر دھماکے'' کی بات کی۔ اس کے گمان میں یہ بات بالکل نہیں آئی تھی کہ یہ سلنڈر دھماکا نہیں اور اس دھماکے اور میرے یہاں وارد ہونے میں گہرا تعلق ہے۔ میں نے تاجور سے پوچھا کہ ابھی ملازمہ کس کی بیماری کی بات کر رہی تھی؟ تاجور نے اشک بار لہجے میں مجھے بتایا کہ امی کو کل سے 103 بخار ہے۔ کچھ دیر کے لیے تو بے ہوش ہی ہو گئی تھیں۔ وہ اب بھی اسپتال میں ہیں۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے تاجور کو دیکھا۔ ''اور تاجور! اس کے باوجود کل تمہیں مہندی لگائی جائے گی۔ شاید ڈھولک بھی بجائی جائے گی...... اور پھر پرسوں تمہیں نکاح کے بعد رخصت کر دیا جائے گا۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس بیڈ کے کنارے پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ دو موتی اس کی آنکھوں سے جھڑے اور اس کی جھولی میں گم ہو گئے۔ اس کی صورت دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ وہ میرے یہاں آنے سے پہلے نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ رو بھی رہی تھی۔ اس کی ورم زدہ آنکھیں سرخ تھیں اور اب کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کی حالت چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تاجور! تمہارے ابا جان نے پورے خاندان سے جھوٹ بولا۔ تمہیں اور سارے گھر والوں کو خاموشی سے یہاں لے آئے اور کہا یہ کہ شادی پر لاہور جا رہا ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کہ وہ تنِ تنہا دارابیوں میں تمہارا نکاح کر دیں۔ وہ اب صرف اور صرف اپنی ضد کا جھنڈا اونچا کر رہے ہیں۔''

''کچھ بھی ہے شاہ زیب! میں اب ان کو دکھ نہیں دے سکتی۔'' وہ کراہ کر بولی۔

''اور اس ماں کو دکھ دے سکتی ہو جس نے تمہیں اپنی کوکھ میں پالا...... اور جو اَب تمہارے باپ کے سامنے بے بسی کی تصویر نظر آتی ہے۔ اپنے اس ماموں کو دکھ دے سکتی ہو جو تمہارے حق کے لیے ہر جگہ لڑا ہے اور دارابیوں کی دشمنی مول لے رہا ہے۔ اپنے ان سب خونی رشتوں کو بھی دکھی کر سکتی ہو جو اُن دارابیوں کی خصلت جانتے ہیں اور تمہیں اس گڑھے میں گرنے سے بچانا چاہتے ہیں۔''

وہ سسک اٹھی۔ ''میں کیا کروں، میں بے بس ہو چکی ہوں۔ میں اپنے ان سب ہمدردوں سے بھی شرمندہ ہوں جو میرے لیے بولتے رہے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکے۔ مم...... میں نہیں چاہتی کہ میرے اپنے ہی خاندان والے میری وجہ سے آپس میں لڑنا شروع کر دیں...... اور پھر مجھ پر سب سے زیادہ حق تو میرے باپ کا ہے ناں؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ٹھیک کر رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کر رہے ہوں گے۔''

''بلی کو دیکھ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند نہ کرو تاجور! تم دیکھ رہی ہو کہ یہ ایک قاتل گڑھا ہے۔ آنکھوں سے دیکھ کر اس میں گرو گی تو یہ خودکشی سے بڑا گناہ ہو گا اور میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔''

''ہم...... کچھ نہیں کر سکتے شاہ زیب...... بہت بڑا طوفان آ جائے گا۔ اب سب سہنا پڑے گا۔ کیونکہ...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔ ''میں یہاں تک پہنچ ہی گیا ہوں ناں، بولو پہنچا ہوں یا نہیں؟''

وہ خاموش رہی۔ اس نے بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اُڑسا اور ڈری نظروں سے سوئے ہوئے راحیل کو دیکھا۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ جاگ نہ جائے۔

میں نے خودسری سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ''میں تمہیں لینے آیا ہوں تاجور۔''

وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ جیسے بےساختہ اس کی گود میں سمٹ گئے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ زیب!'' وہ سہم کر بولی۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تاجور! اگر تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور اپنے والد کی ضد کی وجہ سے ایک دلدل میں دھنسنے سے بچنا چاہتی ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔ میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا اور تمہیں جبر کے اس گھیرے سے نکال کر لے جاؤں گا۔ ہم کورٹ میرج کر لیں گے...... یا پھر نکاح...... جیسے بھی تم چاہو...... اور مجھے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

یقین ہے تاجور! تمہاری والدہ اور تمہارے خاندان کے زیادہ تر بزرگ اس بات پر خدا کا شکر ادا کریں گے کہ تم دارابیوں کے چنگل سے نکل گئی ہو۔''

''آپ...... نہ ہونے والی باتیں کر رہے ہیں شاہ زیب! وہ خدا کا شکر ادا کیسے کریں گے۔ میرے خاندان والے آپ کو جانتے نہیں، پہچانتے ہیں۔ سکھیرا میں تو لوگ یہی جانتے ہیں کہ آپ کا نام وقاص محمد ہے اور آپ چاچا بشیر کے ڈرائیور ہیں...... شادی شدہ ہیں۔''

''تاجور! اگر دنیا کو دیکھو گی تو پھر ہم اسی گورکھ دھندے میں پھنسے رہیں گے۔ میں جانتا ہوں تم مجھے چاہتی ہو اور میں بھی تم پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے ہمارے لیے ایک دوسرے کی چاہت کافی نہیں ہے۔ صرف ایک دوسرے کی چاہت۔ خدا کا شکر ادا کرنے والی جو بات میں نے کی ہے، وہ اس حوالے سے کی ہے کہ تمہارے بہت سے بزرگ اس بات پر خوش ہوں گے کہ تم جہاں بھی ہو لیکن کم از کم اس طاقتور سیاسی خاندان کے عیاش امیر زادے سے تو بچ نکلی ہو۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے تاجور! کہ ان کی بیویوں کی حیثیت کنیزوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تم دارج کے بھائی شکیل کو دیکھ لو۔ اس خانوادے کے دوسرے مردوں کو دیکھ لو۔ اگر دارج نے تمہیں کوئی سہانے سپنے دکھائے ہیں تو ان کے اثر سے نکل آؤ اور اگر اس نے نہیں دکھائے اس کے گھر والوں نے دکھائے ہیں تو بھی نکل آؤ۔ خوف اور مصلحت کے اس جال کو توڑ دو تاجور! میں تمہارے ساتھ ہوں، اور تمہیں اپنانے کے لیے بڑی سے بڑی مصیبت سے ٹکرانے کو تیار ہوں۔''

''شاہ زیب! میرے دل کو کچھ ہو جائے گا۔ خدا کے لیے آپ چپ ہو جائیں۔''

''ٹھیک ہے، میں چپ ہو جاتا ہوں لیکن کوئی اور تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے......''

میں نے چھ پاکٹ والے ٹراؤزر کی ایک جیب سے اپنا سیل فون نکالا۔ اس میں محترم مولانا حبیب اللہ کی گفتگو ریکارڈ تھی۔ اسی گفتگو کے ایک حصے میں انہوں نے بڑی دردمندی اور حسرت سے کہا تھا کہ کاش...... کوئی تاجور کو شریکِ زندگی بنانے والا بھی ہوتا اور اس کی پُرخلوص محبت میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ اسے حالات کی اس غلیظ دلدل سے نکال کر لے جاتا۔

میں نے وائس ریکارڈر میں جا کر اسے پلے کر دیا۔ وہ اپنے ماموں کی اور میری باتیں سننے لگی۔ اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ سن تو رہی ہے مگر پریشانی غالب ہے۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''تاجور! یہاں اس کمرے میں اب کوئی نہیں آئے گا۔ اور آخر میں ہوگا بھی وہی جو تم چاہو گی۔ اگر تم کہو گی تو میں خاموشی سے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ اور شاید کبھی تمہیں اپنا منہ بھی نہیں دکھاؤں گا۔ لیکن اس وقت ذرا دھیان سے یہ باتیں سنو۔''

میں نے ریورس کر کے ٹریک کو دوبارہ پلے کیا۔ وہ سننے لگی۔ ساتھ ساتھ زرد رخساروں پر آنسو بھی رینگ رہے تھے۔ باہر سے بلند ہونے والی آوازیں اب مدھم پڑ گئی تھیں۔ تاہم گارڈز کی بلند آواز سے کسی وقت عمارت کے احاطے گونجتے تھے۔

پوری گفتگو سننے کے بعد تاجور نے سسک کر پوچھا۔ ''ماموں جان اب کہاں ہیں؟''

''لاہور میں......''

''وہ ٹھیک تو ہیں ناں؟''

''مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اردگرد کے حالات سے بے خبر رکھا جا رہا ہے۔ ان دارابیوں کو بس یہ جلدی ہے کہ تم جلد از جلد دارج کے نکاح میں آ جاؤ۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں شاہ زیب؟''

''جن لوگوں نے تمہاری اور دارج کی شادی کی مخالفت کی ہے، وہ سب پریشانی کا سامنا کرنے پر مجبور ہوں گے...... اور تمہارے بڑے ماموں چونکہ پیش پیش تھے اس لیے ان کی پریشانی کا تو آغاز بھی ہو چکا ہے۔ ان پر بنائے گئے ایک جھوٹے کیس کو پھر زندہ کر دیا گیا ہے اور وہ ضمانت قبل از گرفتاری کرانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ بہرحال وہ دلیر شخص ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے ایسے نیک بندوں کی مدد بھی فرماتا ہے، وہ یقیناً اپنا دفاع کر لیں گے۔''

تاجور کا زرد چہرہ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بولی۔ ''میں ہی کیوں نہیں مر جاتی۔ سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔''

''جینا...... مرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے تاجور...... لیکن قدرت اس مشکل کا صلہ بھی دیتی ہے اور اس کو دینا ہی پڑتا ہے...... کیونکہ وہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی پابندی کرتی ہے۔ تم بھی قدم بڑھا کر دیکھو۔ رستہ بھی ملے گا اور منزل بھی۔''

''خدا کے لیے شاہ زیب! مجھے کسی ایسے امتحان میں نہ ڈالیں، میں جس کے قابل نہیں۔ آپ کو یہاں نہیں آنا

چاہیے تھا۔ آپ نے بہت بُرا کیا ہے، اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی.....'' اس کی آنکھوں میں گہرے اندیشے تھے۔ یقیناً اب اسے یہ شبہ بھی ہو رہا تھا کہ دھماکے کی آواز اور میرے یہاں پہنچنے میں تعلق ہے۔

میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''تاجور! میں نے یہاں آ کر برا کیا ہے تو پھر میں چلا جاتا ہوں لیکن تم آخری بار سوچ لو۔ میں پھر مڑ کر نہیں آؤں گا۔ یہ سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے سب کچھ تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ یا تو میرا ہاتھ تھام لو اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوگی اور میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا یا پھر مجھے خدا حافظ کہہ دو۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

تاجور اسی طرح ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ دونوں ہاتھ گود میں سمیٹے ہوئے...... انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے۔ اس کے پورے بدن میں لرزش تھی۔

''میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں تاجور؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور مجھے یوں لگا جیسے ایک برچھی سی سینے میں گھس گئی ہو۔

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''تاجور! میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔ تمہارا جواب ہاں میں ہے یا نہ میں؟''

وہ اب بھی خاموش تھی، میں جانتا تھا کہ وہ نہایت سنگین کشمکش اور تناؤ سے گزر رہی ہے لیکن میں بھی مجبور تھا۔ وقت بڑی تیزی سے سمٹ رہا تھا اور ہزاروں سال طویل کشمکش بھی ہو لیکن ایک وقت تو ایسا آ ہی جاتا ہے جب حتمی فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور یہ وہی لمحے تھے۔ میرے اندر بھی عجیب سی کوفت اور تپش جاگ گئی تھی۔

کافی دیر بعد میں نے کہا۔ ''تو تم نہیں بولو گی تاجور! مجھے تمہاری خاموشی کو ہی انکار سمجھنا پڑے گا؟''

اس کا سر بدستور جھکا رہا۔ وہ لمحے کوہ ہمالیہ سے گراں تھے اور ان کا بوجھ دل اور سینے کے رگ پٹھوں کو روندتا ہوا گزر رہا تھا۔

نیند میں راحیل نے کروٹ لی اور نیند میں ہی اپنا ایک ہاتھ تاجور کی گود میں رکھ دیا۔ تاجور نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ جیسے وہ اس ہاتھ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے...... اور ان سارے رشتوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہے جو اس ہاتھ ہی کی طرح اسے پیارے ہیں۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اٹھنا بہت کٹھن تھا۔ لگتا تھا کہ اپنے جسم کو نہیں اپنی لاش کو اٹھا رہا ہوں۔ اس لمحے تاجور نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں بے پناہ کرب تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی...... ایسا مت کریں میرے ساتھ۔ میں ایک عورت ہوں۔ میں اس ندی جیسی ہوں جو اپنے دونوں کنارے کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے اتنی کڑی آزمائش میں نہ ڈالیں۔

''کچھ بولو تاجور...... کچھ بولو...... کوئی ایک لفظ کہہ دو میرے حق میں۔ کوئی ایک جملہ جو میری پوری زندگی کو غارت ہونے سے بچا لے۔'' میں نے خاموشی کی زبان میں کہا۔

اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں گہری سانس لے کر واپس مڑا۔ ایک قدم اٹھایا اور دوسرا اٹھانے سے پہلے واپس مڑا۔ میں نے آگے بڑھ کر تاجور کے سر پر ہاتھ رکھا۔ زخمی آواز تھی۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! مجھے تمہاری ہی قسم ہے۔ میں اس کمرے سے ہی نہیں تمہاری زندگی سے بھی نکل جاؤں گا۔''

میں چل پڑا...... دروازے تک پہنچنے سے پہلے مجھے رکنا پڑا۔ وہ گر گئی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر بستر پر گری تھی اور پھر وہاں سے پھسل کر قالین پر آ گئی تھی۔ اس کے گرنے سے پہلے میری سماعت تک اس کی آواز پہنچی تھی۔ اس نے کربناک آواز میں میرا نام لیا تھا۔

میں تیزی سے اس کے پاس آیا۔ دونوں گھٹنے موڑ کر دوزانو اس کے پاس بیٹھا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ ''تاجور! آنکھیں کھولو تاجور......'' میں نے کئی بار یہ الفاظ دہرائے۔

اس کے ہونٹ تھوڑے سے وا تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفے پر لٹایا۔ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ اسے ذرا سا جھنجوڑا۔ اس کی نبض ٹھیک تھی۔ سانس بوجھل تھی مگر روانی سے آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسی بے ہوشی صدمے یا شدید تناؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد یہ نیم بے ہوشی یا پھر نیند میں بدل سکتی ہے۔ میں نے اس کا سر، چہرہ اور ہاتھ پاؤں ٹٹولے۔ وہ کسی سخت چوٹ سے محفوظ رہی تھی۔ ہاں سر کے پچھلے حصے میں معمولی چوٹ آئی تھی۔

میرے دل نے گواہی دی۔ شاہ زیب! یہ تاجور کا وہ جواب ہے جو وہ اپنی زبان سے نہیں دے سکی۔ یہ جواب

اس کی ''حالت'' نے دیا ہے۔ وہ تمہارا جانا نہیں سہہ سکی۔
میرے سینے میں سنسنی کی بلند لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ایک ہیجان تھا جو سرتاپا پھیل گیا تھا۔ مجھے لگا میرے اندر اتنی توانائی پیدا ہو چکی ہے کہ میں بڑی سے بڑی مشکل سے ٹکرا کر تاجور کو اس مہلک گھیرے سے نکال سکتا ہوں۔

میں نے سجاول سے کال ملائی اور سرگوشیوں کے لہجے میں اس سے بات کی۔ ''کہاں ہو سجاول؟''

''پارک کے سامنے والی سڑک پر۔ یونس وغیرہ بھی میرے پاس آگئے ہیں۔ تمہارا کام ہوا؟''

''ہاں، میں اس وقت تاجور کے پاس ہی ہوں۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''اوئے خوش کیا ہے تم نے شاہی؟'' وہ ذرا جوش سے بولا۔ (وہ جوش و خروش اور خوشی کا اظہار کم ہی کرتا تھا)

میں نے کہا۔ ''اردگرد کیا پوزیشن ہے؟''

وہ بولا۔ ''دھماکے کے بعد کچھ افراتفری مچی تھی۔ پر اب سکون ہی ہے۔ ان اندھوں کو ابھی تک پتا نہیں چلا کہ گیس سلنڈر کے پھٹنے کی وجہ کیا ہے۔ ویسے اب پولیس کی ایک گاڑی آئی ہوئی ہے۔ کوٹھی کی پچھلی طرف کھڑی ہے۔ گاڑی کا معائنہ وغیرہ کر رہی ہے۔ مین گیٹ کی طرف اسی طرح دو تین گارڈ ٹہل رہے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ میں ابھی ان کا ٹہلنا بند کرتا ہوں۔ تم تیار رہو۔''

''کیا مطلب؟''

''تین اسٹکس میرے پاس ہیں۔ میں انہیں یہاں کسی مناسب جگہ پر پھاڑ رہا ہوں۔ جیسے ہی بلاسٹ ہو تم گاڑی چلا کر مین گیٹ کی طرف آؤ۔ بلکہ اپنی گاڑی کا رخ ابھی ٹھیک کرلو۔''

''ٹھیک ہے، ہم تیار ہیں۔'' سجاول نے پاٹ دار آواز میں کہا۔

میں نے احتیاطاً ہولسٹر میں سے ریوالور نکال لیا۔ بغیر آواز پیدا کیے دروازے کی کنڈی گرائی اور دائیں بائیں دیکھ کر باہر نکل آیا۔ میرے ٹراؤزر کی بڑی جیب میں وہ تینوں ڈائنامائٹ اسٹکس موجود تھیں جو یہاں ایک زوردار بلاسٹ پیدا کر کے میرے نکلنے کی راہ ہموار کر سکتی تھیں، تاہم میں یہاں کسی قسم کا جانی نقصان نہیں چاہتا تھا۔ یہاں تاجور کے علاوہ دین محمد صاحب اور ان کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ پھر ملازمائیں فردوس اور انوری بھی یہیں تھیں، اس کے علاوہ بھی بے گناہ لوگ تھے۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، پھر سیڑھیاں چڑھ کی چھت کی طرف بڑھا۔ ابھی میں چھت سے دور ہی تھا کہ سیڑھیوں کے موڑ پر ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا، اس ادھ کھلے دروازے میں ایک بلب اسپارک کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا یہ ''یو پی ایس'' کی جگہ تھی۔ ایک ہیوی ڈیوٹی یو پی ایس اور بجلی کے تار وغیرہ یہاں دکھائی دے رہے تھے۔ یہ مناسب جگہ تھی۔ یہاں بلاسٹ ہوتا تو کوٹھی میں لائٹ کا انتظام بھی درہم برہم ہو جاتا۔

میں نے اسٹکس نکالیں یہ چھوٹے سائز کی تھیں پھر بھی میں نے تین کے بجائے دو اسٹکس استعمال کیں۔ ان کے مختصر سے فلیتے کو آگ دکھانے کے لیے لائٹر میں سجاول سے ہی لے آیا تھا۔ میں نے اسٹکس کو یو پی ایس کے باکس کے پاس ہی رکھا اور آگ دکھا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ میری توقع اور خواہش کے عین مطابق تھا۔ میں آٹھ دس زینے اتر کر تاجور والے کمرے کے دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے اور اس کے ساتھ ہی گہری تاریکی پھیل گئی۔

کوٹھی کے مکینوں بلکہ اردگرد کے لوگوں کے لیے بھی یہ رات خاصی ''ناخوشگوار'' ثابت ہو رہی تھی۔ یہ دوسرا بلاسٹ تھا جس نے انہیں بستروں سے اچھلنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ پنسل ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ میں سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں تاجور بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے ایک بڑی چادر میں لپیٹ کر کندھے پر ڈال لیا۔ ریشم کی طرح ہلکی اور پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح نازک۔

راحیل جو اتنی افراتفری کے باوجود اب تک سویا رہا تھا...... اب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔
''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' اس کی غنودہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ تب تک میں کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

باہر ایک بار پھر دھما چوکڑی مچ گئی تھی۔ عورتیں باقاعدہ چلا رہی تھیں۔ دروازے دھڑا دھڑ بج رہے تھے۔ تاریکی نے مکینوں کو مزید بدحواس کر دیا تھا۔ سیڑھیوں میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ غالباً یو پی ایس والے کیبنٹ میں تھوڑی سی آگ بھی لگ گئی تھی۔ میں تاجور کے ساتھ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے کوریڈور میں پہنچا۔ گاہے بگاہے میں ایک لمحے کے لیے پنسل ٹارچ بھی روشن کر لیتا تھا۔ میں نے گدرائے ہوئے جسم والی فردوس کی جھلک دیکھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش میں گر گئی تھی۔ شاید اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام

رکھا تھا۔ افراتفری کا ایسا عالم تھا کہ کسی نے میری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے نیم تاریکی میں دیکھا بھی ہوگا تو یہی سمجھا ہوگا کہ ایک گارڈ کسی زخمی کو اٹھا کر خطرے والی جگہ سے دور لے جارہا ہے۔

میں نے بائیں ہاتھ سے تاجور کو کندھے پر تھام رکھا تھا، دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا اور کسی بھی خطرے کی صورت میں، میں اسے اپنے دفاع کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ فوراً ہی مجھے الیکٹرک فرم والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آ گئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر یونس خود بیٹھا تھا۔ گاڑی کا سلائڈنگ ڈور کھول دیا گیا۔ میں نے پلک جھپکتے میں تاجور کو گاڑی کی لمبی نشست پر لٹا دیا۔ اس نے اب کسمسانا شروع کردیا تھا، ہر کسی کی توجہ کوٹھی کی طرف تھی۔ شاید ہی کسی کو پتا چلا ہو کہ ایک سوزوکی ہائی روف یہاں رکی ہے اور اس میں کسی کو ڈالا گیا ہے۔

میں گاڑی کے اندر داخل ہوا اور سلائڈنگ ڈور بند کردیا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ کہیں آگ کے آثار نہیں تھے۔ موقع پر جو تھوڑی سی آگ لگی تھی اسے یقیناً فوراً بجھا دیا گیا تھا۔ اس ساری کارروائی میں تھوڑا بہت مالی نقصان تو ہوا تھا لیکن کسی طرح کا جانی نقصان نہیں ہوا تھا اور یہ شکر کا مقام تھا۔

☆☆☆

رات گزر چکی تھی۔ دھیرے دھیرے صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر گیندے اور گلاب کے پھول اوس میں نہائے دکھائی دیتے تھے۔ وہ بھی آنسوؤں کی اوس میں نہائے کسی پھول جیسی ہی تھی۔ وہ ایک تکیے سے ٹیک لگائے آرام دہ بستر پر نیم دراز تھی۔ میں نے اس کے سر کی چوٹ پر تھوڑی سی پائیوڈین لگا دی تھی۔ وہ سسک کر بولی۔ ”یہ سب کیا ہوگیا ہے شاہ زیب! وہاں میرے بارے میں کیا سوچا جارہا ہوگا۔ اباجی کی کیا حالت ہوگی...... اور امی جان اور دوسرے......“

”اباجی کے سوا کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہوگی تاجور، بلکہ وہ خوش ہی ہوئے ہوں گے۔ دیکھنا وہ بہت جلد تمہاری ہمت کی داد دیں گے۔“

”لل...... لیکن ان کو کیا پتا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے، میں خود گئی ہوں...... یا کوئی مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا ہے...... یا پھر کچھ اور......“

”تم ان سب کو بتا دو کہ تم خود گئی ہو، کیونکہ تم جانتے بوجھتے اس اندھی کھائی میں گرنا نہیں چاہتی تھیں۔“

”مگر کیسے...... اور میری بات پر کون یقین کرے گا۔ وہاں جو کچھ آپ نے کیا ہے، وہ سب کے علم میں آچکا ہوگا۔ وہاں جو دو مرتبہ بارود کے دھماکے ہوئے۔ وہ کس گنتی میں آئیں گے؟ ہر کوئی جان چکا ہوگا کہ وہ دھماکے صرف اس لیے تھے کہ چوکیداروں اور پولیس والوں کی توجہ ہٹائی جائے اور کوئی کوٹھی کے اندر داخل ہوسکے اور پھر باہر بھی نکل سکے۔“

”بھئی یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ دھماکوں والا چکر کوئی اور ہو...... اور تم نے بس اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا ہو۔ اس طرح کے حالات میں لوگ اس طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں...... تم یہ سب کچھ اپنے اوپر کیوں لے رہی ہو؟ مجھے کسی نے اندر داخل ہوتے نہیں دیکھا، نہ ہی ہم دونوں کو باہر نکلتے دیکھا ہے۔ جب کوئی ثبوت نہیں ہے، گواہی نہیں ہے تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔“

اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے نازک رخسار سے آنسو پونچھے اور بولی۔ ”میں نے تو اپنی جوتی تک نہیں پہنی ہوئی تھی پھر کوئی اس بات پر یقین کیسے کرسکتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے وہاں سے نکلی ہوں۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ راحیل کو اس بات کا تھوڑا بہت شک ہوگیا ہو کہ کمرے میں میرے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔“

”اسے بالکل شک نہیں ہوا تاجور! اس وقت تک کوٹھی میں گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ باقی رہی تمہاری جوتی والی بات تو...... جب کوئی ہنگامی صورتِ حال میں موقع تاک کر بھاگتا ہے تو ضروری نہیں ہوتا کہ وہ جرابیں جوتی وغیرہ پہنے......“

”شاہ زیب! میرے سر پر تو دوپٹا بھی نہیں تھا۔“

”وہ چادر تو تھی جس میں، میں نے تمہیں لپیٹا تھا۔ اس نے دوپٹے کی کمی پوری کردی۔“

وہ شکوک کا اظہار کررہی تھی اور میں ہر شک کا جواب دلیل سے دے رہا تھا۔ دوپہر تک وہ کافی حد تک سنبھل گئی۔ اسے سکون بخش دوا کی آدھی گولی کھلا کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہم اس وقت یونس کے الیکٹریشن دوست شرافت علی کے گھر میں موجود تھے۔ اس کا یہ پانچ مرلہ مکان اسلام آباد اور راولپنڈی کے سنگم پر واقع تھا۔ شرافت علی کی بیوی اپنے بچوں سمیت اپنی والدہ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ چھوٹے بھائی کو اس نے خود کسی کام سے لاہور روانہ کردیا تھا۔ ہم دو چار دن بہ آسانی پوری رازداری کے ساتھ یہاں رہ سکتے تھے۔

سجاول نے چونکہ رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا تھا لہٰذا اس وقت وہ سومن کا ریچھ ڈبل بیڈ پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ یونس اور شرافت ٹی وی کے سامنے موجود تھے۔ میں نے یونس سے پوچھا۔ ''کوئی نیوز آئی ؟''

''نہیں...... اور یہ ہے حیرانی کی بات۔ لگتا ہے کہ میڈیا والوں کو وہاں تک جانے ہی نہیں دیا گیا۔''

شرافت علی بولا۔ ''بس اتنی خبر آئی ہے کہ کل رات چھوٹے سیکٹر نمبر چار میں رات کو دو بجے کے لگ بھگ زوردار ''کارسلنڈر'' دھماکا ہوا جس سے علاقے کے مکین خوف زدہ ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، تاہم گاڑی تباہ ہو گئی۔''

''دوسرے دھماکے کا ذکر نہیں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کم از کم ہم نے تو کسی چینل پر نہیں سنا۔'' یونس پمپ والا نے جواب دیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ داراب فیملی نے اپنے اثر رسوخ سے اور اپنے لمبے ہاتھوں کے ذریعے اس خبر کو دبا لیا ہے۔ تاجور کے غائب ہو جانے والی خبر کو بھی آؤٹ نہیں ہونے دیا گیا تھا مگر یہ بات تو طے تھی کہ اس کی تلاش پورے زور وشور سے ہو رہی ہو گی اور عین ممکن ہے کہ اب تک لاہور میں تاجور کے ماموؤں اور دیگر عزیزوں کے گھروں پر خفیہ چھاپے بھی مارے جا چکے ہوں۔

لالہ موسیٰ کے نواحی گاؤں میں خورسنہ اور اس کا بچہ گھر میں اکیلے تھے۔ شام کو میں نے سجاول کو زبردستی پنڈی واپس بھیج دیا، تاہم یونس میرے ساتھ ہی رہا۔ وہ مجھے وقاص کے نام سے جانتا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ کچھ عرصہ پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے کسی اور روپ میں دیکھ چکا ہے۔ اس کے سامنے میں آواز بدلنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں نے تاجور کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جب یونس یا شرافت میرے آس پاس ہوں تو مجھے میرے اصل نام سے نہیں پکارے۔ بہرحال ابھی تک ایسا موقع آیا ہی نہیں تھا کہ تاجور نے اور میں نے ان دونوں کے سامنے بات کی ہو۔

رات کے وقت تاجور پھر بے چین ہونے لگی۔ وہ کچھ کھا پی بھی نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور بمشکل چند لقمے کھلائے۔ وہ اپنی والدہ کی صحت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے بھائیوں راحیل اور اسفند کی یاد بھی اسے بری طرح ستا رہی تھی۔ میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ اپنے والد کی ضد اور دارج دارابی کی ہوس کے جال سے نکل آنا اس کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ میں نے ایک بار پھر اسے وہ آڈیو ریکارڈنگ سنائی جس میں محترم مولانا حبیب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

پچھلی رات تو تاجور شدید ٹینشن میں تھی اس لیے اس نے یہ ریکارڈنگ زیادہ توجہ سے نہیں سنی تھی، تاہم اس مرتبہ اس نے دھیان سے اپنے بڑے ماموں کے خیالات سنے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا اضطراب کافی حد تک کم ہوا ہے۔ اس نے دلگیر آواز میں کہا۔ ''مجھے بڑے ماموں کی طرف سے بھی بہت پریشانی ہے، کہیں یہ نہ ہو کہ میرے اس طرح غائب ہو جانے کا الزام بھی بڑے ماموں پر آ جائے۔''

''اس بارے میں تم زیادہ فکر نہ کرو تاجور، تمہارے بڑے ماموں ایک باہمت شخص ہیں، ویسے بھی ان کے اردگرد ان کے بہت سے بااثر عقیدت مند موجود ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔''

''لیکن شاہ زیب! بڑے ماموں اور دوسرے خود کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟ میرے ساتھ کیا ہوا ہے، میں کہاں گئی ہوں؟''

''تمہارے پاس بڑے ماموں کا نمبر ہو گا، میرے پاس بھی ہے، تم انہیں فون کر دو بلکہ...... یہ بھی ٹھیک نہیں۔ تم انہیں اپنی ہینڈ رائٹنگ میں ایک خط لکھ دو اور بتا دو کہ ایک عاقل بالغ لڑکی کی حیثیت سے تم نے اپنی مرضی سے گھر چھوڑا ہے اور اب مکمل محفوظ جگہ پر ہو۔ فی الحال مجبوری ہے جس کی وجہ سے تم اپنا ٹھکانا نہیں بتا سکتی ہو۔''

تاجور خط لکھنے پر آمادہ تو ہو گئی لیکن وہ الجھن میں تھی، اس نے کہا۔ ''وہاں دو مرتبہ جو دھماکا ہوا میں اس کے بارے میں کیا لکھوں؟''

''تم اس سے خود کو بالکل لاتعلق ظاہر کرو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے بس اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہاں سے نکل گئیں۔''

''شاہ زیب! یہ جھوٹ ہے۔ میں ماموں کو یہ جھوٹ کس طرح لکھوں اور یہ بھی تو جھوٹ ہے کہ میں اکیلی وہاں سے نکلی ہوں۔''

''مگر تاجور، اس سارے خط میں جو اصل بات ہو گی وہ تو جھوٹ نہیں ہے، تم اس شکنجے سے نکلنا چاہتی تھیں اور تم نکل گئیں اور اب تم اپنی مرضی سے ایک بالکل محفوظ جگہ پر

ہو۔ وقت آنے پر تم اپنا اتا پتا بھی بتا دو گی۔"

میں نے اسے قائل کر لیا تو اس نے اپنے بڑے ماموں کے نام دو صفحے کا ایک خط لکھ دیا۔ یونس ایک دن کے لیے لالہ موسیٰ جا رہا تھا۔ میں نے اسے لفافہ بند خط دے دیا اور ہدایت کی کہ وہ اس خط کو گجرات سے لاہور کے اس ایڈریس پر فوراً پوسٹ کر دے۔

ملازمہ فردوس کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بطور ڈرائیور وقاص میرا تاجور سے رابطہ رہا ہے اور میں اسے فون کرتا رہا ہوں۔ مجھے فردوس کی طرف سے تھوڑا سا اندیشہ تھا کہ کہیں کسی موقع پر وہ اپنی زبان نہ کھول دے۔ اگلے روز میں بذریعہ ٹیکسی پنڈی سے کچھ دور گوجر خاں میں پہنچا اور وہاں سے فردوس کو فون کیا۔ گوجر خاں آنے کا مقصد یہی تھا کہ میری لوکیشن وغیرہ ٹریس نہ ہو سکے۔ تیسری چوتھی کوشش پر فردوس سے رابطہ ہو گیا۔ وہ حسب معمول خوف زدہ تھی، میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ "کہاں ہو؟" میں آواز بدل کر بول رہا تھا۔

"وہیں...... اسلاماں باد...... میں۔" وہ ہکلائی۔

"اب بھی واش روم میں ہو؟"

"نن...... نہیں، چھت پر چڑھ کر بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں پھر ہو گیا نکاح شکاح؟" میں نے بدستور عام لہجے میں پوچھا۔

"نن...... نکاح...... نہیں ابھی نہیں ہوا۔ ایک دو دن آگے چلا گیا ہے۔" وہ گول مول انداز میں بولی۔

میں سمجھ گیا کہ گھر کے ملازمین کو بھی سختی سے پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ تاجور کی غیر موجودگی کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیں گے۔ میں نے کہا۔ "کیوں خیریت ہے، اس وارج خبیث سے تو ایک دن بھی صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس بے چاری کی ماں اسپتال میں پڑی ہے اور وہ سہاگ رات منانے کے لیے دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔"

"بب...... بس...... اُن کی...... بیماری کی وجہ سے ہی لیٹ ہوا ہے۔" فردوس نے پردہ داری کرتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ "ویسے تم کہاں ہو وقاص بھائی؟"

"دسکھیر امیں اور کہاں؟"

"پرسوں رات کہاں تھے؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا شک جھلک دکھا رہا تھا۔

"پرسوں بھی یہیں تھا...... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"کچھ...... نہیں......" وہ ہکلائی پھر ذرا وقفہ دے کر کہنے لگی۔ "جب تم نے پچھلی دفعہ بات کی تو ایسا لگتا تھا کہ...... تم...... یہ نکاح ہونے ہی نہیں دو گے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ نکاح ہو بھی گیا تو وہ کون سا اُڑ کر آسمانوں میں چلی جائے گی۔ رہے گی تو اسی زمین پر۔ یہاں سکھیرا بھی آئے گی۔ کبھی نہ کبھی تو اپنا نشانہ بھی لگے گا اپنی شہزادی پر۔"

"وقاص! تم آگ سے کھیل رہے ہو۔"

"میں نے کہا ہے ناں کہ میں آگ سے نہیں کھیل رہا، میں خود آگ ہوں۔ اس وارج خبیث جیسی کوئی لکڑی میرا راستہ نہیں روک سکتی۔ روکے گی تو کوئلہ ہو جائے گی۔ بس تم ایک بات یاد رکھنا، تم نے میرے بارے میں اپنی زبان بالکل بند رکھنی ہے۔ اگر کسی وقت تم نے اس معاملے میں ایک لفظ بھی بولا تو پھر تمہاری اور تمہارے گھر بار کی خیر نہیں ہے۔"

وہ جیسے جھرجھری لے کر بولی۔ "میں نے تم سے سو واری کہا ہے، میں کچھ نہیں بولوں گی، مر کر بھی نہیں بولوں گی۔"

فردوس سے بات ختم کرنے کے فوراً بعد میں پنڈی واپس روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا میری غیر موجودگی میں تاجور کو اضافی پریشانی ہو گی۔

میں دوپہر دو بجے کے لگ بھگ واپس گھر پہنچا تو تاجور تکلیف میں تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا اور وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔ پرسوں رات جب وہ کمرے میں بے ہوش ہو کر گری تھی، اس کے سر اور کمر پر چوٹ آئی تھی۔ کمر کی چوٹ اس وقت تو زیادہ ظاہر نہیں ہوئی تھی مگر اب تکلیف دے رہی تھی۔ بائیں جانب والی پسلیوں میں گاہے بگاہے شدید ٹیس اٹھتی تھی۔ وہ پین کلر سے کام چلا رہی تھی مگر اب لگتا تھا کہ ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ گرتے ہوئے، بیڈ کا کوئی حصہ اس کی پسلیوں سے ٹکرایا تھا اور وہاں گہرا نیل بھی دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑی ہمت والی تھی مگر اب اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ یہ سہ پہر ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ اس وقت اکثر پرائیویٹ کلینکس میں ڈاکٹر موجود نہیں ہوتے۔ کسی بڑے اسپتال میں جانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ہمارے میزبان شرافت علی نے پتا کیا اور چار بجے کے قریب ایک نزدیکی کلینک میں ڈاکٹر کی موجودگی کا علم ہوا۔ شرافت علی ایک ٹیکسی کار بھی لے آیا تھا۔ میں اس کار

کے ذریعے کراہتی ہوئی تاجور کو کلینک لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا، وہیں پر ایکسرے وغیرہ بھی ہوا۔

اس نے کہا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ پٹھے کی چوٹ ہے، آرام کرنے سے دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے درد کش انجکشن بھی لگا دیا اور بیرونی استعمال کے لیے دوا بھی دی۔

تاجور کو کلینک میں ہی خاطر خواہ افاقہ ہو گیا۔ ہم اسی ٹیکسی کار میں واپس روانہ ہوئے۔ تاجور نے چہرے پر چادر کا نقاب کیا ہوا تھا۔ بس اس کی آنکھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ پچھلی نشست پر تھی، میں ڈرائیور کے ساتھ آگے تھا۔ گارڈ والی نیلی وردی سے میں نے کل ہی نجات حاصل کر لی تھی۔ اب میں شرافت علی کی فراہم کردہ ایک پینٹ شرٹ میں تھا۔ سر پر پی کیپ تھی جو میں نے پیشانی پر آگے تک جھکا رکھی تھی۔ میں جانتا تھا دارج داراب انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا۔ اس کے ہرکارے ہر ممکنہ جگہ پر تاجور کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ہم بہ امر مجبوری گھر سے نکلے تھے ورنہ تاجور کے لیے اس گمنام گھر کی چار دیواری محفوظ ترین جگہ تھی۔

بعض اندیشے بڑی جلدی درست ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے تاجور کے دیکھے جانے کا اندیشہ تھا اور اسے دیکھ لیا گیا..... لیکن ان لوگوں نے نہیں دیکھا جن کی طرف سے خطرہ تھا۔ اسے کسی اور نے دیکھا اور جس نے دیکھا وہ میرے یا تاجور کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یقین نہیں آیا کہ وہ اس جگہ ہمارے آس پاس موجود ہے۔ وہ پہلوان حشمت راہی تھا۔ ہماری ٹیکسی ایک ٹریفک سگنل پر رکی ہوئی تھی۔ پہلوان ایک رکشا میں تھا اور رکشا ہماری ٹیکسی کے عین برابر میں تھا۔ وہیں سے پہلوان نے تاجور پر غور و خوض کیا تھا اور اسے پہچان لیا تھا۔ تاہم اسی دوران میں سگنل کھل گیا اور ٹریفک چل پڑا۔ اب حشمت راہی نے اپنا آدھا دھڑ رکشا سے باہر نکال لیا اور بہ آواز بلند پکارنے لگا۔ ''تاجور...... تاجور۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ لمبا کر کے ہماری ٹیکسی پر زوردار دستک بھی دی۔ تاجور کے منہ سے بے ساختہ ''ہائے اللہ'' نکلا اور وہ سہم کر رہ گئی۔ رکشا، ٹیکسی سے ذرا آگے نکل گیا۔ پہلوان نے ہیجانی انداز میں ہاتھ لہرایا اور ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''روکو...... گاڑی روکو۔''

ڈرائیور نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پہلوان جس طرح رکشا سے باہر نکلا پڑ رہا تھا یوں لگتا تھا کہ وہ گر پڑے گا یا پھر رکشا کو ہی الٹا دے گا۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر ڈرائیور کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ گاڑی روک دے۔

رکشا اور ٹیکسی دونوں سڑک کے کنارے ایک کھلی جگہ پر رک گئے۔ تاجور نقاب کی اوٹ سے لرزاں آواز میں بولی۔ ''ہائے اللہ اب کیا ہوگا، یہ تو چاچا حشمت ہیں۔''

''اب بات تو کرنا ہی پڑے گی...... لیکن میرے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

تاجور نے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پہلوان کسی قوی ہیکل مینڈک کی طرح پھدک کر رکشا سے باہر نکلا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا منہ کچھ سوجا ہوا ہے۔ تاجور نے اپنی طرف والی کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار دیا تھا۔ پہلوان نے آتے ساتھ ہی تاجور کے سر پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ پھیرا اور ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''مجھے اپنی نگاہوں پر یقین ناہیں آوت کہ تمہیں یہاں دیکھ رہا ہوں۔''

تاجور نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ''چاچا جی! آپ گاڑی میں آجائیں، اس طرح باہر کھڑے ہو کر بات کرنا ٹھیک نہیں۔''

پہلوان حشمت نے کچھ کہنا چاہا، پھر ارادہ بدل کر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں اس رکشا والے کو فارغ کر لوں۔''

وہ اپنے بھاری جسم کو جھلاتا ہوا تیزی سے رکشا کی طرف گیا۔ اس میں سے اپنا ایک بیگ نکالا اور کرایہ ادا کر کے گاڑی کی پچھلی نشست پر تاجور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار پھر تاجور کے سر پر پیار دیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اب اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دے گا لیکن تاجور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور بولی۔ ''آپ میرے ساتھ چلیں پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔''

تاجور کے رازدارانہ انداز کو دیکھ کر پہلوان نے اپنا مٹکا سا سر اثبات میں ہلایا پھر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ تاجور نے کہا۔ ''انہوں نے میری بہت مدد کی ہے۔ میں ابھی گھر جا کر ان کے بارے میں آپ کو بتاتی ہوں۔''

''جانا کہاں ہے؟'' پہلوان نے پوچھا۔

''زیادہ دور نہیں۔'' تاجور نے کہا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کی ہدایت کی۔

اپنے نقوش کی تبدیلی یعنی کاسمیٹک سرجری کے بعد اپنے کسی بھی شناسا سے ملنا ایک بہت انوکھا تجربہ ہوتا تھا۔ ایسے تجربے کی اصل کیفیت وہی بیان کرسکتا ہے جو اس میں سے گزرا ہو۔ آپ کسی کے سامنے ہوتے ہیں۔ وہ آپ کی اصل کو نہیں جان رہا ہوتا۔ آپ کے چہرے کو دیکھتا ہے، آپ کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے، آپ کے حوالے سے ایک الجھن سی اس کے دل و دماغ میں جاگتی ہے۔ آپ کا اور اس دوسرے شخص کا تعلق جتنا قریبی اور پرانا ہوتا ہے یہ الجھن اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔

پہلوان حشمت نے بھی دو تین بار بڑے دھیان سے میری طرف دیکھا، کچھ کہنا بھی چاہا لیکن پھر تاجور کی ہدایت کے مطابق خاموش رہا۔ میرے ذہن میں ہلچل تھی۔ پہلوان کا ملنا ایک اتفاق ہی تھا مگر یہ اتفاق زیادہ مناسب موقع پر نہیں ہوا تھا۔ اگر ہم اسے پکارتا چھوڑ کر نکل جاتے تو یہ بھی کسی طور درست نہیں تھا۔ اسے ساتھ لے لینے میں ہی عافیت نظر آرہی تھی۔

گھر میں پہنچتے ہی وہ بند ٹوٹ گیا جو پہلوان حشمت نے اپنی تیز رفتار گفتگو کے سامنے باندھ رکھا تھا۔ پہلوان نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی اور وہ ٹھیک طرح بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ گفتگو میں اس رکاوٹ کی وجہ اس کا سوجا ہوا منہ اور جبڑا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ کس واقعے کا نتیجہ تھا۔

وہ تاجور پر سوالوں کی بارش کر رہا تھا تم یہاں کیسے؟ تم تو دین محمد کے ساتھ اسلام آباد گئی تھیں۔ سنا تھا تمہارا نکاح ہو رہا ہے۔ نکاح ہوا یا ناہیں۔ اور دین محمد صاحب کہاں ہیں؟ ہماری بہن کی حالت ٹھیک ہوئی یا ناہیں؟ میری سمجھ میں کچھ ناہیں آوت۔ تم نے شادی سے انکار تو ناہیں کر دیا؟"

تاجور نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "چاچا جی! آپ ایک ایک کر کے سوال پوچھیں گے تو شاید میں آپ کو جواب بھی دے سکوں۔"

"چلو جیسے تم ٹھیک سمجھت ہو مگر جواب تو دو۔" پہلوان نے کہا۔

ساتھ والے کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں، میں بند کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ کھڑکیاں بند اور پردہ برابر کر کے واپس پلٹا تو پہلوان کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے دیکھا، وہ آنکھوں پر اپنا صافہ رکھے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ تاجور کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ پہلوان کہہ رہا تھا۔ "دیکھو، میری مت ہی ٹھکانے ناہیں

رہی۔ کتنی اہم اور دکھ والی بات بھول گیا...... شاہ زیب کی موت کا جتنا دکھ ہوا شاید اپنے کسی خونی رشتے کا بھی نا ہیں ہوتا۔ دو تین دن روتا ہی رہا۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ سجاول سیالکوٹی کے ڈیرے پر اس نے جو کچھ میرے اور تمہارے لیے کیا وہ کوئی بھولنے والی بات نا ہیں۔ اگر ہم دونوں وہاں سے صحیح سلامت نکلے تو یہ اس کی ہمت کی وجہ سے ہی تھا...... وہ...... وہ بہت چاہت تھا تم کو...... تمہارے لیے بہت کچھ کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ کاش تم دونوں کے ملنے کی کوئی سبیل نکل آتی۔"

یہ میری "وفات حسرت آیات" کا ذکر ہی ہو رہا تھا۔ اپنے ہوتے ہوئے اپنے نہ ہونے کی باتیں سننا بھی عجیب تجربہ تھا۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ میں ایک روح ہوں اور اپنے "مرنے" کے بعد اپنے لواحقین کے جذبات ملاحظہ کر رہا ہوں۔ پہلوان حشمت اور تاجور کے درمیان کچھ دیر میرے حوالے سے باتیں ہوئیں۔ پھر تاجور نے صفائی سے گفتگو اور سوالات کا رخ پہلوان کی طرف موڑ دیا۔ وہ بولی۔ "چاچا جی، جس طرح آپ میرے بارے میں حیران ہیں، میں بھی بہت حیران ہوں۔ آپ یہاں کیسے؟ اور آپ کے منہ پر یہ چوٹ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ سے یہاں راولپنڈی میں اس طرح ملاقات ہوگی۔"

پہلوان اب کافی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے صافے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی کہ مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے، بیٹا جی! یہ سارا معاملہ تمہارا ہی تو تھا۔ اب چاند گڑھی میں بھی ہر کسی کو معلوم ہو چکا ہے کہ دین محمد صاحب سب رشتے داروں کی مرضی کے خلاف تمہاری شادی لاہور کے بہت امیر کبیر لوگوں میں کرنا چاہت ہیں۔ تمہارے بڑے ماموں مولوی حبیب صاحب نے اور تمہاری امی نے بھی اس رشتے کی سخت مخالفت کی۔ اس پر لاہور کے وہ بڑے لوگ تمہارے بڑے ماموں کے بھی سخت خلاف ہو گئے۔"

"بڑے ماموں خیریت سے تو ہیں ناں؟" تاجور نے جیسے تڑپ کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم کو کچھ خبر نا ہیں...... لیکن گھبراؤ نا ہیں...... ویسے وہ خیریت سے ہی ہیں، مگر پچھلے دنوں کافی مشکل میں رہے ہیں۔ پولیس ان کو بالکل ناجائز طور پر گرفتار کرنا چاہ رہی تھی۔ ان کے عقیدت مندوں نے بہت بڑی تعداد میں جمع ہو کر پولیس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ چاند گڑھی سے بھی کئی لوگ یہ خبر سن کر لاہور پہنچے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اچھا خاصا ہنگامہ ہوا۔ بعد میں بات بڑے پولیس افسروں تک اور میڈیا والوں تک پہنچ گئی۔ پولیس کو فی الحال تو مولوی صاب کی جان چھوڑنی پڑ گئی ہے۔ کل یہ اعلان بھی ہوا تھا کہ ان کے خلاف درج ہونے والا پرچہ خارج کر دیا جاوے گا۔"

میں دروازے کی اوٹ سے سب کچھ سن رہا تھا۔

تاجور نے اپنے ماموں جان کی خیر خیریت کے حوالے سے کچھ مزید سوالات پوچھے پھر پہلوان سے دریافت کیا کہ ان کے منہ پر یہ چوٹ کیسے لگی ہے۔ پہلوان نے کہا۔ "بیٹا جی! تم کو تو معلوم ہی ہووے گا، ہم کے اپنے جھگڑے تو کم ہی ہووت ہیں، بس دوسروں کے جھگڑوں میں چوٹیں لگتی رہتی ہیں اور یہ چوٹ تو بڑی برکت والی ہے۔ ایسی دس چوٹیں میں مزید کھانے کو تیار ہوں۔"

تاجور کے استفسار پر پہلوان حشمت نے بتایا کہ پرسوں جب مولوی صاحب کو ان کے گھر سے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تو ان کے عقیدت مندوں اور پولیس میں باقاعدہ جھڑپ ہوئی۔ اس جھڑپ میں کسی ساتھی کی کہنی اُن کے جبڑے پر لگ گئی۔ پھر پہلوان نے خود ہی کہا۔

"تاجور! تمہارا چاچا اتنا نرم نازک نا ہیں ہے۔ اب بھی آج کل کے تین چار لونڈوں کو اکیلا ہی مار کر بھگا سکت ہوں۔ یہ دراصل ایک پرانی چوٹ تھی جو خوامخواہ تازہ ہو گئی۔"

پھر پہلوان حشمت نے تاجور کو وہی واقعہ سنایا جو کچھ عرصہ پہلے جاماجی میں مجھے بھی ٹیلی فون پر سنایا تھا۔ چاند گڑھی میں زمیندار کے دو بکروں کی لڑائی ہوئی تھی۔ ایک بکرے کا سینگ ٹوٹ گیا تھا۔ خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر پہلوان بھاگا بھاگا وہاں پہنچا تھا اور بکرے کے سینگ کی مرہم پٹی کی کوشش کی تھی۔ جذبۂ خیر سگالی سے ناواقف بکرے نے ایک زوردار ٹکر پہلوان کو بھی رسید کر دی تھی اور جبڑے کا کڑاکا نکال دیا تھا۔

آخر میں پہلوان نے بتایا۔ "بیٹا جی! میں نے گاؤں واپس جانے سے بہتر سمجھا کہ یہاں پنڈی آ جاؤں۔ یہاں اپنی ایک پھوپی زاد رہتی ہے۔ سوچا دو چار روز اس کے گھر آرام کر لوں گا۔ یہاں پر ایک مشاعرے کا دعوت نامہ بھی آیا ہوا تھا۔ اگر جبڑے نے اجازت دی تو مشاعرہ بھی بھگتا لوں گا۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نا ہیں تھی کہ پنڈی کی ایک سڑک پر میں تمہیں اس طرح ٹیکسی میں دیکھ لوں گا......"

پہلوان کا ذہن ایک بار پھر اپنے بے شمار سوالوں کی

طرف منتقل ہو رہا تھا۔ میں موقع تاک کر اندر چلا گیا اور تاجور سے کہا۔ ”آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بات سن لو۔“

تاجور بھی یقیناً کسی موقع کی ہی منتظر تھی۔ پہلوان سے مہلت لے کر باہر آ گئی۔ ایک قریبی کمرے میں جا کر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”اب کیا کرنا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پہلوان جی بُرے وقت پر ٹپکے ہیں۔ لیکن ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم ان کو جانے دیتے تو پنڈی میں ہماری موجودگی کی بات نجانے کہاں تک پھیل جاتی۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ ویسے شاہ زیب...... پہلوان چاچا بھروسے کے بندے ہیں۔ امی جی ان کو بھائی کہتی ہیں اور ان سے دکھ سکھ بھی بانٹتی ہیں۔ یہ بھی ہمارے گھر کی بات باہر نہیں کرتے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ عام لوگوں کے لیے بھی محبت اور ہمدردی ان میں بہت زیادہ ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے تاجور، مگر موجودہ حالات میں انہیں کیا بتاؤ گی؟“

”یہی تو پوچھ رہی ہوں۔“

میں نے تھوڑی دیر مراقبے میں رہنے کے بعد کہا۔ ”اس بات کا تو مجھے بھی پتا ہے کہ پہلوان حشمت پیٹ کا ہلکا نہیں ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ تمہارے ماموں جان کے عقیدت مندوں میں سے ہے ورنہ چاند گڑھی سے پولیس کے ڈنڈے کھانے کے لیے لاہور کیوں پہنچتا۔ حق سچ کا ساتھ دینے والے لوگ ہی اس طرح بغیر کسی مفاد کے خود کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم پہلوان حشمت کو بھی وہ سب کچھ بتا ڈالو جو مولانا حبیب اللہ کو اپنے خط میں لکھا ہے۔“

”یعنی میں شادی والے گھر سے بھاگ آئی ہوں؟“

”بالکل، تم کو جھجکنا نہیں چاہیے تاجور! تم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ تم پہلوان کو بھی بتا دو کہ تمہیں اسلام آباد کے اس گھر سے بھاگنے کا ایک موقع ملا اور تم نے اس سے فائدہ اٹھایا۔“

”آپ کے بارے میں انہیں کیا بتاؤں؟ وہ ابھی تک آپ کو پہچاننے میں ناکام ہیں۔“

”فی الحال کچھ بھی کہہ دو...... کہہ دو کہ میں اور شرافت، شاہ زیب کے قریبی دوست ہیں، اور ہم نے تمہیں پناہ دی ہے۔ تم ہم پر پورا...... مکمل اعتماد کرتی ہو۔“

”آپ کے بارے میں پہلوان چاچا اُلجھن میں نظر آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی آواز پر بھی غور کر رہے ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے دو چار دن کے ساتھ میں وہ آپ کو پہچان نہیں لیں گے؟“

”چلو، اگر پہچان لیں گے تو پھر دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا اور تاجور کو کچھ ضروری ہدایات دے پہلوان حشمت کے پاس واپس بھیج دیا۔

دروازے کی اوٹ سے میں نے دیکھا۔ پہلوان حشمت ایک بار پھر صافے کی مدد سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میرے ذکر نے اسے افسردہ کیا ہے۔ جونہی تاجور اندر داخل ہوئی وہ سرتاپا سوال بن کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے تاجور سے پہلا سوال یہی کیا کہ وہ اسلام آباد سے یہاں کیسے پہنچی ہے اور اس کا نکاح ابھی ہوا ہے یا نہیں؟

تاجور نے ٹھہر ٹھہر کر اور مکمل رازداری کی شرط کے ساتھ، بڑے سلیقے سے پہلوان حشمت کو اس کے سارے سوالوں کے جواب دیے۔ اس کی ساری بات سننے کے بعد پہلوان نے ایک بار پھر بڑے جذباتی انداز میں تاجور کے سر پر پیار دیا اور اشکبار لہجے میں کہا۔ ”بیٹا جی! تم نے کچھ برا نہیں کیا، تم کو یہی کرنا چاہیے تھا۔ میرا دل کہوت ہے کہ اگر مولوی جی یہاں ہوتے تو وہ بھی اسی طرح تمہارے سر پر پیار دے کر یہی بات کہتے۔ اللہ اچھا کرے گا، سب اچھا ہو جائے گا۔“

پھر پہلوان نے تاجور سے میرے اور شرافت کے بارے میں پوچھا۔ تاجور نے میرا نام وقاص بتایا اور ہم دونوں کے حوالے سے وہی کچھ کہا جو میں نے اسے بتایا تھا۔ اس دوران میں پہلوان نے وہ بات بھی کہی جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ وہ بولا۔ ”تاجور بیٹا! یہ جس کا نام تم وقاص بتا رہی ہو...... مجھے...... اس کی شکل...... کچھ جانی پہچانی لگت ہے۔ جیسے کہیں...... دیکھا ہوا ہے اس کو......“

پھر وہ ایک دم جیسے چونک کر بولا۔ ”یہ شاہ زیب کا بس دوست ہی ہے، یا دور پاس کا رشتے دار بھی ہے؟“

”ہاں، یہ ان کی برادری کا ہے۔“ تاجور نے مدّھم آواز میں کہا۔

”شکل بھی کچھ کچھ ملت ہے۔“ پہلوان نے اُلجھن آمیز لہجے میں جواب دیا۔

پہلوان حشمت موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد جانا چاہتا تھا کہ تاجور کا

آئندہ لائحہ عمل کیا ہے، اس کی رائے تھی کہ وہ فوراً اپنے بڑے ماموں جان سے رابطہ کرے۔

تاجور نے اس حوالے سے سوچ بچار کے لیے ایک دوروز مانگے اور پہلوان حشمت کو قائل کرلیا کہ وہ نہ صرف رازداری برتے گا بلکہ راولپنڈی میں اپنا قیام یہیں اس گھر میں رکھے گا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ تاجور پہلوان حشمت کو اپنے ایک ''بڑے'' کی حیثیت سے دیکھ رہی ہے اور اس کی آمد سے کچھ راحت بھی محسوس کررہی ہے۔

یہاں پہنچنے سے پہلے پہلوان حشمت کو کچھ علم نہیں تھا کہ تاجور اپنے والدین سے علیحدہ ہوکر کہیں جا چکی ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ داراب فیملی اور دین محمد وغیرہ نے تاجور کی گمشدگی کی خبر مکمل طور پر چھپالی ہے اور اسے تن دہی سے ڈھونڈ رہے ہیں۔

انجکشن اور دوا کے بعد تاجور اب بہتر محسوس کررہی تھی۔ اس کی پسلیوں کی چوٹ کے لیے پہلوان حشمت نے اسے ایک تیر بہدف نسخہ بتایا۔ حالانکہ یہی نسخہ اس کے جبڑے کی چوٹ پر فیل ہو چکا تھا۔ پہلوان حشمت جب بولنے پر آتا تھا تو نان اسٹاپ بولتا تھا۔ بہرحال اس کے اخلاص اور انسان دوستی کے جذبے سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ اگلے دوروز میں، میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کی موجودگی میں تاجور خود کو نسبتاً ایزی محسوس کررہی ہے اور پہلوان نے اس کا دھیان بھی پریشان کن سوچوں کی طرف سے ہٹا رکھا ہے۔ شروع میں تو پہلوان حشمت نے کہا تھا کہ تاجور، مولانا حبیب اللہ سے رابطہ کرے مگر بعد میں اس پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت ہر طرف تاجور کو ڈھونڈا جارہا ہوگا۔ دارج داراب اسے دبوچ کر پنجرے میں ڈالنے کے لیے بے تاب ہوگا۔

اب بھی ساتھ والے کمرے میں تاجور اور پہلوان کے درمیان گفتگو ہورہی تھی اور میں دروازے سے لگ کر کھڑا سن رہا تھا۔ تاجور نے پوچھا۔ ''چاچی اور بچے چاند گڑھی میں ہی ہیں؟''

''نہیں۔'' پہلوان نے ذرا افسردگی سے کہا۔ ''آج کل کافی بُرا وقت چل رہا ہے۔ تمہاری چاچی جھگڑ کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی ہے۔ چاروں بچوں کو بھی لے گئی ہے۔ ڈھائی تین مہینے ہونے کو آئے ہیں نہ اس نے کوئی رابطہ کیا، نہ میں نے۔''

''آپ نے کیوں نہیں کیا؟''

''سوچتا ہوں کہ کچھ وقت وہ وہاں گزار ہی لے تو اچھا ہے۔ وہ کیا شعر ہے، کون سے میاں بیوی ہیں جن میں کھٹ پٹ نہیں ہوتی...... محبت سچی ہوتو دوری سے گھٹ نہیں ہوتی۔ کچھ خرچہ میں بھیج دیوت ہوں۔ کچھ اس کے ماں باپ کر لیوت ہیں۔''

''لگتا ہے کہ آج کل ہاتھ بھی تنگ ہے آپ کا؟''

''اصل بات یہی ہے بیٹاجی کہ اب ہڈی جوڑ کا کام بڑا مندا پڑ گیا ہے۔ دیہاتوں کے سیانے بیانے لوگ بھی ڈاکٹروں کے پاس بھاگت ہیں۔ ویسے بھی اب ڈانگ سوٹے کی لڑائیاں تو ہوتی ناہیں جن میں ہڈیاں ٹوٹتی تھیں۔ اب تو فائر مارا اور بندہ پار کردیا۔ آج کل تو میں ہڈیاں جوڑنے کے بجائے شعر جوڑنے پر زیادہ توجہ دے رہا ہوں، کچھ نہ کچھ آمدن ہوجاوت ہے۔ یہاں راولپنڈی میں مجھے اکثر بلایا جاوت ہے مشاعروں میں۔''

تاجور نے کہا۔ ''تو پھر کیوں نہ آپ کچھ دن یہاں راولپنڈی میں ہی رہیں۔ مجھے آپ کی وجہ سے بڑا سہارا مل رہا ہے چاچاجی۔''

''وہ تو کوئی بات ناہیں، مگر چاند گڑھی میں لوگ پریشان ہوں گے کہ حشمت کہاں غائب ہوگیا۔ مولانا والے معاملے میں گیا تھا، کہیں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔''

''آپ وہاں کسی کو فون کردیں کہ آپ خیر خیریت سے ہیں اور کچھ دن یہاں راولپنڈی میں ہی رہیں گے۔''

پہلوان نیم رضامند ہوگیا۔ وہ جانتا تھا کہ تاجور اس وقت مشکل میں ہے اور وہ دوسروں کی مشکلات رفع کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا بڑا خوب صورت پہلو تھا۔

اس نے سرگوشی کے لہجے میں تاجور سے پوچھا کہ وہ میرے اور شرافت کے حوالے سے پوری طرح مطمئن ہے؟''

تاجور نے اپنے بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اُڑستے ہوئے کہا۔ ''ہاں چاچا! یہ دونوں شاہ زیب کے سچے دوست ہیں۔ وہ شرافت تو مجھے بالکل بہن کی طرح سمجھتا ہے۔ یہ جو چادر میں نے اوڑھی ہوئی ہے یہ اسی نے میرے سر پر رکھی تھی۔''

''اور وہ دوسرا وقاص؟'' پہلوان نے ذرا اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ بھی بڑے اچھے ہیں۔''

''پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگت ہے کہ یہ

شخص کچھ گھنا سا ہے۔ اس کی آواز بھی...... کچھ سنی سنی سی لگتی ہے۔ رشتے میں یہ کیا تھا شاہ زیب کا؟''

''زیادہ قریب کا رشتہ تو نہیں، لیکن رشتہ ہے۔'' تاجور نے گول مول جواب دیا اور پھر گفتگو کا رخ پہلوان کے سوجے ہوئے جبڑے کی طرف موڑ دیا۔ اس نے پریشانی ظاہر کی کہ پہلوان کے جبڑے کی سوجن نہیں اتر رہی۔

پہلوان نے مخصوص انداز میں کہا۔ ''جس طرح عاملوں اور فقیروں کی دعائیں خود اپنے اوپر اثر نہیں کرتیں، اسی طرح شاید حکیموں اور پہلوانوں کے نسخے بھی خود پر بیکار جاتے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کل ٹائم نکال کر کسی ڈاکٹر کو ہی دکھالوں۔ اس بارے میں میرا ایک بڑا مشہور قطعہ ہے۔

سب کی طرف سے سب کو سلام آنا چاہیے
حکیم ہو یا ڈاکٹر بس کام آنا چاہیے
علاج میں ہار جیت کا کوئی چکر نہیں ہوتا
علاج سے بس مریض کو آرام آنا چاہیے

میں نے بے شمار دنوں کے بعد تاجور کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی اداس مسکراہٹ دیکھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ پہلوان کا یہاں موجود ہونا اور ہمارے ساتھ رہنا بڑا سودمند ثابت ہوگا۔ ہم زیادہ دن یہاں شرافت علی کے گھر میں نہیں رہ سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ یونس ہمارے لیے کسی علیحدہ گھر کا انتظام کر دیتا۔ ایسی صورت میں بھی تاجور کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ پہلوان حشمت کی صورت میں اسے ایک ''بڑے'' کا تسلی بخش سہارا مل جاتا۔ اس کے علاوہ بھی پہلوان حشمت کئی طرح سے ہماری معاونت کر سکتا تھا۔

میں نے شام کے وقت تاجور سے اکیلے میں بات کی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں اسلام آباد والے نیم سرکاری بنگلے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بازار جاؤں اور اس کے لیے کچھ کپڑے اور جوتے لے آؤں۔ (وہ ابھی شرافت کی بیوی کی چپل سے گزارا کر رہی تھی) میں نے کہا۔ ''تاجور! میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پہلوان حشمت کو اپنے بارے میں بتا دیا جائے......''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں...... وہ بار بار آپ کے بارے میں سوالات پوچھ رہے ہیں، جیسے کسی شک میں ہوں۔''

''لیکن ایک دم سب کچھ بتانا بھی مناسب نہیں۔ تم پہلے مرحلے میں ان کو آگاہ کرو کہ شاہ زیب کے بارے میں ابھی آس موجود ہے۔ شرافت علی نے کچھ کھوج لگایا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ لاہور گلبرگ والے بلاسٹ میں شاہ زیب کے بچ جانے کی امید ہے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے آپ کہتے ہیں...... ویسے یہ چاچا حشمت کے لیے بہت بڑی خبر ہوگی۔''

''دوسرے مرحلے میں اسے یہاں میری موجودگی کے بارے میں بتا دو۔ پتا نہیں کہ کاسمیٹک سرجری وغیرہ کا اسے پتا ہے یا نہیں، لیکن وہ بات سمجھ جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''میرے پاس تو آپ کی سرجری والی تصویریں بھی ہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں تو وہ بھی دکھا دیتی ہوں۔ شاید بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آجائے۔''

''وہ بھی دکھا دو۔ مگر اصل بات یہی ہے کہ پہلے اسے پوری طرح رازداری کا پابند کرنا ہے...... اور یہ سمجھانا ہے کہ فی الحال میرا روپوش رہنا ہی میری زندگی کا ضامن ہے۔''

میں نے تاجور کو اس حوالے سے تفصیلی ہدایات دے دیں۔

اس رات سونے سے پہلے میں نے حشمت راہی والے کمرے میں جھانکا۔ ٹیوب لائٹ میں اس کی آنکھیں اشک بار دکھائی دیتی تھیں۔ ایک دو آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی داڑھی میں بھی چمک رہے تھے۔ میں نے پہلی بار اسے نماز پڑھتے دیکھا۔ میں جان گیا کہ تاجور نے پہلے مرحلے کی آگاہی پہلوان کو دے دی ہے۔ یعنی میرے زندہ ہونے کے حوالے سے اُسے کچھ نہ کچھ بتا دیا ہے۔

سجاول کے ڈیرے پر قیام کے دوران میں میرے اور پہلوان کے درمیان کافی انسیت پیدا ہوگئی تھی اور بہت سے دیگر لوگوں کی طرح یقیناً پہلوان نے میری ''موت'' کا گہرا دکھ محسوس کیا تھا۔ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ جب اپنے کسی قریبی کو بالکل کھو کر دوبارہ پایا جاتا ہے تو دل و دماغ کی کیفیت عجیب ہوتی ہے۔ اس طرح کے ایک دو تجربے مجھے پہلے بھی ہوئے تھے۔ ایک تجربہ تو جاماجی میں ہی ہوا تھا۔ زینب کے زندہ ہونے کی نوید سن کر ابراہیم پر جو شادی مرگ طاری ہوئی تھی وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ میرا اور پہلوان کا تعلق اتنا قریبی تو نہیں تھا...... پھر بھی تعلق تو تھا۔

اگلے روز دوسرا مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ شام کا وقت تھا۔ سجاول کا فون آیا ہوا تھا (جاماجی میں بیگم نورل کی موت کا اس نے گہرا دکھ محسوس کیا تھا۔ جاماجی میں بیگم نورل نے اسے بھائی کا درجہ دیا تھا اور اس کی دی ہوئی انگوٹھی آج بھی سجاول کی انگلی میں چمکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بیگم نورل کی

بات ہی کر رہا تھا۔ بیگم نورل نے اپنے سوتیلے بھائی رائے زل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے بے مثال طریقے سے موت کو گلے لگایا تھا) ابھی میری اور سجاول کی بات جاری ہی تھی کہ اچانک ایسے لگا جیسے توپ کا گولا دروازے سے آ ٹکرایا ہے۔ یہ پہلوان حشمت تھا جو دروازے کی چولیں ہلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر سکتے کی سی حالت میں کھڑا میری طرف دیکھتا رہا پھر ہیجانی انداز میں بولا۔ ''تم...... تم......شاہ زیب ہو؟''

میں نے فون بند کیا اور اسے جیب میں رکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے پہلوان جی؟''

اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔ وہ بھاگ کر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے خود کو گرنے سے بمشکل بچایا۔ مجھے زور زور سے آگے پیچھے جھلانے کے بعد اس نے خود کو پیچھے ہٹایا۔ ایک بار پھر مجھے دھیان سے دیکھنے کے بعد اپنے جن جپھے میں لے لیا۔ ''مجھے یقین نا ہیں آ رہا۔ لگت ہے کہ کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے پھر پیچھے ہٹ کر میرا چہرہ دیکھا اور دوبارہ مجھے گلے لگایا۔ یہ عمل ایک بار مزید دہرانے کے بعد وہ بے دم سا ہو کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''مجھے پہلے دن سے ہی کچھ شک ہووت تھا۔ جب بھی تم کو دیکھت تھا۔ مجھے لگت تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دال میں کچھ غلط ہے...... اگر آج بٹیا مجھے خود نہ بتاتی تو ہوسکت تھا کہ میں خود تمہارے بارے میں کچھ کھوجنے کی کوشش کرتا۔''

میں نے اسے بتایا کہ اپنے خدوخال میں یہ تبدیلی مجھے کس مجبوری کے تحت کرانا پڑی ہے اور فی الحال یہ میرے لیے کس قدر اہم ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ یہ عارضی ہے۔ بات کرتے کرتے پہلوان کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے، کہنے لگا۔ ''میری سمجھ میں بالکل نہیں آوت تھا کہ تاجور بٹیا اس طرح اس چار دیواری میں دو غیر مردوں کے ساتھ کس طرح رہ رہی ہے...... اور یہ بات بھی سمجھ نا ہیں آ رہی تھی کہ وہ ان بڑے لوگوں کے چنگل سے کس طرح نکل پائی ہے لیکن اب سب کچھ سمجھ میں آ رہا ہے...... سب کچھ آ رہا ہے۔''

میں نے پہلوان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلوان جی! آپ نے بھی خبروں وغیرہ میں سن لیا ہوگا کہ کچھ غیر ملکی قاتل یہاں موجود ہیں۔ انہیں ابھی تک پوری طرح یقین نہیں آیا کہ میں ختم ہو چکا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ وہ اب بھی میری ''موت'' کی تصدیق کر رہے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے مددگاروں نے چاند گڑھی اور سکھیرا وغیرہ پر بھی نگاہ رکھی ہوئی ہو۔ یہ راز اب آپ کے پاس ایک امانت ہے کہ میں ابھی راہی عدم نہیں ہوا ہوں۔''

پہلوان حشمت نے پوچھا۔ ''میرے علاوہ اور کس کس کو پتا ہے؟''

''صرف دو افراد۔ اور وہ بھی پورے بھروسے کے لوگ ہیں۔''

''ایک تو انیق ہووے گا۔''

''نہیں پہلوان جی، وہ بھی نہیں۔''

میرے جواب نے پہلوان کو حیران کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''شام کا وقت ہے۔ اذان ہو رہی ہے۔ میں اوپر والے کو حاضر ناظر جان کر عہد کرت ہوں کہ کوئی میرے ٹکڑے بھی کر دیوے گا تو یہ بات میں اپنی زبان پر نہیں لاؤں گا۔'' اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو لشکارے مار رہے تھے۔

رات کو تاجور نے پہلوان حشمت کی پسندیدہ ڈش گڑ والے چاول بنائے جن میں سونف، بادام اور کشمش ڈالی گئی تھی۔ ساتھ میں چکن کڑاہی اور روغنی نان تھے جو شرافت علی بازار سے لایا تھا۔ شرافت کے ساتھ ہم بہت کم بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے پہلوان کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اگر شرافت کے سامنے مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت پڑے تو وہ مجھے وقاص کے نام سے ہی بلائے گا۔

وہ ایک سرد رات تھی۔ میں اور پہلوان حشمت کمبل اوڑھے ساتھ ساتھ بچھی چار پائیوں پر لیٹے تھے۔ پہلوان نے کہا۔ ''شاہ زیب! میں سمجھت ہوں کہ اوپر والے نے تمہیں ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس نئی زندگی کا شکریہ ادا کرنے کا بہترین طریقہ میں تمہیں بتاؤں؟''

میں سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھنے لگا۔

وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''تم تاجور سے شادی کر لو۔ میں بہت اچھی طرح جانت ہوں تم اس سے پیار کرت ہو...... اور وہ بھی تم سے کرت ہے۔ سجاول سیالکوٹی کے ڈیرے پر میں نے سب کچھ دیکھ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا، اگر اوپر والے نے تمہیں یہ موقع دیا ہے تو اس کو کھونا نا ہیں۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ اس کے لیے تیار ہو جائے گی؟''

''کیوں نا ہیں ہووے گی۔ جب وہ اپنی مہندی سے ایک رات پہلے تمہارے ساتھ چلی آئی ہے تو...... پھر باقی کیا

رہ گیا ہے۔ اس نے بہت بڑا قدم اٹھایا ہے شاہ زیب! اور میں تمہیں تجربے کی بات بتاوت ہوں۔ کامیابی زندگی میں ایک بار بندے کا دروازہ ضرور کھڑکھڑاوت ہے۔ دروازہ کھل جاوے تو اندر آجاوت ہے ورنہ واپس چلی جاوت ہے۔ وہ کیا شعر ہے۔

سچی محبت کرنے والوں کی مراد آخر بر آتی ہے
ملن کی رُت ایک بار، دروازہ ضرور کھڑکاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پہلوان جی، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر ابھی تک تاجور نے نکاح کے حوالے سے میرے ساتھ کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ کسی وقت وہ مجھے سخت الجھن میں لگتی ہے۔''

''تو پھر تم وقت ضائع کیوں کرت ہو؟ دیکھو کسی بھی وقت یہ سنہری موقع تم دونوں کے ہاتھ سے نکل سکت ہے۔ تم آج ہی اس سے کھل کر بات کرو، بلکہ ابھی کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر میری ضرورت پڑی تو اس کو منانے میں تمہاری مدد کروں گا۔''

اس رات میرے اور تاجور کے درمیان ایک اہم گفتگو ہوئی۔ یہ راولپنڈی کی ایک خنک رات تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن اسے بولٹ نہیں کیا گیا تھا۔ تاجور گم صم سی صوفے پر بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہاری بات تسلیم کرتا ہوں۔ ایک موقع تھا کہ میں نے اس سلسلے میں مسلسل خاموشی اختیار کی۔ کوئی پیش رفت نہیں کی۔ تم سے کوئی ٹھوس بات نہیں کی لیکن اس کی وجہ تم جانتی ہو اور تمہارا دل بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ میں بڑے سخت دشمنوں کے گھیرے میں تھا۔ میرے خون کی پیاس نے ان کو دیوانہ کر رکھا تھا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں ان سے بچ جاؤں گا۔ وہاں لاہور میں جو کچھ بھی ہوا ہے وہ بالکل اچانک اور حیران کن طور پر ہوا ہے۔ یوں لگا ہے کہ میری مسلسل تڑپ کے نتیجے میں قدرت نے میرے لیے اچانک ایک راستہ پیدا کیا ہے۔ مجھے ایک نئی شناخت ملی ہے تاجور! اور اسی شناخت کے بل بوتے پر آج میں خود کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ اپنے اور تمہارے بارے میں کوئی بات کر سکوں۔''

وہ ایک توقف کے ساتھ بولی۔ ''مجھے نہیں لگتا شاہ زیب کہ میں آپ کے قابل ہوں۔ میں...... خود میں ایسی کوئی خوبی نہیں پاتی جس کی وجہ سے میں آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کر سکوں۔''

''یہ خود سے نہیں، مجھ سے پوچھو کہ تم میں کوئی ایسی

اجتماعی پاگل پن

اکیڈمی کا ایک شاگرد اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اپنے استاد بوڑھے فلسفی سے عرض کیا۔ ''دانا کہتے ہیں کہ انسان پاگل ہے، کیا آپ اس کی وضاحت فرما سکتے ہیں؟''

فلسفی نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور بولا۔ ''میرے عزیز شاگرد ہم انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر بھی پاگل ہیں، اس کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ جنگ میں لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں اور ہم خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں لیکن اس کے برعکس ہمارے سامنے اگر ایک شخص قتل کر دیا جاتا ہے تو ہم بدحواس اور پریشان ہو جاتے ہیں۔''

ولید خان، جنگل خیل کوہاٹ

خوبی ہے یا نہیں تاجور! میں تمہاری ہی قسم کھا کر کہتا ہوں، اگر تم میرے سوال کا جواب ہاں میں دو گی تو میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا۔ آج مجھے کھلے الفاظ میں کہہ لینے دو تاجور! کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ شاید اسی دن سے اور اسی لمحے سے جب میں نے تمہیں پہلی بار لاہور میں شاہی قلعہ کے احاطے میں دیکھا تھا۔ تم کچھ لوفروں سے بچنے کے لیے میری جانب آئی تھیں۔ وہ بہت پرانی بات ہے تاجور لیکن میری نگاہوں کے سامنے آج بھی اسی طرح نئی اور تازہ ہے۔ پچھلے برسوں میں تمہارا وہ تصور اور منظر ہزاروں بار میری نگاہوں کے سامنے سے گزرا ہے۔''

وہ میری طرف دیکھے بغیر، عجیب لہجے میں بولی۔ ''آپ کی پرواز بہت اونچی ہے شاہ زیب، میں زمین پر رینگنے والے ایک عام جاندار کی طرح ہوں۔ ایک سیدھی سادی پینڈو۔ کوئی ایسی خوبی نہیں مجھ میں جس پر فخر کر سکوں۔ آپ......''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تاجور جب تم میری اونچی پرواز کی بات کرتی ہو تو میں اس میں چھپے ہوئے درد اور طنز کو سمجھتا ہوں۔ تم نے ملنگی ڈیرے پر میرا وہ روپ دیکھا جس نے تمہیں دلی طور پر مجھ سے بدظن کیا۔ ایک موقع پر ریشمی کے سامنے مجھے ''پردے والی سرکار'' کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا پڑا۔ اس طرح کے واقعات نے تمہارے اندر ایک خوف پیدا کیا۔ مجھ سے لگاؤ رکھنے کے

باوجود تم مجھ سے دور ہوگئیں۔ میں ایک ایسے غنڈے اور قاتل کے روپ میں تمہارے سامنے آیا جو دن رات خطروں میں گھرا رہتا ہے اور جس کے نزدیک اپنی اور دوسروں کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ میں نے بھی انکار نہیں کیا تاجور...... شاید...... میں واقعی ایسا ہی تھا۔ دنیا کی ساری برائیاں مجھ میں موجود تھیں لیکن...... اب میں وہ نہیں ہوں تاجور، میں بدل چکا ہوں۔ تم نے مجھے بدل دیا ہے تاجور! مجھے یقین ہے جب تم ٹھنڈے دل سے سوچتی ہو گی تو تمہارا دل بھی گواہی دیتا ہوگا کہ میں شراب، عورت اور بے جا مار دھاڑ جیسی ''بدعادتوں'' سے بہت دور آگیا ہوں۔ اب وہ شاہ زیب نہیں ہوں تاجور جسے تم نے پہلے چاند گڑھی اور پھر ملنگی ڈیرے پر دیکھا تھا۔ میری طرف دیکھو تاجور...... اور مجھے دیکھ کر بتاؤ، کیا میں وہ ہوں؟''

اس کی پلکیں بے ساختہ لرزیں لیکن اس نے نظر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کی پیشانی پر حیا آمیز پسینے کی چمک تھی۔ میری ''اونچی پرواز'' کا ذکر کر کے اس نے جو سوال اٹھایا تھا اس کا میں نے تسلی بخش جواب دیا تھا۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''تاجور! آج میں اقرار کرتا ہوں کہ تمہارے بغیر میں ادھورا ہوں۔ خود کو مکمل کرنے کے لیے مجھے تمہارے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ اگر تم کہو گی تو ہم سب کچھ چھوڑ کر کسی گمنام گوشے میں چلے جائیں گے۔ اپنی اس نئی شناخت سے میں تمہارے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر دوں گا۔ اگر ہمیشہ کے لیے نہیں تو ہم کم از کم اس وقت تک روپوش رہیں گے جب تک ہمارے اردگرد حالات تسلی بخش نہیں ہو جاتے۔''

رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔ میں نے آج اپنا دل کھول کر تاجور کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ ساری محبت...... وہ ساری سچائی اور وہ ساری آرزوئیں جو اس کے حوالے سے میرے دل میں موجود تھیں میں نے اس پر آشکار کر دی تھیں۔

وہ پتھر کی طرح تھی لیکن پتھر نہیں تھی۔ اگر پتھر ہوتی تو پھر اس رات اسلام آباد کے اس عالیشان بنگلے کے کمرے میں چکرا کر فرش پر نہ گر جاتی۔ ہاں وہ پتھر نہیں تھی۔ وہ پتھر کی شکل کا موم تھی اور جب وہ پگھلنا شروع ہوئی تو پھر پگھلتی چلی گئی۔ اس نے کئی گلے شکوے بھی کیے۔ کئی اندیشوں کا اظہار بھی کیا۔ اپنے والدین اور اپنے بھائیوں سے دوری کا درد بھی اس کے حواس پر چھایا لیکن اس سب کے باوجود اس کا پگھلتا ہوا موم گواہی دے رہا تھا کہ وہ آج کی شب مجھے مایوس کر کے یہاں سے نہیں اٹھے گی۔

اور اس نے واقعی مایوس نہیں کیا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک لڑکی تھی۔ اپنی زبان سے واضح اقرار تو نہیں کر سکتی تھی مگر جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے کافی تھا۔ وہ بولی۔ ''میں بڑے ماموں جان کی باتیں ایک بار پھر سننا چاہتی ہوں۔ وہ باتیں سن کر مجھے بڑا حوصلہ ملتا ہے۔ کاش اس وقت وہ میرے پاس ہوتے۔ میری طرف سے جو فیصلہ کرنا ہوتا وہ خود کرتے۔''

''تم سمجھو تاجور، وہ اب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اپنی اس ریکارڈ شدہ آواز کے ذریعے انہوں نے تم تک جو پیغام پہنچایا ہے، اس میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے تاجور، تم جب بھی ان سے ملو گی، وہ تمہیں اپنے بولے ہوئے ایک ایک لفظ کے ساتھ کھڑے نظر آئیں گے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی شفاف گردن پر سامنے کی طرف ایک چھوٹا سا خوش نما گڑھا پڑا۔ اس ملاقات میں اس نے پہلی بار پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیا آمیز سرخی تھی۔ وہی سرخی جو خاص موقعوں پر یلغار کر کے اس کے چہرے کی طرف آتی تھی۔ ''مجھے کچھ سوچنے دیں۔'' اس نے کہا اور جلدی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس نے کہا تھا...... مجھے کچھ سوچنے دیں...... لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کافی کچھ سوچ چکی ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلنے والی حیا آمیز سرخی نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل مچلا کہ اسے دیکھنے کی کوشش کروں۔ میں نے کھڑکیاں دیکھیں وہ مکمل طور پر بند تھیں، میں نے موہوم امید کے سہارے ''کی ہول'' سے آنکھ لگائی۔ وہ مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی نظر آئی لیکن وہ آئینے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے بال کھولے جو کسی حسین ریشمی رات کی طرح اس کے کشادہ شانوں پر بکھر گئے۔ وہ ان میں برش کرنے لگی۔ اس نے رخ تھوڑا سا پھیرا تو اس کا چہرہ بھی میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ ایک حیا آمیز مدھم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔ اس کے ذہن میں شاید انہی باتوں کی بازگشت تھی جو تھوڑی دیر پہلے میں نے اس سے کہی تھیں۔ جی چاہا اس منظر کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھوں میں قید کر لوں۔

پھر اس نے عجیب دلربا انداز میں نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ایک نگاہ آئینے پر ڈالی اور بالوں کو جُوڑے کی شکل میں باندھا۔ پورے مشرق کا حسن جیسے اس کے دراز قد پیکر میں سمٹ آیا تھا۔ اب وہ دروازے کی طرف آ سکتی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

پہلوان حشمت نے ٹھیک ہی کہا تھا...... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ بہت بڑے لوگوں سے بہت بڑی ٹکر لی تھی ہم نے۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں اس سلسلے میں سجاول سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر سجاول اور خورسنہ یہاں آ جاتے اور پہلوان حشمت بھی تاجور کے بزرگ کی حیثیت سے یہاں موجود ہوتا تو کسی مہربان نکاح خواں کا انتظام کر کے نکاح پڑھوایا جا سکتا تھا۔

میں سجاول کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا فون آ گیا۔ وہ میری اور تاجور کی تازہ ترین صورتِ حال جاننے کے لیے صبح سے تین بار فون کر چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اب بھی اسی حوالے سے فون کیا ہے مگر یہ ایک دوسری بات تھی۔ اس کے لہجے نے ہی مجھے سمجھا دیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔ ''شاہی! مجھے لگتا ہے کہ تمہارا انکو شہزادہ مصیبت میں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے کسی ساتھی منور کا فون آیا ہے، بڑا سیریس قسم کا فون تھا۔''

''کچھ بتاؤ بھی کیا ہوا ہے؟''

''مجھے لگ رہا ہے کہ تیرے ڈنمارک والے ''یاروں'' سے انیق کا پیچا پڑ گیا ہے۔ یا تو اس نے خود ان کو جا ٹکر ماری ہے یا پھر انہوں نے اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔ فون کے ساتھ ہی ٹرپل ٹو سے فائرنگ کی آوازیں بھی آئی ہیں۔ مجھے تو یہی اندازہ ہوا ہے کہ فون کرنے والا منور بھی مارا گیا ہے یا زخمی ہوا ہے۔''

''فون کیا تھا؟'' میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کر پوچھا۔

جواب میں سجاول نے ہنگامی لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ ابھی کوئی دس منٹ پہلے انیق کے موبائل فون سے اس کے دوست منور کی کال آئی۔ وہ بُری طرح ہانپا ہوا تھا اور لگ رہا تھا کہ کسی سے بچنے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ بھاگتے بھاگتے ہی اس نے بتایا کہ کچھ غیر ملکی نقاب پوش انیق کو پکڑ کر یہاں گوجرانوالہ والی نہر کے پاس لے آئے ہیں۔ نہر سے تھوڑے فاصلے پر نیلی اور سفید ٹائلوں والی دو منزلہ کوٹھی ہے۔ ان کے ارادے بہت بُرے ہیں۔ ابھی منور نامی وہ لڑکا یہیں تک کہنے پایا تھا کہ تین فائر ہوئے۔ لڑکے کے کراہنے اور گرنے کی آواز آئی۔ ایسے لگا تھا کہ وہ پانی میں گرا ہے۔

میں نے سجاول سے پوچھا۔ ''تمہارا اپنا کیا خیال ہے۔ اس میں کسی ڈرامے کا چانس کتنے فیصد ہے؟''

''فیصد کا تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر جو کچھ سنا ہے وہ تو ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔'' سجاول کی آواز میں بھی پریشانی نمایاں تھی۔

''تو پھر...... تمہارا کیا مشورہ ہے؟''

''تمہارا تاجور کے پاس رہنا ضروری ہے۔ ویسے بھی پنڈی سے گوجرانوالہ کا فاصلہ چار گھنٹے سے کم کا نہیں ہے۔ میں یہاں سے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا ہوں۔ گوجرانوالہ میں اپنے ایک دو بندے بھی ہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں کہ کیا ہوا ہے۔''

''نہیں سجاول، یہ ٹیکساری گینگ ہے۔ تم نے بے شک بڑے بڑے بدمعاش دیکھے ہیں اور ان سے مارا ماری بھی کی ہے لیکن یہ بالکل اور ٹائپ کے لوگ ہیں۔ ان کو صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں، میرا وہاں پہنچنا ضروری ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ داؤد بھاؤ کو فون کر کے اس سے صورتِ حال جاننے کی کوشش کرو اور مجھے بتاؤ۔''

''تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں اس کے نمبر پر کوئی دس بار ٹرائی کر چکا ہوں۔ وہ رابطے میں نہیں ہے۔''

''اچھا کاغذ قلم لو اور یہ ایک دوسرا نمبر لکھو۔ یہ بھاؤ کے قریبی ساتھی مختار جھارے کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے بات ہو جائے۔''

سجاول نے خورسنہ کو آواز دی اور اس نے میرا بتایا ہوا نمبر نوٹ کیا۔ میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ مجھے انیق کی طرف سے مسلسل اندیشے تھے۔ ٹیکساری گینگ کے شیطان اپنے دشمن کو تو کہاں معاف کرتے تھے وہ اس کے ہمنواؤں اور قریب والوں کو بھی عبرت کا نشان بنا دیتے تھے۔ لاہور میں ان سفاک قاتلوں کے ساتھ میرا جو خونی ٹکراؤ ہوا تھا اس میں انیق پیش پیش رہا تھا۔ اس کے علاوہ مختار جھارا اور لودھی وغیرہ نے بھی میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ لودھی تو خیر ان کا شکار بن چکا تھا مگر مجھے جھارے اور انیق کی مسلسل فکر تھی اور لگ یہی رہا تھا کہ آج یہ فکر حقیقت کا روپ دھار گئی ہے۔

وہ سارے حسین رومانی خیالات جو تھوڑی دیر پہلے میرے رگ و پے میں بے مثل شادمانی جگا رہے تھے، کہیں سینے کی گہرائی میں دبک گئے۔ میں بے قراری سے کمرے

میں ٹہلنے لگا۔ قریباً دس منٹ بعد سجاول کا فون پھر آیا۔ اس نے کہا۔ ''مختار سے بھی رابطہ نہیں ہوا۔ پہلی کال پر دو دفعہ بیل گئی پھر فون بند کر دیا گیا۔ اب مسلسل بند ہی جا رہا ہے۔''

میں جانتا تھا کہ مختار جھارے کی حیثیت داؤد بھاؤ کے دستِ راست کی ہے۔ جس نمبر پر سجاول نے بات کی تھی وہ کبھی بھی بند نہیں ملتا تھا۔ اس کا بند ہونا بھی گڑبڑ اور خطرے کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''سجاول! تم گوجرانوالہ پہنچو، اگر وہاں کوئی ساتھی ہیں تو ان کو بھی الرٹ کر دو، لیکن میرے پہنچنے سے پہلے تم نے کسی بھی طرح کی کوئی کارروائی نہیں کرنی۔''

''تم ان لوگوں کو ضرورت سے زیادہ ''ہوّا'' بنا رہے ہو، یا پھر مجھ پر بھروسا نہیں۔''

''تم پر بھروسا ہے سجاول، اور ان کو ضرورت سے زیادہ ہوّا بھی نہیں بنا رہا۔ بس تمہاری منت کر رہا ہوں۔ میرے آنے سے پہلے کچھ نہیں کرنا۔''

''تاجور کو کیا بتاؤ گے؟''

''اس کی فکر نہ کرو۔ شرافت علی اور پہلوان حشمت ہیں یہاں۔ بس میں روانہ ہو رہا ہوں یہاں سے۔ تم اپنا فون کھلا رکھنا۔''

''تم چار گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں پہنچ سکو گے۔''

''میں موٹروے سے آ رہا ہوں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

''یار، تمہارے پہنچنے تک ہم اس کوٹھی کا کھوج لگانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں ناں۔'' سجاول نے بگڑے لہجے میں کہا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ زیادہ ہی نہ بگڑ جائے۔ میں نے کہا۔ ''چلو کر لو کوشش لیکن اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ میرے پہنچنے سے پہلے کوئی کارروائی نہ کرنا۔''

''اچھا یار۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا جب میں گوجرانوالہ انٹرچینج سے گزر کر شہر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت شہر کی سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ سجاول شہر سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر لبِ سڑک ایک ریسٹورنٹ کے اوپن ایریا میں موجود تھا۔ اسے ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں تک سفر کرنے کے لیے میں نے شرافت علی والی ہائی روف سوزوکی ہی استعمال کی تھی۔ گاڑی اچھی حالت میں تھی اور میں نے بہ آسانی 120 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کر لیا تھا۔

جس وقت میں سجاول کے پاس پہنچا وہ سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر چائے کے لوازمات رکھے تھے اور ایش ٹرے میں سگریٹ کے بہت سے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ سجاول کے دو مقامی ساتھی بھی مؤدب انداز میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ مرنے مارنے والے دبنگ افراد ہیں۔ میں نے اس سے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا، اگر دیکھا بھی ہوتا تو اس بدلی ہوئی شکل و شباہت کے ساتھ مجھے ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا (یعنی پہچانے جانے کا خطرہ نہیں تھا)

سجاول نے فون پر گفتگو ختم کی اور سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ''دو بندے موٹر سائیکلوں پر گئے ہوئے ہیں۔ نہر کے ساتھ ساتھ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی نیلی سفید ٹائلوں والی کوٹھی کا کوئی کھوج نہیں ملا۔''

''اصل میں ہمیں ایریا کا بھی تو پتا نہیں۔ اس نے آبادی وغیرہ کا نام نہیں لیا تھا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میں نے بتایا ہے ناں شاہی، وہ بھاگتے بھاگتے بڑی افراتفری میں بات کر رہا تھا لیکن جب اس نے گوجرانوالہ والی نہر کہا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ نہر کا وہ حصہ جو گوجرانوالہ شہر کے نزدیک سے گزرتا ہے۔''

''مختار جھارے یا گروپ کے کسی اور بندے سے تو رابطہ نہیں ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ ''سجاول نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ اور اس کے ساتھی وقتاً فوقتاً روپوش ہو جاتے ہیں...... لگ رہا ہے کہ اس وقت بھی وہ ایسے ہی پیریڈ سے گزر رہے ہیں۔''

اسی دوران میں تازہ چائے اور لوازمات آ گئے۔ لبِ سڑک واقع اس ریسٹوران والے سجاول سے کافی مرعوب نظر آتے تھے۔ آج کل وہ کلین شیوڈ ہو چکا تھا۔ لباس بھی سفاری سوٹ ٹائپ کا تھا۔ اس کے باوجود اپنے بھاری بھرکم جسم اور بارعب چہرے کے ساتھ وہ دیکھنے والے پر اپنی ہیبت بٹھا دیتا تھا۔

اچانک سجاول کے سیل فون پر پھر کال کے سگنل آئے۔ دوسری طرف اس کا مقامی ساتھی ہی تھا۔ اس نے ہیجانی انداز میں اطلاع دی کہ نہر سے کچھ فاصلے پر نیلی اور سفید ٹائلوں والی دو منزلہ کوٹھی کا کھوج لگ گیا ہے۔

میں نے فون سجاول کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ میں

MEDICAM
Pro-Tech
MEDICAM
Sensitivity
Bleeding Gums
MEDICAM
Pro-Tech
MEDICAM
Pro-Tech
ہمارا
Personal Dentist!
مسوڑھوں سے خون اور Sensitivity سے مکمل نجات!

نے سجاول کے کارندے سے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی کوٹھی ہے؟“

”بالکل جناب! جو نشانیاں سردار نے بتائی ہیں ان کے مطابق تو یہ وہی ہے۔ نہر سے کوئی آدھا کلومیٹر ہٹ کر درختوں کے اندر ہے۔ سیمنٹ اور بجری کی چھوٹی سی سڑک ہے جو کوٹھی تک جاتی ہے۔“

”تم کوٹھی سے کتنی دور ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”فرلانگ سے جیادہ کا فاصلہ ہوگا جی۔“

”دیکھو...... تھوڑا سا اور پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے کسی طرح کی کوئی حرکت نہیں کرنی ہے۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں، تمہارا ساتھی کہاں ہے؟“

”وہ بھی میرے نال ہی ہے جی۔ جرا پیشاب کرنے جھاڑیوں میں گیا ہے۔“

”اس کو بھی سمجھا دو۔ میں فون سردار کو دے رہا ہوں۔ اسے ٹھیک طرح سے موقع بتا دو۔“

میں نے فون دوبارہ سجاول کو تھما دیا۔ سجاول نے اپنے کارندے سے بات کی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنی پلاننگ کے مطابق دو گاڑیوں پر سوار ہو کر موقعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ رات کے ساڑھے تین چار بجے کا وقت تھا۔ میں اور سجاول ایک کارندے کے ساتھ ٹویوٹا جیپ میں تھے۔ ڈرائیونگ کارندہ کر رہا تھا۔ ایک ہنڈا اکارڈ گاڑی میں سجاول کے پانچ مسلح ساتھی ہمارے عقب میں آ رہے تھے۔ سجاول کے تین چار ساتھی موقع پر بھی موجود تھے۔ ہماری گاڑی میں چھوٹی نال کی ایک کلاشنکوف اور اے کے 57 رائفل موجود تھی۔ فالتو راؤنڈ بھی کافی تعداد میں نشستوں کے نیچے خاص طریقے سے چھپائے گئے تھے۔ پلاننگ کے مطابق پہلے میں نے اور سجاول نے آگے جانا تھا۔ ضرورت پڑنے پر دیگر ساتھیوں کو بھی بلایا جا سکتا تھا۔ جو شخص ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ ایک سابق پولیس انسپکٹر تھا۔ سجاول نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ موقع پڑنے پر وہ فوراً مقامی پولیس کو بھی اس معاملے میں ”انوالو“ کر لے۔

ہم موقع پر پہنچے۔ درختوں میں گہری تاریکی تھی۔ نہر کی طرف سے آنے والی ہوا ٹھٹھری ہوئی تھی۔ سجاول کے اسلحہ بردار اور چادر پوش ساتھی درختوں میں موجود تھے۔ دور تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر وہ نیلی اور سفید ٹائلوں والی کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی زیادہ تر کھڑکیاں تاریک تھیں۔ صرف گیٹ اور ایک دو کمروں میں روشنی دکھائی دیتی تھی۔ سجاول کے ساتھی انو نے بتایا کہ یہاں رکھوالی والے کتوں کی موجودگی ثابت نہیں ہوئی۔ موقع محل کا جائزہ لینے کے بعد اور ڈسکشن کے بعد طے ہوا کہ میں کوٹھی کے اندر گھسنے اور مین گیٹ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے یہ کوشش عقبی جانب سے کرنا تھی۔ ضرورت پڑنے پر سامنے کی طرف سجاول کے ساتھیوں نے ہوائی فائر کرنے تھے تاکہ اندر موجود لوگوں کی توجہ بٹ جائے۔

سجاول کے ساتھیوں میں سے انو نامی نوجوان کافی چاق چوبند نظر آتا تھا۔ میں نے اس کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سجاول کے پاس دو بلٹ پروف جیکٹس بھی موجود تھیں جو اس نے زبردستی مجھے اور انو کو پہنا دیں۔ سی سی ٹی وی کیمروں کے آثار تو نظر نہیں آتے تھے، تاہم بڑی احتیاط سے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے اندر چلتے ہم کوٹھی کی عقبی باؤنڈری کی طرف بڑھے۔ یہ الگ تھلگ کوٹھی کسی زمیندار یا مقامی کارخانے دار کی دکھائی دیتی تھی۔ ایک جگہ میں رک گیا۔ یہاں کسی چوڑے ٹائروں والی گاڑی کے گزرنے کے نشانات تھے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر سیل فون کی ٹارچ کی روشنی میں جائزہ لیا۔ انو بھی دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تمہاری موجودگی میں تو کوئی گاڑی یہاں سے نہیں گزری؟“ اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ”غور سے دیکھو، پتا چلتا ہے کہ اس بڑی جیپ کو یہاں سے گزرے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“

”یہ اندازا آپ نے کیسے لگایا۔“ انو نے پوچھا۔

”اردگرد کی زمین پر اوس ہے۔ مٹی پر ٹائروں کے جو نشان ہیں وہ تازہ ہیں۔ یہاں اوس کا گیلا پن نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ نو دس سیٹوں والی بڑی جیپ تھی۔ یہ اشارہ بھی مل رہا ہے کہ یہ یہاں سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف گئی ہے۔“

”جرور ایسا ہوا ہوگا۔ نشان بھی تاجے ہی لگ رہے ہیں۔“ انو بولا۔

دیوار کے اوپر خاردار تاروں کی باڑ تھی مگر سجاول کے ساتھی انو کے پاس ایک بڑا بوریا موجود تھا۔ ایسے بوریے نوک دار سلاخوں اور خاردار تاروں پر ڈال کر ان کو آسانی سے پار کیا جا سکتا ہے۔

میرے سینے میں شعلے سے لپک رہے تھے۔ انیق میرا وہ پیارا ساتھی تھا جس کی بے مثال محبت اور دلیری نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا اور اب اگر وہ میرے بدترین دشمنوں کے چنگل میں تھا تو اس کی زندگی اور سلامتی کے لیے مجھے اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا بالکل آسان محسوس ہوتا تھا۔

میرے دائیں ہاتھ میں چھوٹی نال کی کلاشنکوف تھی جسے باؤنڈری وال کے بالکل پاس پہنچ کر میں نے کندھے سے لٹکا لیا۔ میں نے مضبوط جسم والے انو کے کندھوں پر پاؤں رکھے اور وہ مجھے لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں گیارہ بارہ فٹ اونچی چاردیواری کے اندر جھانک سکتا تھا۔ پلان کے مطابق اب یہ موقع تھا کہ میں فون پر مسڈ کال دے کر سجاول کو ہوائی فائر کرنے کا کہہ سکتا تھا مگر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں ہوائی فائرنگ والا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے (ایسی صورت میں اردگرد موجود پولیس کی کوئی گشتی پارٹی بھی متوجہ ہو سکتی تھی) مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کوٹھی میں کچھ زیادہ مزاحمت موجود نہیں ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر چوڑے ٹائروں کے وہی نشانات گھومے جو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے دیکھے تھے۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ٹیکساری گینگ کے وہ شیطان صفت ہرکارے یہاں سے نکل چکے ہوں۔ میں نے خاص طریقے سے تہ کیا گیا بوریا خاردار تاروں پر ڈالا اور پھرتی سے اندر کود گیا (میرے کندھے کا کامیاب آپریشن جاما جی میں ہوا تھا اور اس آپریشن کے بعد سے میری پہلے والی فارم مکمل طور پر لوٹ آئی تھی) فرش پر پنجوں کے بل کودنے کے بعد میں نے چند سیکنڈ تک خود کو ساکت رکھا اور اردگرد سے ابھرنے والی آوازوں پر غور کیا۔ مکمل خاموشی تھی لیکن پھر دفعتاً میرے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔

کوٹھی کے کسی اندرونی حصے سے ایک دردناک آواز ابھری تھی۔ کوئی ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلّا رہا تھا۔ یہ مردانہ آواز بہت مدھم تھی لیکن سنائی دے رہی تھی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز پر کان لگا دیے۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد پکارنے والا پھر کربناک انداز میں پکارا۔

''بچاؤ......بچاؤ......کوئی ہے؟''

یہ سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کہیں یہ انیق کی آواز تو نہیں۔ میں نے پچیس گولی والی کلاشنکوف کندھے سے اتار کر اپنے ہاتھ میں لی اور باغیچے سے گزر کر کوٹھی کے پہلو کی طرف بڑھا۔ باغیچے سے گزرتے ہوئے مجھے بُو کا احساس ہوا۔ ''سیل فون ٹارچ'' کی روشنی میں، میں نے دیکھا۔ یہ ایک کتّے کی بو چھوڑتی ہوئی لاش تھی۔ اسے زمین میں دبایا گیا تھا مگر شاید اس کا کچھ حصہ مٹی سے باہر رہ گیا تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں، میں نے بڑی تیزی لیکن احتیاط سے کوٹھی کے پورچ اور برآمدوں کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ کوٹھی میں زیادہ افراد موجود نہیں ہیں۔ پرانے ماڈل کی ایک پک اَپ کے سوا کوئی گاڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انٹرنس والا فینسی دروازہ لاک تھا۔ یہی وقت تھا جب کوئی پھر چلّایا۔ وہ نزع کے عالم میں لگتا تھا۔ میں نے رائفل کے دستے سے ایک چھوٹا شیشہ توڑا اور دروازے کو اندر سے کھول دیا۔ شیشہ ٹوٹنے سے کافی آواز پیدا ہوئی تھی مگر اردگرد کے کمروں میں کہیں حرکت کے آثار نظر نہیں آئے۔ یہ خاموشی کسی پلاننگ کا حصہ بھی ہو سکتی تھی مگر پچانوے فیصد امکان یہی تھا کہ گینگ کچھ دیر پہلے یہاں سے نکل چکا ہے۔ میں بھاگا ہوا کوٹھی کے مین گیٹ پر آیا اور اسے اندر سے کھول دیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر سیٹی بجائی اور ساتھ ہی ہاتھ لہرایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سجاول اور اس کے ساتھی کوٹھی کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔

اسی دوران میں رائفل بدست انو بھی بھاگا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم باقی لوگوں کو احاطے میں پوزیشن لینے کا کہو۔ میں اندر جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جی۔ آپ جب تک کہیں گے، ہم یہاں پر ہی رکیں گے۔''

میں رائفل بدست اندر کی طرف لپکا۔ کسی اندرونی حصے سے ابھرنے والی دردناک آواز نے ایک بار پھر میری رہنمائی کی۔ میں کامن روم میں پہنچا اور پھر ایک کوریڈور سے گزرتا ہوا ایک ہال کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔

''کہاں ہو تم؟ آواز دے کر بتاؤ۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

''بچاؤ...... بچاؤ۔'' ایک بار پھر کربناک آواز ابھری۔

یہ جان کر تھوڑی سی تسلی ہوئی کہ یہ انیق کی آواز نہیں تھی۔ میں نے انگلی رائفل کی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ میرے ایک اشارے پر یہ روسی رائفل موت کی بارش کر سکتی تھی۔ ہال کمرے کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے ایک ادھ کھلی کھڑکی کی آہنی گرل میں سے اندر جھانکا اور اپنی جگہ سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا لیکن بھروسا کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا...... کیونکہ یہ سامنا تھا ٹیکساری گینگ جیسے وحشی ٹولے سے۔

میں نے چار نیم عریاں افراد کو دیکھا۔ وہ ڈنڈ پیلنے والی پوزیشن میں تھے۔ لکڑی کے جن تختوں پر انہوں نے یہ

پوزیشن لے رکھی تھی۔ ان پر قریباً ایک فٹ اونچی تین نہایت نوکیلی آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ڈنڈ یعنی پُش اَپ کی پوزیشن میں موجود چاروں افراد کے ہاتھ اور پاؤں آہنی شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ نوکدار سلاخیں ان کی ناف، پیٹ اور گردن کو چھوتی تھیں۔ وہ جتنی دیر تک خود کو اپنے بازوؤں کے زور پر اوپر اٹھائے رکھتے یہ سلاخیں ان کے جسم سے دور رہتیں لیکن جب جب وہ تھک کر نیچے کی طرف آتے یہ تیکھی سلاخیں دھیرے دھیرے ان کے جسم میں اترتی چلی جاتیں۔ میں نے اب تک بڑے بڑے خوفناک مناظر دیکھے تھے لیکن اس منظر نے سرتاپا جھنجوڑ دیا۔ دو افراد اپنے جسم کو اپنے بازوؤں پر نہیں سہار پائے تھے اور سلاخ نما نوکیلی میخیں دھیرے دھیرے ان کے جسم میں اتر گئی تھیں۔ ایک ناف میں، ایک پیٹ میں اور ایک گردن میں۔ وہ دونوں مرچکے تھے۔ ان کا خون چوبی تختوں کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ خون کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کو مرے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

باقی دو افراد میں سے ایک انیق تھا اور دوسرا مختار جھارا جسے ہم مسلسل فون کال کرتے رہے تھے۔ مختار جھارا کی ہمت بھی تقریباً جواب دے چکی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ انیق کی طرح جھارے کے جسم پر بھی صرف ایک پتلون تھی۔ نیچے والی سلاخ نما میخ دھیرے دھیرے اس کی ناف میں اترتی جارہی تھی۔ درمیانی میخ نے بھی اس کے پیٹ میں گھسنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں زخموں میں سے خون نکل رہا تھا۔ جھارے کا دبلا پتلا جسم پسینے سے تر تھا۔ وہ اپنے بازوؤں کے زور پر خود کو اٹھائے رکھنے کی پوری کوشش کررہا تھا اور ساتھ ساتھ دلدوز انداز میں چلّا رہا تھا۔

جھارے سے دو فٹ کے فاصلے پر انیق بھی ڈنٹر پیلنے والی پوزیشن میں تھا۔ وہ اپنے کانپتے بازوؤں کو سیدھا رکھنے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا اور ساتھ ساتھ کراہ رہا تھا۔ ابھی آہنی میخیں اس کے جسم سے دور تھیں لیکن کب تک؟ یہ ایک دو انچ کا فاصلہ کسی بھی وقت طے ہوسکتا تھا۔ یہ سارے کا سارا منظر میں نے بس تین چار سیکنڈ کے اندر دیکھا۔ انیق اور جھارے کے پاس بہت تھوڑا ٹائم تھا اور شاید جھارے کے پاس تو بالکل بھی نہیں تھا۔ میں نے مقفل دروازے پر دو فائر کیے اور توڑتا ہوا اندر گھس گیا۔

فائرز کی آواز پوری کوٹھی میں گونجی تھی۔ سجاول، انو اور ان کے دیگر ساتھی بھی لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ''پکڑو اِن کو۔'' میں نے پکار کر کہا۔

سجاول کے ساتھیوں نے فوراً انیق اور جھارا کو ان کی کمر سے تھام لیا اور ان کے جسموں کو قاتل میخوں سے دور رکھنے میں ان کی مدد کی۔ ان کو چوبی تختوں پر سے فوراً ہٹایا نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ ان کی کلائیاں اور ٹخنے ''کلپس'' میں جکڑے ہوئے تھے۔ جھارے کے نحیف لیکن مضبوط جسم سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور میخوں کے سرے سرخ تھے۔ یہ شیطانی گروہ کی غیر انسانی کارروائی تھی جسے دیکھ کر دل کانپ گئے تھے۔ سجاول نے اپنی بھاری آواز میں مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''تم ان کے ہاتھ پاؤں کھولو، میں کوٹھی میں دیکھتا ہوں۔ کوئی حرم زادہ یہاں چھپا ہوا نہ ہو۔''

سجاول اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ تند بگولے کی طرح سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اے کے 57 رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور آنکھیں خون کی طرح سرخ دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے انو وغیرہ کے ساتھ مل کر برق رفتاری سے جھارے اور انیق کے ہاتھ پاؤں آہنی کلپس سے آزاد کیے۔ جھارے کے جسم سے خون کا اخراج کافی زیادہ تھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کے زخموں پر پٹیاں رکھی گئیں اور سجاول کے دو تنومند ساتھی اسے اٹھا کر تیزی سے باہر کھڑی گاڑیوں کی طرف لے گئے۔ انیق کی حالت بھی نیم بے ہوشی والی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بڑا سخت جان ہے۔ اس کی قوتِ برداشت اور ہمت میں بھی کوئی شک نہیں تھا لیکن وہ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں جس سخت ترین آزمائش سے گزرا تھا وہ گوشت پوست کے انسان کو ریزہ ریزہ کرسکتی تھی۔ انیق کا سارا جسم لرز رہا تھا اور پسینے میں تر تھا۔

میں نے سجاول کے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ انیق کو سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے جائیں۔ دو افراد نے دونوں طرف سے اس کے بازو اپنے کندھوں پر رکھے اور اسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے قریبی کمرے میں لے گئے۔ انیق مسلسل کراہ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے ایک پاؤں اور سر پر بھی گہری چوٹ ہے۔ یہ چوٹیں غالباً دو تین گھنٹے پہلے کی تھیں۔ شاید اس وقت کی جب ڈیتھ اسکواڈ کے بھیڑیے انیق اور اس کے ساتھیوں کو اپنی گرفت میں لے رہے تھے۔

انیق بری طرح نڈھال اور نیم غشی کی حالت میں تھا اس کے باوجود میں اس کے سامنے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے انو سے کہا کہ وہ اس کی چوٹوں کو دیکھے اور اگر خون بہہ رہا ہے تو اسے روکے۔ اسی دوران میں سجاول کا ایک کارندہ

سیڑھیوں سے اتر کر دوڑتا ہوا مجھ تک پہنچا۔ ”آپ کو سردار بلا رہے ہیں...... اوپر...... لاشیں ہیں۔“ اس نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

میں سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا۔ سامنے ایک کمرے میں تکلیف دہ منظر دکھائی دیا۔ دو لڑکیاں اور ایک جواں سال عورت تھی۔ تینوں نے اپنے گرد بیڈ شیٹس لپیٹ رکھی تھیں۔ ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان کے جسموں پر چوٹیں تھیں اور چوٹوں سے خون رس رہا تھا۔ ان کی حالت گواہی دے رہی تھی کہ وہ پچھلے ایک دو روز سے ڈیتھ اسکواڈ کی وحشت کا شکار ہیں۔ غنیمت بس یہی تھا کہ وہ زندہ بچ گئی تھیں۔ سجاول نے اس کمرے کے دروازے کے قفل کو توڑ کر ان تک رسائی حاصل کی تھی۔ ان کی چوتھی ساتھی بھی یہاں موجود تھی مگر وہ زیادہ بدقسمت ثابت ہوئی تھی۔ وہ اپنے جسم کے علاوہ اپنی جان بھی نہیں بچا سکی تھی۔ میں اسے دیکھ کر مزید افسردہ ہو گیا۔

”تم اسے پہچانتے ہو؟“ سجاول نے پوچھا۔

”ہاں، یہ داؤد بھاؤ کی رکھیل تھی۔ میں نے لاہور میں کئی بار اسے دیکھا ہے۔ روبی نام ہے اس کا۔“

روبی کی کمر میں بائیں طرف ایک خنجر دستے تک پیوست تھا۔ وہ اوندھی پڑی تھی اور اس کے اردگرد لوتھڑوں کی صورت میں جما ہوا خون بتا رہا تھا کہ اسے مرے ہوئے آٹھ دس گھنٹے تو ہو ہی چکے ہیں۔ شاید اسے مارنے کے بعد بطور ”نشانِ عبرت“ یہیں پڑا رہنے دیا گیا تھا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ بھاگنے کی کوشش میں مری ہے یا پھر مزاحمت کی وجہ سے۔ داؤد بھاؤ کی یہ نوعمر رکھیل بمشکل بیس برس کی ہوگی۔ وہ لاہور والے زمین دوز اڈے پر داؤد بھاؤ کے گرد تتلی کی طرح منڈلاتی تھی۔

”یہ باقی کی لڑکیاں بھی داؤد بھاؤ کے گروہ سے ہیں؟“ سجاول نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

”کہیں داؤد بھاؤ خود بھی تو نہیں ٹپک گیا؟“ سجاول نے خیال ظاہر کیا۔

”میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ داؤد بھاؤ آسانی سے ہاتھ آنے والا بندہ نہیں۔ اس کے یہ ساتھی بھی لوہے کے چنے تھے مگر پتا نہیں کیسے گھیرے میں آ گئے۔“

”انیق کہاں ہے؟“

”نیچے کمرے میں، تم اسے دیکھو، بلکہ اگر ہو سکے تو

لاحاصل

مرزا سدا کے کنوارے تھے۔ رشتے طے کرانے والے منشی جی آئے دن ان پر ڈورے ڈالنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے لیکن مرزا بھی داؤ میں نہ آتے۔

ایک روز منشی جی پوری تیاری کے ساتھ پہنچے اور بولے۔ ”بڑھتی ہوئی عمر میں ہر شخص کو شدت سے ایک ساتھی اور ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم جوان نہیں تو ایسے بوڑھے بھی نہیں ہو، برسرِ روزگار ہو، اپنا گھر ہے۔ میری مانو تو اب دیر نہ کرو، اپنا گھر بسا لو۔“

”منشی جی! مجھے گھر بسانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جب میری ساری ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں تو شادی کی کیا ضرورت ہے...... دو بہنیں ہیں جو ہر وقت میرے ذرا سے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔“

”بہنیں ہزار بھی ہوں تو وہ بیوی کا بدل نہیں ہو سکتیں۔“ منشی جی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ”تم اپنی بہنوں سے وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتے جو اپنی بیوی سے کہہ سکتے ہو!“

”فضول باتیں ہیں۔“ مرزا نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ آپس میں رشتے کی بہنیں ہیں...... میں نے کب کہا کہ وہ میری بہنیں ہیں!“

منشی جی بھونچکا رہ گئے۔

ساہیوال سے ساحر کاظمی کا تعاون

لیڈر

ایک سیاسی لیڈر کو مختصر تقریر کے لیے اسٹیج پر بُلایا گیا اور دو گھنٹے مسلسل بولتا رہا۔ مجمع سے احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں تو لیڈر نے اپنی تقریر سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا، دراصل میں آج اپنی گھڑی گھر بھول آیا......“

”کیلنڈر ہی دیکھ لیتے...... پیچھے دیوار پر لٹکا ہوا ہے۔“ سامعین میں سے کسی دل جلے کی تیز آواز آئی۔

عماد، پنجاب

اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔ اسے مرہم پٹی اور تسلی تشفی کی ضرورت ہے...... ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے۔ جو فائر ہم نے کیے ہیں ان کی آواز دور تک گئی ہوگی۔ کیا پتا کوئی پولیس پارٹی یہاں پہنچ جائے۔''

''لاشوں اور لڑکیوں کا کیا کرنا ہے؟'' سجاول نے پوچھا۔

''لڑکیوں کو کسی محفوظ ٹھکانے تک پہنچا دیتے ہیں۔ لاشیں یہیں پڑی رہیں۔'' پھر ایک دم مجھے یاد آیا کہ سجاول کے کارندے نے سیڑھیوں سے اترنے کے بعد مجھے جو اطلاع دی تھی اس میں لاشوں کا ذکر کیا تھا مگر مجھے ابھی تک فرسٹ فلور پر صرف روبی کی لاش ہی نظر آئی تھی۔

''کوئی اور بھی مرا ہے یہاں؟'' میں نے سجاول سے پوچھا۔

''ہاں، لگتا ہے چوکیدار ہے یہاں کا۔ سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں لاش پڑی ہے۔ اسے بھی بڑے بھیڑے طریقے سے مارا گیا ہے۔ اس کے گلے کے گرد پھندا کسا گیا ہے۔ پر اتنا بھی نہیں کسا گیا کہ وہ فوراً مر جائے۔ لگتا ہے کہ وہ دو تین گھنٹے تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔''

میں نے ساتھ والے کمرے میں جا کر صحت مند پٹھان چوکیدار کی لاش دیکھی۔ اس میں سے اب بُو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گردن میں نائیلون کی سرخ رسی کا پھندا تھا۔ یقیناً بے بس...... بدنصیب شخص دیر تک زندگی اور سانس کے لیے تڑپتا رہا تھا۔ اس کا منہ اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

یہ درندگی یہ بے رحمی ٹیکساری گینگ اور ڈیتھ اسکواڈ کا خاصہ تھی۔ وہ بدترین اذیت رساں تھے۔ ڈیتھ اسکواڈ کے ان سب خبیثوں کے اندر ان کے جدّامجد شیطان صفت ''ایول'' کی روح تھی۔ سونے پر سہاگا ان کی وہ تربیت تھی جو ٹیکساری گینگ کے بدنام زمانہ سرغنہ جان ڈیرک نے کی تھی۔ اس نے ان ''ٹیسٹ ٹیوب شیطانوں'' کو ایک خطرناک ترین ٹولا بنا دیا تھا۔ وہ مارنے سے نہیں ڈرتے تھے اور نہ مرنے سے۔ وہ دنوں میں برسوں کی لذتیں سمیٹ رہے تھے۔ ان کا جنون جب نشے میں ڈوب کر دو آتشہ ہوتا تھا تو وہ اس نہج پر پہنچ جاتے تھے جہاں زندگی اور موت ان کے لیے ہم معنی ہو جاتی تھی اور یہی سب سے تشویش ناک بات تھی۔

سجاول، انیق کو دیکھنے کے لیے نیچے گراؤنڈ فلور پر جا چکا تھا۔ سجاول کے ساتھی انو نے بتایا۔ ''لگتا ہے جی کہ کوٹھی کا مالک یہاں نہیں تھا۔ صرف چوکیدار تھا۔ اسے ان بدمعاشوں نے باندھ دیا اور کوٹھی پر قبجا (قبضہ) کر لیا۔ میرا تو اندازا ہے کہ یہ قبجا سات آٹھ روز سے تھا۔ شاید کل کسی وقت یہ لوگ ان لڑکیوں اور مردوں کو بھی پکڑ کر یہاں لے آئے۔''

''تم لوگوں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ یہاں کوئی چھپا ہوا تو نہیں ہے؟''

''نہیں جی، ایک ایک کونا دیکھ لیا ہے۔ چلے گئے ہیں حرامجادے۔ کوئی بڑی ہی گندی نسل کے انگریج ہیں یہ؟''

یہ جن شکنجوں میں انیق، مختار اور ان کے دو ساتھیوں کو کسا گیا تھا، پتا نہیں گینگ والوں نے کہاں سے حاصل کیے تھے۔ یہی لگ رہا تھا کہ یہ سات آٹھ روز والا قیافہ درست ہے۔ یہ ابلیسی ٹولا پچھلے قریباً ایک ہفتے سے یہاں موجود تھا۔ لکڑی کے یہ تختے ان کو یہیں اس کوٹھی سے مل گئے تھے۔ ان پر میخیں اور کلپس وغیرہ لگا کر انہیں اذیت رسانی کے آلے کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک طرح سے یہاں سے رخصت ہوتے وقت یہ شیطانی ٹولا، انیق اور اس کے تین ساتھیوں کو دردناک موت سے دوچار کر گیا تھا...... یعنی سسکتے رہو اور مرتے رہو، ان میں سے دو تو واقعی موقع پر مر گئے تھے۔ مختار جھارے کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ یہ انیق کی غیر معمولی سخت جانی تھی کہ اس نے اپنے لرزتے بازوؤں پر اپنے جسم کا بوجھ اٹھائے رکھا تھا اور ہمارے پہنچنے تک میخ نما سلاخوں سے بچا رہا تھا۔

اس خالی کوٹھی میں جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے، شراب کی خالی بوتلیں اور تاش کے پتے وغیرہ بکھرے ہوئے تھے۔ میری معلومات کے مطابق ڈیتھ اسکواڈ کے یہ لوگ کچا گوشت بھی کھا جاتے تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں وہاں دیسی مرغیوں اور بطخوں کے بچے کھچے ٹکڑوں کی شکل میں ملا۔ کچے قیمے کی شکل میں بہت سا گوشت ریفریجریٹر میں بھی موجود تھا۔ یہ مرغیاں وغیرہ یقیناً اس کوٹھی سے ہی حاصل کی گئی تھیں۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ انیق سے بات کروں۔ اُسے گلے سے لگاؤں، اسے اس نئی زندگی پر مبارک باد دوں مگر میں اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ سجاول نے میری بات مان لی تھی۔ وہ انیق کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ تھا۔ بھاؤ گینگ کی تینوں لڑکیوں کو محفوظ مقام تک پہنچانے کی ذمّے داری انو نے لے لی۔ ان بے چاریوں کی حالت پر

ترس آتا تھا۔ بے شک وہ کوئی گھریلو، شریف زادیاں نہیں تھیں۔ کئی طرح کے لوگوں سے ان کا سابقہ پڑ چکا تھا، پھر بھی ان کی آنکھوں میں وحشت ٹھہری سی گئی تھی۔ ذرا سی آواز پر بدک جاتی تھیں۔ مجھے ایک لڑکی کے بازو پر سگریٹ سے جلائے جانے کے داغ بھی نظر آئے۔ میں نے اسی سے پوچھا۔ ''ان لوگوں نے کہاں سے پکڑا تمہیں؟''

اس نے بولنے کی کوشش کی مگر بولا نہیں گیا۔ وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بس اتنا کہہ سکی۔ ''ہمیں یہاں سے لے جاؤ۔ وہ پھر آجائیں گے...... پلیز دیر نہ کرو۔''

جواں سال عورت نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''آپ...... کون ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''تم لوگوں کا ہمدرد اور مددگار ہوں... فی الحال اپنا نام نہیں بتا سکتا اور مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے اور داؤد بھاؤ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں، یہ بھی جانتا ہوں کہ داؤد بھاؤ آج کل روپوش ہے اور کس وجہ سے روپوش ہے......''

میری باتوں سے جواں سال عورت میں آمادگی پیدا ہوئی۔ دونوں لڑکیوں کی طرح وہ بھی اب بُرے بھلے لباس میں نظر آ رہی تھی۔ انو نے ان کے لیے شالیں بھی فراہم کر دی تھیں۔ وہ اپنے تراشیدہ بالوں کو اپنے زخمی ہاتھ سے آنکھوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''داؤد بھاؤ نے پیر کے روز ہمیں بھی انڈر گراؤنڈ ہونے کی ہدایت کی تھی۔ مختار بھائی ہم کو لے کر شادمان کی ایک کوٹھی میں چلے گئے تھے۔ پرسوں رات کو انیق بھی وہیں آ گیا۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہمارے اندر کی ہی ایک لڑکی نے مخبری کی ہے۔ چائے یا کھانے میں بے ہوشی کی دوا تھی۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں ان لوگوں نے ہمیں وہاں سے اٹھایا۔ ہوش آیا تو ہم لاہور کے بجائے اس منحوس کوٹھی میں تھے۔''

''انیق اور مختار بھی ساتھ تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... انیق نے بڑی دلیری دکھائی...... مگر...... اس کا بھی بس نہیں چلا۔ اسے ان لوگوں نے بڑا مارا پھر اس کے ہاتھوں میں کڑیاں لگا دیں۔'' کل کے واقعات یاد کر کے اس کی آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل کچھ اور پھیل گیا۔ دوسری لڑکیاں بھی اشکبار ہو گئیں۔

''اس لڑکی روبی کو چاقو کس نے مارا؟''

''ان ہی سفید چیڑی والوں میں سے کوئی تھا۔ روبی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اس نے جان بچانی چاہی، روئی چلّائی بھی۔ مگر انہوں نے اسے وہیں اسی وقت قتل کر دیا۔''

زیادہ سوال جواب کا وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔ میں نے کوٹھی میں تیزی سے گھوم پھر کر کچھ شواہد اٹھائے اور کچھ مٹائے۔ بھاؤ گینگ کی تین لاشیں بھی یہاں موجود تھیں مگر انہیں یہاں سے لے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم نے لڑکیوں کو لے جانے پر اکتفا کیا۔ اسی دوران میں سجاول کو فون پر یہ بُری خبر بھی ملی کہ مختار جھارا اسپتال نہیں پہنچ سکا۔ وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی ناف والا زخم دیکھا تھا جو بہت سنگین تھا۔ غالباً اسی نے اس کی جان لی تھی۔

☆☆☆

صبح گیارہ بجے تک میں شرافت کی ہائی روف سوزوکی پر راولپنڈی واپس پہنچ چکا تھا۔ جاتے ہوئے میں پہلوان حشمت کو بتا کر گیا تھا کہ ایک ضروری کام سے لاہور جا رہا ہوں۔ اس نے تاجور کو بھی بتا دیا تھا مگر وہ میری غیر موجودگی سے بے حد پریشان تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو ناراض نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔

''ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟'' وہ بھاری لہجے میں بولی۔

''بھئی، میں بتا کر گیا تھا۔ ضروری کام تھا، تم سو رہی تھیں۔''

''فون تو کر سکتے تھے ناں، اتنے بُرے بُرے خیال آ رہے تھے مجھے۔'' اس کی ناک سرخ ہو گئی، یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اگلے چند سیکنڈ میں رو سکتی ہے۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دلاسا دیا۔ وہ اپنی لٹوں کو اپنے خوب صورت کانوں کے پیچھے اُڑس کر بولی۔ ''کہیں...... آپ نے...... ان سے جھگڑا تو نہیں کیا؟''

میں سمجھ گیا۔ ''ان'' سے تاجور کی مراد دارابی اور دارج تھا۔

میں نے کہا۔ ''ان سے جھگڑے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ جب تم یہاں ہو...... اور میں یہاں ہوں تو پھر وہ سب جائیں جہنم میں۔ بس اتنی دعا ہے کہ وہ اوپر والا دین محمد صاحب کے دل میں ہمارے لیے کچھ نرمی پیدا کر دے۔''

وہ نڈھال سی میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے شاہ زیب؟ اتنی

محبت کرنے والے لوگ اتنے سخت کیوں ہو جاتے ہیں۔ کیوں وہ ہماری فریاد نہیں سنتے۔ کیوں ہمارے دل کی بات نہیں سمجھتے؟'' اس کا اشارہ اپنے والد کی طرف تھا۔

''یہ تو اوپر والے کا نظام ہے تاجور...... محبت کی راہ میں مصیبتیں تو آنا ہی ہوتی ہیں، چاہے وہ کسی طرف سے آجائیں۔ آخر کو تو وہ تمہارے والد ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ان کا دل پسیج جائے گا۔''

کچھ دیر ہمارے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اب میں کیا پوچھنے والا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی پلکیں بے ساختہ جھک گئی تھیں۔ اس نے اپنی انگلیاں مروڑنا شروع کر دیں۔

میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟''

''کس بارے میں؟'' وہ انجان بن کر بولی۔

''کون سا دن مبارک رہے گا؟''

اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ابھی تو یہ بھی پتا نہیں چل رہا کہ یہ کام بھی مبارک رہے گا یا نہیں۔''

''تو پھر میں کیا سمجھوں؟''

''جو مرضی سمجھ لیں۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ایک چھوٹے سے گھونگھٹ نے اس کا نصف چہرہ چھپا لیا تھا۔

''......تو کیا انکار سمجھ لوں۔''

''ہاں انکار ہی سمجھ لیں۔'' اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک غیر محسوس مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

چند سیکنڈ بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ دروازے کے پاس پہنچا۔ کان لگا کر اندر کی آہٹ لینے کی کوشش کی۔ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ انکار ہے یا اقرار۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ کوئی ٹھوس جواب ہونا چاہیے بھئی۔''

''میں چاچا حشمت کو بتا دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی بھیجتا ہوں چاچا حشمت کو۔''

درحقیقت وہ اپنا جواب تو اسی وقت دے چکی تھی جب اُس عالی شان بنگلے میں، میں نے اس سے کہا تھا...... اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں...... اور وہ بڑی باہمت ہونے کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔

میں نے پہلوان حشمت کو تاجور کی طرف بھیج دیا اور خود ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ شرافت علی نے ٹی وی لگا رکھا تھا۔ ایک کبڈی میچ دکھایا جا رہا تھا۔ جیتنے والی ٹیم کا کپتان اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر سوار تھا اور پُرجوش نعرے بلند کر رہا تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر کبڈی شاہ سیف کی طرف چلا گیا۔ وہ رنگ رنگیلا پنجابی گبرو بھی تو اپنی کبڈی ٹیم کا کپتان تھا۔ اپنے حریفوں پر بجلی کی طرح جھپٹتا تھا اور ہوا کی طرح ان کی گرفت سے نکل جاتا تھا۔ وہ ہماری گرفت سے بھی نکل گیا تھا۔ ہم اسے روکنے کے لیے کچھ نہ کر سکے تھے۔ دکھیاری ماں اس کی راہ دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ بوڑھا باپ اب کمر پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے چلتا تھا اور چھوٹی بہنیں...... جن کی آنکھوں کا وہ تارا تھا...... ہمیشہ کے لیے اس کی تصویروں سے دل بہلانے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ سیف کی ماں کا آخری وقت جیسے میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنی آخری رات اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کے کمرے میں گزاری تھی۔ اس کی تصویریں، اس کے استعمال کی اشیا، اس کے میڈل اور ٹرافیاں سب اس کے اردگرد تھے، اور وہ ان چیزوں پر سر رکھ کر ان پر ہاتھ پھیرتی ہوئی ابدی نیند سو گئی تھی۔

سیف کی موت گاہے بگاہے مختلف بہانوں سے میرے دل و دماغ کو جھنجوڑتی رہتی تھی۔ اور یہ کیفیت میری ہی نہیں تھی۔ اس کے سب قریبی اس جواں مرگ کی جدائی کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تاجور بھی۔ اسے سیف سے بھی زیادہ اس کی والدہ کی موت کا دکھ تھا۔ دو دن پہلے وہ اخبار میں ایک اشتہار دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔ یہ اشتہار ایک گمشدہ نوجوان کے بارے میں تھا۔ اشتہار کے مضمون میں لکھا تھا...... تمہاری ماں تمہارے غم میں بستر پر پڑی ہے۔ وہ اور صدمہ نہیں جھیل سکتی۔ جہاں اور جس حال میں ہو واپس آجاؤ۔ تم سے کسی طرح کی باز پرس نہیں کی جائے گی۔

تاجور نے مجھ سے مخاطب ہو کر جذباتی لہجے میں کہا تھا۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے، ماؤں کے نصیب میں ایسے دکھ کیوں لکھے جاتے ہیں۔''

میں کیا جواب دیتا۔ تاہم اس وقت میرے دل میں آیا تھا۔ کاش شفقت بی بی کے مرنے سے پہلے میں بھی کوئی ایسا اشتہار دے سکتا۔ سیف سے کہتا...... جہاں اور جس حال میں ہو واپس آجاؤ۔ تمہاری ماں اور دکھ نہیں جھیل سکتی۔ اور وہ واقعی واپس آجاتا۔ موت سے اپنی کلائی چھڑا لیتا۔

میرے گلے لگ کر کہتا...... دیکھو میں لوٹ آیا ہوں۔ میری ماں کی محبت نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ میرا سینہ پھٹ گیا تھا۔ سانس رک گئی تھی۔ نبض بند ہوگئی تھی مگر زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔ ہاں میری ماں کی محبت نے مجھے مرنے نہیں دیا تھا۔

میں کافی دیر افسردہ بیٹھا رہا۔ پھر اس افسردگی کو پہلوان حشمت کے مسکراتے ہوئے چہرے نے ڈھانپ لیا۔ وہ میری طرف آرہا تھا۔ زندگی کے سفر میں دکھ اور راحت کے لمحے اسی طرح ایک دوسرے کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔

پہلوان حشمت نے مبارک بادی انداز میں مجھے گلے سے لگایا اور بولا۔ ''تاجور تمہاری خوشی میں خوش ہے، وہ راضی ہے۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پہلوان سے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو میرا منہ میٹھا کرنا ہے۔ اور تم اچھی طرح جانت ہو، میرا منہ ایک کلو سے کم مٹھائی میں میٹھا ناہیں ہووے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اور اگر آپ کو باقاعدہ مٹھائی کھلانا پڑے تو پھر؟ چھ سات کلو تو ضروری ہوگی۔''

''ناہیں، اب ایسی بھی بات ناہیں۔ چار پانچ کلو سے کام چل جاوت ہے۔ ابھی ابھی اس معاملے میں دو شعر وارد ہوئے ہیں مجھ پر۔ پڑھو۔'' اس نے سگریٹ کے پیکٹ پر لکھے شعر میری طرف بڑھائے۔

خوشی کے موکے کو ہم خوشی سے ہی مناتے ہیں
ہر ڈر دل سے نکالتے ہیں، پیتے ہیں اور کھاتے ہیں
محنت نہ کرنے سے بندے کو دل کے مسئلے ہوتے ہیں
رس غلے غلاب جامن کب بندے کو پھڑکاتے ہیں

میں بولا۔ ''پہلوان جی! یہ کیا بات ہے۔ آپ ویسے تو بڑی پکی اردو بولتے ہیں مگر شاعری میں پنجابی بھی گھسیڑ دیتے ہیں۔''

''بس پرانے وقت کی بات ہے۔ ایک دو شعروں میں تھوڑی سی پنجابی جوڑی تھی۔ وہ کسی نے بہت پسند کیے۔ بس، پھر اسی وقت سے یہ عادت پکی ہوگئی۔''

''جس نے شعر پسند کیے وہ کون تھا...... یا کون تھی؟''

پہلوان بولا۔ ''تم اتنے بھولے نہ بنو۔ اندر سے بہت کھوچل ہو تم۔ اچھی طرح جانت ہو کہ پیار کرنے کے بغیر کوئی شاعر بن ہی ناہیں سکتا۔ ہاں جی...... ہم نے بھی کبھی جوانی میں یہ جھک ماری تھی۔ لیکن اس خوشی کے موقع پر درد و غم کا ذکر چھیڑنا ٹھیک ناہیں۔ تم بتاؤ اب یہ شبھ کام کب ہونا ہے...... اور کیا انتظام کرنا ہے نکاح کا؟''

میں پہلوان کو سجاول اور اس کی شادی کے بارے میں تقریباً سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں سجاول اور خورسنہ وغیرہ کا یہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ لیکن اب پتا نہیں کہ وہاں اس بے چارے انیق کی کیا پوزیشن ہے۔ پہلے مجھے اس کی حالت کا پوچھنا ہوگا۔''

''تو فون کرو۔''

''یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چلو تمہاری طرف سے میں خود ہی مٹھائی لے آوت ہوں۔ پیسے بعد میں دے دینا۔'' پہلوان میرا مطمحِ نظر سمجھ کر باہر نکل گیا۔

میں نے اپنے نئے نمبر سے سجاول کو کال ملائی اور انیق کا احوال پوچھا۔

سجاول نے بتایا۔ ''سر پر بھی چوٹ لگی ہے مگر گٹّے (ٹخنے) کی چوٹ کافی ڈھاڈی ہے۔ میں نے محلے کے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ چھوٹا موٹا فریکچر بھی ہوسکتا ہے۔ اسپتال میں چیک کرالیں۔ پر تم جانتے ہو اس کو اسپتال لے جانا ہم دونوں کے لیے خطرناک ہے۔ اب ڈاکٹر نے ٹیکے وغیرہ لگائے ہیں۔ درد میں کمی ہے اور سو رہا ہے۔''

''کچھ بتایا ہے اُس نے کہ کیا ہوا؟''

''ہاں، تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا۔ میں ان کو چھوڑوں گا نہیں۔ کہیں بھی چلے جائیں، جا پکڑوں گا۔ انہوں نے روبی کو مار دیا...... فلاں فلاں کو بھی مار دیا۔ میں بدلہ لوں گا۔'' سجاول نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''میرا خیال ہے روبی اس کڑی کا نام ہے جس کی لاش اوپر والی منزل سے ملی ہے۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

سجاول بولا۔ ''وہی بات صحیح ہے جو اس کٹے بالوں والی عورت نے بتائی تھی۔ تہمینہ نام کی کسی خاص کڑی نے مخبری کی اور یہ سارے شادمان کی کسی کوٹھی سے پکڑے گئے۔ بڑی زبردست پلاننگ تھی۔ انیق کو بہت دکھ ہے۔ وہ تاجور کے بارے میں بھی فکرمند ہے۔ بے ہوشی میں ہی بڑبڑا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، وہ اس تک بھی پہنچ سکتے ہیں...... سجاول بھائی تم اس کا دھیان کرو۔ میں نے کہا، تم گھبراؤ نہ۔ وہ دھیان میں ہی ہے، کچھ نہیں ہوگا اُسے۔ پوچھ رہا تھا کہ میں وہاں موقع پر کیسے پہنچا ہوں؟''

''کیا بتایا تم نے؟''

''یہی کہ اس کے ساتھی منور نے فون کیا اور واردات والی جگہ بتائی۔ ہم چل پڑے۔''

میں نے سجاول سے پوچھا۔ ''منور کے بارے میں کوئی کھوج ملا؟''

''کھوج کیا ملنا تھا۔ وہ مرگیا ہے نہر میں ڈوب کر۔ دو چار گولیاں بھی لگی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ جب اس کی کال آئی تو ساتھ ہی فائرنگ بھی سنائی دی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ٹیکساری گینگ والوں کو اس بات کا شک ہوگیا ہو کہ اس بندے نے مرنے سے پہلے کہیں اطلاع دے دی ہے اسی لیے وہ اس کوٹھی سے نکل گئے ہوں۔''

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے سجاول۔ اگر وہ اس بات پر کوٹھی سے نکلتے تو فوراً نکلتے۔ وہ تو دو تین گھنٹے بعد بھی وہیں رہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ذہن میں آتی ہے۔''

میں نے سجاول کو اپنے اور تاجور کے بارے میں اطلاع دی۔ وہ خوش ہوگیا۔ اس نے مجھے مبارک باد دی اور بولا۔ ''پھر اب کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارا، خورسنہ اور ذیشان کا یہاں ہونا ضروری ہے۔ لیکن تم فوری طور پر انیق کو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اسے بہتر ہونے میں تین چار روز تو لگ ہی جانے ہیں۔ مجھے بھی تھوڑی بہت تیاری کرنی ہے۔ تاجور کے کپڑے، جوتے وغیرہ بھی لینے ہیں، اور تھوڑی سی جیولری بھی۔ میرے خیال میں تو جمعہ کا دن رکھا جاسکتا ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی چنگا ہے۔ انیق کی دیکھ بھال کا بھی کوئی انتظام کیا ہی جاسکتا ہے۔''

''میں یہ بھی چاہتا ہوں سجاول کہ تاجور کی والدہ کی طرف سے کوئی خیر خیریت کی خبر مل جائے۔''

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ اب بہتر ہیں۔''

''لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ کل پرسوں تک اسپتال سے ڈسچارج ہوجائیں۔ یہ تاجور کے لیے بڑی اچھی خبر ہوگی اور ماحول کو بہتر بنائے گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' سجاول نے کہا۔

خورسنہ بھی فون پر آئی اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں مبارک باد دی۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''جاماجی میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ تاجور آپ کی گرل فرینڈ ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں لیکن کسی وجہ سے ناراض ہیں۔ لوگ آپ دونوں کو ایک دیکھنا چاہتے تھے، جاماجی کی سیکڑوں خواتین نے آپ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے رسمیں بھی ادا کی تھیں۔ آپ کو یاد ہے ناں؟''

''ہاں، میں کچھ بھی بھولا نہیں۔''

''آج ان سب لوگوں کی خواہش پوری ہونے کی امید پیدا ہوگئی ہے لیکن وہ بے خبر ہیں، بلکہ بہت ہی بے خبر ہیں۔ وہ اپنی دانست میں آپ کو ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔'' اس کے لہجے میں اداسی آگئی۔

ہم نے تھوڑی دیر مزید بات کی۔ وہ بڑی ذہین تھی۔ فون پر ہونے والی گفتگو میں وہ مجھے وقاص کے نام سے مخاطب کررہی تھی اور اس نے اپنی آواز بھی بہت دھیمی رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ انیق اسی گھر میں ہے اور میرے ''حیات'' ہونے کی خبر انیق سے مکمل طور پر پوشیدہ ہے۔

شام تک گوجرانوالہ کے واقعے کی خبر پوری تفصیل سے میڈیا تک پہنچ چکی تھی۔ ایک بار پھر چینلز نے سنسنی پھیلا دی۔ ٹیکساری گینگ کے ذکر نے اس سنسنی میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ایک نیوز کاسٹر ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ ''ناظرین! یاد رہے کہ یہ تیسرا اسکین ترین وار ہے جو اس غیر ملکی گروہ نے کیا ہے۔ آخر کیسے پہنچے ہیں یہ لوگ یہاں؟ کیوں پہنچے؟ اب تک یہ قانون کی گرفت میں کیوں نہیں آئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اس مرتبہ عام شہریوں کو نشانہ نہیں بنایا گیا۔ نشانہ بننے والے جرائم پیشہ گروہ کے لوگ ہی تھے، مگر انہیں جس اذیت ناک طریقے سے مارا گیا ہے وہ لرزہ خیز ہے۔''

پھر تفصیل بتائی جانے لگی کہ کس طرح ''پُش اَپ'' کی پوزیشن میں جکڑے گئے افراد کے جسم آہستہ آہستہ نوکیلی سلاخوں پر آئے اور یہ سلاخیں سرک سرک کر ان کے جسموں میں داخل ہوئیں......

اسی دوران میں دروازے پر بیل ہوئی، میں چونک گیا۔ سب کچھ ٹھیک جارہا تھا، مگر اپنے اور تاجور کے نکاح کے حوالے سے عجیب سا وہم تھا دل میں۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے...... کسی طرح یہ وقت خیریت سے گزر جائے۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آخری شکار

اعتزاز سلیم وصلی

خدا نے اسے حسن و جمال سے نوازا تھا... وہ نوخیز کِھلتی کلی کے مانند تھی... وہ خواب پسند تھی لیکن اہل زر کی ہوس پرستی کا شکار ہو گئی... اس کے جسم و جاں نے وہ اذیتیں سہیں... کہ قلب و روح پر اپنے نشاں چھوڑ گئیں... جرم و سزا کا شکار ہو جانے والے شکاریوں کا ایک لامتناہی تسلسل...

بے انصافی...... ظلم وستم......اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھ جانے والے بدنصیبوں کی دردناک داستاں......

عام سی شکل وصورت کا مالک وہ نوجوان اس چھوٹے مکان میں بیٹھا گہری سوچ میں گم دکھائی دیا۔ سامنے بیٹھی لڑکی کی نگاہوں کا مرکز اس کے چہرے سے ظاہر ہونے والے تاثرات تھے۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ ’’تم اب کیا چاہتی ہو؟‘‘ لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں تو بہت عرصے سے اپنی موت چاہتی ہوں مگر مانگنے سے ملتی نہیں یہ بدبخت موت۔'' اس کے بات کرنے کا انداز سادہ سا تھا مگر نجانے کیوں اس چوبیس سال کے نوجوان کو اس کے لہجے میں چھپی تلخی صاف محسوس ہوئی۔

''تمہاری موت سے کیا ہوگا؟ وہ سب مرجائیں گے جنہوں نے تمہیں اس حال تک پہنچایا؟'' نوجوان طنزیہ انداز میں بولا۔

''نہیں مگر مجھے زندگی نام کی اس اذیت سے چھٹکارا مل جائے گا۔'' وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی مگر حالات اور تجربات نے ایسے جملے سکھادیے تھے۔

''اگر موت ہی تمہارا مقصد ہے تو میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟'' نوجوان کے لہجے میں ناگواری لڑکی سے چھپی نہ رہ سکی۔

''میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟'' آخر وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بہت کچھ......'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''کیا؟'' لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

''بدلہ......'' ایک لفظ نے اُسے چونکا دیا۔

''مگر کیسے؟'' وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جب کچھ کرنے کا سوچ لیا جائے تو وہ کر بھی گزرتے ہیں ابھی تم آرام کرو۔'' وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کے قدموں کی آواز دماغ میں آنے والی سوچوں پر اپنے اثر چھوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

شہر سے ہٹ کر بنے اس بڑے فارم ہاؤس پر ہنگامہ جاری تھا۔ میوزک فل آواز میں بج رہا تھا۔ تقریباً بیس کے قریب نوجوان لڑکے لڑکیاں نیو ایئر کے استقبال میں ایک دوسرے سے چپک کر ڈانس کررہے تھے۔ شراب اور شباب کے نشے سے چور اردگرد کا ہوش بھلائے لڑکے اپنی دنیا میں مگن دکھائی دے رہے تھے۔ فارم ہاؤس کے باہر دھند نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک کار اس فارم ہاؤس کے گیٹ پر رکی۔ اس میں ایک قاتلانہ اداؤں کی مالک حسینہ جدید تراش کے لباس میں ملبوس ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھی۔ چوکیدار نے ایک نظر اسے دیکھا اور کچھ بولے بنا اندر جانے دیا۔ قریب کھڑے سیکیورٹی گارڈ نے معنی خیز نظروں سے سر ہلایا اور آہستگی سے اس کے کان میں کہا۔ ''لگتا ہے صاحب لوگوں کا ایک آدھ سے دل نہیں بھرتا۔'' اس کی بات سن کر چوکیدار ہنس پڑا۔ کار گیراج میں روک کر وہ حسینہ باہر آئی۔ اس نے پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک نوجوان لڑکا جینز شرٹ میں ملبوس سیٹ کے درمیان سکڑا پڑا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ دونوں اس طرح اندر بڑھ رہے تھے جیسے سب کچھ پہلے سے طے کیا ہو۔ فارم ہاؤس کے جس حصے میں ہنگامہ ہورہا تھا۔ وہ دونوں اسی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

''میں اس کے سامنے گئی تو وہ مجھے پہچان لے گا۔''

لڑکی کا لہجہ اس کے لباس اور انداز سے میل نہیں کھاتا تھا۔

''کچھ نہیں ہوگا یہاں سب نشے میں ہوں گے، جشن ہے نئے سال کا۔'' نوجوان نے تسلی دی۔ ساتھ ہی دونوں اندر کی جانب بڑھتے چلے گئے۔

لڑکی حیرانگی چھپائے اندر کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے شکار کو بھی دیکھ لیا تھا۔ نوجوان اس سے الگ ہوکر ایک جانب بڑھ گیا جہاں قطار میں تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اپنے شکار کو دیکھا اور دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ نشے میں بے ہنگم انداز میں ہاتھ چلا رہا تھا جبکہ اس کی ساتھی لڑکی اس سے بچنے کی کوشش کررہی تھی۔ حسینہ اس کے قریب ہوئی اور غیر محسوس انداز میں اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اب وہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ حسینہ نے اس کو اپنے پیچھے آنا کا اشارہ کیا۔ وہ قطار میں موجود تینوں کمروں کی جانب بڑھے۔ لڑکی ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ لڑکا اس کے پیچھے اندر آگیا۔ وہ لپک کر اس کو گلے لگانا چاہتا تھا مگر یہ اس کی آخری خواہش تھی جو پوری نہ ہوسکی۔ لڑکی کے ساتھ آنے والا لڑکا واش روم سے برآمد ہوا اور اس نے انتہائی مہارت سے چاقو پھینکا جو سیدھا اندر آنے والے لڑکے کے دل کے قریب لگا۔ وہ الٹ کر گرا۔ لڑکی نے نفرت سے اس کے چہرے پر تھوک دیا اور جنون میں آکر چاقو اس کے جسم سے نکال کر دو تین بار دوبارہ اس کے جسم پر وار کیا۔ لڑکے نے اسے غصہ نکالنے دیا۔

''بس کرو، چلو نکلتے ہیں یہاں سے۔'' لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کو سنبھالا۔ جاتے جاتے لڑکی نے ایک بار پھر مردہ پڑے نوجوان پر تھوک دیا۔

''کمینہ، کُتا، ذلیل......'' اس کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ لڑکا اسے سنبھال کر باہر لے آیا۔ لڑکی کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے مگر کسی نے توجہ نہیں دی اور نئے سال کی آمد کے ساتھ شہر دھماکوں سے گونج اٹھا۔ فارم ہاؤس میں

بھی سب نے نعرے لگائے۔ وہ دونوں آرام سے چلتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔ اگلے ہی لمحے شہر کی طرف جانے والی وہ گاڑی اپنے مقصد میں کامیاب ہو کے واپس لوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

''ہمارا مستقبل کیا ہوگا عثمان؟'' اسما نے اس کے کندھے سے سر جوڑا۔ عثمان جو اپنی سوچوں میں گم تھا، چونک اٹھا۔

''یہ کیا بیٹھے بٹھائے سوچ لیا تم نے؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس سوچتی ہوں بچھڑ گئے تو زندہ نہیں رہ سکوں گی میں۔'' اس کے لہجے میں چھپی معصومیت پر عثمان کو بے اختیار پیار آیا۔ اس نے ہولے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال کو چھوا۔

''پریشان مت ہو جان، ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے، یہ کالج کا آخری سال ہے اس کے بعد کسی جاب کی تلاش میں نکلوں گا اور جاب ملتے ہی تمہارا رشتہ مانگ لوں گا۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے ڈیڈ آسانی سے تمہیں میرا رشتہ دے دیں گے؟'' اس نے منہ بنایا۔

''تو کیا کرنا ہوگا؟'' وہ حیران ہوا۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے، ڈیڈ کلاس کے فرق کی وجہ سے کبھی یہ رشتہ منظور نہیں کریں گے بلکہ ہو سکتا ہے وہ اپنے ہی جیسے ایم این اے یا کسی صوبائی وزیر کے بیٹے سے میرا رشتہ طے کر دیں گے۔'' اسما نے منہ بنایا۔

''مگر تمہارا ووٹ تو میرے حق میں ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے ووٹ کی اہمیت نہیں ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

شہر کے اس مہنگے ترین کالج میں صرف شہر کے امیر ترین افراد کے بچے ہی پڑھنے آتے تھے۔ اسما علاقے کے ایم این اے کی بیٹی تھی۔ عثمان البتہ ایک لوئر مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ گھر میں عثمان کے علاوہ اس کے تین چھوٹے بہن بھائی تھے۔ اس کے والد کی ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان تھی۔ عثمان پڑھنے میں تیز تھا۔ اس نے ضلع میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اس مہنگے ترین کالج میں مفت داخلہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے سال ہی اس کی ملاقات اسما سے ہوئی۔ دونوں عمر کے اس حصے میں تھے جب جوانی کا نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مخلوط نظامِ تعلیم سے عشق کی سہولت میں آسانی ہوئی اور دونوں سچے جذبات کے ساتھ محبت نام کے بندھن میں بندھ گئے۔ کالج کا یہ وقت کب گزر گیا، دونوں کو پتا ہی نہیں چلا اور اب آخری سال کے ایگزامز سر پر تھے۔ دونوں کو ایگزامز کے ساتھ جدائی کا خوف ستا رہا تھا۔

''چلو کچھ سوچتے ہیں۔'' عثمان خود پریشان تھا۔ اتنے دنوں کا تعلق آسانی سے ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔

''عثمان ایک بات کہوں؟'' اسما نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں کہو۔''

''منیر بھائی کو ہم پر شک ہے، انہیں کسی نے بتایا ہے کہ میں کالج میں تمہارے ساتھ ہوتی ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ یہاں سب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔''

''تم یہ کہہ سکتے ہو کیونکہ تم انہیں جانتے نہیں، یہ سچ ہے کہ ہم ماڈرن فیملی سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کی سوچ بہت عجیب ہے خود چاہے جو کرتے پھریں، مجھ پر پابندیاں لگاتے ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''ہمم......'' عثمان کی سوچ گہری ہوئی۔ ''یہ منیر بھائی کرتے کیا ہیں؟''

''آوارہ گردی، غنڈا گردی......اور ہر قسم کے بُرے کام۔'' اسما کے انداز پر وہ ہنس پڑا۔

''یہ تو ...... پورا فلمی سین بن رہا ہے، ہیرو اور اس کا عشق اور محبوبہ کا ایک عدد بدمعاش بھائی۔'' عثمان نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''یہ فلم نہیں، حقیقت ہے مسٹر عثمان۔'' اس نے جواب دیا۔

''چلو جب سب کچھ سنبھال لیا تو تمہارے بھائی کو بھی دیکھ لوں گا۔'' وہ بولا۔ دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے کالج کی کینٹین کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

عثمان گھر میں داخل ہوا تو سب کو مصروف پایا۔ گھر کی صفائی کی جا رہی تھی۔ عثمان سے ایک سال بڑی بہن ہانیہ جس کی شادی چھ ماہ پہلے ہوئی تھی، وہ بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر عثمان کو دروازے پر ہی ملا۔

''واپس آکر ملتا ہوں میں ذرا سامان لینے جا رہا ہوں۔'' حیدر نے بتایا۔

عثمان اندر آیا۔ اندر سے اس کا گونگا بھائی فرحان جو

سب سے چھوٹا بھی تھا، بھاگتا ہوا آیا اور اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔ اس نے فرحان کو اٹھا کر پیار کیا اور اُسے اٹھائے اندر داخل ہوا۔

''امی کوئی آرہا ہے؟'' ماں کے کمرے میں داخل ہو کر اس نے پوچھا۔

''ہاں دانیہ کو دیکھنے آرہے ہیں۔ حیدر کے جاننے والے ہیں کوئی۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''اچھا یہ دانیہ اتنی بڑی ہوگئی کہ اس کے رشتے آرہے ہیں؟'' وہ حیرانگی سے بولا۔ ان کے پورے خاندان میں لڑکے لڑکیوں کی شادی جلد کر دی جاتی تھی۔ دانیہ تیسرے نمبر پر تھی۔ وہ بہت حسین تھی۔ ابھی اس کی عمر صرف بیس سال تھی۔ رات کے کھانے پر سب اکٹھے تھے۔ عثمان نے لڑکے کو دیکھا۔ عام سی شکل وصورت کے اس نوجوان کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ عثمان اسے دیکھ کر چونک گیا۔ اس سے ملنے کے بعد اس نے حیدر کو اشارہ کیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''ہاں عثمان کیا بات ہے؟'' حیدر اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

''حیدر بھائی آپ اس لڑکے کو اچھی طرح جانتے ہیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ہاں، کیوں؟''

''اس لڑکے کی صحبت اچھی نہیں ہے، میں جانتا ہوں اسے، ہمارے کالج کے گیٹ پر ایک لڑائی میں یہ شامل تھا، اس نے زخمی بھی کیا تھا کچھ لڑکوں کو۔'' عثمان کی بات سن کر ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''عثمان، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''نہیں بھائی، یہ وہی ہے یہ سلمان شہزاد کے لیے کام کرتا ہے آئی تھنک۔'' عثمان نے مزید بتایا۔ سلمان شہزاد شہر کا بدنام شخص تھا۔ شہر کے سارے بدمعاش اس کے انڈر کام کرتے تھے۔ ''سوری مگر میں دانیہ کو ایسے لڑکے کے ساتھ بالکل نہیں بیاہ سکتا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ حیدر کا چہرہ سرخ ہوا۔

''تم ابھی اتنے بڑے نہیں ہوئے عثمان، انکل اور آنٹی کے ہوتے ہوئے فیصلہ کرسکو۔''

''میں کرسکتا ہوں فیصلہ، میری بہن ہے وہ۔'' عثمان کا لہجہ بلند ہوا۔ ہانیہ شاید کہیں قریب ہی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''کک کیا بات ہے عثمان غصہ کیوں کررہے ہو؟''

''ہانیہ کہہ دو جا کر اُن سے، ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔'' اس کی نگاہیں حیدر پر تھیں مگر مخاطب ہانیہ تھی۔ ہانیہ چپ چاپ لوٹ گئی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد رات نو بجے گھر میں ہنگامہ ہوا۔ حیدر بلند آواز میں بول رہا تھا۔

''سمجھ کیا رکھا ہے اس نے خود کو..... ہوتا کون ہے یہ سب فیصلے کرنے والا۔'' ہانیہ بھی شوہر سے متفق دکھائی دیتی تھی۔

''عثمان نے جو کہا، جو کیا ٹھیک کیا، میرا بیٹا ہے وہ، غلط نہیں کرے گا کچھ بھی۔'' عثمان کے والد جو کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے، دھیمے لہجے میں بولے۔

حیدر نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔ ''انکل، وہ اچھا لڑکا ہے۔''

''وہ اچھا لڑکا نہیں..... عثمان نے کہا ہے تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ کھڑے ہو کر بولے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ حیدر نے سرخ چہرے کے ساتھ سب کو دیکھا اور بولا۔

''آج کے بعد ہانیہ اور میں کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔'' وہ باہر نکل گیا۔ ہانیہ نے سب کو باری باری دیکھا اور چپ چاپ شوہر کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

''دانیہ.....'' اس کے منہ سے نکلا۔ پہلی نظر میں محبت کسے کہتے ہیں اگر کوئی شہریار سے پوچھتا تو پتا چلتا۔ اس کی نظروں کے سامنے موبائل رکھا ہوا تھا۔ یہ دانیہ کی تصویر تھی۔ دور سے کھینچی گئی تصویر جس میں وہ کسی دکان کے سامنے گزر رہی تھی۔ شہریار کے لیے پورے شہر میں اس کا پتا چلانا مشکل نہ تھا۔ اس نے حیدر کو اپنے جال میں پھانسا اور دوست بنا کر دانیہ کے گھر تک رسائی حاصل کی مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ عثمان نے اسے بالکل ٹھیک پہچانا تھا۔ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ ''کب تک سوگ مناؤ گے شہری، بھول جاؤ اُسے۔''

''بھول جاؤں گا ماں، بھول جاؤں گا۔'' اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

''میں نے پوچھا تھا حیدر کی بیوی سے، اس نے کسی سلمان شہزاد کا کہا ہے کہ تم اس کے ساتھ کام کرتے ہو اور اس کی شہرت ٹھیک نہیں۔'' ماں نے سادگی سے پوچھا۔

''بکواس کرتے ہیں ماں، سلمان بھائی کو ویسے ہی بدنام کیا ہوا ہے ان لوگوں نے۔'' اس نے غصے سے کہا۔

سلمان کے ساتھ وہ تین برس سے تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی وہ اس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد روزی روٹی کمانے کا ذریعہ دوست نے بتایا تو اس نے ہچکچائے بغیر ہامی بھر لی۔ وہ ایک طرح سے سلمان کا سیکریٹری تھا۔ اس کی ذہانت کی وجہ سے سلمان اسے پسند کرتا تھا۔

''تم سلمان سے کہو وہ ان سے بات کرے گا۔'' ماں نے کہا۔

''نہیں ماں، زبردستی نہیں کریں گے۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ خود بھی انہیں ڈرا دھمکا سکتا تھا مگر اسے دانیہ کا جسم نہیں محبت چاہیے تھی۔ ''شاید دانیہ میں تمہاری زندگی کا ایک مختصر کردار ہوں۔'' اس نے سوچا مگر قسمت میں شاید کچھ اور لکھا تھا۔

☆☆☆

اسما اور عثمان آخری پیپر دینے کے بعد کالج کے پاس ہی ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ ''شاید جدائی کا وقت آ گیا ہے۔'' اسما کے لہجے میں اداسی نے عثمان کو تڑپا دیا۔

''ایسے نہ کہو، ہم ملتے رہیں گے روز نہ سہی ہفتے میں ایک دو بار سہی۔''

''نہیں عثمان، ایسا ممکن نہیں، منیر بھائی نے ڈیڈ سے کہہ دیا ہے کہ اب جو بھی رشتہ آئے، اسے منظور کر لیں میرے لیے۔ پتا نہیں کس نے کان بھرے ہیں اُن کے۔'' وہ پریشان لہجے میں بولی۔

''ایسا کیوں کر رہے ہیں وہ؟''

''پتا نہیں یار، مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا، اب دیکھو میرے اور تمہارے تعلق کے بارے میں کوئی نہیں جانتا سوائے چند دوستوں کے یا پھر تمہارے گھر والوں کے۔'' اسما عثمان کے والد کی غیر موجودگی میں عثمان کے تمام گھر والوں سے مل چکی تھی۔ ''پھر بھی انہیں ہماری اکثر باتوں کا پتا ہوتا ہے۔'' دونوں کافی دیر باتیں کرتے رہے اور کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

وہ شام بڑی اداس تھی۔ عثمان دن بھر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ہانیہ کے گھر چلا گیا۔ حیدر گھر پر ہی موجود تھا۔ اس نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''کیوں آئے ہیں جناب عثمان صاحب۔'' اس کے لہجے میں طنز نے عثمان کے ذہن میں تپش پیدا کی مگر وہ خود پر قابو پا گیا۔

''اس دن کے لیے معذرت کرنے آیا ہوں حیدر بھائی جو بھی تھا مگر آپ کے مہمانوں کو یوں انکار کرنا مناسب نہیں تھا۔''

''ارے میرا بھائی آیا ہے۔'' ہانیہ اندر سے بھاگ کر نکلی اور اس سے لپٹ گئی۔ ''چلیں حیدر اب آپ بھی ملیں اس سے۔'' اس نے مان سے کہا تو حیدر نے مسکراتے ہوئے عثمان کو گلے لگا لیا۔ دونوں اندر بیٹھ گئے۔

''کیا بات ہے عثمان، کچھ اداس دکھائی دے رہے ہو۔'' ہانیہ نے چائے دیتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں بس وہ......'' عثمان نے بات اُدھوری چھوڑی۔

''کیا وہ؟''

''اسما کا مسئلہ ہے۔ اس کے گھر والے شادی کرنا چاہتے ہیں اس کی۔'' عثمان نے بتایا۔

''ہم......تم پہلے جانتے تھے عثمان کہ اس تعلق کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا پھر پریشانی کیسی؟'' حیدر نے نارمل لہجے میں کہا۔

''بس حیدر بھائی میں تو سمجھ جاؤں گا مگر وہ پاگل ہے۔''

''اسے بھی سمجھاؤ، میں جانتا ہوں اس کے بھائی اور باپ کو، شاطر لوگ ہیں وہ، ان سے بچ کے ہی رہنا۔'' حیدر نے بتایا۔

''بس اسی بات کی پریشانی ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اچھا ہانیہ میں چلتا ہوں گھر میں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ کھڑا ہوتے ہوئے کر بولا۔ حیدر اُسے باہر تک چھوڑنے آیا۔ کچھ دیر باہر دونوں باتیں کرتے رہے اور پھر گھروں کو لوٹ گئے۔

☆☆☆

''اب......تمہارا گنہگار تو اپنے انجام کو پہنچ گیا۔'' لڑکا اسے سامنے بٹھائے پوچھ رہا تھا۔ ''اور میرا خیال ہے اصل مجرم تو وہی تھا۔''

''نہیں......ابھی چار افراد باقی ہیں۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''چار لوگ......ہمم۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''چار افراد کون؟ دو تو اس کے ساتھی ہیں باقی دو کون ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کا باپ اور ایک وہ شخص جس نے بربادی کے بعد میرے زخموں پر نمک چھڑکا تھا۔'' اس کے لہجے میں چھپی آگ نے لڑکے کو جھلسا دیا۔

''وہ کون تھا؟''

''تھا کوئی ذلیل انسان۔''

''اب اگلا ٹارگٹ کون ہے؟''

''جبار......'' اس کے منہ سے نکلا۔

''جبار...... یہ تو ان کا خاص بندہ ہے، آسان شکار نہیں ہوگا۔''

''پہلا بھی آسان نہیں تھا جو یوں آسانی سے مارا گیا اور قسمت نے ساتھ دیا تو باقی بھی مشکل نہیں ہوں گے۔''

''چلو میں اس کی تفصیل حاصل کرتا ہوں۔'' اس نے موبائل نکالا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

لڑکی خاموش بیٹھی رہی۔ ہر شام کو وہ اس کے گھر دو تین گھنٹے کے لیے آتی تھی۔ پانچ منٹ بعد لڑکا واپس آیا۔

''جبار ہر ہفتے کی رات کسی لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس بار جگہ ویران نہیں، شہر کے درمیان فلیٹ ہے۔ اس کی بلڈنگ بھی کافی بڑی ہے۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

لڑکی نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اسے سمجھانے لگا۔

☆☆☆

سیاست دان کے بیٹے کے قتل نے ہنگامہ مچا دیا تھا۔ پولیس کی دوڑیں لگیں اور قاتلوں کی تلاش شروع ہوگئی۔ پتا چلا کہ اس رات ایک گاڑی سب سے آخر میں آئی تھی اور سب سے پہلے رخصت ہوئی۔ انسپکٹر قیصر نے تمام تفصیلات حاصل کیں۔ سیکیورٹی کیمرے سے لی گئی تصویریں دھند کی وجہ سے واضح نہ مل سکیں البتہ گاڑی کا نمبر واضح تھا جو جعلی نکلا اور گاڑی بھی چوری کی تھی۔ حقیقی معنوں میں یہ کیس ایک معما بن گیا۔ کوئی ایک شخص بھی لڑکی کا حلیہ درست نہ بتا سکا۔ چوکیدار نے جو حلیہ بتایا تھا، اس سے یہی اندازہ لگایا گیا کہ وہ خاص قسم کے گیٹ اَپ میں وہاں آئی تھی۔ انسپکٹر قیصر نے تفتیش کا دائرہ کار بڑھایا اور ایک ہفتے بعد گاڑی تک پہنچ گیا مگر فنگر پرنٹ حاصل نہ کرسکا۔ اس دن ایک ماتحت مقتول کی تفصیل بتا رہا تھا۔ ''عمر پچیس سال، کام آوارہ گردی اور غنڈا گردی، کئی لڑکیوں کے ریپ کیس میں ملوث اور ایک قتل کیس میں بھی نامزد رہا ہے۔''

''مطلب خس کم جہاں پاک۔'' قیصر بڑبڑایا۔ وہ ایمان دار اور فرض شناس پولیس والا تھا اس لیے افسران نے یہ کیس اس کے سپرد کیا تھا۔ ''تم ایسا کرو اس کے دشمنوں کی لسٹ بناؤ۔ جو زیادہ خطرناک دکھائی دیں، ان کو الگ کرو اور اس کے موبائل نمبر کا ریکارڈ حاصل کرو آج ہی۔'' اس نے ماتحت کو ہدایت کی اور خود کام میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

لفٹ میں سوار وہ دونوں اس بلڈنگ کی دوسری منزل کی جانب گامزن تھے۔ دونوں کے حلیے میں کافی تبدیلی تھی۔ لڑکی نے جدید فیشن کی جینز پہن رکھی تھی اور سر پر ایک بڑا سا ہیٹ اور آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ تھا جبکہ لڑکا پیزا بوائے کے روپ میں دکھائی دیا۔ دونوں کے ہاتھوں پر اسکن کلر کے باریک دستانے تھے جو زیادہ غور سے دیکھنے پر دکھائی دیتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بیگ بھی تھا۔ لفٹ رکتے ہی وہ اپنی منزل کی جانب بڑھے۔ یہ دو کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ کسی نے ان کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا اور یہی بات ان کے حق میں جاتی تھی۔ فلیٹ کے دروازے پر رک کر لڑکے نے بیل بجائی لڑکی البتہ اردگرد دیکھ رہی تھی۔ اندر سے کسی کی آواز سن کر لڑکے نے بلند آواز میں کہا۔ ''پیزا بوائے سر۔''

''مگر میں نے کوئی آرڈر نہیں کیا۔'' جبار کی آواز میں حیرانگی تھی۔

''آپ نے آرڈر نہیں کیا سر مگر یہ میڈم مجھے ساتھ لے آئی ہیں۔'' لڑکے جواب دیا۔

''کون میڈم؟'' جبار نے جیسے ہی دروازہ کھولا، وہ دونوں اندر گھس گئے۔

''یہ کیا؟'' وہ حیرانگی سے مڑا۔ لڑکی تب تک دروازہ بند کرچکی تھی جبکہ لڑکے کے ہاتھ میں پسٹل دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکے نے اشارہ کیا۔

''ہاتھ اٹھا کر اندر چل۔'' جبار چپ چاپ ہاتھ اٹھا کر اندر چلنے لگا۔ اچانک وہ پیچھے مڑا اور دونوں ہاتھوں سے لڑکے کو دھکا دیا۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی مگر وہ بھی مکمل پلاننگ سے آئے تھے۔ لڑکے کے گرتے ہی لڑکی حرکت میں آئی اس کے ہاتھ میں دبا چاقو جبار کی ران میں گھسا اور اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی۔ تب تک لڑکا خود کو سنبھال چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی جبار کے گھٹنے میں لگی اور وہ نیچے گر گیا۔ ''جلدی بتا اور کون ہے فلیٹ میں۔''

''ک ک کوئی نہیں۔'' وہ ہکلایا۔ لڑکی کے چہرے پر وہی جنون دکھائی دیا جو اس سے پہلے نیو ایئر نائٹ میں دکھائی دیا تھا۔ اس نے ران سے چاقو نکال کر جبار کے جسم کے نازک حصے میں گھسا دیا۔ جبار کی چیخیں پورے فلیٹ میں گونج رہی تھیں۔ لڑکا چپ چاپ بس پستول تانے کھڑا تھا۔ دوسرے وار میں جبار کی گردن کو نشانہ بنایا اور زندگی سے رہائی اسے ماتھے پر لگنے والی گولی نے دی۔

''جلدی نکلو۔ میرا خیال ہے اس کی ساتھی لڑکی آنے والی ہو گی۔'' لڑکے کی آواز سن کر لڑکی ہوش میں آئی۔ دونوں واش روم کی طرف بڑھے۔ لڑکے نے پیچھے لٹکایا ہوا بیگ اتارا، اس میں ان کے دوسرے کپڑے تھے۔ پندرہ منٹ بعد بلڈنگ سے سادہ کپڑوں میں ملبوس جوان جوڑا گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

''عثمان......'' اس کے لبوں سے سسکتی ہوئی آواز سن کر عثمان بے تاب ہو گیا۔ ''کیا ہوا اسما؟''

''وہ میری شادی کر رہے ہیں۔''

''کک کب۔'' عثمان کا دل دھڑکا۔

''ایک ماہ بعد...... عثمان مجھے لے چلو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اسما رو رہی تھی۔

''مگر اسما میں کیسے لے جاؤں؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''مجھے نہیں پتا عثمان پر میں نہیں رہ سکوں گی تم بن۔''

''اگر میں تمہارے بھائی سے بات کروں تو پھر؟'' اس نے پوچھا۔

''تو بھائی تمہارے ٹکڑے کر دیں گے۔''

''مجھے ڈر نہیں...... میں رشتہ لاؤں گا تمہارے گھر آج شام کو ہی......''

''ایسا مت کرنا عثمان، اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کی بھی عزت خراب کرو گے۔''

''پھر تم بتاؤ کیا حل ہے اس بات کا؟''

''تم مجھ سے ملنے آؤ کالج کے پاس ہی، ابھی۔'' اس نے کہا تو عثمان نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔'' عثمان نے کال بند کی۔ دوست سے بائک مانگ کر وہ گھر سے روانہ ہو گیا۔ اسما شاید ٹیکسی پر آئی تھی۔ دونوں بینچ پر آ بیٹھے۔

''اب بتاؤ، کیا کروں میں؟'' عثمان نے پوچھا۔ اسما بس چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ''کچھ بولو بھی اسما۔''

''مجھے لے چلو عثمان، اس شہر سے دور...... اپنے ساتھ جہاں کوئی بھی مجھے تم سے جدا نہ کر سکے۔'' محبت بھرے لہجے میں بولے گئے ان الفاظ نے عثمان کو جھنجوڑ دیا۔

''لے جاؤں گا، آج رات ہی۔'' اس نے اسما کی آنکھوں میں دیکھا۔

اسما کو اعتبار کرنا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے صرف عثمان تھا اور عثمان کی دنیا اسما تک محدود ہو چکی تھی۔ بوڑھے ماں باپ، بہنیں، معذور بھائی اور تمام ذمے داری وہ بھول چکا تھا۔ جوانی بہت بری چیز ہے، ارد گرد کا ہوش بھلا دیتی ہے۔ پارک سے باہر رکنے والی گاڑی میں بیٹھے اس شخص کی نظریں ان پر مرکوز ہوئیں۔

''یہ تو اسما ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ گاڑی سے اتر کر وہ ان کی جانب بڑھا۔ اسما کی نگاہوں نے جیسے ہی اسے دیکھا...... اس کے منہ سے نکلا۔

''منیر بھائی۔''

منیر تیزی سے ان کی جانب آیا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''وہ بس......'' اسما سے کوئی جواب نہ بن پایا۔

''چلو وہ سامنے گاڑی کھڑی ہے میری اس میں بیٹھو۔'' اسما چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جانے لگی۔ عثمان کھڑا ہو کر جانے لگا تو منیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تمہیں ابھی جانے کی اجازت نہیں دی میں نے۔'' اس کے لہجے میں چھپی آگ کی تپش عثمان نے محسوس کی۔

''مجھے کسی کی اجازت درکار نہیں۔'' وہ بزدل نہیں تھا۔ اس نے منیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

منیر نے گہری سانس لے کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو سختی سے بند کر دیا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے مگر اچانک اس کا زوردار مُکا عثمان کے منہ پر لگا اور اس نے عثمان کا گریبان پکڑ کر کہا۔

''آئندہ میری بہن سے دور رہنا۔'' عثمان کے منہ میں خون کا ذائقہ گھل گیا۔ منیر اس کا گریبان چھوڑ کر پیچھے مڑا۔

''منیر۔'' عثمان نے پکارا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مُکّے کا جواب زوردار تھپڑ سے آیا۔ ''دور کر سکتے ہو تو کر لینا۔'' یہ کہہ کر وہ لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

منیر گال پر ہاتھ رکھ کر دھیمے سے مسکرایا۔ ''تمہیں جواب ضرور ملے گا مائی ڈیئر عثمان۔'' اسما گاڑی میں بیٹھی عثمان کا جواب دیکھ کر خوشی کے ساتھ خوف زدہ تھی۔

☆☆☆

جبار کے قتل نے نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ جبار کی لاش دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسے کتنی بے رحمی سے مارا گیا ہے۔ شہر کی پولیس اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود صرف اتنا سراغ لگا سکی کہ قاتل جوڑا پیزا بوائے اور ماڈرن لڑکی کے روپ میں رات کو بلڈنگ میں داخل ہوا تھا۔ انسپکٹر قیصر نے بلڈنگ کے گیٹ پر لگے سیکیورٹی کیمرے کی فوٹیج حاصل کی

مگر یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ پورے ایک گھنٹے کی ریکارڈنگ غائب تھی یعنی قاتل اس کا انتظام کر کے آئے تھے۔ چوکیدار نے آنے والے پیزا بوائے اور ماڈرن لڑکی کا جو حلیہ بتایا، وہ نیو ایئر نائٹ میں قتل کرنے والے جوڑے سے ملتا جلتا تھا۔ اس وقت جبار کا ریکارڈ اس کے سامنے پڑا تھا۔ ''یہ دونوں مقتول کئی بُرے کاموں میں پارٹنر تھے...... یعنی اگلا نشانہ بھی وقار خان کی پارٹی کا کوئی بندہ ہوگا۔''

''سہیل......'' اس نے ماتحت کو آواز دی۔ ''پتا کرو...... جبار اور وقار خان کے بیٹے کے ساتھ ان کے کارناموں میں اور کون شریک ہوتا تھا۔''

''او کے سر۔'' سہیل نے جواب دیا۔

''اور سر یہ ہے دونوں کا ریکارڈ۔'' اس نے سامنے ریکارڈ رکھا۔ پولیس رپورٹ کے مطابق تقریباً چار مقدمات میں دونوں مقتول نامزد رہے تھے مگر ثبوت اور گواہوں کی کمی کی وجہ سے دونوں کو کبھی کوئی خاص سزا نہیں ملی البتہ جبار چھ ماہ کے لیے جیل کی سیر کر چکا تھا۔ قیصر نے تمام کیسز کا بغور مطالعہ کیا۔ ان میں سے کوئی بھی کیس خاص نہیں لگا۔ ایک کیس میں جبار، وقار خان، اس کا بیٹا اور جبار کا کزن رفیق نامزد تھے مگر جب قیصر نے مدعی کے حوالے سے تفصیل پڑھی تو یہ ایک غریب فیملی کا کیس نکلا جس نے بعد میں صلح کر لی تھی۔

''کون ہے یہ قاتل جوڑا جو اتنی پلاننگ سے وار کرتا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ایک سپاہی کو بلایا۔ ''سہیل سے جبار کے کزن رفیق کا پتا حاصل کرو اور اس کی اگلے کئی دن نگرانی کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔'' سپاہی سیلیوٹ مار کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

آغازِ سرما کی اس رات میں ہلکی ہلکی ہوا موسم کو خوشگوار بنا رہی تھی۔ علاقے کا ایم این اے اور اس کا بیٹا منیر باہر لان میں بے چینی سے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔

''میں نے منع کیا تھا بابا اسے باہر جانے کی اجازت مت دیا کریں۔'' منیر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''جوان اولاد کو گھر میں قید نہیں کیا جا سکتا منیر سمجھا کرو اس بات کو، آ جائے گی واپس۔'' انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔

''کب آئے گی واپس، شام چھ بجے نکلی تھی اور اب بارہ بج رہے ہیں۔'' منیر جھنجلایا۔ اسی وقت اقرا بیگم کی آمد ہوئی۔

''اسما کے .... کمرے سے اس کا سامان غائب ہے...... جیولری بھی اور تمام رقم بھی۔''

''کک کیا؟'' بابا کھڑے ہوئے۔ منیر بھاگتا ہوا اندر پہنچا۔ اسما کے کمرے میں کچھ نہیں تھا۔ وہ باہر آ کر بولا۔

''وہ کس کے ساتھ گئی ہے یہاں سے؟''

''پتا نہیں، اس کی کوئی دوست آئی تھی گاڑی میں...... تب سب مصروف تھے جب وہ دونوں نکلیں یہاں سے۔''

منیر ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے موبائل نکال کر کسی سے رابطہ کر چکا تھا۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں اسما کی تلاش پورے شہر میں جاری تھی مگر یوں لگتا جیسے وہ اس شہر میں ہے ہی نہیں۔ ہر جگہ اس کا پتا کیا گیا۔ کہیں سے کچھ سراغ نہ ملا۔ اس شام بابا اور اقرا بیگم منیر کو سمجھانے میں لگے ہوئے تھے مگر وہ بے قابو ہو رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں وہ کس کے ساتھ گئی ہے، زندہ نہیں چھوڑوں گا دونوں کو۔'' وہ باپ کے ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گیا۔

''یہ بات ابھی تک زیادہ پھیلی نہیں مگر یہ لڑکا ضرور کوئی ایسی حرکت کرے گا جس سے میرا سیاسی کیریئر خراب ہو۔'' وہ پریشانی سے بولے۔

''کچھ نہیں ہوگا، آپ پریشان نہ ہوں، میں اسے کال کر کے سمجھاتی ہوں۔'' اقرا بیگم اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن پر ایک کار آ کر رکی۔ اس میں سے نقاب پوش لڑکی نیچے اتری۔ یہ اسما تھی۔ اس نے پچھلی سیٹ پر رکھا اپنا بیگ اٹھایا۔ اس میں جیولری اور کچھ رقم تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی لڑکی سے کہا۔ ''شکریہ سعدیہ، میرے گھر والے تنگ کریں گے مگر امید ہے تم ثابت قدم رہو گی۔'' سعدیہ نے مسکرا کر ہاتھ ہلا دیا۔

عثمان بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں بغیر کچھ کہے ٹرین میں جا بیٹھے۔ ''سوچ لو عثمان اب بھی وقت ہے۔'' عثمان کے چہرے پر الجھن دیکھ کر اسما نے کہا۔

''نہیں اسما اب وقت نہیں بچا...... سب کو چھوڑ دیا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس نے افسردگی سے کہا۔ اسما نے اپنا سر اس کے کاندھے پر ٹکا دیا۔

''کراچی میں ہم کہاں رہیں گے؟''

''دوست ہے میرا وہاں، کچھ دن اُس کے پاس رہیں گے پھر نکاح کر لیں گے اور معاملہ ٹھنڈا پڑتے ہی واپس

آجائیں گے۔‘‘ عثمان نے بتایا۔

’’واپسی کا دروازہ کبھی نہیں کھلے گا ہم پر۔‘‘

’’کھل جائے گا کم از کم ساتھ مرتو جائیں گے۔‘‘ عثمان پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کے بولا۔ ’’اب مایوسی کی باتیں مت کرو‘‘ انہی باتوں کے درمیان ٹرین چل پڑی۔ کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر عثمان کا دوست انہیں لینے آیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ان کے گھروں پر کیا بیت رہی تھی، اس بات سے بے خبر دونوں اپنی نئی منزل کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

اسما کے گھر میں ہی نہیں، عثمان کے گھر میں بھی ہنگامہ جاری تھا۔ حیدر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ ’’میں جانتا تھا، یہ لڑکا کوئی نیا گل کھلائے گا، بھاگ گیا ہوگا اس بدکردار کے ساتھ۔‘‘

’’مجھے تو سمجھ نہیں آتی بھائی پر کیا جادو کیا ہے اس نے۔‘‘ ہانیہ بھی شوہر کی ہم خیال تھی۔ عثمان کی معذرت کے باوجود حیدر اپنے ذہن سے اس کی باتیں نہ نکال سکا اور آج اسے قدرت نے خوب موقع دیا تھا۔ ندیم اور عثمان کی ماں زینب نڈھال پڑے تھے۔ عثمان ان کے بڑھاپے کا سہارا جاچکا تھا۔ حیدر اس وقت پریشان لہجے میں بولا۔ ’’اس لڑکی کا بھائی منیر بہت خطرناک ہے، اللہ کرے اس کی نگاہ ہمارے اس گھر پر نہ پڑے، میں پتا کرتا ہوں اس کا قریبی دوست میرا جاننے والا ہے۔‘‘ حیدر اپنا سیل نکال کر باہر نکلا۔ گھر پر خوف اور ڈر کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ ان لمحات میں حیدر ہی واحد سہارا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد واپس آیا۔ ’’بہت مشکل حالات ہیں، اسما اور عثمان کی تلاش جگہ جگہ جاری ہے۔ لگتا یہی ہے اگر وہ مل گئے تو دونوں کو ماردیں گے۔‘‘

’’اللہ نہ کرے حیدر بھائی۔‘‘ کافی دیر سے چپ بیٹھی دانیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ابھی وہ لوگ یہی باتیں کررہے تھے کہ دروازے پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ حیدر نے باہر جھانکا...... اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ’’منیر اور اس کے ساتھی۔‘‘ یہ کہتے ہی وہ پلٹا۔ وہ چار لوگ تھے۔ انہوں نے دھکا مار کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئے۔

’’کہاں ہیں وہ دونوں......‘‘ منیر سیدھا حیدر کی طرف آیا۔

’’ہم میں سے کوئی نہیں جانتا منیر صاحب۔‘‘ وہ عاجزی سے بولا۔

’’مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے...... کہاں ہیں وہ دونوں؟‘‘ وہ غصے سے پاگل ہورہا تھا۔ اچانک اس نے حیدر کو زور سے دھکا دیا۔ ’’میں پوچھ رہا ہوں کہاں ہے وہ کتا؟‘‘ وہ چلایا۔

حیدر سنبھل کر اٹھا مگر تب تک وہ لوگ اندر داخل ہوچکے تھے۔ منیر کے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر ندیم کو زور سے تھپڑ مارا۔

’’کہاں ہے تیرا وہ بیٹا۔‘‘ ہانیہ اور دانیہ کی چیخوں سے گھر گونج رہا تھا۔ زینب دوڑتی ہوئی منیر کے پیروں پر گرگئی۔

’’خدا کے لیے ہمیں معاف کردو، ہم نہیں جانتے وہ کہاں ہیں۔‘‘ منیر کے پیر کی ٹھوکر نے اسے دور پھینکا۔ اگلے کچھ لمحات اس گھر پر بھاری تھے۔ محلہ ان کی چیخیں سننے کے باوجود مدد کو نہ آیا۔ ندیم صاحب نے کمزور سی مزاحمت کی مگر وہ ان بدمعاشوں کا سامنا نہ کرسکے اور تھک کر گر گئے۔ گھر میں شاید ہی کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ سے بچی ہو۔ اچانک حیدر آگے بڑھا اور اس نے منیر کے ایک ساتھی کو بازو سے پکڑ کر سائڈ پر لے گیا۔ یہ اس کو جانتا تھا۔ اس نے کان میں کچھ کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ منیر کو بلا لایا۔

’’کیا تم جو بات کررہے ہو، اس پر عمل بھی کروگے؟‘‘ منیر نے اسے گھورا۔

’’جی جناب میں قسم کھاتا ہوں ضرور کروں گا پر ابھی آپ لوگ جاؤ یہاں سے۔‘‘

’’ہم جارہے ہیں مگر یاد رکھنا...... خون کا بدلہ خون اور بہن کا بدلہ بہن۔‘‘ منیر کا لہجہ شیطانی تھا۔

’’جج جی سمجھ گیا...... میں کل شام آجاؤں گا آپ کے پاس۔‘‘ منیر نے سب کو اشارہ کیا۔ جتنی تیزی سے وہ لوگ آئے تھے، اتنی ہی تیزی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد گھر سے دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔

☆☆☆

’’رفیق کی نگرانی پولیس کا بندہ کررہا ہے اور وقار خان کی سیکیورٹی بھی سخت ہے۔‘‘

قاتل جوڑا اپنی پچھلی کامیاب واردات کے ٹھیک دو ہفتے بعد اسی مکان میں بیٹھا اگلے شکار کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔

’’تو کیا خیال ہے اسے نہ نشانہ بنایا جائے جس نے آخر میں تمہیں نشانہ بنایا تھا۔‘‘ لڑکے نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

’’نہیں......‘‘ اس نے سختی سے انکار میں سر ہلایا۔ ’’وہ

سب سے آخر میں شکار بنے گا ہمارا، ابھی رفیق کی باری ہے اور ہاں رفیق کو جلدی نہیں مارنا، اس سے حساب بچتا ہے ابھی میرا۔'' لڑکی کے چہرے پر وہی درندگی دکھائی دی جو اسے ہر چیز کا ہوش بھلا دیتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ؟'' لڑکے نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''پوچھو۔''

''کبھی سوچا ہے اپنے مستقبل کے بارے میں؟''

''نہیں...... میں جس رستے پر چل رہی ہوں، اس کی منزل موت ہے اور میں نے تمہیں پہلے کہا تھا، میں موت کی تلاش میں ہوں۔ تم نے ہی یہ رستہ دکھایا ہے۔ چاہو تو تم اپنا راستہ تبدیل کرلو۔'' وہ بالکل نارمل انداز سے بات کر رہی تھی۔ لڑکا حیرانگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حالات انسان کو ایسے ہی بدل دیتے ہیں۔ کل تک معصوم سی بے ضرر لڑکی آج ایک خطرناک قاتل کے روپ میں تھی۔

''اب بھی کہو گی کہ ہماری منزلیں جدا جدا ہیں۔'' لڑکے نے عجیب لہجے میں سوال کیا۔ لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے لڑکی کے چہرے پر شرم کی سرخی نمودار ہوئی۔ وہ اٹھ کر لڑکے کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ لڑکے نے پتا نہیں کس جذبے کے تحت اس کا ہاتھ پکڑا اور گلے سے لگا لیا۔ اس کے سینے میں منہ چھپا کر وہ سسک کر بولی۔

''میں تمہارے قابل نہیں رہی......''

''کس نے کہا یہ؟'' اس نے تیز سانسوں کے درمیان پوچھا۔ اس کے لبوں نے لڑکی کے ماتھے کو چھوا۔ ''تم ویسی کی ویسی ہو۔'' اس کے ہونٹ مزید سفر کر رہے تھے مگر لڑکی جھجکی اور اس سے الگ ہوگئی۔

''میں کل آؤں گی پھر۔'' وہ تیز تیز قدموں سے باہر کی جانب چل دی۔ لڑکا گہری سانس لے کر سوچوں میں گم ہوگیا۔

☆☆☆

رفیق اس شخص کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ یہ پولیس والا ہے مگر اسے ڈر محسوس نہیں ہوا کیونکہ وقار خان نے اس جیسے کئی غنڈے پال رکھے تھے۔ جبار کی موت کے بعد سب احتیاط کر رہے تھے۔ قاتل جوڑے کی دہشت سب کے دلوں میں تھی۔ یہ پولیس والا کافی دن سے اس کے تعاقب میں تھا۔

اس شام رفیق اپنے گھر میں داخل ہوا تو اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ اس کی بیوی گھر میں نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ بیڈ پر پڑے کاغذ کے ایک ٹکڑے نے اس کی توجہ حاصل کی۔ ''رفیق تمہاری جان کو خطرہ ہے، گھر سے نکلو اور اس پولیس والے سے جان چھڑا کر بس اسٹاپ تک آجاؤ۔'' خط کے آخر میں ''تمہارا ہمدرد'' لکھا ہوا تھا۔ یہ پڑھتے ہی رفیق کے اعصاب تن گئے۔ اس نے دراز سے اپنا پستل نکالا اور اسے نیفے میں اُڑس کر باہر آگیا۔ پیغام دینے والے نے اگرچہ اپنا نام نہیں لکھا تھا مگر رفیق جانتا تھا یہ وقار خان کی پارٹی میں سے کوئی اس کا ہمدرد ہوگا۔

بائیک نکال کر اس نے گلی کا چکر کاٹا اور پولیس والے کو دھوکا دینے کے لیے شہر کی گلیوں میں چکر لگانے لگا۔ دو چکر کاٹ کر وہ مسجد کے پاس سے گھوم گیا اور تیز رفتاری سے واپس اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بائیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ پندرہ منٹ بعد اس نے بائیک اسٹاپ پر روکی تو پاس ہی ایک اور موٹر سائیکل سوار آگیا۔ اس نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔

''رفیق...... اپنی بائیک یہی کھڑی کر کے لاک کر دو اور میرے ساتھ آؤ، تمہارا ہمدرد۔'' رفیق نے ہر ممکن تیزی سے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور جلدی سے اس کے پیچھے سوار ہوگیا۔ بائیک آگے بڑھا کر سوار بولا۔ ''وقار خان صاحب نے بلایا ہے، کچھ مسائل کی وجہ سے وہ خود رابطہ نہیں کر سکے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ تیز رفتاری سے شہر سے باہر جانے لگے۔ تقریباً بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا۔ یہ کسی گاؤں سے کچھ دور ایک ویران سی جگہ تھی۔ مین روڈ سے ہٹ کر کچی سڑک پر دونوں پیدل چلنے لگے۔

''خان صاحب اتنی دور کیوں آئے ہیں؟'' رفیق نے پوچھا۔

''کوئی کام ہے زمینوں پر۔'' سوار جس نے ابھی تک ہیلمٹ نہیں اتارا تھا، مدھم آواز میں بولا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک ٹیوب ویل کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔

رفیق نے اردگرد دیکھا۔ ٹیوب ویل کے ساتھ بنے ایک کمرے سے لڑکی برآمد ہوئی۔ رفیق اسے دیکھ کر چونک گیا۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا مگر دیر ہو چکی تھی۔ ہیلمٹ والے کے ہاتھ میں پستل دکھائی دیا۔

''خبردار رفیق، حرکت مت کرنا۔'' وہ پھنکارا۔ لڑکی کے

ہاتھ میں رسی تھی۔ اس نے پسٹل لڑکے سے لے کر اسے رسی پکڑا دی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد رفیق ٹیوب ویل کے ساتھ بنے کمرے میں بے بس بندھا پڑا تھا۔

''کیا خیال ہے رفیق، منہ پر تھپڑ کیسے مارتے ہیں، میں تم سے سیکھنا چاہتی ہوں۔'' رفیق کو ایسے لگا جیسے وہ اس پر ہنس رہی ہو۔ لڑکی نے لڑکے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''چاقو مجھے دو اور تم باہر جاؤ۔'' لڑکا چپ چاپ اس کی ہدایت پر عمل کر کے باہر چلا گیا۔ رفیق کے منہ میں کپڑا تھا، وہ بس ''غوں غوں'' کر رہا تھا مگر لڑکی جیسے ہر چیز سے بے خبر تھی۔ اس کا ہاتھ گھوما اور چاقو گہرا کٹ لگاتا ہوا رفیق کے چہرے پر خونی دھار ڈال گیا۔ وہ تڑپا۔ دوسری بار وار بائیں جانب لگا اور اس کے بعد لڑکی پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ اگلے کچھ لمحات رفیق پر بھاری تھے۔ چہرے پر لگنے والے چاقو کے زخم اسے بے حال کر رہے تھے۔ اچانک اسے لگا جیسے رفیق اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس نے رفیق کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ دبی دبی آواز اور سسکیوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔

''قاتل...... ساتھی بھائی۔'' لیکن اچانک لڑکا اندر آ گیا اور اس نے پسٹل نکال کر رفیق کو تمام تکلیفوں سے آزادی دے دی۔

''یہ کیا کہنا چاہتا تھا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''پتا نہیں کچھ عجیب سا بول رہا تھا۔'' وہ یہی کہہ کر باہر آ گیا۔ قاتل جوڑا کامیاب واردات کے بعد واپس چل دیا۔ بائک پر سوار ہو کر لڑکی نے راستے میں پوچھا۔

''میں نفسیاتی مریض تو نہیں لگتی تمہیں؟''

''نہیں، جن کے ساتھ تم یہ کر رہی ہو، وہ اسی سلوک کے مستحق ہیں۔'' لڑکے نے نارمل انداز میں کہہ کر اسپیڈ بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ٹھکانے پر واپس جا رہے تھے۔

☆☆☆

اندھیری رات کے بعد آنے والی صبح روشن ہوتی ہے مگر وہ صبح بھی تاریک تھی۔ ندیم کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اسپتال میں داخل تھے۔ بڑی مشکل سے ان کی جان بچائی گئی۔ دانیہ اور فرحان گھر پر تھے جبکہ باقی سب اسپتال گئے تھے۔ دوپہر کے وقت حیدر چلا آیا۔ دانیہ نے بے قراری سے پوچھا۔ ''ابو کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اب بہتر ہیں...... دانیہ تم میری ایک بات مانو گی؟'' حیدر نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''جی۔''

''منیر نے شرط رکھی ہے کہ عثمان کی کوئی بہن آ کر اس سے معافی مانگے تو وہ انہیں کچھ نہیں کہے گا۔'' اس نے نظریں چرائیں۔

''تو؟''

''میرے ساتھ چلو ہم اس سے معافی مانگ آتے ہیں۔'' نجانے کیوں حیدر اس سے نگاہیں نہیں ملا رہا تھا۔

''پکا، وہ سب کو معاف کر دے گا ناں؟'' دانیہ نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں کر دے گا سب کو معاف۔'' اس نے جواب دیا۔ کچھ دیر بعد دانیہ فرحان کو گھر چھوڑ کر حیدر کے ساتھ جا رہی تھی۔

شہر سے دور اس فارم ہاؤس میں منیر بڑے ٹھاٹ سے اپنے بیڈروم میں بیٹھا تھا۔ دانیہ اور حیدر صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''اچھا لگا مجھے، تم اپنی بات کے پکے نکلے۔'' اس نے حیدر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی جناب، اب کیا حکم ہے؟'' وہ خوشامد سے بولا۔

''تم جاؤ اور دو دن بعد لے جانا اِسے۔'' منیر نے حکم دیا۔ دانیہ حیران ہوئی۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گی حیدر بھائی ہم معافی مانگنے آئے تھے، لیں ہاتھ جوڑ دیتی ہوں ہمیں معاف کر دیں منیر صاحب۔'' منیر اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔

''اتنی آسانی سے معافی نہیں ملتی بے بی۔'' اس نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم جاؤ حیدر۔'' اس نے حیدر کی طرف دیکھا۔

حیدر چپ چاپ باہر چلا گیا۔ دانیہ اٹھ کر اس کے پیچھے جانے لگی تھی کہ منیر نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

''نہ نہ، اتنی بھی کیا جلدی ہے آرام سے معافی دوں گا تمہیں؟'' اس نے دانیہ کو بازو سے پکڑ کر اسے پیچھے دھکا دیا۔ وہ چلائی مگر یہاں چیخیں سننے والا... کوئی نہیں تھا۔

''عثمان کی سزا تم بھگتو گی، آئندہ کوئی بھی کسی لڑکی کو بھگانے سے پہلے سوچے گا ضرور۔'' وہ دانیہ پر حاوی ہو چکا تھا۔ دانیہ کی چیخیں اس فارم ہاؤس میں گونج رہی تھیں......

☆☆☆

عثمان اور اسما عثمان کے دوست ظہیر کے پاس بیٹھے آئندہ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ''میرا خیال ہے ہمارا واپس جانا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔'' اسما نے کہا۔

''مگر اب کوئی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے تم بیوی ہو میری۔'' عثمان جھنجلایا۔

''عثمان! منیر بھائی اور بابا یہ شادی کبھی قبول نہیں کریں گے، وہاں میری اور تمہاری جان کو خطرہ ہے۔'' اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''اسما میری فیملی ہے وہاں، ماں باپ بہن بھائی، ان کا سہارا صرف میں ہوں۔'' عثمان بے بسی سے بولا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا عثمان کہ ہم کشتیاں جلا کر نکلے ہیں اور تمہیں اب فکر کیوں ہو رہی ہے؟''

''پتا نہیں کیوں اسما میرا دل گھبرا رہا ہے وہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں شاید۔'' اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''موبائل آن کرو اپنا۔'' اسما نے اس سے کہا۔ دونوں کے سیل پورے ہفتے سے بند تھے۔ ظہیر اندر سے ان کا بیگ اٹھا لایا۔ اسما نے عثمان کا موبائل نکال کر آن کیا۔

''حیدر کا نمبر ملاؤ۔'' عثمان نے کہا۔ اسما نے نمبر ملا کر اسے سیل دیا۔ ''ہیلو حیدر بھائی۔'' حیدر کی آواز سن کر عثمان جلدی سے بولا۔

''کیوں کال کی ہے تم نے، سب کچھ اجاڑ دیا یہاں...... اب کیوں کال کی؟'' حیدر کی چلّاتی ہوئی آواز سن کر لمحہ بھر کے لیے وہ سن ہو گیا۔

''ک ک کیا ہوا؟''

''ندیم انکل نہیں رہے ہم میں...... مر گئے ہیں وہ...... تم نے مارا ہے انہیں، تم قاتل ہو عثمان۔'' حیدر کی بات سن کر عثمان کے منہ نکلا۔

''ابو'' سیل اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ''ابو، ابو'' وہ چلّاتے ہوئے باہر دوڑا۔ ظہیر نے بمشکل اسے قابو کیا۔ اسما جلدی سے پانی لے آئی۔ وہ روتے ہوئے بار بار ''ابو، ابو'' پکار رہا تھا۔ ''ظہیر گاڑی نکالو مجھے واپس جانا ہے۔'' کچھ دیر بعد اٹھ کر وہ اندر آ گیا۔ اسما بوجھل دل کے ساتھ اس کا اور اپنا سامان اٹھا لائی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اسی شہر جا رہے تھے جہاں سے نئی منزل کی جانب روانہ ہوئے تھے۔

☆☆☆

''اب بس کر دو منیر۔'' اس شام اس کے بابا فارم ہاؤس پر آئے تھے۔

''کیا بس کر دوں؟ اسما واپس آ گئی؟'' وہ نارمل انداز میں بولا۔

''ہاں آ گئی واپس، اب اس کی بہن کو جانے دو۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''تو مار کیوں نہیں دیا اس بے شرم کو؟'' منیر غصے میں آ گیا۔

''میں نہیں مار سکتا اُسے، نادان بچی ہے میری۔'' وہ بے بسی سے بولے۔ بیڈروم سے دانیہ چلّاتی ہوئی باہر نکلی۔

''انکل پلیز مجھے گھر جانا ہے، مجھے جانے دیں۔'' وہ ان کے پیروں پر گر گئی۔ نجانے کیوں انہیں اس پر ترس نہیں آیا۔ انہوں نے باہر کسی کو آواز دی۔ ملازم حاضر ہوا۔

''اسے لے جاؤ۔'' ملازم اسے باہر لے جانے لگا۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ ابھی اس پر گزرنے والی قیامت کا وقت پورا نہیں ہوا تھا۔ باہر دو افراد موجود تھے۔ یہ منیر کے دوست تھے۔ وہ اسے پکڑ کر ملازموں کے کوارٹر کی طرف لے گئے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر ایک نے آگے بڑھ کر اسے زور سے تھپڑ مارا۔ یہ وہی تھا جو منیر کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔ اسی نے سب سے پہلے اس کے باپ ندیم کو تھپڑ مارا تھا۔ ایک اور شام ان کی درندگی کی نذر ہو گئی۔ دانیہ برباد ہو کر واپس منیر کے بیڈروم میں آ گئی۔ اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا۔ چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔ درندوں نے اسے بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ بابا اندر داخل ہوئے۔

''چلو آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں۔'' وہ نرمی سے بولے۔ دانیہ عجیب سی نظروں سے گھورتی ہوئی ان کے ساتھ چل پڑی۔ وہ واپس جا رہی تھی اپنے گھر، جہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ ایک عزت دار لڑکی تھی۔

☆☆☆

اسما کو اس کی خواہش پر گھر چھوڑ کر عثمان اور ظہیر جب اس کے گھر پہنچے تو وہاں چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ زینب اور دانیہ بلند آواز سے رو رہی تھیں۔ عثمان کو دیکھتے ہی زینب دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ ندیم صاحب کو دفنا دیا گیا تھا۔ عثمان ماں کو لپٹائے باپ کے کمرے میں داخل ہوا۔ طوفان گزر چکا تھا مگر اس کا دل دھاڑیں مار کے رونے کو کر رہا تھا۔ فرحان اپنے بھائی کے چہرے پر ہاتھ لگا رہا تھا۔

''آ گئے تم؟'' حیدر کمرے میں داخل ہوا۔ عثمان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ''برباد کر دیا تم نے، سب کچھ برباد کر دیا۔'' حیدر کے لہجے میں دکھ تھا۔ کچھ دیر بعد عثمان سنبھلا تو ماں کو چپ کروایا۔ وہ سب اس کے اپنے تھے۔ اس کا گناہ معاف کر چکے تھے مگر امتحان اور بھی تھے۔

''دانیہ کہاں ہے حیدر بھائی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ......'' حیدر چپ کر گیا۔

''مجھے بتائیں حیدر بھائی دانیہ کہاں ہے؟'' وہ اٹھ کر دانیہ اور فرحان کے کمرے کی جانب بڑھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''دانیہ یہاں نہیں ہے عثمان۔'' حیدر تھکے لہجے میں بولا۔

''کہاں ہے میری بیٹی' میں بھی کل سے پوچھ رہی ہوں تم کچھ بتا کیوں نہیں رہے حیدر؟'' زینب نے پوچھا۔

''اسے منیر کے لوگ لے گئے۔'' حیدر نے دھماکا کیا۔

''کیا......؟'' سب کے منہ کھل گئے۔ ''دانیہ کل سے ان لوگوں کے پاس ہے اور آپ ہمیں اب بتا رہے ہیں؟'' عثمان چیخا۔

''چیخو مت عثمان...... مجھے بھی خود آج پتا چلا ہے۔'' حیدر کے چہرے پر آنے والے تاثرات نے اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیا۔

''میری بہن......'' عثمان باہر کی جانب دوڑا۔ ٹھیک اسی وقت باہر گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے کسی نے دانیہ کو دھکا دے کر باہر پھینکا اور گاڑی بھگا لے گیا۔ عثمان نے آگے بڑھ کر دانیہ کو سنبھالا۔ اس کے چہرے پر لگنے والے زخم اور اس کا حلیہ گزر جانے والے دن کا حال سنا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ عثمان سے لپٹ کر گھر میں داخل ہوئی۔ سب لوگ چپ تھے۔ کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ یہ بڑے لوگوں کا بھیانک انتقام تھا جس کا نشانہ ایک بے قصور بنی تھی۔

☆☆☆

''وقار خان صاحب آئے ہیں۔'' قیصر کو اس کے ماتحت نے اطلاع دی۔ ابھی وہ واپس مڑا ہی تھا کہ وقار خان اندر داخل ہوا۔ وقار خان لمبے قد اور مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ اس کی شخصیت رعب دار تھی۔ پچاس سال کی عمر میں بھی چال ڈھال میں چستی دکھائی دیتی تھی۔ قیصر سے ہاتھ ملانے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''انسپکٹر صاحب کہاں تک پہنچی آپ کی تفتیش...... ویسے امید ہے مجھے مجرم تب تک پکڑیں جائیں گے جب اپنے بیٹے کی طرح میں بھی کہیں خون میں ڈوبا پڑا ہوں گا۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

''خان صاحب ہم سراغ لگا رہے ہیں مجرموں کا۔ کچھ غلطی آپ کے لوگوں نے بھی کی، رفیق کی نگرانی کے لیے پولیس والا اس کے پیچھے تھا مگر نجانے کیوں وہ خود اس سے پیچھا چھڑا کر موت کی طرف چل دیا۔'' قیصر نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

''جب آپ کو پتا تھا اُن دو کا اگلا ٹارگٹ رفیق ہے تو آپ نے اس کو مکمل تحفظ کیوں نہیں دیا؟'' وقار کے لہجے میں غصہ تھا۔

''ہمیں بھی بس شک تھا وقار صاحب اور نگرانی جاری تھی لیکن رفیق کی اپنی غلطی سے جان گئی ہے۔'' قیصر کو اس کا لہجہ بالکل پسند نہیں آیا مگر وہ برداشت کر گیا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں ان کا اگلا نشانہ کون ہے؟'' وہ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ......'' وقار کا رنگ بدل گیا۔

''کیسے اور کیوں، وجہ بتائیں۔''

''ٹھوس تو نہیں مگر یہ دیکھیں۔'' قیصر نے اس کے سامنے ایک کیس کی تفصیل رکھی۔ ''آپ اور آپ کا بیٹا اس کیس میں نامزد تھے جبکہ رفیق اور جبار دونوں اس کیس میں ملوث تھے۔''

''مطلب تین افراد مارے جا چکے ہیں اب چوتھے کی باری ہے اور ہماری پولیس چپ چاپ بیٹھی تماشا دیکھ رہی ہے۔''

''جی نہیں وقار صاحب...... ہم ہرگز چپ چاپ نہیں بیٹھے...... ان کے خاکے بنوائے جا چکے ہیں مگر افسوس تینوں وارداتوں میں انہوں نے مختلف حلیے اپنائیں اور جس کیس کے نامزد لوگ نشانہ بن رہے ہیں، ان کے مدعی کی تفصیل بھی حاصل کر لی ہے مگر تا حال وہ شک سے باہر ہیں، فنگر پرنٹ تک نہیں چھوڑے انہوں نے۔'' قیصر نے تفصیل بتائی اور پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق تینوں افراد کو مارنے کے لیے مختلف پسٹل استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تینوں مقتول کے پاس چاقو موجود تھا۔''

''مجھے یہ سب نہیں سننا انسپکٹر صاحب... میں نے اپنی سیکیورٹی کے لیے پرائیویٹ ایجنسی کی مدد لے رکھی ہے امید ہے وہ ہماری پولیس کی طرح ناکام نہیں ہوگی۔'' وقار یہ کہتے ہوئے باہر کی جانب چل دیا۔ قیصر نے منہ بنایا۔

''انہیں لگتا ہے ہم نکمے ہیں، اپنے کرتوت نہیں پتا۔'' اس نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

☆☆☆

''عثمان صاحب ہم نے میڈیکل رپورٹ حاصل کر لی اور مقدمہ بھی درج کر لیا ہے آپ کے کہنے پر مگر کیس میں کوئی طاقت نہیں، آپ کی بہن خود چل کر اُن کے پاس گئی تھی۔'' سب انسپکٹر کے لہجے سے یہ بات سن کر عثمان کو آگ لگ گئی۔

''ہمارے ملک میں انصاف حاصل کرنا مشکل کام ہے سر مگر میں حاصل کر کے رہوں گا، میں میڈیا تک پہنچ گیا تو

ان کا پول کھل جائے گا۔"

"آپ جائیں عثمان صاحب آپ کو کس نے روکا ہے مگر اس میں بھی آپ ہی کی بدنامی ہے۔ میرا مشورہ مانیں اس مسئلے کو یہیں ختم کر دیں اور ان سے صلح کر لیں۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔

"ان باتوں کے لیے آپ نے کتنے پیسے لیے ہیں اس منیر سے۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو۔" سب انسپکٹر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"میں سنبھال کر ہی بات کر رہا ہوں اور اب روک سکتے ہو تو روک لو میں میڈیا تک جاؤں گا۔" عثمان اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔

"ہیلو سر، یہ لڑکا خطرناک لگ رہا ہے میڈیا تک چلا گیا تو میڈیا کیس اچھالے گا۔" اس کے باہر جاتے ہی سب انسپکٹر نے منیر کا نمبر ملایا۔

"تم فکر مت کرو، یہ اب جہنم میں جائے گا۔" دوسری طرف سے منیر کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

عثمان کالج کے پاس اسی پارک میں بیٹھا اپنی سوچوں میں گم تھا جہاں کبھی اس کی اور اسما کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ رات کی سیاہی دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ منیر کی گاڑی پارک میں آ کر رکی۔

"بہت سوچا تھا عثمان، بہت سوچا تھا مگر تمہاری موت کے علاوہ اسما اور تمہیں جدا کرنا ناممکن ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ اپنا سیل اٹھا کر اس نے نمبر ملایا۔ "بابا، سلمان شہزاد کے پاس کوئی لڑکا ہے جو ہمارا کام کر سکے؟"

"تم اس سے خود رابطہ کرلو۔" عثمان کو مارنے کا فیصلہ وہ کر چکے تھے۔ منیر نے کال کاٹ کر سلمان شہزاد کا نمبر ملایا اور عثمان کے قتل کا حکم دے ڈالا۔

ان تمام باتوں سے بے خبر عثمان اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر میں عجیب طرح کی خاموشی تھی۔ کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ہیلمٹ پہنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی چلائی گئی دونوں گولیاں عثمان کے سر میں لگیں۔ ایک تاریک رات مرحوم ندیم کے گھرانے کا مستقبل چھین کر اپنے اختتام کے سفر پر چل پڑی۔

وقت کا کام گزرنا ہے اور وہ گزرتا چلا جاتا ہے۔ عثمان کے قاتل کے خانے میں بھی نام کے بجائے نامعلوم لکھا گیا۔ حیدر نے دانیہ کا کیس بھی صلح کر کے ختم کروا دیا۔ عثمان کے قتل کے ٹھیک ایک ماہ بعد منیر اور اس کا باپ عثمان کے گھر آئے۔ حیدر نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا۔ زینب چپ چاپ ان کے پاس جا بیٹھی۔

"ہمیں افسوس ہے ماضی میں جو کچھ ہوا۔" بابا بولے۔

افسوس، ندیم اور عثمان کی موت...... دانیہ کی عزت کے قاتل...... ان کے افسوس کرنے پر زینب کے دل میں درد ہوا مگر بے بس لوگ ایسے کئی درد چھپا جاتے ہیں۔

"ہم ایسا ہرگز نہیں چاہتے تھے مگر حالات بگڑتے چلے گئے، کچھ بچوں کی نادانی اور کچھ قسمت کی خرابی، خیر ہمیں خبر ہوئی ہے کہ آپ کو کچھ مالی پریشانیاں ہیں، اب ہمارے اوپر کیس ختم ہو چکے ہیں اس لیے ہم آپ کی کچھ مدد کر سکتے ہیں۔" اس نے منیر کو اشارہ کیا۔ اس نے چپ چاپ ایک چیک نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ پچاس لاکھ، اس گھرانے کی بربادی کی قیمت صرف پچاس لاکھ۔ چائے پینے کا احسان کر کے وہ باہر چل دیے۔ دانیہ دروازے پر کھڑی تھی۔ منیر نے اس کی طرف دیکھا اور ایک ہوائی بوسہ اچھال کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ حیدر کو عجیب سی لگی۔

پچاس لاکھ کافی بڑی رقم تھی۔ حیدر نے ندیم کی دکان بیچ دی اور ٹوٹل رقم ملا کر مین مارکیٹ میں دکانیں خرید لیں۔ اب اس گھر میں مالی پریشانی نہیں تھی۔ اس دن حیدر گھر آیا۔ فرحان اور زینب ہانیہ کے گھر تھے۔ دانیہ نہا کر باہر نکلی۔ وہ نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ حیدر نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

"آئیں بھائی بیٹھیں۔" دانیہ نے بال سمیٹے۔ اس کی گوری رنگت اور چہرے کے پیارے نقوش کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتے تھے۔ حیدر بیٹھ گیا۔

"دکانوں کا حساب لے آیا ہوں۔" حیدر نے رجسٹر اس کے پاس رکھا۔ دانیہ پاس ہی بیٹھ کر تفصیل دیکھنے لگی۔ اس نے مڈل پاس کیا تھا۔ اچانک حیدر نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ چونکی۔ حیدر کے لمس میں گرمجوشی محسوس ہوئی۔

"کک کیا بات ہے حیدر بھائی؟"

"بھائی نہیں ہوں تمہارا۔" حیدر نے کہہ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

دانیہ چیخی۔ ''حیدر بھائی یہ کیا کر رہے ہیں آپ......''

''چل زیادہ نخرے مت دکھا، بڑی آئی عزت دار، منیر کو مزے دے سکتی ہے تو مجھے کیوں نہیں؟'' دانیہ جانتی تھی اب چیخیں بے کار جائیں گی...... رشتے کے تقدس بھلا دینے والے حیدر کے سامنے مزاحمت بے کار گئی۔ طوفان گزر گیا۔ وہ بیڈ پر لیٹا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ دانیہ چپکے سے اٹھی اور کچن میں آگئی۔ کچھ دیر بعد حیدر اس کے پاس آیا۔

''اب میں چلتا ہوں۔'' لہجے میں شرمندگی نہ اپنے کیے کا افسوس......

''حیدر کچھ تو سزا بنتی ہے۔'' دانیہ نے سوچا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں موجود چھری حیدر کے بائیں کندھے میں انگارے بھر گئی۔ اس کے بعد دانیہ پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے حیدر کی دونوں ٹانگوں کا نشانہ بنا کر اسے شدید زخمی کر دیا تھا۔

اسپتال میں لیٹے حیدر نے یہی بیان دیا کہ کچھ نامعلوم لوگوں نے اس سے پیسے چھیننے کی کوشش میں زخمی کر دیا ہے۔ ہانیہ اور زینب نامعلوم لوگوں کو بددعائیں دے رہی تھیں اور دانیہ مسکرا رہی تھی۔ عجیب مسکراہٹ......

☆☆☆

''وقار خان کی سیکیورٹی بہت سخت ہے اس تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔'' لڑکا، لڑکی کے پاس بیٹھا بتا رہا تھا۔ ''ایسا کرتے ہیں جو تم پانچویں شکار کی بات کر رہی ہو اُسے پہلے ختم کر دیتے ہیں۔''

''نہیں پہلے وقار خان ہی نشانہ بنے گا، سب سے آخر میں اُسے بنائیں گے۔'' لڑکی نے سختی سے انکار کیا۔

''میں دو سال سے تمہارے ساتھ ہوں تمہیں اتنا کچھ سکھایا ہے اور تم مجھ سے باتیں چھپاتی ہو۔'' لڑکے نے دکھ سے کہا۔

''میں چھپاتی نہیں، وقت آنے پر بتاؤں گی۔'' وہ نرمی سے بولی۔ ''چلو اب وقار تک پہنچنے کا کوئی طریقہ سوچتے ہیں۔'' لڑکا اندر سے کاغذ اٹھا لایا۔ اس نے پنسل سے نقشہ بنایا۔

''یہ ہے وقار خان کا بنگلا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سرخ پنسل سے اردگرد نشان بنانے شروع کر دیے۔ ''یہ ہیں وہ سیکیورٹی گارڈز جو اس پورے بنگلے کے اردگرد ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔''

''ہاں، وقار خان نے ایک سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں، یہ تو بس وہ سیکیورٹی گارڈز ہیں جو نمایاں ہیں باقی کچھ ایسے بھی ہوں گے جو عام لوگوں کے بھیس میں اردگرد موجود ہیں۔''

''چلو یہ اچھا ہے وقار خان کو کچھ اندازہ تو ہوا ہے کہ موت کا خوف کیا ہوتا ہے۔'' وہ مسکرائی۔ عجیب مسکراہٹ...... قاتل مسکراہٹ۔ لڑکے نے محسوس کیا، مسکراتے وقت اس کے چہرے پر نامعلوم تاثر ابھرتا ہے جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا۔ ''اس کی سیکیورٹی کو دیکھتے ہوئے ہم اسے گھر میں نشانہ نہیں بنا سکتے۔'' وہ بولا۔

''تو کیا ہوا، گھر سے باہر تو نکلے گا ناں۔''

''ہاں، وقار خان اپنے معمول کے کاموں سے ہٹ کر ہر اتوار کو اپنے بیٹے کی قبر پر پھول چڑھانے آتا ہے...... اس وقت ہم اپنا کام کر سکتے ہیں۔''

''کیسے......؟''

''قبرستان میں اس کے ساتھ دو سیکیورٹی گارڈز ہوتے ہیں، جو اس کے دائیں اور بائیں موجود ہوتے ہیں، یہ سیکیورٹی کافی کم ہے۔ اس کے علاوہ پولیس کا خطرہ بہرحال موجود ہے۔'' اس نے سمجھایا۔

''ایک بات ہے ویسے، کسی کے گھر میں گھس کر اُسے مارنے کا اپنا مزہ ہوتا ہے، کیا خیال ہے؟'' لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ لڑکا مسکرایا۔

''یہ خودکشی ہوگی۔''

''تو کیا ہوا، زندگی میں کیا رکھا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گے تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔''

''اور مر کر خدا کے پاس ہوگی۔''

''ویسے بھی ایک دن جانا ہی ہے۔''

''چلو جیسے تمہاری مرضی، گھس جائیں گے اس کمینے کے گھر میں بھی۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' وہ جوش سے بولی۔ اس کے بعد وہ اپنی پلاننگ مکمل کرنے لگے۔

☆☆☆

''دانیہ، ہانیہ، زینب، فرحان اور حیدر۔'' قیصر نے اپنے سامنے پڑی لسٹ پر یوری فیملی کے نام دیکھے۔ ''ان میں سے کون اتنی پلاننگ سے قتل کر سکتا ہے؟'' اس نے سہیل کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کوئی بھی نہیں۔''

''ان کی نگرانی سے کیا حاصل ہوا؟''

''کچھ نہیں، ایک نارمل روٹین سے گزار رہے ہیں

زندگی، ہاں البتہ دانیہ ہر شام کو ایک مخصوص جگہ جاتی ہے۔''
''کس جگہ؟'' وہ چونکا۔
''سلمان شہزاد کے گروپ کا ایک لڑکا ہے شہریار اس کا نام ہے۔'' سہیل نے جیسے دھما کا کیا۔
''اوشٹ...... تم شہریار کی مکمل تفصیلات جانتے ہو؟''
''نو سر۔'' سہیل نے نفی میں سر ہلایا۔
''یہ دیکھو۔'' اس نے شہریار کا ریکارڈ سہیل کے سامنے رکھا۔ ''یہ لڑکا سلمان شہزاد کے لیے ہر وہ کام کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے، عام سی شکل وصورت کے اس لڑکے کے پاس غضب کا دماغ ہے اور یہ ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے کہ ہم پیشہ ور قاتل اور مجرم کو یوں آزادی سے گھومنے دے رہے ہیں کیونکہ ہمارے پاس نہ تو کوئی ثبوت ہے اور نہ ہی کوئی گواہ، اس کے علاوہ سلمان شہزاد اور وقار خان کے اچھے تعلقات ہیں پھر یہ لڑکا ان کے لوگوں کو کیسے مار سکتا ہے؟'' آخری الفاظ بولتے ہوئے قیصر کے لہجے میں حیرانگی اتر آئی۔
''ایک وجہ ہو سکتی ہے سر۔''
''کیا؟''
''دانیہ...... وہ اتنی خوب صورت ہے کہ کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتی ہے۔'' سہیل نے جواب دیا۔
''ایسا بالکل ہو سکتا ہے، ان کی مکمل نگرانی کرو ہم جلد انہیں پکڑ لیں گے۔''
''اوکے سر۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اٹھنے لگا تھا کہ کسی کی کال آگئی ''جی'' کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔ دوسری جانب کسی کی پُرجوش آواز سنائی دی۔ ''سر دانیہ اور شہریار اس وقت گاڑی میں سوار کہیں جارہے ہیں، ہم ان کے پیچھے ہیں۔''
''اوکے، تم اُن کے پیچھے رہو، ہم آرہے ہیں۔'' اس نے قیصر کو یہ خبر سنائی۔ ''جلدی چلو میرا خیال ہے آج ڈراپ سین ہو جائے گا۔'' وہ تیزی سے اٹھا۔ پندرہ منٹ بعد پولیس وین سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ دوبارہ کال آگئی۔ ''سر وہ ہمیں چکما دے کر کہیں نکل گئے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا کہاں گئے ہیں۔''
''نکمے ہو تم سب، ڈھونڈو انہیں۔'' سہیل غصیلے لہجے میں بولا۔
''اب کہاں جانا ہے سر۔'' اس نے پوچھا۔
''وقار خان کے بنگلے کی طرف بڑھو۔'' گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔

☆☆☆

''یہ تو ہمارے تعاقب میں ہیں۔'' شہریار بڑبڑایا۔ اس نے گاڑی کا رخ بدلا اور یوٹرن لے کر تیزی سے واپس چل دیا۔
''یہ کیا کر رہے ہو۔'' دانیہ کا حلیہ کافی بدلا ہوا تھا۔
''پولیس والے ہمارے تعاقب میں ہیں...... شاید گھر سے ہی پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' اس نے اسپیڈ بڑھائی۔ اگلے دس منٹ تک گاڑی شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی۔ آخر شہریار نے ایک تنگ سڑک پر موڑ کاٹا اور پانچ منٹ بعد وہ تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوگیا۔
''آج تو ہم اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔
''مگر پولیس کو خبر کیسے ہوئی؟'' دانیہ نے سوال اٹھایا۔
''پتا نہیں مگر اب ہمیں احتیاط برتنی ہوگی۔''
''احتیاط...... ہونہہ، ہم آج ہی جائیں گے اور اُسے جہنم واصل کریں گے۔''
''تم پاگل ہو، وہاں سیکیورٹی کے علاوہ پولیس کا گھیرا بھی ہوگا۔''
''تو کیا ہوا؟ تم ڈرتے ہو؟''
''چیلنج کر رہی ہو؟''
''نہیں، اگر تم وہاں نہیں جانا چاہتے تو ٹھیک ہے، مجھے بنگلے کے قریب اتار دینا، میں خود چلی جاؤں گی، مار دوں گی یا مر جاؤں گی۔'' اس کے لہجے کی اس درندگی سے کبھی کبھی شہریار بھی خوف زدہ ہو جاتا تھا۔
''اب راستہ جدا نہیں ہو سکتا، مرنا جینا ساتھ ہوگا۔'' شہریار نے کہا اور گاڑی وقار خان کے بنگلے کی طرف موڑ دی۔ شہر کی سڑک پر وہ دونوں جارہے تھے۔ قاتل جوڑا، دہشت کا نشان، اپنے آخری ٹارگٹ کی طرف۔

☆☆☆

''یہ پولیس کا گھیرا، یہ سخت سیکیورٹی دو افراد سے بچنے کے لیے ہی ہے؟'' وقار خان نے جیسے خود سے سوال کیا۔
''ہاں وقار صاحب مگر ہم انہیں یہاں پہنچنے سے پہلے پکڑ لیں گے۔'' قیصر نے جواب دیا۔ وہ ہنس پڑا۔
''ہماری پولیس اتنی تیز ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔''
''پولیس اپنا کام کر رہی ہے جناب، ہم نے مجرموں کا

سراغ لگا لیا ہے، جلد پکڑ لیے جائیں گے۔'' قیصر کو اس کا لہجہ کبھی پسند نہیں آتا تھا۔

''سر ایک گاڑی آ رہی ہے اور میرا خیال ہے وہی ہے جس کا پیچھا کر رہے تھے ہم لوگ۔'' قیصر کو کال موصول ہوئی۔ وہ جلدی سے باہر نکلا۔ گیٹ کے باہر انہیں ایک گاڑی دکھائی۔ اس نے روکا مگر اس میں ادھیڑ عمر آدمی سوار تھا۔ وہ واپس لوٹ گیا۔ اس کی چھٹی حس بار بار خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ ''کچھ غلط ہو رہا ہے۔'' وہ وقار خان کے پاس آیا۔

''آپ کے باقی گھر والے کہاں ہیں؟''

''اقرا اور اسما گھر پر نہیں ہیں...... اس خطرناک صورتِ حال میں انہیں یہاں نہیں رکھ سکتا، وہ ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ٹھیک اسی وقت باہر چیخ و پکار مچ گئی۔ ''آگ آگ'' کوئی چیخ رہا تھا۔ سرونٹ کوارٹر جو کہ بنگلے کی ایک سائڈ پر تھا، اس کے قریب ہی آگ بھڑک رہی تھی اور یہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ سب لوگ اسے بجھانے میں مصروف تھے۔ قیصر... وقار خان کو بنگلے کے اندر ہی رہنے کا کہہ کر خود سرونٹ کوارٹر کی جانب چلا گیا۔ وقار خان بے چینی سے اندر ٹہل رہا تھا کہ اس کے نمبر پر کال موصول ہوئی۔ ''وقار خان اگر تم اسما اور اقرا کی جان بچانا چاہتے ہو تو جلدی سے اس فلیٹ پر پہنچ جاؤ جہاں تم نے انہیں چھپا رکھا ہے۔'' بولنے والی لڑکی کا لہجہ وقار خان کے لیے انجان نہ تھا۔ اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ اکیلا گاڑی میں بیٹھا، اس سے پہلے کسی کو خبر ہو، وہ بیوی اور بیٹی کو بچانے نکل پڑا۔

آگ ایک گیس سلنڈر کو لگی تھی۔ اس پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ قیصر فوراً ہی واپس آیا۔ وقار خان غائب تھا۔ وہ بھاگ کر باہر نکلا سیکیورٹی گارڈ سے پوچھا تو جواب ملا۔ ''ابھی ابھی گاڑی میں گئے ہیں صاحب۔'' قیصر باہر نکلا۔ یہاں سہیل ایک گاڑی میں بیٹھا تھا۔''

جلدی چلو جو گاڑی ابھی یہاں سے نکلی ہے اس میں وقار خان ہے۔'' سڑک پر دوڑنے والی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ حیرت سے ان دو گاڑیوں کو دیکھ رہے تھے جو تھوڑے فاصلے سے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔

☆☆☆

گیس سلنڈر کو اندر پھینک کر باہر بنگلے کی دیوار سے نشانہ بنا کر شہریار پیچھے مڑا۔ ''اب بنگلے میں گھسنا ہے۔'' دانیہ نے پوچھا۔

''نہیں، آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اسے لے کر گاڑی میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں اسی بلڈنگ میں داخل ہوئے جہاں جبار کو قتل کیا تھا۔ اس کے گراؤنڈ فلور پر ہی ایک فلیٹ کے دروازے پر رک کر شہریار نے گھنٹی بجائی۔

''کون؟'' اندر سے آواز آئی۔ یہ اسما کی آواز تھی۔

دانیہ نے اسے پہچان لیا۔ نفرت کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔

''وقار صاحب نے بھیجا ہے مجھے، کچھ کام ہے آپ سے۔''

اسما نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں پھرتی سے اندر داخل ہو گئے۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر شہریار نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خبردار اگر آواز نکالی تو۔'' تھوڑی دیر بعد اسما اور اقرا بیڈروم میں بندھی پڑی تھیں۔ وقار کو کال کر کے اس نے موبائل بند کر دیا تھا۔ ''تمہارے پاس دوسرا آپشن تھا، تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' دانیہ نے ناراضگی سے پوچھا۔

''بس اتفاق سے یاد آ گیا جب جبار کو قتل کیا تھا تب یہ فلیٹ نظروں سے گزرا تھا۔'' اس نے بتایا۔

دونوں بے چینی سے وقار کا انتظار کرنے لگے۔ ''کیا خیال ہے وہ کمینہ پولیس کو لائے گا؟''

''ہو سکتا ہے مگر ہمارے پاس بھی دو افراد ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ بیس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ وقار خان ہاتھ اوپر اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ''آ گئے سرکار، کسی کو ساتھ تو نہیں لائے؟'' اس کے اندر داخل ہوتے ہی شہریار نے باہر جھانکا۔

''کوئی نہیں ہے۔'' وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اقرا اور اسما کو جانے دو۔'' اس کی بات مکمل ہوئی تھی کہ دانیہ نے آگے بڑھ کر تھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔

''اپنی بیوی اور بیٹی کا بڑی جلدی خیال آیا ہے تمہیں۔''

''ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''ہاں تو میرا کیا قصور تھا بتاؤ...... جو منیر کے بعد تم نے مجھے رفیق اور جبار کے حوالے کیا تھا؟'' وہ گرجی۔

''میں تمہارا مجرم ہوں مگر میری بیٹی اور بیوی کو کچھ مت کہو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''چھوڑ دیں گے انہیں مگر ابھی میرا انتقام تو پورا ہو لینے دو۔'' اس نے شہریار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے پستل اسے پکڑا دیا۔ ''اپنی موت سے نظریں ملا لو وقار

خان۔'' وقار نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''ہمارے تین گننے تک باہر آجاؤ ورنہ دروازہ توڑ دیا جائے گا۔'' شہریار اور دانیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے فلیٹ میں دو گولیاں چلنے کی آواز آئی تھی۔

☆☆☆

جیل میں بیٹھی دانیہ مسکراہٹ لیے سب کو دیکھ رہی تھی۔کل سے میڈیا کے کئی رپورٹر اپنے اختیارات استعمال کر کے اس تک پہنچ چکے تھے مگر سب سوالوں کا جواب ایک ہی تھا...... مسکراہٹ، ایک عجیب مسکراہٹ، قاتل مسکراہٹ۔ اس شام قیصر اس کے پاس آیا۔''کیوں مارا تم نے اسے؟''

''کسے؟ جبار کو؟ رفیق کو؟ منیر کو؟ یا وقار خان کو؟'' وہ ہنس پڑی۔

''نہیں، ان کو مارنے کی وجہ تھی تمہارے پاس...... میں پوچھنا چاہتا ہوں شہریار کو کیوں مارا؟'' قیصر نے پوچھا۔

''اس کو مارنے کی بھی وجہ تھی...... اس نے بھی کسی کی جان لی تھی...... میرے بھائی عثمان کو مارا تھا اس نے، وہ بھی قاتل تھا۔'' ہنستے ہنستے وہ اچانک رونے لگی۔ قیصر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اسے اس معصوم لڑکی سے قاتل ہونے کے باوجود ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چپ ہوگئی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں پوری بات جاننا چاہوں گا۔'' قیصر نے پوچھا تو دانیہ آہستہ آہستہ بتانے لگی......

☆☆☆

''عثمان بھائی اور اسما کے گھر سے بھاگنے کے بعد ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ہمارا واحد آسرا حیدر تھا جس نے ہر مشکل وقت میں کمینگی دکھائی۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے منیر کے حوالے کر دیا۔ وہاں دو دن مجھ پر ہر طرح کا ظلم کیا گیا۔ واپسی پر میں بے حس ہو چکی تھی۔ عثمان بھائی گھر واپس آچکے تھے۔ وہ میرے انصاف کے لیے لڑنا چاہتے تھے مگر یہاں انصاف حاصل کرنا ناممکن ہے۔ ابو کی وفات کے بعد عثمان کو بھی قاتلوں نے ہم سے چھین لیا۔ حیدر نے گھر تو سنبھال لیا مگر ایک دن اس نے مجھے ہوس کا نشانہ بنا ڈالا۔ میں شاید اسے ختم ہی کر دیتی مگر ہانیہ اور ان کے ہونے والے بچے کا سوچ کر رک گئی مگر جب اسے چھریاں مار کر خون بہایا تو مجھے عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ میں نے سوچ لیا کہ سب سے اسی طرح بدلہ لوں گی مگر تب میں کمزور تھی۔ مجھے کسی سہارے کی تلاش تھی جو بدلے میں میری مدد کرتا۔ وہ سہارا مجھے شہریار کی شکل میں ملا جو تب تک سلمان شہزاد کے لیے ہر کام کرتا تھا۔ اس نے قتل بھی کیے اور لڑائی بھڑائی کی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی۔ عثمان بھائی کے مرنے کے بعد بھی اس نے رشتہ بھجوایا مگر امی نے انکار کر دیا۔ میں اس سے ملی۔ وہ مجھے حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسی لالچ میں میرے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس کی خطرناک ذہانت میرے کام آئی۔ چھ ماہ کے اندر اندر اس نے مجھے اسلحہ چلانا سکھایا اور کچھ لڑائی بھڑائی کے گر سکھا دیے۔ گھر والوں کو یہی لگتا تھا کہ میں شام کو کہیں پڑھنے جاتی ہوں مگر میں اس کے پاس آتی تھی۔ پھر ہم نے نیو ایئر نائٹ کو منیر کو نشانہ بنایا۔ گاڑی چوری کرنا شہریار کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہم بغیر سراغ چھوڑے منیر کو مار کر واپس آگئے۔ اس کے بعد جبار بھی آسان ثابت ہوا۔ البتہ رفیق کو جب میں باندھ کر مار رہی تھی وہ عجیب انداز میں بولا تھا۔''بھائی قاتل، بھائی قاتل۔'' اچانک شہریار نے اسے مار دیا۔ مجھے شک ہوا۔ میں نے تحقیق کی تو مجھے پتا چلا کہ عثمان کو مارنے کے لیے منیر نے سلمان شہزاد کو پیسے دیے تھے اور اس نے شہریار کے ذریعے اسے قتل کروادیا تھا۔ میں چاہتی تو شہریار کو مار سکتی تھی مگر میرا انتقام ادھورا رہ جاتا۔ اس سے پہلے میں عثمان کے قاتل کو ڈھونڈنا چاہتی تھی مگر وہ خود بخود میرے سامنے آگیا۔ میں نے اسے استعمال کیا اور اپنا مقصد پورا کیا۔ جب وقار کے پیچھے تم لوگ آئے تو میں نے دونوں کو وہیں گولی ماردی۔ افسوس کہ شہریار کی ذہانت اس کی محبت اور اعتبار کے آگے ہار گئی...... وہ میرا آخری شکار تھا۔''

☆☆☆

اس کی بات ختم ہوگئی۔ قیصر کچھ سوچ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں۔'' دانیہ نے پوچھا۔

''یہی کہ حالات نے کس طرح ایک معصوم لڑکی کو خطرناک قاتل میں بدل ڈالا۔'' اس نے افسوس سے کہا۔

دانیہ موت کے انتظار میں وہیں بیٹھی رہ گئی...... چہرے پر مسکراہٹ لیے...... عجیب مسکراہٹ...... قاتل مسکراہٹ......

کامیاب واردات

محمد لطیف

زندگی سے ہر شخص پیار کرتا ہے... اسے سنوارنے... سجانے اور بہتر سے بہتر کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے... اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ ایک پُرآسائش زندگی کا ساتھ ہمیشہ رہے... مگر ہر ایک کی قسمت میں یہ خوش بختی نہیں ہوتی... ان کو اپنا بخت بنانا پڑتا ہے... بدلنا پڑتا ہے... وہ بھی اپنی زندگی کے خشک... ویران... بے رونق دنوں کو پُررونق اور پُروقار بنانا چاہتا تھا... اور اس نے تکمیلِ خواہش کا بہترین منصوبہ ترتیب دے لیا تھا...

کامیاب واردات کے انوکھے کھلاڑیوں کی یادگار اننگز......

اس کمرے میں موجود تینوں افراد گہری سوچ میں غرق تھے۔

سوچ کی پرچھائیاں ذہن کے محفوظ گوشوں سے نکل کر اب چہرے پر بھی جھلکنے لگی تھیں۔ خوف، تجسس، سنسنی، گھبراہٹ کے ملے جلے جذبات کے علاوہ ایک ہی چیز ان تینوں چہروں میں مشترک تھی...... اُمید۔ اور بالآخر اسی اُمید نے باقی سب پرچھائیوں کو مات دے کر انہیں ایک فیصلے پر مجبور کر دیا۔

''پھر میں تمہاری جانب سے اقرار ہی سمجھوں؟'' ارسلان نے گلا کھنکار کر اپنے سامنے بیٹھے شخص سے کہا۔ اس ملاقات میں در پردہ ارسلان ہی کا ہاتھ تھا۔

''ایک بار پھر سوچ لو۔ یہ جرم ہے اور چالاک ترین مجرم بھی کوئی نہ کوئی کلیو ایسا چھوڑ دیا کرتا ہے جو قانون کو اس کی گردن میں شکنجہ کسنے کے لیے مدد دیتا ہے۔'' مخاطب کی آواز اندیشوں اور وسوسوں سے لبریز تھی۔

''تمہاری یہ بات غلط نہیں۔ پرفیکٹ کرائم آج تک صرف قصّے کہانیوں اور فلموں تک ہی محدود ہیں لیکن یار! یہ کہانیاں بھی تو ہمارے معاشرے ہی کا حصہ ہیں۔ ان کے کردار بھی ہم جیسے ہی لوگ ہیں تو پھر ہم کیوں پرفیکٹ کرائم انجام نہیں دے سکتے؟'' ارسلان کی دائیں سمت میں بیٹھے تیسرے شخص نے کہا۔ وہ تقریباً پچیس برس کا تھا لیکن اپنے ڈیل ڈول اور وضع قطع سے پینتیس سے کم کا نہیں لگتا تھا۔

''یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کوشش سے ہی کامیابی ممکن ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی زندگیاں تبدیل کرنے کا ایک موقع مل رہا ہے۔ اس سے اگر فائدہ نہ اٹھایا گیا تو مستقبل میں سسکنے، تڑپنے اور اپنی قسمت کو کوسنے کے علاوہ ہم کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔'' ارسلان نے گہری نظروں سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر کہا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے اس کی ذہنی آمادگی اور تعاون سب سے اہم تھا۔

''لیکن اگر پکڑے گئے تو؟'' وہ ہچکچایا۔

''اور اگر نہ پکڑے گئے تو؟'' ارسلان نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''اگر نہ پکڑے گئے تو ہم سبھی لاکھوں روپے کے مالک ہوں گے اور اس رقم سے ایک بہترین نئی زندگی کا آغاز کرسکیں گے۔'' تیسرے فرد نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

ارسلان کے چہرے کی چمک یکدم بڑھ گئی۔ ''گڈ! یہ ہوئی نا مردوں والی بات! میں اگلے دو دن میں کچھ اور ضروری معلومات اکٹھی کرلیتا ہوں۔ پھر اس کام کا طریقۂ کار اور جزئیات بھی فائنل کرلیں گے۔'' اس کی بات پر دونوں نے تائید میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر مزید بات چیت کے بعد وہ روانہ ہو گئے لیکن ارسلان وہیں بیٹھا اپنے منصوبے پر مزید غور و فکر کرتا رہا۔ 'بھائی بھائی جیولرز' میں ڈکیتی کی واردات کو حتمی شکل دینا بہرحال اتنا آسان بھی نہ تھا۔ ایک ہموار، پُرسکون زندگی گزارنے والے ارسلان کے لیے یہ مشکل سر کرنا بہت ضروری ہو چکا تھا۔

☆☆☆

'بھائی بھائی جیولرز' نے پہلی ملاقات میں ہی ارسلان کا دل موہ لیا تھا۔

اس دکان کا افتتاح کچھ عرصہ پہلے ہی ہوا تھا۔ آس پاس کے سبھی دکانداروں نے اپنی مخصوص نفسیات کے تحت خاصی لے دے بھی کی تھی۔ اس بازار میں آرٹیفیشل جیولری کی دکانیں تو بہت تھیں لیکن سنار پہلی بار آئے تھے۔

''دیکھنے میں تو خاصے سمجھدار لگتے ہیں دونوں بھائی! پھر کسی پوش علاقے میں کیوں نہیں گئے؟'' دلاور نے کہا۔ وہ بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے فروخت کرتا تھا اور اس دکان کو کرائے پر لینے کے لیے کافی عرصے سے کوششیں کر رہا تھا۔

''میں نے تو اس روز بڑے بھائی سے پوچھا بھی تھا۔'' اشرف نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ وہ ٹیلرنگ شاپ کا مالک تھا اور ارسلان بھی اسی دکان پر ملازم تھا۔

''اچھا! تو کیا بتایا پھر اس نے؟''

''انہیں جائداد سے حصہ ملا ہے۔ خواہش کے باوجود پوش علاقے میں کوئی دال نہیں گلی۔ کہہ رہا تھا کہ رزق تو اتنا ہی ملنا ہے جتنا نصیب میں لکھ دیا گیا ہے۔ جگہ چھوٹی ہو یا بڑی، پھر کیا فرق پڑتا ہے۔''

''کافی درویش صفت لگتا ہے۔'' دلاور ہنسا۔

''ہاں! دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔'' اشرف نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

ان دونوں کے پاس کھڑا ارسلان بظاہر اپنے سامنے پھیلے کپڑوں کی کٹائی کر رہا تھا مگر کان اُن کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ بازار کے سبھی دکاندار اور ان کے ملازمین کی طرح وہ بھی پرتجسس تھا۔ دکان کی سجاوٹ اور مالکان کی لگن پہلے روز ہی اسے بہت پسند آئی تھی۔ اتفاق ایسا تھا کہ جیولرز اور ٹیلرنگ کی دکانیں بالکل آمنے سامنے تھیں اس لیے غیر ارادی طور پر وہ ان کے معاملات سے باخبر رہنے لگا۔

آغاز میں دس پندرہ روز تو خریدار کم ہی آئے پھر ایک روز سوٹڈ بوٹڈ شخص کی آمد ہوئی۔ وہ یقینی طور پر کسی بہترین گاڑی میں آیا تھا اور اب وہ گاڑی اس بازار کے آغاز میں ہی بنائی گئی مختصر سی پارکنگ میں موجود تھی۔ اس پارکنگ میں چند دکاندار بھی اپنی بائیکس کھڑی کیا کرتے تھے۔

اس شخص کے ساتھ ایک حسین پری پیکر بھی تھی۔ لڑکی

کی عمر بیس، بائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ شیفون کی سیاہ ساڑی اور بھرپور میک اَپ میں وہ بجلیاں گرا رہی تھی۔ ان دونوں کا انداز 'باہمی رشتے' کی خوب چغلی کھا رہا تھا۔ ارسلان اس وقت لنچ بریک میں فارغ تھا اس لیے گلاس ڈور سے اندرونی مناظر بہت دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

لڑکی نزاکت میں اپنی مثال آپ تھی۔ سیلز مین انہیں مختلف زیورات نکال کر دکھاتا رہا لیکن بات بنتی نظر نہیں آرہی تھی۔ چند لمحے بعد سیلز مین نے انٹرکام اٹھا کر کسی سے بات کی۔ چوبی دروازہ کھلا اور ایک سیلز گرل انہیں اپنے ہمراہ اندرونی جانب لے گئی۔ نصف گھنٹے بعد جب وہ گاڑی میں آکر بیٹھے تو زیورات کے بہت سے ڈبے ان کے ہاتھوں میں موجود تھے۔ لڑکی کا نخرہ اور نزاکت ایک واضح فریفتگی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ وہ اس نیم گنجے اور سیاہ رو شخص پر ریشہ خطمی نظر آرہی تھی۔ یہ منظر ارسلان کے دل پر بجلی بن کے گرا۔ اس کے دل میں حسد وجلن کے جذبات بھڑکنے لگے۔

''واہ میرے مولا! کسی کو تو اتنا دیا کہ وہ اس طرح لٹاتا پھر رہا ہے اور کوئی ہماری طرح ایک جائز، حلال رشتہ بنانے کے لیے پائی پائی کا محتاج ہے۔'' اس نے مایوسی سے سوچا۔

پھر یہ سب ایک معمول بن گیا۔ بھائی بھائی جیولرز نے بہت جلد اپنی گڈول بنا لی۔ ارسلان وہاں مختلف مرد وخواتین کو آتے دیکھتا رہتا۔ بازار میں ہونے والی چہ میگوئیاں اور طنزیہ باتیں دھیرے دھیرے ختم ہوگئی تھیں اور وہاں بھی دکاندار ان دونوں بھائیوں کے اخلاق سے متاثر ہوچکے تھے۔

یہ معمولات شاید یونہی جاری رہتے لیکن ایک روز ارسلان نے کیبل پر ایسی فلم دیکھ لی جس میں تین نابینا افراد سے بینک ڈکیتی کروائی گئی تھی۔ اس فلم کا پلاٹ اسے بہت پسند آیا۔ ارسلان شفیق ان ستّر فیصد لوگوں کی طرح تھا جو میٹرک، انٹر کرنے کے بعد تعلیم سے تائب ہوجاتے ہیں اور کوئی ہنر سیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ والد بچپن میں اور والدہ نے چند سال قبل ہی وفات پائی تھی۔ بھلے وقتوں میں خریدا گیا ڈیڑھ مرلے پر محیط اور ٹین کی چھت پر مشتمل گھر اسے بہت سی مشکلات سے بچائے ہوئے تھا۔ اس کے کئی رشتے دار تنہائی اور اکلوتے ہونے کے پیشِ نظر اپنی بچیوں کا رشتہ دینے کے لیے تیار تھے تاہم وہ شادی سے قبل اپنے حالات میں بہت زیادہ نہ سہی لیکن تھوڑی بہت تبدیلی چاہتا تھا۔ وہ مزاجاً رومان پسندی اور حقیقت شناسی کا امتزاج تھا لہٰذا کسی بھی حسین وجود کو اپنانے سے قبل زندگی کی کچھ بدصورتیاں کا خاتمہ چاہتا تھا۔ پہلے پہل اس نے اے سی اور موبائل ریپئرنگ کا کام سیکھا اور پھر مرکزی بازار میں لیڈیز کپڑوں کی سلائی کٹائی کے اسرار و رموز سیکھنے کے درپے ہو گیا۔ دیگر نوجوانوں کی طرح وہ بھی 'شارٹ کٹ' کا قائل تھا۔ اپنا مستقبل محفوظ بنانے کے لیے اسے یکمشت صرف چند لاکھ روپوں کی ضرورت تھی جن کے حصول کا طریقہ بہرحال اس فلم نے سجھا دیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے ذہن میں ڈکیتی کا منصوبہ پنپنے لگا۔ یہ کام اکیلے شخص کے لیے مشکل تھا اور کسی پر اعتبار کرنا مشکل تر۔ ان زمینی حقائق کے باوجود وہ ایسا موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک بہترین مستقبل کے لیے یہ خطرہ مول لینا بہت ضروری ہوچکا تھا۔

اپنی عقل اور بساط کے مطابق اس نے کمر کس لی اور انٹرنیٹ سے ہر وہ فلم تلاش کی جس کی کہانی کسی بھی بینک یا دکان میں ڈکیتی پر مبنی ہوتی تھی۔ ایک ماہ تک غیرملکی فلمیں دیکھنے کے بعد وہ ذہنی طور پر اتنا پختہ ہوگیا تھا کہ اس واردات کے لیے بہترین منصوبہ ترتیب دے لیتا۔ مزید ایک ہفتے کی محنت کے بعد اس نے اپنے مشاہدے، حقائق اور فلموں سے حاصل کیے گئے علم کی بنا پر اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے شاندار منصوبہ بنالیا۔ اسے قوی امید تھی کہ وہ بہت جلد ایک کامیاب واردات انجام دے گا۔

اس رات وہ بہت مطمئن نیند سویا لیکن اگلے روز ایک غیرمتوقع صورتِ حال نے اس کے سبھی خواب ملیامیٹ کر دیے۔

☆☆☆

اس روز ارسلان لنچ بریک میں دکان کے باہر بیٹھا غیرمحسوس طریقے سے جیولرز شاپ میں موجود سی ٹی وی کیمروں کی صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ دکان کے داخلی دروازے پر گارڈ کے علاوہ ایک کیمرا موجود تھا جس کا کنٹرول اندرونی جانب دروازے کے پاس ہی ایک کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے شخص کے پاس تھا۔ اسی کے مقابل ایک اور کاؤنٹر تھا جہاں دو سیلز مین گاہکوں سے نمٹتے تھے۔

پارٹیشن کے دوسری جانب کے بارے میں معلومات بہرحال ابھی ادھوری تھیں۔ ان کا مصدقہ علم ہوتے ہی اسے ایک حتمی منصوبہ تشکیل دینا تھا اور یہی مرحلہ فی الحال سب سے مشکل تھا۔

وہ جلد بازی میں کوئی بھی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

اگلے کئی روز وہ اسی معمول میں الجھا رہا۔ ذہن میں کئی منصوبے بناتے، بگاڑتے اسے علم ہی نہ ہو پایا کہ اس کی یہ سرگرمیاں کسی دوسرے فرد کی نظر میں بھی آچکی ہیں۔

جمعرات کی شب وہ حسبِ معمول اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تو ایک اور سایہ بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ کچی بستی کے اس گھر میں پہنچ کر جب ارسلان نے دروازہ مقفل کرنا چاہا تو کسی نے پاؤں پھنسا کر یہ کوشش ناکام بنادی۔ گلی میں اندھیرے کے باعث وہ اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا، اس لیے جھنجلا کر بولا۔

''کون ہو تم؟ یہ کیا حرکت ہے؟''

''آرام سے پیارے! آرام سے...... اتنی پریشانی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔ تم تو پہلے ہی اس قدر اَپ سیٹ ہو کہ آج رستے میں بادشاہ کے ہوٹل سے کھانا لانا بھی بھول گئے۔ جمعرات کے روز دال گوشت لایا کرتے ہو ناں اس سے؟'' مقابل نے اطمینان سے کہا تو ارسلان کو شدید خطرہ کا احساس ہوا۔

''نکل جاؤ یہاں سے...... ابھی۔'' اس نے پوری قوت سے دروازہ بند کرنا چاہا۔

''جلد بازی سے کام نہ لو...... آرام سے بیٹھ کر پہلے میری بات سن لو۔'' وہ دھیرے سے نکل کر صحن کی مدھم روشنی میں آیا تو ارسلان کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ چہرہ تو وہ ہر روز دیکھتا تھا لیکن اس کی یہاں موجودگی بہت حیران کن تھی۔

وہ اطمینان سے چلتا اس کے اکلوتے کمرے میں چلا آیا اور کرسی پر بیٹھ کر پاؤں سامنے رکھی میز پر ٹکا دیے۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' ارسلان نے زچ ہو کر پوچھا۔

''وہی جو تم چاہتے ہو اور جس کے لیے ہر روز بھائی بھائی جیولرز پر کسی نہ کسی طرح نظریں جمائے کھڑے رہتے ہو۔''

''میں تو بس یونہی ہواخوری کے لیے باہر آجایا کرتا ہوں۔'' اس نے ذرا تن کر کہا مگر حقیقت تو یہ تھی کہ وہ قدرے متفکر ہوگیا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا وہ شخص جیولرز شاپ کی رو میں ہی لیڈیز جوتوں کی دکان پر سیلز مین تھا۔ ارسلان نے اسے کئی بار کندھے پر رکھے کپڑے سے جوتے جھاڑ کر خواتین کے پاؤں میں پہناتے دیکھا تھا۔ اس کی پریشانی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک معمولی سا سیلز مین اگر اس کے عزائم بھانپ سکتا ہے تو وہاں سالہا سال سے بیٹھے جغادری دکاندار بھی اس کی منصوبہ بندی سے آگاہ ہو سکتے تھے۔

''فکر نہ کرو! تمہارے ارادے وہاں کسی اور کے علم میں نہیں آسکتے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو تم نے کیسے......؟''

''میں نے بھی تو اپنی آنکھوں میں وہی خواب سجا رکھے ہیں۔ تمہاری آنکھوں سے جھلکنے والے رنگ پھر میری نظروں سے کیسے پوشیدہ رہتے؟'' اس بار وہ قدرے دوستانہ انداز میں بولا۔

''کہاں رہتے ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟'' ارسلان بھی اب پُرسکون ہوگیا تھا۔

''میرا نام عمران ہے...... ایسی ہی ایک بستی کے اس سے بھی چھوٹے گھر میں رہتا ہوں۔''

''اپنی نوکری سے مطمئن نہیں ہو کیا؟''

''ایسی چاکری سے کون راضی ہوتا ہے یار؟ سارا دن جوتیاں، سیدھی کرتے رہو بس! ہر آنے والی خاتون کے ناز نخرے برداشت کرو۔ ان کا پسندیدہ رنگ' سائز نکلوا کر صاف کرتے ہوئے قدموں میں رکھ دو۔ پسند آگئی تو ٹھیک...... ورنہ منہ بناتی چل دیتی ہیں کہ چھوڑو بھئی! یہاں تو اتنی ورائٹی ہی نہیں ہے۔ پچھلی دکان پر تو بہت آؤٹ کلاس ورائٹی مل رہی تھی۔'' بات کے اختتام پر عمران نے خالص زنانہ انداز میں نقالی کی تو ارسلان بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہوگیا۔ ''مالکان ہمیں ہی موردِالزام ٹھہراتے ہیں۔ خندہ پیشانی سے ان خواتین کی خوشامد کرنے کے لیکچر دیتے ہیں۔ ہماری عزتِ نفس کا کوئی خیال ہی نہیں کرتا۔''

''صحیح کہتے ہو یار! اپنے دھندے میں بھی یہی کچھ ہے۔ خواتین ایک دفعہ سوٹ سلوا کر جاتی ہیں تو اگلے ہی روز تن فن کرتی واپس آجاتی ہیں۔ کبھی فٹنگ پسند نہیں آتی تو کبھی کوئی نقص۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''میں تو ابھی کٹنگ ہی سیکھ رہا ہوں لیکن کاریگر لڑکوں کی شامتِ اعمال دیکھ کر ایک طویل مسافت طے کرنے کا خیال ہی شدید تھکاوٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

وہ دونوں لمحوں میں ہی گھل مل گئے۔ اگلے ایک گھنٹے میں باہمی گھریلو حالات بتاتے ان کے مابین گہرا ہمدردانہ رشتہ استوار ہوگیا تھا۔ عمران عارف کی داستان میں کچھ بھی تو نیا نہیں تھا۔ وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہنیں پڑھائی میں بہت اچھی تھیں لیکن تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں پارٹ ٹائم ملازمت کرنی پڑتی تھی۔ رشتے دار اور احباب کسی بھی مالی یا اخلاقی مدد کے بجائے ان کی

کردارکشی کر کے تسکین حاصل کرتے۔ عمران کم تعلیم یافتہ تھا اور یونہی مختلف دکانوں پر سیلز مین کی نوکری سے گھر چلاتا۔ حالات کی چکی میں پستے اور اپنی عزتِ نفس کی بکھری دھجیاں سمیٹتے ہوئے اس کے ذہن میں جرم کی آبیاری ہونے لگی تھی۔ بہنوں کی شادی کے لیے یقیناً بہت سی دولت درکار تھی جو ایمان داری اور سچائی کی راہ پر چلتے ہوئے تو صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ہی ملتی۔

مختلف باتیں، خیالات اور اپنی زندگی کے مخفی گوشے ایک دوسرے کے گوش گزار کرتے ہوئے عمران نے اس سے پوچھا۔

''کوئی آئیڈیا سوچ رکھا ہے یا تصور میں ہی لوٹ مار کر کے خوش ہوتے رہتے ہو؟''

''آئیڈیا ایک نہیں ہزاروں ہیں۔ بس ضروری معلومات مل جائیں تو اپنی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوگا۔''

''کیسی معلومات درکار ہیں تجھے؟'' عمران کے استفسار پر اس نے اپنی الجھن بیان کر دی۔

''بس اتنی سی بات...... یہ مسئلہ تو میں ابھی حل کیے دیتا ہوں۔ پارٹیشن کے دوسری جانب ایک سیلز گرل کے علاوہ دکان کا دوسرا ساجھے دار بیٹھتا ہے۔ قیمتی زیور بھی اسی طرف ہوتے ہیں۔ وہاں صرف ایک ہی کیمرا ہے جس کا کنٹرول بھی اسی شخص کے پاس ہوتا ہے۔ ادائیگی وہاں نقد لی جاتی ہے۔''

''تجھے کیسے پتا یہ سب؟'' ارسلان کی حیرت دیدنی تھی۔

''تو نے گوگل کا نام سنا ہے ناں...... بس یہ بھی ایک ایسے ہی گوگل کا کمال ہے جہاں ایسی خفیہ معلومات اسٹور ہوتی ہیں۔'' عمران ہنسا۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔''

''ارے میرے بھولو بادشاہ! میری دکان میں جو خواتین آتی ہیں، ان میں سے اکثر ادھر سے ضرور ہو کر آتی ہیں۔ انہیں خریداری تو کچھ بھی نہیں کرنی ہوتی۔ بس کبھی سونے کا بھاؤ پوچھنے اور کبھی اپنا کوئی ذاتی زیور فروخت کرنے کے بہانے اپنا تجسس ختم کرنے چلی جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہاں کے زیورات 'انتظام' ورکرز کے لباس اور اندازِ گفتگو تک بہت اہتمام سے ڈسکس کرنے لگتی ہیں۔ اسی طرح مختلف ٹکڑوں میں سارا نقشہ مجھ تک پہنچ گیا'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''لیکن اصل معلومات مجھے شوکے سے ملی تھیں۔ پچھلے ماہ انہوں نے 'سیلنگ' کا کام جس کاریگر سے کروایا تھا، اتفاق سے وہ میرا دوست ہے۔ اس نے بھی باتوں باتوں میں ساری تفصیل بتا دی۔''

ارسلان کو اپنی خوش قسمتی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کا اتنا بڑا مسئلہ چٹکی بجاتے حل ہو گیا تھا۔

''کیا پلان ہے اب تمہارے ذہن میں؟'' عمران نے سنجیدگی سے پوچھا تو اس نے عرق ریزی سے تیار کیے گئے اپنے چند منصوبے اس کے سامنے رکھ دیے۔

''فلمیں بہت زیادہ دیکھتے ہو کیا؟'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''نہیں! لیکن اس پلاننگ کے لیے واقعی بہت دیکھی ہیں۔'' ارسلان نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

''یہ سب یہاں نہیں چلے گا یار! تمہارے اس پلان میں سب سے بڑی قباحت نقلی اسلحے کا استعمال ہے۔''

''اسلحے کی بہت دہشت ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی ہی ہمارے سب رستے آسان کر دے گی۔'' ارسلان نے فخر سے کہا۔

''شاباش! مجھے اسی حماقت کی توقع تھی۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ وہاں سب احمق بیٹھے ہوتے ہیں۔ آج کل تو بچے بچے کو اسلحے کی پہچان ہے۔ وہ زمانے گئے جب پانی والی بندوق سے بھی واردات کامیاب ہو جایا کرتی تھی۔'' اس کی صاف گوئی سے وہ مایوس ہونے لگا۔

''میں تو اس پروگرام کو حتمی شکل دینے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''یوں کہو ناں کہ حماقت در حماقت کرنے کی پوری تیاری کر رہا تھا۔'' عمران نے بڑے پیار سے چوٹ کی۔ ''کوئی سادہ سا فارمولا سوچو۔ کوئی ایسا طریقۂ کار جس سے بازار میں بیٹھے افراد ہماری موجودگی یا اس انوالومنٹ کے بارے میں بے خبر رہیں۔ تم تو چند ماہ پہلے ہی یہاں آئے ہو۔ گزشتہ برس بھی اس بازار میں ایسی ہی ایک واردات ناکام بنائی گئی تھی۔ دکاندار اور چند گاہک ہجوم کی صورت میں اکٹھے ہو کر ان ڈکیتوں پر پل پڑے تھے۔ ہجوم کی بھی ایک منفرد دہشت اور نفسیات ہوتی ہے۔ اگر دو چار افراد کو زخمی کر بھی دیا جائے تو باقی لوگ مزید مشتعل ہو کر خطرناک تر ہو جاتے ہیں۔ میں تمہارا حوصلہ پست نہیں کر رہا بلکہ کسی بھی بڑے نقصان سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر ایک دفعہ ہم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو پچھلی ایک دہائی میں ہونے والے ایسے تمام واقعات ہم سے منسوب کر کے

متعلقہ تھانے میں ہمارا نام امر کر دیا جائے گا۔'' عمران کے اس منطقی جواز پر ارسلان قائل ہو گیا۔

اس رات وہ بہت بے چین تھا۔ خوابوں کی رہگذر میں بھی دولت، زیورات اور خوشیوں کی برکھا تھی۔ ایک مرمریں ہاتھ کی نرم گرفت اور حدت اس کے وجود کو معطر کر رہی تھی۔ وہ ایک پگڈنڈی پر چلتا جا رہا تھا۔ اطراف میں خوش رنگ پھولوں کی خوشبو نے ماحول میں فسوں پیدا کر رکھا تھا۔

کچھ دور چلتے ہی اس نے ایک خوبصورت بچے کو دیکھا جس کے نقوش میں ارسلان ہی کی جھلک نمایاں تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر بچہ لپکتا ہوا آیا اور ارسلان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بچے کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اس کے وجود میں محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ کیف و سرور کے ہنڈولے میں جھولتا بہت خوش تھا اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کے ذہن میں اپنی مشکلات کا حل آ گیا تھا۔

☆☆☆

صبح کا وقت تھا اور بازار میں ابھی اتنی چہل پہل نہیں ہوئی تھی۔ دکاندار اپنے مال و اسباب کی سیٹنگ میں مصروف تھے۔ بازار کے باہر ایک گاڑی سے دو افراد برآمد ہوئے۔ خوشحالی اور اطمینان دونوں ہی کے بشرے سے عیاں تھا۔ مرد نے نہایت باوقار انداز میں عورت کا ہاتھ تھاما اور مسکراتے ہوئے اسے لیے 'بھائی بھائی جیولرز' کی جانب روانہ ہو گیا۔

مرد انتہائی سیاہ رو تھا۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ عجب ہی بہار دکھا رہا تھا۔ تھری پیس قیمتی سوٹ چہرے پر کسی اسکن انفیکشن کے نشانات کے باعث محسوس ہونے والی کراہت کا تاثر ختم کرنے میں ناکام تھا۔

عورت البتہ نزاکت اور خوبصورتی کا پیکر تھی۔ سیاہ منقش عبایا اور نفاست سے کیا گیا نقاب اسے بہت باوقار بنا رہا تھا۔ اس کی بادامی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ سیلز مین نے ان کی شخصیات کے تضاد کو نظر انداز کرتے ہوئے خوشدلی سے استقبال کیا لیکن عورت ناقدانہ نظروں سے قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہی۔

ان دونوں کو آرام دہ کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ دوسرے سیلز مین نے لپک کر دکان میں ایک جانب رکھے فریج سے ٹھنڈے مشروبات کی دو بوتلیں نکال کر سلیقے سے ان کے سامنے رکھ دیں۔

''نو! تھینک یو...... مجھے ڈاکٹر نے کولڈ ڈرنکس سے منع کر رکھا ہے'' مرد نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بھی واضح طور پر بیٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''میم! آپ تو لیجیے پلیز!'' سیلز مین نے کہا۔

''نہیں شکریہ! میرا نفلی روزہ ہے۔'' اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

''آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں غالباً۔''

''جی ہاں! ایک کاروباری دوست سے بہت تعریف سنی تھی کہ آپ کے پاس بہت زبردست ورائٹی موجود ہے۔'' مرد نے کہا۔

''لیکن مجھے تو یہاں ایسا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔'' خاتون کی مدھم آواز ان کی سماعت تک بخوبی پہنچ گئی۔

''میم! ہمارے پاس جڑاؤ زیورات بھی موجود ہیں۔ اینٹیک اور مغلیہ ٹچ کے یہ سیٹ ہر کسٹمر کو بہت پسند آتے ہیں۔'' پہلا سیلز مین بوکھلایا۔ وہ 'بوہنی' کے وقت کسی بھی گاہک کو خالی ہاتھ جانے ہی نہیں دیتے تھے۔

''ہماری پسند ہر کس و ناکس سے لگا نہیں کھاتی بیٹا! اس لیے اگر واقعی کچھ منفرد ہو تو دکھاؤ! ورنہ ہمارے لیے دکانوں کی کمی نہیں اور آپ کے لیے کسٹمرز کی۔'' مرد شاہانہ بے نیازی سے گویا ہوا۔

اس سیلز مین نے ان کی فرمائش پر مختلف انگوٹھیاں اور بریسلٹ نکال کر سامنے رکھ دیے۔ کافی ردوکد کے بعد عورت نے اپنے لیے ایک نازک بریسلٹ پسند کیا جو حقیقتاً اس دکان کی مہنگی ترین جیولری میں سے ایک تھا۔

''اس کے سوا مجھے تو فی الحال کچھ پسند نہیں آیا۔'' وہ نخوت سے بولی۔ سیلز مین نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد انٹرکام اٹھا کر کسی سے بات کی۔ اگلے ہی لمحہ وہاں موجود چوبی دروازہ کھلا اور ایک سیلز گرل چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ لیے ان کے پاس چلی آئی۔

''آپ میرے ساتھ تشریف لائیے جناب! ایک بار اندر موجود ورائٹی بھی دیکھ لیجیے۔''

مرد نے عورت کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بادلِ ناخواستہ اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں اس سیلز گرل کی معیت میں اندر بڑھ گئے۔ اندرونی نقشہ بھی ہو بہو ویسا ہی تھا۔ دروازے کے بائیں جانب ایک گارڈ موجود تھا۔ سامنے رکھے کاؤنٹر کے عقب میں سیلز گرل اور چند گز کے فاصلے پر ایک درمیانی عمر کا شخص بیٹھا تھا۔

''مونا! سر کے لیے کافی بنواؤ۔'' اس نے تحکمانہ کہا۔

''نہیں جناب! شکریہ۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہمیں ایک شادی میں شرکت کے لیے اسلام آباد روانہ ہونا ہے اور بیگم صاحبہ کی خواہش تھی کہ وہ کچھ منفرد گفٹ پیک کروائیں۔''

''آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔'' مونا نے جواب دیا اور عقبی شوکیس میں رکھے چند سیٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ کر مشاقی سے ان کی خوبیاں گنوانے لگی۔

زیورات بہت نفیس اور دیدہ زیب تھے۔ عورت کی آنکھوں سے پسندیدگی جھلکنے لگی۔ مرد بھی گاہے بگاہے لقمے دے رہا تھا۔ اسی دوران وہ اچانک اپنے پیٹ کی داہنی جانب ہاتھ رکھے دہری ہوگئی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا میم! آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''میں کڈنی پیشنٹ ہوں۔ واش روم کی حاجت آن پڑی ہے۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ واش روم کی سہولت بھی یہیں موجود ہے۔'' مونا نے دلاسا دیا اور گارڈ کے ایک جانب بنے اٹیچڈ باتھ کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ اذیت اور درد برداشت کرتی مطلوبہ سمت بڑھی اور اگلے ہی لمحے اپنے عبایا تلے موجود ایک پسٹل سے گارڈ کے سر پر وار کرنے کے بعد دوسرے شخص کو جالیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی پھرتی تھی۔

''یہ...... کک...... کیا۔'' مونا کی چیخ و پکار سے قبل ہی مرد نے اس کے منہ میں اپنے ریوالور کی نال گھسیڑ دی۔

اگلے چند لمحوں میں میدان خالی ہو چکا تھا۔ انہوں نے نہایت اطمینان سے مطلوبہ زیورات اپنے بیگ میں منتقل کیے اور بااعتماد طریقے سے چلتے ہوئے باہر نکل آئے۔ عورت کی آنکھوں اور وجود کو ایک بار پھر اذیت بھری نقاہت نے ڈھانپ لیا تھا۔

''کیا ہوا میم؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' ایک سیلز مین نے استفسار کیا۔ اس وقت وہاں موجود تینوں افراد ہی مختلف کسٹمرز کو بھگتا رہے تھے۔

''یہ کڈنی پیشنٹ ہیں اور اس وقت انہیں ٹریٹمنٹ کی سخت ضرورت ہے۔ آپ سے جلد ہی دوبارہ ملاقات ہو گی۔'' مرد نے پریشانی اور گھبراہٹ میں کہا اور اسے باہر لے جا کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ بازار چونکہ ابھی مکمل طور پر نہیں کھلا تھا اس لیے پارکنگ میں بالکل ہجوم نہیں تھا۔ وہ سیٹ کی پشت سے اپنا سر ٹکا کر گہری سانسیں لینے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اسے دلاسا دیتے ہوئے مرد نے گاڑی تیزی سے بھگادی۔ مرکزی سڑک پر آتے ہی دونوں کا جوش دیدنی تھا۔

''ارسلان کو میسج کر دو فوراً۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں عمران باؤ! میں نے گاڑی میں بیٹھنے سے قبل اسے مخصوص اشارہ کر دیا تھا۔ وہ مطمئن ہو گا۔'' نقاب کی اوٹ سے سرشار آواز ابھری۔

''اب اس گیم کا مکمل دارومدار اسی پر ہے۔ اس کی کوئی بھی حماقت سارا کھیل بگاڑ دے گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم اب اس گاڑی سے چھٹکارا

پاؤ اور آگے کی سوچو۔"

عمران نے گاڑی ایک نالے کے پاس کھڑی کی اور ہر ممکن جگہ سے تمام فنگر پرنٹس مٹانے سے پہلے گاڑی میں ہی لباس بھی تبدیل کرلیا۔ اب وہ سادہ سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ اگلی منزل پر روانگی کے لیے تیاری نے اعصاب میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

☆☆☆

ارسلان کی حسیات جیولرز شاپ پر ہی مرکوز تھیں۔

پندرہ منٹ بعد ہی اس واردات کی خبر بازار میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ اندرونی جانب برپا ہونے والی اس قیامت کا علم سب سے پہلے ثاقب نامی سیلز مین کو ہوا تھا۔ ان دونوں افراد کی روانگی کے بعد مونا نے خلافِ معمول 'اوکے' کا سگنل نہ دیا۔ وہاں موجود کسٹمرز کو بھگتا کر جب وہ خود وہاں پہنچا تو پہلی نظر لہولہان حالت میں زمین بوس گارڈ پر پڑی۔ کاؤنٹر کے نیچے بے سدھ مونا اور رحمت اللہ بھی کافی زخمی تھے۔ شوکیس اور کاؤنٹر میں موجود سبھی زیورات غائب تھے۔ یہ منظر دیکھ کر رحمت کے بڑے بھائی کی حالت بھی خستہ ہوگئی۔ پولیس کی آمد تک شفقت اللہ دل میں پیدا ہونے والی درد کی لہروں کے باعث ایک نجی اسپتال میں منتقل ہو چکا تھا۔

پولیس نے ملازمین کو بھی شک کے دائرے میں گھسیٹ کر خوب پوچھ گچھ کی لیکن ان دو افراد کے حلیے اور گاڑی کے نمبر کے سوا کچھ بھی علم نہ ہوسکا۔ گاڑی ایک گھنٹا قبل کسی پارکنگ سے چرائی گئی تھی جس کا مقدمہ بھی بیس منٹ قبل ہی ایک تھانے میں درج ہوا تھا۔ فنگر پرنٹس کے نام پر بھی کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

بازار میں سبھی دکاندار ان مبینہ ڈکیتوں کی دیدہ دلیری پر عدم تحفظ کا شکار ہو رہے تھے۔ آس پاس کے سبھی سناروں کو تنبیہہ کردی گئی کہ مشکوک مال بیچنے والے کی فوری اطلاع فراہم کی جائے۔ ایک ہفتے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود ان دونوں افراد کا کوئی سراغ نہ مل سکا اور پھر ایک روز ایسی خبر آئی کہ سارا بازار ہی سوگ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

سنیچر کی رات ارسلان جب گھر آیا تو کافی مضمحل تھا۔

اس نے اپنے اکلوتے اٹیچی میں رکھی زائد سم نکال کر فون میں لگالی۔ یہ سم کارڈ اس کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھا اور کچھ عرصے سے وہ اپنے سوشل اکاؤنٹس کے علاوہ 'نجی معاملات' بھی اسی کے ذریعے چلاتا تھا۔ سم آن ہوتے ہی سوشل اکاؤنٹ میں عمران کا ایک پیغام اس کا منتظر تھا۔ وہ جلد از جلد اس سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ ارسلان نے اگلے روز اپنی آمد کی اطلاع دی اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

اس نے دو روز کی چھٹی لے رکھی تھی اور دکان مالکان کو یہی بتایا تھا کہ اس کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ کپڑوں کے دو جوڑے اور چند ضروری اشیا ایک بیگ میں رکھنے کے بعد وہ نہایت پریشانی کے عالم میں ہمسائے میں موجود گھر کے دروازے پر دستک دینے لگا۔

"کیا ہوا بیٹا؟ اس وقت کہاں جارہے ہو؟" ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھولتے ہی تشویش سے پوچھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ کلرک تھا اور بازار ہی میں آلو کے قتلے بیچ کر گزر بسر کرتا تھا۔

"ماموں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے چاچا! دو چار روز کے لیے جارہا ہوں۔ آپ گھر کا خیال رکھیے گا۔" اس نے چابی تھماتے ہوئے کہا۔

"بے فکر ہو کر جاؤ۔ پروردگار انہیں صحت و تندرستی دے۔" ان کی خلوص بھری دعا پر ارسلان شکریہ ادا کرتا روانہ ہوگیا۔ خوابوں کے جگنو اب اسے اپنی دسترس میں آتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس کے قدم تیز ہوگئے۔ اسٹیشن پندرہ منٹ کی مسافت پر ہی تھا۔

☆☆☆

ریل گاڑی اپنی مخصوص رفتار و آواز سے لاہور کی جانب گامزن تھی۔ ارسلان کے تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہوتے جارہے تھے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے وہ سخت اعصابی دباؤ میں مبتلا رہا تھا۔ بازار میں پولیس کی بار بار آمد اور مخصوص اکھڑ انداز میں کی گئی تفتیش سے اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنا ضبط کھودے گا۔ متوقع گرفتاری کا خوف کبھی کبھی اس کے بدن پر لرزہ طاری کردیا کرتا۔ ابتدا میں ہی وہ ہمت ہار کر منظر عام سے ہٹنے کا منصوبہ بنا چکا تھا لیکن عمران نے اسے اس حماقت سے روک کے رکھا۔

"تمہاری ایک غلطی ہم سب کو لے ڈوبے گی۔ ایسے موقع پر غیر فطری انداز میں غائب ہونے پر پہلا شک تجھی پر جائے گا۔"

"ان کے تیور بہت خطرناک ہیں یار! زبان و انداز اتنا واہیات ہوتا ہے کہ مجھے طیش آنے لگتا ہے۔"

"کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ پھر یہ ساری تفتیش ٹھپ ہوجائے گی۔ تم وہیں رہو اور مناسب وقت پر ہی

نکلنا۔‘‘ اس کے اصرار پر ارسلان خود کو مزید بے بس محسوس کرنے لگا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ واردات کا مشکل ترین مرحلہ بآسانی حل ہو گیا تھا لیکن اس وقت کی تو اُس نے کوئی تیاری ہی نہیں کی تھی۔

ٹرین کی کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھتے ہوئے اس کی ذہنی رو ایک بار پھر اسی رات کی جانب مڑ گئی جب ایک خواب نے ذہن میں انوکھا خیال پیدا کیا تھا۔ اس نے فی الفور عمران ہی کو فون کیا جو اس کی نئی تجویز سن کر پہلے خاموش ہو گیا تھا۔

’’آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن رسکی بہت ہے۔‘‘

’’تھوڑا بہت رسک تو ہمیں لینا ہی پڑے گا۔ اس میں ایک فائدہ بہر حال یہ بھی ہے کہ بازار میں کسی کی نظر میں نہیں آ پائیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے کل ملاقات کر کے اس کی تفصیلات طے کر لیتے ہیں۔‘‘

اگلے روز کی ملاقات بہت اہم ثابت ہوئی۔ عمران اس کے نئے پلان سے جزوی طور پر متفق ہو چکا تھا تاہم چند معاملات اب بھی غور طلب تھے۔

’’اس منصوبے کی رو سے ہمیں ایک عدد خاتون کی ضرورت پیش آئے گی اور یہی نکتہ سب سے زیادہ رسکی لگ رہا ہے۔‘‘

’’میں تو سوچ رہا تھا کہ ہم میں سے ہی کوئی یہ گیٹ اَپ لے لیتا۔‘‘ ارسلان نے کہا۔

’’ایک منٹ میں پکڑ لیے جائیں گے۔ کیا تجھے علم نہیں کہ کسی بھی عورت کے لیے ہم مردوں کی نظر میں ریڈار فٹ ہوتے ہیں جو خوبصورتی اور نزاکت کے پیمانے میں رتی بھر کی بیشی سے تجسس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں کسی کا بھی تجسس ہمارے لیے بہت مہلک ثابت ہوگا۔‘‘ عمران نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا اور گہری سوچ میں کھو گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے پر بپا ہونے والے تلاطم نے ارسلان کو چونکا دیا۔

’’نشا...... اسی کی مدد سے یہ بیڑا پار لگ سکتا ہے۔‘‘

’’کون نشا؟ کوئی بھی خاتون کسی بات کو راز رکھ سکتی ہے کیا؟ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں۔ وہ اس بات کا بھانڈا پھوڑ ہی دے گی۔‘‘ اس نے اپنے کچھ سابقہ تجربات یاد کرتے ہوئے کہا۔

’’نشا سے ایسی کسی بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اصل نام نوشاد ہے۔ وہ مرد ہے نہ عورت۔ اپنے قبیلے کے افراد سے مختلف زندگی گزارنے کی خواہش نے اسے

تمہارا خون برانڈی جیسا ہے

محنت مزدوری کرنے پر اکسایا۔ اس کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ ہے۔ بازار میں دکانداروں کو دوپہر کا کھانا فراہم کرنے کی ڈیوٹی کرتا تھا۔‘‘

’’تھا...... مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ ہمارے معاشرتی اصولوں میں اتنی لچک کہاں کہ ایک نامکمل وجود کے لیے مددگار بن سکیں۔ اسے پہلے پہل تو طنز و مذاق کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ پھر کچھ بدکردار افراد نے ہراساں کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے احتجاج اور کمیٹی صدر کے سامنے شکایت کرنے کے بعد الٹا اسی پر چوری چکاری کے الزامات لگا دیے۔‘‘ عمران نے انکشاف کیا۔

اگلی رات نشا ان لوگوں کے ساتھ موجود تھا۔ عمران اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر چکا تھا۔

’’بہت رسکی معاملہ ہے باؤ عمران!‘‘

’’ہے تو سہی! لیکن کامیابی کی صورت میں ہماری زندگیاں بدل جائیں گی۔‘‘ ارسلان نے کہا۔ ’’آپ کے بھی یقیناً بہت سے خواب ہوں گے۔‘‘

’’اوئے گل سن کا کا! میرے خوابوں کی فکر کرنی چھوڑ تو۔ مجھے خود پر ترس کھانے والے لوگ بڑے ہی زہر لگتے ہیں۔ اس لیے یہ مت سوچنا کہ اپنی مظلومیت کے رونے روتا ہوا میں تمہاری ہر بات مان لوں گا۔ شکر ہے سوہنے رب کا اس نے مجھے جیسا بھی بنایا ہے۔‘‘ اس نے اپنی مٹھاس بھری آواز میں کہا۔

خاصی ردوکد اور بحث و مباحثے کے بعد اس نے عملی تعاون کی حامی بھر لی۔ اس کے کئی مشورے بہت مفید ثابت ہو رہے تھے۔ اس وقت یہ فیصلہ نہیں ہو پایا تھا کہ نشا کے ساتھ عملی پارٹنر کون ہوگا تاہم اگلے روز یہ قرعہ خود کار طریقے سے عمران کے حق میں نکل آیا۔

اس کی ذہنی کیفیت خاصی الجھی ہوئی تھی۔ اسی کشمکش میں اس نے ایک خاتون کے سامنے مطلوبہ جوتا لاکر رکھا تو پاؤں میں پہنانے کے دوران اس کا ہاتھ خاتون کی ٹانگ سے مس ہوگیا۔ موصوفہ بُری طرح بدک اٹھیں۔ اس کا ساتھی مرد عمران پر پل پڑا۔ دکان انتظامیہ نے معاملہ رفع دفع کروانے کی کوشش کی لیکن مرد کا مطالبہ تھا کہ وہ ان کی قدم بوسی کر کے معافی طلب کرے۔ وہ تبدیلی کا لمحہ تھا۔ عمران نے اس فرمائش پر عمل کرنے سے انکار کیا اور نوکری چھوڑ کر چلا آیا۔ اس واردات کے لیے اب اس کی سنجیدگی حد سے سوا تھی۔ نشا کے مشورے پر انہوں نے اپنی جمع پونجی اکٹھی کرنے کے بعد ہتھیار خرید لیے۔ نشا نے اپنی بچت اور جمع جتھا ایک طلائی زیور خریدنے کے لیے صرف کرنا تھا۔

بھائی بھائی جیولرز میں ہونے والے مبینہ ایکٹ کی کئی بار پریکٹس کی گئی۔ نشا کی آمد ان کے لیے بہت بڑا بونس ثابت ہوئی تھی۔ اس کی کارکردگی بھی حقیقتاً لاجواب تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب بے خوفی اور اعتماد تھا۔

''میرے پاس کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں اور پانے کے لیے مکمل جہان ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے لیے میں صرف اس لیے راضی ہوا ہوں کہ عمران باؤ کا ایک پرانا قرض چکانا ہے۔ یہ ایک بار میرے لیے بھرے بازار میں دکاندار سے بھڑ گیا تھا۔'' وہ صاف گوئی سے کہتا۔ کھانا فراہم کرنے کا کام چھوڑنے کے بعد اس نے علاقے کے ایک بااثر شخص کی نجی محافل میں شرکت کر کے پیسہ اکٹھا کرنا شروع کیا تھا۔ ہتھیاروں کا استعمال بھی اس نے وہیں ڈیرے پر سیکھا۔ اس کے علاوہ اپنے ہی قبیلے کے ایک فرد سے بیوٹی پارلر کا کام بھی سیکھنے لگا تھا۔ مستقبل کے لیے وہ بھی بیوٹی پارلر کھولنے کا خواہشمند تھا۔ اسی نے تیل اور ایک خصوصی سرمہ کے استعمال سے عمران کی رنگت کو سیاہی میں تبدیل کر کے چہرے پر انفیکشن نما داغ پیدا کیے اور بار بار پریکٹس کے بعد انہوں نے بظاہر ناممکن واردات کامیاب بنا دی۔ اتفاقات اور قسمت نے بھی اس کامیابی میں بھرپور کردار ادا کیا تھا۔

چوری شدہ گاڑی چھوڑتے ہی وہ بذریعہ ٹرین لاہور آگئے۔ اسٹیشن کے نزدیک ایک سستے سے ہوٹل میں دس روز کے لیے کمرا کرائے پر لینے کے بعد وہ حالات معمول پر آنے کے منتظر تھے۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ارسلان کی آمد کے بعد ہی زیورات ... فروخت ہونے تھے۔ اس شہر میں نشا کے کئی واقف کار تھے جن کے توسط سے اس کام کی تکمیل مشکل نہ ہوتی۔

اگلے روز دوپہر کے بعد ارسلان مطلوبہ ہوٹل تک پہنچ گیا۔ عمران اور نشا بہت پُرجوش تھے تاہم اس کی خاموشی اور بے چینی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کیا ہوا باؤ؟ منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟''

''سوچ رہا ہوں کہ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے ایک زندگی اجاڑنے کا حق ہمیں کس نے دیا تھا؟''

''کک...... کیا مطلب ہے تیرا؟'' عمران چونکا۔

''شفقت اللہ دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا ہے۔ خون زیادہ بہہ جانے کے بعد رحمت اللہ کی حالت بھی خطرے میں ہے۔ اس کے بیٹے نے قتل کی ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔''

''ہائے میں مرجاواں! میں نے تو بڑے پولے ہاتھوں سے مارا تھا اسے۔'' نشا نے کہا۔

''اب کیا صورتِ حال ہے وہاں؟'' عمران نے پوچھا۔

''عبیداللہ نے ملازموں کو ایک ماہ کی زائد تنخواہ وغیرہ دے کر فارغ کر دیا ہے۔ دکان کا باقی سامان سمیت کر لکڑی اور شیشے کے ریکس وغیرہ اتار کر لے گئے ہیں۔ چینی کے برتنوں والا مجید اپنے کسی بھائی کو وہاں کتابوں کی دکان سیٹ کروا کر دینا چاہتا ہے۔ پارٹیشن کی دوسری جانب وہ انٹر نیٹ وغیرہ کی سہولت دے گا۔''

''جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا...... ہم نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا اور نہ ہی ہم پیشہ ور مجرم ہیں۔ ان کی اسی طرح لکھی تھی۔ ہم نہ ہوتے کوئی اور ہوتا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ زیورات بیچنے کے لیے کدھر جانا ہے؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''انارکلی میں ایک دکان ہے۔ وہ ایسا مال آدھے ریٹ پر خریدا کرتا ہے۔'' نشا نے بتایا۔

''تو چلو پھر دیر کس بات کی ہے؟'' ارسلان قدرے عجلت میں تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ایک رکشے پر سوار جب روانہ ہوئے تو ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص سے ملاقات کرنے والے ہیں جو ان کی زندگی ہی تبدیل کر دے گا۔

☆☆☆

انارکلی بازار کی رونقیں اپنے جوبن پر تھیں۔

سنار کی دکان پر پہنچ کر ان کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ سنار نے بڑے تپاک سے نشا کا استقبال کیا۔

''اوئے نشا بجلی! تو کدھر غائب ہوگئی ہے۔''

''عزت کی روٹی کمانے گئی تھی ستار باؤ! دو چار مہینے بعد ہی دماغ ٹھکانے آگیا۔ اب شیخ ایاز کے فنکشن بھگتاتی ہوں۔''

''تیرے جانے کے بعد ادھر کی تو ساری رونقیں ہی ختم ہوگئی ہیں۔''

''زیادہ مکھن نہ لگا! اگلے فنکشن کا بتا دینا مجھے۔ دو چار روز ادھر ہی ہوں۔ آجاؤں گی۔''

''بڑی خچری ہے تو!'' ستار نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''کسی دن تیرے ان قہقہوں سے چھت زمین پر آجائے گی اس لیے کام کی بات کرلے ان سے۔ یہ باؤ اپنی بیوی اور ماں کے زیور بیچنا چاہتا ہے۔ نیا کاروبار شروع کرنا ہے۔'' نشا نے عمران کی طرف اشارہ کیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں چن مکھناں! میں خرید لوں گا لیکن ریٹ چالیس فیصد کے حساب سے دوں گا۔'' اس نے کاؤنٹر پر موجود سیاہ باٹ نما چیز کو کھسکا کر سامنے کیا۔ اس سے زیور کی پرکھ کی جاتی تھی۔ عمران نے ارسلان کے زانو پر رکھے بیگ سے چند انگوٹھیاں اور سیٹ نکال لیے۔ منصوبے کے مطابق انہیں دو مختلف دکانوں پر یہ مال فروخت کرنا تھا۔

''کیا حال چال ہیں بادشاہو! بڑی ترقیاں کررہے ہو کاروبار میں۔'' ایک چہکتی ہوئی سرشار آواز نے ستار کو مخاطب کیا۔

''او خیر! آج تو بڑے اونچے بندے تشریف لائے ہیں اس غریب خانے پر۔'' ستار ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہیں پھیلا کر کاؤنٹر کے عقب سے ہی نووارد سے معانقہ کرنے لگا۔

نووارد کا چہرہ سامنے آتے ہی ارسلان کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ کر زمین پر جاگرا۔ اس کے لبوں سے برآمد ہونے والی سرسراتی مدھم صدا نے نشا اور عمران کے رنگ بھی فق کردیے۔

''عبیداللہ...... یہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔''

☆☆☆

کائنات کے ہر منظر نے تاریکی کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

اس روز کسی اہم کرکٹ میچ کے باعث گلیاں، محلے معمول سے کچھ زیادہ ہی سنسان تھے۔ ایسی ہی اس سونی

نماز

جماعت کی ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدے کے لیے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدے کو قربان کردینا اور اختلاف باہمی کو ترک کرکے صرف ایک مرکز پر جمع ہوکر جماعتی، مستی کی وحدت میں فنا ہوجانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے۔ اس کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و میر لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کرلینا ضروری ہے۔ اسلام کی نماز انہی رموز و اسرار کا گنجینہ ہے۔ یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے۔ اسی لیے اس کے بغیر مسلمان نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی جماعتی وحدت ہے۔ نہ انقیاد امامت ہے۔ نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے۔

مرسلہ: ریاض اختر تبسم، بابو محمد محلہ، مردان

گلی میں قدموں کی چاپ بتاتی تھی کہ راہگیر نہایت بیزار اور بوجھل کیفیت میں مبتلا ہے۔ ہر گھر سے کمنٹری کی آواز اور افرادِ خانہ کے پُرجوش نعرے اس کے قدموں میں مزید تیزی پیدا کردیتے۔ یہ تھکا ہارا، مایوس شخص ارسلان تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر اس کے پردۂ تصور پر چند روز قبل گزرے پُرجوش لمحات زندہ ہوگئے جب وہ تینوں مستقبل کے لیے سہانے خواب دیکھنے میں مگن ہوتے تھے۔ اس کی حالت ایسے سگ گزیدہ کی سی تھی جسے ہر منظر میں اپنا شکاری ہی دکھائی دیتا ہے۔ عبیداللہ ان کا شکاری ہی تو تھا۔ اس روز ستار کی دکان میں عبید کی آمد کسی بم دھماکے سے کم نہ تھی۔ اگر وہ واقعی ان میں سے کسی کا تعاقب کرتے ہوئے آیا تھا تو اب پولیس کے درشن بھی یقینی تھے۔ ان سبھی کی سٹی گم ہوچکی تھی۔

''میں نے تم دونوں کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے، کہاں بھلا؟'' اس کی آنکھوں میں سرد مہری تھی۔

''یا اللہ! کہاں غلطی ہوگئی تھی ہم سے؟'' ارسلان نے ہونٹ کچلتے ہوئے سوچا۔

''انہیں نہیں دیکھا ہوگا باؤ! ان جیسے کسی غریب کو دیکھا ہوگا۔ اس دنیا میں ہر غریب ایک جیسا ہی تو دکھتا ہے۔'' حسبِ سابق نشا نے ہی سب سے پہلے خود کو سنبھالا اور اسے مدلل جواب دیا۔ اسی دوران دو باتیں بہت تیزی سے وقوع پذیر ہوئیں۔ ستار اپنے ملازم کو خصوصی ریفرشمنٹ کا سامان

لانے کی ہدایات دینے لگا۔ اس کی پشت ان تینوں کی جانب تھی۔ اسی وقت عبید کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ فون سنتا ہوا دکان کے دوسرے کونے میں پہنچ گیا۔

''یہ بیگ اٹھاؤ اور یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ اردو بازار سے ہوتے ہوئے داتا دربار پہنچ جانا۔ میں بھی وہیں آجاؤں گا۔ ایک سیکنڈ کی بھی دیر مت کرو۔'' نشا کی سرسراتی آواز نے ان کے وجود میں بجلی دوڑا دی۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی ان کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوتی۔ وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح وہاں سے روانہ ہوگئے۔

دربار میں پہنچنے تک ان کا تنفس بے ربط ہو چکا تھا۔ وہ دونوں ٹھنڈے فرش پر ہی ایک جانب بیٹھ گئے۔ اسی وقت عمران کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

''کس کا فون ہے؟'' ارسلان متوحش ہوا۔

''نشا کا......'' اس نے الجھ کر کہا اور سبز بٹن دبا دیا۔ ارسلان بھی فون کے بالکل قریب ہوگیا۔ ان کی سماعت میں نشا اور ستار کی آوازیں گونجنے لگیں۔

''ارے! یہ دونوں کدھر چلے گئے؟''

''اس کی زنانی کا فون آگیا تھا ستار باؤ! کہہ رہی تھی کہ اس کے بھائیوں نے پیسے کا بندوبست کردیا ہے۔ زیور واپس لے آؤ۔ تم خود تو اپنے اس نئے مہمان کے ساتھ کھابے اڑا رہے تھے۔ اچھا خاصا سودا گنوا دیا۔''

''ایک تو ان زنانیوں کی بھی سمجھ نہیں آتی کہ زیورات پر جان کیوں دیتی ہیں۔'' ستار کی طنزیہ آواز ابھری۔ ''خیر میں یہ بتا رہا تھا کہ کل میرے چھوٹے بیٹے کی مہندی کا فنکشن ہے تو آئے گی کہ نہیں؟''

''آجاؤں گی بھئی! اچھا ہے دیہاڑی لگ جائے گی۔ ویسے یہ بتا کہ یہ جو باؤ تیرے پاس آیا تھا' اسے بھی بلایا ہے کہ نہیں؟ مجھے کہہ کر گیا ہے تیری آواز بڑی 'فٹ' ہے۔ کسی گانے شانے کا چانس دلوا دوں گا۔'' نشا نے معنی خیزی سے پوچھا۔

''میں نے کہا تو ہے اسے بھی لیکن اسے اپنے باپ اور چاچے کے ساتھ عمرہ .... کرنے جانا ہے کل۔ مشکل ہی آئے گا۔''

''کرتا کیا ہے یہ؟ پہلے تو کبھی اس بازار میں نہیں دیکھا۔''

''ارے! دیکھے گی بھی کیسے؟ بڑی اونچی شے ہے یہ...... یہاں پر ایسے ہی نہیں آیا تھا۔ سارا بازار گھوم پھر کر جائزہ لے رہا ہوگا کہ آج کل کون سے ڈیزائن کے زیور زیادہ 'اِن' ہیں۔ پھر یہاں سے پان منڈی جائے گا اور ویسے ہی انڈین زیورات اٹھا لائے گا۔''

''اس کی دکان کا پتا ہی بتا دے۔ فلم میں چانس مل جائے گا مجھے۔'' وہ بہت ہوشیاری سے اپنے پتے کھیل رہا تھا۔

''یہ لوگ پہلے اچھرہ میں ذیلدار روڈ پر کرائے کی دکان میں بیٹھتے تھے۔ دو مہینے بعد ڈیفنس چلے گئے۔ اس کے بعد سنا تھا کہ شاہدرہ اور فیصل آباد میں بھی پھیرا ڈالا ہے۔ کسی بھی جگہ دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے۔ پان منڈی سے انڈین زیور اصلی کے بھاؤ بیچ کر خوب مال کماتے ہیں۔''

''ہائے اوربا! نقلی زیور اصلی کے بھاؤ بیچتے ہیں۔ توبہ توبہ! اتنی دیدہ دلیری۔'' نشا کی متوحش آواز نے ان کے وجود پر بھی قیامت ڈھا دی تھی۔

''بڑی ہی سیدھی ہے بھئی نشا بجلی تُو تو۔ ارے گولڈ مارکیٹ میں کچھ عرصے سے ڈکیتیوں کی کامیاب وارداتوں کی وجہ سے مالکان نے آرٹیفیشل زیور رکھنے شروع کر رکھے ہیں۔ ڈیزائن دکھا کر اصلی مال ڈلیور کروا دیتے ہیں۔ یہ تگڑم ذرا سیانی ہے۔ نقلی دکھا کر نقلی ہی بیچتی ہے۔''

''بڑے ہی کمینے ہیں یہ تو! آپ لوگ پکڑواتے کیوں نہیں انہیں؟''

''اوئے پاغلے! تیرے میرے جیسوں کی سوچ جہاں ختم ہوتی ہے ناں! ان کی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ہائی سوسائٹی کے سیٹھ لوگوں کو انہوں نے پہلے ہی مٹھی میں کر رکھا ہے۔ وہ اپنی کسی نہ کسی 'سہیلی' کے ساتھ انہیں اپنا خاندانی سنار بتا کر دکان میں آتے ہیں اور من پسند شاپنگ کروا کے اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔ اصل منافع یہ عام لوگوں کو لوٹ کر ہی حاصل کرتے ہیں۔ اگر کوئی شکایت کر بھی دے تو سیٹھ لوگ ایک گھنٹے میں انہیں مکھن سے بال کی طرح نکال لائیں گے۔'' ستار کی آواز ان کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

''اب چھوڑ ان فضول باتوں کو! کل آئے گی کہ نہیں؟'' اس نے ایک بار پھر سابقہ سوال دہرایا۔

''ایک بڑھیا سا سوٹ دلوا دے۔ تیرے فنکشن کو یادگار بنا دوں گی۔''

عمران کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے فون بند کردیا۔ ارسلان کی حالت بھی دیدنی تھی۔ اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے انہوں نے جمع پونجی لٹا دی تھی اور اب تھکے ہارے جواریوں کی طرح سر نہوڑائے بیٹھے تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کائنات کی ہر شے کی گردش تھم چکی تھی۔ زیورات سے بھرا بیگ وہیں چھوڑے وہ بدحواس ہو کر گھر آگئے تھے۔

☆☆☆

منظر ایک بار پھر اسی گھر کا تھا۔ وہ تینوں اداس اور خاموش بیٹھے تھے۔

''ہاں بھئی ارسلان باؤ! اب کونسی دکان لوٹنی ہے؟'' نشا نے طنز کیا۔

''ایک ہی لوٹ کر کنگلے ہو گئے ہیں۔ اب مزید کی ہمت کہاں سے لائیں؟'' اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کا بھی اتنا نقصان ہو گیا۔''

''اوئے بس کر کاکا! بس کر۔ تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے خود پر ترس کھانے والے لوگ بڑے زہر لگتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں ہر بات اور ہر واقعے کو قدرت کی طرف سے ایک سبق سمجھ لیا کرتا ہوں۔ اس واردات میں بھی میرے لیے کئی سبق موجود تھے۔ دوسری بات میں اس نقصان کے بدلے ستار باؤ کے ایک فنکشن سے اتنی ہی کمائی کر آیا ہوں۔ بہرحال اگر کبھی کسی چنگے کام کے لیے میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا اور اس ناکامی کا ماتم کرنے کے بجائے کوئی اچھا کام کرنے کی کوشش کرنا۔ قسمت دوسرا موقع قسمت والوں کو ہی دیا کرتی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہوا روانہ ہو گیا۔

''بات تو اس نے سولہ آنے ٹھیک کہی ہے۔ اس بار تو قسمت اور اتفاقات نے ساتھ دے دیا ورنہ اگر پکڑے جاتے تو جانے کیا ہوتا؟'' عمران نے کہا۔ وہ عادی مجرم نہیں تھے اس لیے پہلی واردات کے بعد ہی ہمت ہار بیٹھے تھے۔

''اب کیا سوچا ہے تم نے ویسے؟''

''کچھ نہیں! کہیں ہاتھ پاؤں مار کر سیلز مین بننے کی ہی کوشش کروں گا۔ تو نے کیا سوچا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ زندگی جس طرح چل رہی ہے' اپنی قسمت' اسی طرح جیتا رہوں گا۔''

اس روز کے بعد وہ اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ مالی نقصان کا خیال کبھی کبھی اسے مضطرب بھی کر دیتا تھا لیکن تائب ہونے کے بعد وہ اپنے فیصلے پر قائم ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس رات بھی دکان سے واپسی پر وہ اپنی 'کامیاب واردات' کے بارے میں سوچ کر افسردہ ہونے لگا۔ اسے اپنی زندگی بے مقصد محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک نے اسے چونکا دیا۔

''اس وقت کون آگیا؟'' وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر روانہ ہو گیا اور وہاں نشا کو موجود پا کر مزید حیران ہوا۔

''تیرے ساتھ ایک بڑی ضروری گل کرنی ہے مجھے۔'' وہ کافی سنجیدہ تھا۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ آجاؤ اندر!''

کمرے میں پہنچ کر نشا نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے تھما دیا۔ ''یہ لے پکڑ! تمہارے ہتھیار میں نے شیخ ایاز کے ڈیرے پر فروخت کروا دیے ہیں۔ یہ اسی کی پیمنٹ ہے۔''

''میں تیرا شکریہ کیسے ادا کروں یار! حقیقت تو یہ ہے کہ میں واقعی مایوس ہونے لگا تھا۔ یہ میری محنت کی کمائی تھی اس لیے ضائع ہونے کا دکھ بھی بڑا تھا۔''

''محنت کی کمائی کبھی رائگاں نہیں جاتی باؤ! اور اگر شکریہ ہی ادا کرنا ہے تو میرا ایک مشورہ مان لے۔''

''ہاں بول ناں! میں بالکل مانوں گا۔''

''انسان کو ہمیشہ اپنے اوپر نہیں' نیچے والوں کو بھی دیکھ لینا چاہیے۔ تیرے پاس اپنا گھر ہے' نوکری ہے۔ ہزاروں لوگوں سے بہتر زندگی جی رہا ہے۔ تیرے کندھوں پر کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ اونچے خواب دیکھنے چھوڑ دے۔ اپنے باؤ عمران کی طرف دیکھ۔ اس کی ذمے داریاں اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا رہی ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتا ہے تو...... کھل کر کہہ۔''

''میں صرف اتنا کہوں گا کہ زندگی میں بہت اندھیرے محسوس ہوں تو اپنے آس پاس موجود کسی کا سہارا لے لینا چاہیے یا کسی کا سہارا بن کر اسے تاریکی سے نکال لینا چاہیے۔ باؤ عمران کی ذمے داریوں کا بوجھ ہلکا کر کے تیری زندگی میں بھی رونق آسکتی ہے۔ اگر میرا مشورہ قبول ہو تو بتا دینا ورنہ تجھ سے گلہ کبھی بھی نہیں ہوگا۔'' وہ اس کا کندھا تھپتھپاتا چلا گیا۔

ارسلان بے یقینی اور حیرت کی کیفیت میں گھرا تھا۔ نشا کی بات کا ماخذ اسے سمجھ میں آگیا تھا۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے فون نکالا اور اسے ایک پیغام بھیج دیا۔

''تو ٹھیک کہتا ہے۔ زندگی میں اندھیروں کو تاریکی سے نہیں مٹایا جا سکتا۔ اگر عمران کو کوئی اعتراض نہیں تو مجھے تیرا مشورہ قبول ہے۔ شکریہ!''

''شکریہ ادا نہ کر پاگلے! بس اپنے ویاہ پر ایک بڑھیا سا سوٹ سلوا دینا مجھے۔'' نشا کے جواب پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 46

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانجے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر

میں تباہی مچادیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔سی جی بھوانی،شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر،شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔اپنے ساتھیوں کی . بائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کور یلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے،جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی،سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد تولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے،پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔جاتے ہوئے پریل،شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔شہزی،لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔شہزی،پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔پریل،شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی،میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے،میجر وسیم،شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ،نوید سانچے والا کی قید میں ہے۔عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔یہ وزیر جان تھا۔اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔مگر شہزی،وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ان کا سرغنہ،شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔وزیر خان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ایک برج پر شہزی،وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔کاسپاکو،شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا،اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔اور اس کے لیے کاسپاکو نے شہزی کا انتخاب کیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

موت......یقینی موت کے تصور سے میرا پورا وجود لرز کر رہ گیا۔

اب تک تقدیر نے جہاں میرے کام سنوارے ہیں تو وہیں غیر متوقع طور پر کچھ کام بگڑ بھی گئے ہیں۔ بھانت بھانت کے خطرناک اور ایک سے ایک جغادری دشمن میرے راستوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح دانت نکوسے اچانک آن کھڑے ہوتے تھے۔ کبھی وہ مجھے بچھاڑتے تو کبھی میں انہیں دھول چٹا دیتا۔

دِگرگوں حالات سے میرا چولی دامن کا ساتھ ہو چکا تھا۔ لیکن امریکا یاترا کے لیے میری پاکستان سے لے کر یہاں تک کتنی ہی کوششیں تھیں جو بارآور ثابت ہوتے ہوتے بیکار ہوتی چلی گئیں۔ اب جبکہ آخری امید کاسپاکو کے ذریعے کچھ بنتی نظر آئی تو یہ اچانک عجیب تیوروں کے ساتھ پستول ہاتھ میں لیے آن وارد ہوا تھا۔ شاید اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔

''یہ لو......تمہارا کام ختم ہو گیا ہے تو اسے گولی مار دو......یہ اب ہمارے لیے بے کار ثابت ہو چکا ہے۔'' تب ہی اچانک اس کی نظر جان روڈلف کے زخمی ہاتھ پر پڑی (میں نے پہلے اس کے زخمی ہاتھ کی ڈریسنگ وغیرہ کرا دی تھی)

''اوہ......تم نے اس کی مرہم پٹی کروا دی؟ کیا ضرورت تھی اس کی؟ اسے گولی مار دو......''

دفعتاً کاسپاکو میری طرف دیکھ کر ہنسا اور بے اختیار میرے سینے میں اٹکی ہوئی سانس کسی طائر آزاد کی طرح جیسے پھڑ پھڑاتی ہوئی نکلی۔ ورنہ تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید اب ایک بار پھر میرا کھیل بگڑ گیا ہے۔

''ابھی نہیں باس......!'' میں نے جواب میں کاسپاکو کی طرف دیکھ کر پوری تسلی سے مسکرا کر کہا۔ اس کے لیے ''باس'' میرے منہ سے یونہی...نہیں نکلا تھا... وہ محسوس کرتے ہوئے بولا۔

''اچھا لگا تمہارا مجھے باس کہنا۔ خیر جیسے تم مناسب سمجھو، میرا ایک مہمان آنے والا ہے، میں یہاں تک اس سے ملنے آیا تھا۔''

پستول اس نے اپنے ساتھ کھڑے ایک ہرکارے کو تھما دیا۔ ''تمہاری بات چیت ختم ہو گئی ہے تو تم بھی آ جاؤ۔'' اس کے بعد یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی خودکار وہیل چیئر کے لیور کو گھمایا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

ہم باہر نکل آئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

''سون کے سلسلے میں کیا، کیا تم نے؟'' اس نے چلتے چلتے پوچھا۔ وہ علاج والے گوشے سے اب یہاں آ چکا تھا۔

''وہ اس سارے معاملے میں بے قصور ہے۔'' میں اندر سے ڈرتے ڈرتے مگر محتاط سے لہجے میں بولا۔ میں اس کی چیئر کے متوازی چل رہا تھا۔ ہم ایک چوڑی راہداری سے گزر رہے تھے۔

''تم شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے مگر عورتوں کے معاملے ذرا نرم ہو، لگتا ہے سون تمہیں پسند آ گئی ہے۔'' کاسپاکو نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ''ورنہ میرے نزدیک ذرّے سے بھی شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔''

''کچھ ایسی ہی بات سمجھ لیں۔'' میں نے ذرا جھینپی جھینپی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''ویسے باس! میں نے ان دونوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''کہاں؟''

''میں آپ کو ابھی اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کرتا ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

کچھ منٹوں بعد ہم ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ڈین چنگ اپنے ایک ساتھی ہرکارے کے ساتھ وہیں الرٹ کھڑا تھا۔ کاسپاکو کو سہارا دے کر چیئر سے آرام دہ صوفے پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ سامنے کی گلاس ٹاپ والی میز پر لوازمات سرو کر دیے گئے تھے۔ کاسپاکو شغل کے دوران میں میری طرف تکنے لگا۔ اس کی نظروں کا مطلب بھانپ کر میں نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔

''مجسمے کی امریکا کی جانب ترسیل، اس اہم ترین مہم پر روانگی اور اس کے پسِ پردہ ہونے والے......بیش قیمت سودے کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے کی ضرورت کے پیشِ نظر ہی میں نے جان روڈلف کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اتنا کہہ کر میں لحہ بھر کو رکا۔

''ہم......میں سمجھ رہا ہوں۔'' کاسپاکو واڈکا کا ایک تلخ گھونٹ معدے میں منتقل کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''جوشوا نے آپ سے جھوٹ بولا ہے کہ روڈلف والا معاملہ محض ایک شخص کی بدنیتی پر مبنی ہے، جبکہ یہ ایک پوری سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا گیا تھا۔''

''ہم......'' کاسپاکو نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ اس کا چہرہ اندرونی اُبال سے پھر سرخ ہونے لگا تھا۔ ''تو گویا جوشوا اپنی ناکامی کے بعد ہم سے دوبارہ دغابازی کا کھیل کرنا چاہتا

ہے۔‘‘

’’یقیناً......!‘‘میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

’’دیکھو شہزی! یہ مہم سراسر تمہاری جان کے رسک پر مبنی ہے اسی لیے میں نے یہاں تک کا معاملہ تمہاری صوابدید پر چھوڑ رکھا ہے۔ تم جیسے بہتر سمجھو۔ لیکن...... جوشوا یہ سب کیوں کر رہا ہے؟‘‘

’’اس لیے کہ جوشوا جیسے لوگوں کا کام ہی نوسر بازی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’جعل سازی دھوکا، فریب، فراڈ یہی کچھ کرتے ہیں یہ لوگ۔ نصف رقم ہمیں دینے کے باوجود بھی دھوکا ان کے لیے فائدہ مند ہی ثابت ہوگا کیونکہ بقول روڈلف کے جوشوا پہلے ہی سے خفیہ طور پر اور انتہائی راز داری کے ساتھ مہنگے گاہک تلاش کر چکا ہے۔ ان میں ایک عالمی تنظیم ’’اسپیکٹرم‘‘ بھی شامل ہے۔ آخر اللہ کرگاہک سے انہیں بہت زیادہ رقم ملنے کی اُمید ہے۔ لہٰذا روڈلف کو میں جوشوا سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ یوں بھی یہ ثانوی بات تھی۔ میں نے اسے جوشوا کے متعلق یہ بتایا کہ اس نے اپنے جس بددیانتی کے منصوبے میں اسے استعمال کرنے کی کوشش چاہی اور اب ناکامی کی صورت میں وہ اس سے لاتعلقی کا اظہار کر کے اپنا یہ سودا بچانا چاہ رہا ہے۔ وغیرہ۔‘‘

’’گڈ! چال تو تم نے اس کے ساتھ اچھی چلی ہے مگر روڈلف ہمارے کس کام کا ہے اب......؟‘‘ کاساپا کو نے پوچھا۔ اس کا سوال میرے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ میں نے کہا۔

’’ہم اب جوشوا سے نہیں بلکہ اس کے گاہکوں سے براہِ راست سودا کریں گے جن سے ہمیں دھوکے کا کوئی خطرہ نہ ہوگا اور جوشوا سے دگنی رقم وہ ہمیں دیں گے۔ ہمارا یہ کام روڈلف آسان کرے گا۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ کاساپا کو میری جانب غور سے تکتا رہا۔ میں مزید بولا۔

’’جان روڈلف، ہمارے لیے جوشوا کے موٹی آسامی والے گاہک ’’اسپیکٹرم‘‘ کو ہمارے لیے ہائی جیک کرے گا۔‘‘

’’تمہارا منصوبہ نسبتاً شان دار اور سودمند ہے۔ مسٹر شہزاد!‘‘ کاساپا کو نے میری توصیف کی اور بولا۔ ’’روڈلف کو تو تم نے فٹ کر دیا یہ بتاؤ سون تمہارے اس منصوبے میں کہاں فٹ ہوتی ہے؟‘‘

’’وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ ایک حسین عورت کی سنگت...... بعض جگہوں پر خاصی آسانیوں کا سبب بنتی ہے۔‘‘ میں نے دانستہ اپنے لہجے اور مسکراہٹ کو معنی خیز بناتے ہوئے کہا۔

’’ہوم م م......‘‘ کاساپا کو ایک گہری ہمکاری لے کر رہ گیا پھر بولا۔ ’’ڈین چنگ بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔‘‘

’’بالکل۔‘‘ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ’’اس مہم میں، ہم چار افراد کافی ہوں گے۔ آپ بس ہماری امریکا روانگی کی مہم کا مکمل اور محفوظ بندوبست کر رکھیں۔‘‘

’’وہ سب پہلے ہی طے ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘

میں نے اس کے جواب میں اطمینان سے اپنا سر ہلا دیا۔

’’ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔‘‘

’’ہاں! کہو۔‘‘

’’میرے کاغذات کے سلسلے میں اب جوشوا سے کوئی مدد کی امید نہیں کی جا سکتی جبکہ بینکنگ کے چند ضروری اُمور نمٹانے میں مجھے وہاں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا کیا، کیا جائے؟‘‘

’’نو پرابلم۔‘‘ کاساپا کو بولا۔ ’’میں تمہارے نام سے اپنی بینک اسٹیٹمنٹ شو کر کے فوری طور پر تمہاری انویسٹر کی حیثیت سے ملٹی پریز ویزا تیار کرواتا ہوں۔ دنیا کے کسی بھی ملک کی ویزا پالیسی ’انویسٹر‘ کے سلسلے میں بے حد آسان اور جلد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ...... پیسے کو ہر ملک سلام پیش کرتا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اس میں تمہارے اصل کوائف ہی کام کے ہوں گے، جعلی کام نہیں ہو سکتا اس میں۔‘‘

’’میرے پاس اپنے اصل کوائف ہی ہیں باس!‘‘ میں نے جواب میں کہا۔ ’’البتہ تھائی لینڈ کا میرے پاس ویزا اب شاید چند دنوں کا ہی رہ گیا ہو۔‘‘

’’کوئی پروا نہیں، میں یہاں کا کنگ ہوں۔ کاغذات ٹھیک ہیں تو سمجھو کام ہو گیا۔ تم آگے کا لائحۂ عمل تیار رکھو، باقی مجھ پر چھوڑ دو، البتہ اپنے سفری کاغذات میرے حوالے کر دو۔‘‘

میں نے اپنے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔ وہ اس نے تھائی زبان میں ڈین چنگ کے سپرد کرتے ہوئے اس سے کچھ کہا بھی۔ اس نے فدویانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

ساتھ ہی میں نے کاساپا کو سے اپنے اس خدشے کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ جوشوا یا اس کے ساتھیوں کی طرف سے دوبارہ حملے کا خطرہ بھی موجود ہے لہٰذا اس سلسلے میں وہ ضروری

اقدامات کر کے رکھے۔ اس کے جواب میں کاساپاکو نے بڑے غرور بھرے انداز میں مجھ سے یہی کہا تھا کہ...... میں اس بارے میں بے فکر رہوں...... وہ پہلی بار دھوکے میں ضرور مار کھا گیا تھا مگر اس بار ایسا نہیں ہوگا، اس نے اپنے مسلح آدمیوں کو ہر طرف ہائی الرٹ کر رکھا ہے۔ وغیرہ۔

ایک اور خدشے کے تحت میں نے کاساپاکو سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ...... میرا اصل نام ظاہر نہ ہونے پائے نہ ہی شناخت، کیونکہ جوشوا کا کسی نہ کسی حوالے سے...... وزیر جان سے تعلق رہا ہے۔ اگرچہ دونوں الگ الگ ونگ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔

کاساپاکو نے اس کی بھی حامی بھرلی۔ اس نے میرا نام جون تجویز کیا تھا اور مجھے انڈین نژاد ظاہر کیا تھا۔ اس کی ہدایت اس نے ڈین چنگ کو بھی کر دی تھی کہ وہ مجھے ان کے سامنے ''جون'' کے نام سے ہی پکارے۔

مجھے اب بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ آگے ہر گام پر میرے لیے خطرہ تیار کھڑا تھا۔ روڈلف کتنا میرا حامی بن چکا تھا اور اسپیکٹرم والوں سے کس حد تک متنفر تھا، یہ تو آئندہ کے حالات پر ہی منحصر تھا۔ لیکن جوشوا اور کاساپاکو کے درمیان مجسمے کے سلسلے میں جو سودا طے ہوا تھا، وہ دونوں گروپوں کی کمزوری تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ...... اب کسی قسم کی دغابازی اور دھوکے بازی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں دونوں کو نقصان پہنچ سکتا تھا بلکہ دیکھا جاتا جوشوا کو زیادہ ہوتا، وہ مجسمے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا بلکہ...... اس کی وہ خطیر رقم بھی ماری جاتی جو اس نے نصف کی صورت کاساپاکو کو ادا کر دی تھی۔ لہٰذا اب دونوں پارٹیوں کا مفاد اسی میں تھا کہ باقی کا نصف سودا بھی خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہو جائے۔ میرے لیے بھی یہ ایک بڑی تشفی آمیز بات تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب...... ڈین چنگ کو کسی نے آکر کان میں کچھ کہا جو اس نے اسی طرح ذرا جھک کر کاساپاکو کے کان میں بھی منتقل کر دیا۔ جسے سنتے ہی کاساپاکو نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

''میں اب اپنے کمرے میں چلوں گا۔ مجھے پاکستان میں مقیم اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فون پر کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

''ہامم...... ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' اس نے کہا اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں جو ٹیلی فون رکھا تھا اس میں ڈائرکٹ ڈائلنگ کی سہولت موجود تھی۔ اب میں بلا دھڑک اپنے ساتھیوں سے باتیں کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پاکستان میں زہرہ بانو سے رابطہ کیا۔

وہ میری آواز سنتے ہی بولی۔ ''شش...... شہزی! تت...... تم ٹھیک تو ہوناں......؟ کک...... کہاں سے بول رہے ہو؟''

''سب ٹھیک ہے بانو! اور انشاء اللہ آگے بھی سب ٹھیک ہی ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، وہاں سب ٹھیک تو ہے ناں، تم، اماں اور بابا کیسے ہیں؟''

''وہ سب ٹھیک ہیں، میں تو تمہارے بارے میں بڑی سخت تشویش میں مبتلا تھی اتنے دن سے...... ابھی تمہاری آواز اور خیریت سنی تو جان میں جان آئی ہے۔''

''اول خیر کیسا ہے؟''

''وہ تو تمہاری طرف سے پریشانی میں باؤلا ہوا جا رہا تھا۔''

''کبیل دادا اور شکیلہ کی امریکا سے کوئی تازہ ترین خیریت کی اطلاع آپ کو موصول ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی وہاں بالکل ٹھیک ہیں، پر تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔'' زہرہ بانو نے جواب دیا۔

''وہ کہاں اور کس کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''انہوں نے اپنی جگہ بنا لی ہے، وہ چند دن وہاں سکون سے رہے ہیں لیکن شہزی! ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ ٹائیگر ٹیگ اور اسپیکٹرم کے ٹاپ ایجنٹ...... بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تم ابھی تک کیا بینکاک میں ہی پھنسے ہوئے ہو؟''

مجھے اپنوں کی کسی حد تک خیریت کی اطلاع مل گئی تھی لیکن کبیل دادا اور شکیلہ کے سلسلے میں یہ سن کر مجھے گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ سی آئی اے کا ونگ ٹائیگر ٹیگ جو باسکل ہولارڈ کی سرکردگی میں درپردہ جے بی سی کے مفادات کے لیے کام کر رہا تھا، جبکہ جے بی سی یہودی اور اسرائیل کی نو دریافت شدہ ایسی تنظیم تھی جس کا مقصد ہی ایک تھا یعنی یہودی اور گریٹر اسرائیل کے منصوبوں کو فروغ دینے کے ساتھ مسلم امہ میں انتشار اور فلسطین میں اپنے غاصبانہ قبضے کو یقینی بنائے رکھنا تھا اور جو بھی مسلم ریاست یا مملکت ان کے خلاف آواز اٹھائے، اسی ملک کو تخریب کاری اور مختلف حربوں سے انتشار کی زد میں لاتے رہنا تھا۔

یہی سبب تھا کہ مجھے پہلے ہی روز سے عابدہ سے متعلق یہی اندیشناک خیال پریشان کیے جا رہا تھا کہ یہودی لابی عابدہ کو اپنے کسی ناپاک مقاصد میں استعمال کرنے کی کوشش

کر سکتے ہیں۔

بہرحال...... میں نے زہرہ بانو کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ دنوں سے ایک مشکل میں پھنس گیا تھا مگر اب اس سے نکل آیا ہوں۔ میں زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ دعا کرتی رہنا۔۔ اپنا اور سب کا خیال رکھنا۔''

''اول خیر سے بات نہیں کرو گے؟''

''بہت جلد سب سے اور تفصیلی بات کروں گا۔'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں غسل وغیرہ کر کے تھوڑا فریش ہوا اور جیسے ہی باتھ روم سے باہر آیا تو چونک پڑا۔

☆☆☆

میرے سامنے سانچی کھڑی تھی۔ وہ نسبتاً بہتر نظر آ رہی تھی۔ اس نے مناسب لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے گندھے ہوئے تھے اور ان میں نیلے پیلے دیدہ زیب پھولوں کا ایک چھوٹا سا بنچ لگا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ مگر آنکھوں میں وہی شکوے تھے جو اَن کہے رہ گئے تھے۔

''تم......!'' میرے منہ سے فقط یہی نکلا۔ ''بیٹھو...... گی؟''

''نہیں، میں تم سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ ہمارا پیچھا تم کب چھوڑو گے؟'' اس نے کہا۔ لہجہ اور آواز سرد تھی۔

''سوری! میں سمجھا نہیں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم یہاں سے کب جا رہے ہو، ہمیشہ کے لیے۔'' وہ بولی۔

''بہت جلد...... لیکن...... تمہیں کیا پریشانی ہے میرے یہاں ہونے سے؟'' میں نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں دے رکھی ہے۔''

''تم نے مجھے جو تکلیف دینا تھی وہ دے چکے ہو، اب بھلا کیا کسر رہ گئی ہے باقی۔''

''میں نے......؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''اتنے انجان مت بنو شہزی!'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''آج جس ذلت بھرے مقام پر میں کھڑی ہوئی ہوں میں نے ایسی شرمناک زندگی کا کبھی تصور تک نہیں کیا تھا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''میں اس کی وجہ ہرگز نہیں ہوں، تم ایسا سمجھ رہی ہو تو یہ سراسر غلط ہے۔'' میں نے اسی طرح جواب دیا۔

''اس روز تم میری بات مان لیتے تو شاید ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ لیکن میں نے شاید تمہیں نیک مشورہ دے کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ آج مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ تم خود بھی ایک کرمنل تھے اور اسی لیے کاسپا کو جیسے گینگسٹر سے تمہاری اچھی نبھ رہی ہے۔''

''وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رہی بات تمہارا مشورہ نہ ماننے والی تو اگر میں یہ کہوں کہ میرے بجائے تم نے میرا مشورہ نہ مان کے ایک بھیانک غلطی کی تھی۔ تم اس زندگی سے خوش نہیں ہو تو چلی کیوں نہیں جاتیں۔ یہ کہو کہ یہاں کے ٹھاٹ باٹ والی زندگی نے تمہیں......''

''شٹ اَپ۔'' وہ غصے سے سرخ ہوتے ہوئے بولی۔ ''کسی خوش فہمی میں مت رہنا شہزی! بہت جلد کاسپا کو سے دوستی تمہیں بھی مہنگی پڑ جائے گی۔'' اس کے لہجے میں دھمکی چھپی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ میری خوامخواہ ہی دشمن بن رہی تھی۔ میں نے اس سے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''تم نے اپنی بات کہہ دی ہے تو یہاں سے جا سکتی ہو۔'' میں نے اسے دھتکارنا چاہا۔ اس کا چہرہ مزید بگڑ گیا مگر پھر اچانک اسے کیا ہوا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ میں حیران سا رہ گیا۔ سانچی کے اس انداز سے مجھے بے کسی و لاچارگی محسوس ہونے لگی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس پر ترس آیا۔ میں چند ثانیے تو اسی طرح ہکا بکا سا کھڑا رہا، اس کے بعد بولا۔

''سانچی! اپنے حالات کی تم خود ذمے دار ہو۔ اب رونا کیسا؟''

اس نے رونا بند کیا مگر ہولے ہولے سسکنے لگی اور اپنے چہرے سے ہاتھوں کا پیالہ ہٹا کر خلا میں گھورنے لگی پھر اسی انداز میں بولی۔

''شش...... شہزی! شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو، مجھے اس روز تمہاری بات مان لینی چاہیے تھی مگر میں نے وہ سب تمہاری بھلائی کی خاطر ہی کیا تھا، اس میں میری نیک نیتی شامل تھی۔ مجھے تم ایک بے ضرر اور معصوم انسان لگے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ، جس نے اس روز نجانے کتنے بے گناہوں کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر بچایا تھا۔'' بالآخر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں چند قدم اس کی جانب بڑھا اور...... پھر تشفی آمیز انداز میں اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے ملائمت آمیزی سے بولا۔

''سانچی! اب جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ مگر بہتری کی اُمید ضرور رکھو اور خود کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔''

''میری تو اب یہاں سے روح ہی نکل سکتی ہے، وہ بھی مرنے کے بعد۔ میں نے تو کئی بار خودکشی کا بھی سوچا لیکن شاید میں اتنی بہادر نہیں ہوں۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔ میں نے اس کی بات سُن کر کہا۔

''دیکھو، یہ کام تمہیں بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ پہلے تم پیروں تک مگر اب تم گلے تک اس دلدل میں پھنس چکی ہو، لہٰذا میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے تمہیں کہ اب...... صبر اور حوصلے کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار کرو، مجھے یقین ہے ایک دن تم پھر سے اچھے دنوں کی جانب واپس لوٹ جاؤ گی۔''

میری بات سے اس کی کچھ تسلی ہوئی، کچھ نہیں ہوئی تاہم میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

''موتو کہاں ہے؟ کیا اس سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟'' میں نے دیکھا وہ اس بات پر تھوڑا چونکی۔ اس کی آنکھوں کی شام اور گہری ہوگئی۔ چہرے کی دھند بھی کچھ سوا ہوئی پھر اسی لہجے میں بولی۔

''وہ کاساپوکو کے خوف سے کہیں روپوش ہو چکا ہے لیکن مجھ سے اس نے رابطہ کیا تھا۔'' میں اس کی بات پر چونکا۔

''ویسے وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ میرے ساتھ وہ بھی زخمی ہوا تھا بلکہ اس کی حالت زیادہ نازک تھی۔''

مجھے اس کی بات سے تسلی ہوئی تھی کہ وہ سانچی اور موتو اب بھی ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔

''ہاں! وہ کچھ بہتر ہے، اس کی بہن فرنا ایک تربیت یافتہ نرس ہے۔ مجھے موتو نے ساری بات بتا دی تھی۔ تم دونوں ایک ساتھ جھگڑے میں زخمی ہو گئے تھے۔''

''اس نے بےوقوفی کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں رہائی دلا کر......؟'' سانچی کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا مگر میں نے اس کا بُرا منائے بغیر اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی اور بولا۔

''اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھے اپنے کون سے مقصد کی خاطر رہائی دلا رہا تھا؟ بلکہ وہ رہائی کہاں تھی، وہ تو میرا سودا کر رہا تھا۔ مجھے ایک گڑھے سے نکال کر دوسرے گڑھے میں پھینک رہا تھا۔ وہ تو مجھے اچانک شبہ ہوگیا کہ وہ میرے ساتھ کوئی گیم کھیل رہا ہے اسی لیے میں نے ہاتھ ضروری سمجھا تھا۔''

''کچھ بھی سہی، تمہیں وہ فوکٹ پیلس کے تہ خانے سے نکال چکا تھا۔ بعد میں جب تم اس کی بہن فرنا کے گھر میں تھے تو تم اس کا ساتھ دیتے۔''

''میں ایسا ہی کرنا چاہتا تھا مگر دونوں بہن بھائیوں کی نیت میں فتور آ گیا تھا، وہ مجھے دھوکے سے بےہوشی کا ٹیکا لگا کر بےبس کر ڈالنا چاہتے تھے۔ کسی حد تک کامیاب بھی رہے مگر میں اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب رہا۔'' کہتے ہوئے میں نے ایک پُرغور سی نظر سانچی کے چہرے پر ڈالی اور بھویں سکیڑ کر سوال کیا۔

''میں نے تو سنا تھا کہ تم موتو سے بددل ہو چکی تھیں۔ کیونکہ وہ کاساپوکو جیسے کرمنل گینگسٹر کا ہرکارہ تھا۔ لیکن اب لگتا ہے تمہارا اس کی طرف سے دل صاف ہوگیا ہے۔ چلو، اچھی بات ہے۔ تم دونوں پھر سے ایک ہونے لگے ہو۔'' میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر وہ جیسے یکایک لجاجت آمیز لہجے میں بولی۔

''پلیز! ہماری مدد کرو...... ہم دونوں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں فراموش کریں گے۔''

''بےشک فراموش کر دینا، میں اس کی پروا بھی نہیں کرتا، کیونکہ میں نیکی کر دریا میں ڈال...... کے مصداق ہی کیا کرتا ہوں، انسان تو منافق ہے وہ کسی کو کیا اجر دے گا۔ میں اجر کی توقع اسی واحد ذات پاک سے رکھتا ہوں یعنی اللہ...... انسان تو احسان کھا کے بھی دشمنی پر اُتر آتا ہے، ہمارے پیارے حضرت علیؓ کا قول مبارک ہے جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔''

میری بات پر سانچی کے چہرے پر ذرا ندامت اور شرمندگی کے تاثرات اُبھرے تھے۔ میں نے فوراً کہا۔

''میں وہ باتیں بھلا چکا ہوں لیکن خیر...... موتو اگر اس روز بددیانتی دکھانے کے بجائے مجھ سے صلح و مشورہ کرتا تو ہم دونوں مل کر کوئی بہتر صورت نکال لیتے۔ لیکن نہ تم نے میری بات مانی تھی نہ ہی موتو نے۔ اب مجھے بتاؤ بھلا میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں تو خود کاساپوکو کے نرغے میں ہوں۔''

''کاساپوکو تم پر اندھا بھروسا کرنے لگا ہے۔ تم اس کے ساتھی تو نہیں ہو مگر اس کے اہم ترین ساتھی سے بھی آگے کی چیز بن چکے ہو اس کے لیے...... تم اس سے میری سفارش کر دو کہ وہ مجھے آزاد کر دے اور موتو کی بھی جان بخشی کر دے۔'' سانچی بولی۔

میں نے اپنے قریب...... بالکل قریب کھڑی سانچی کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ مجھے بالکل ایک معصوم سی بچی

کی طرح لگی جو کہہ رہی ہو کہ اپنا کھلونا مجھے کھیلنے کو دے دو نا وہ میں تمہیں کھیل کر واپس کر دوں گی۔ یا پھر شاید کاساپا کو کے ساتھ اتنی قربت کے باوجود وہ اس کی چنگیزی فطرت سے ابھی تک آگاہ نہیں ہو سکی تھی کہ وہ ہرنی ہو کے ایک خونخوار بھیڑیئے سے بھلائی کی توقع رکھے بیٹھی تھی۔ جس کے مزاج میں ہی سفاکی اور بربریت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یوں تو مجھے بھی کاساپا کو سے اپنے لیے کسی التفات کی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ اس میں اس کا اپنا ذاتی اور دیرینہ مفاد کارفرما تھا جو نکل جانے کے بعد وہ میرا بھی جانے کیا حشر کرتا۔

بہرکیف میں پھیکے انداز میں بے اختیار مسکرا دیا۔

''کیا ہوا شہزی......؟'' اس نے پوچھا۔

''تم بالکل بچوں والی باتیں کر رہی ہو سانچی!'' بالآخر میں نے ہولے سے کہا۔'' کاساپا کو سے کسی بھی قسم کے رحم یا نیکی کی توقع رکھنا بھی موت کے مترادف ہوگا۔ وہ شکار آزاد کرنے کے بجائے شکار مار گرانے کا عادی ہے۔ میرا تمہیں اب بھی وہی مشورہ ہے۔ اچھے وقت کی امید میں یہ براوقت گزارتی رہو اور موتو کو بھی یہی تلقین کرو۔''

میری بات سُن کر اس کے امید بھرے چہرے پر اوس پڑ گئی۔ پھر وہ پلٹی اور مجھے اس کے ہولے سے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے سے نکلتی چلی گئی۔

سانچی تو چلی گئی مگر مجھے ایک نامعلوم سی تشویش آمیز پریشانی میں ضرور مبتلا کر گئی۔ میں اب تک درست خطوط پر اپنے آئندہ کے ٹھوس لائحۂ عمل پر بڑی کامیابی کے ساتھ سرگرم تھا۔ میری امریکا یاترا کے منصوبے متعدد بار بنے اور بگڑے تھے۔ اب ایک آخری جوا کھیلنے کا تقدیر نے مجھے ایک موقع اور دیا تھا جسے میں کسی بھی صورت میں گنوانا نہیں چاہتا تھا اور اب تک اللہ کا کرم تھا کہ سب ٹھیک جا رہا تھا۔ لیکن سانچی سے اس تازہ ملاقات اور بات چیت سے مجھے لگا کہ وہ اب اپنی موجودہ زندگی سے بیزار ہے۔ موتو سے اس کے خفیہ طور پر روابط تھے۔ دونوں اندر ہی اندر جانے کیا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مجھ سے ملنے کا مشورہ موتو نے ہی اسے دیا ہوگا۔

مجھے اب ڈر یہ تھا کہ کہیں دونوں عین وقت پر کوئی گل نہ کھلا دیں۔ کوئی ایسی گڑبڑ نہ پیدا کر دیں کہ میری امریکا یاترا والی مہم ایک بار پھر کھٹائی میں پڑ جائے۔ دل کو تسلی بھی تھی کہ بھلا یہ دونوں کیا کر سکتے تھے؟ کاساپا کو اتنا تر نوالہ نہیں تھا کہ ناکام عاشق کے اس جوڑے کی کسی سازش کا بہ آسانی شکار ہو جاتا۔ پھر بھی جانے کیوں سانچی اور موتو کے نئے عزائم جان لینے کے بعد میں مخمصے کا شکار ہو رہا تھا۔ نجانے یہ موتو...... جو پہلے بھی ایک بے وقوفی کر چکا تھا، دوسری بار بھی نہ کر بیٹھے اور اپنی محبوبہ سانچی کو الٹی سیدھی پٹی نہ پڑھا دے۔

اچانک ایک خیال یہ بھی آیا کہ کیوں نا...... میں کاساپا کو کو ان دونوں کے عزائم سے آگاہ کر ڈالوں؟ یا کم از کم اتنا تو اشارتاً کہہ ڈالوں کہ وہ سانچی سے محتاط رہے۔ جس کی مثال اب اس کے لیے کسی زخمی ناگن سے کم نہیں رہی تھی جو اس کی جلوتوں اور خلوتوں میں اس کے پہلو سے لپٹی رہتی تھی۔ مجھے اپنا یہ خیال خود غرضانہ لگا۔ اگر میں ایسا کر ڈالتا تو کاساپا کو سانچی کو کھڑے کھڑے گولی مار دیتا۔

میں نے ان خیالوں کو ذہن سے جھٹکا اور دل ہی دل میں یہی تمنا چاہی کہ سانچی کوئی ایسا ویسا بے وقوفانہ قدم نہ ہی اٹھائے۔

جان روڈلف کو میں شیشے میں اتار چکا تھا۔ ہم جلد سے جلد یہاں سے کوچ کر جانا چاہتے تھے۔ بلکہ میری ضمانت پر ہی کاساپا کو نے جان روڈلف کو بھی ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی اسی شرط پر کہ اگر اس نے پھر کوئی چالاکی یا بدعہدی دکھانے کی کوشش کی تو اسے بلادریغ گولی مار دی جائے۔

☆☆☆

بعد کے یہ چند دن مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو جانے کا احتمال، انجانے اور وسوسہ انگیز خدشات تلے ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا مگر شکر تھا کہ ایسا کچھ نہ ہوا۔

میرے کاغذات بھی بن کر آگئے تھے۔ اب یقیناً منزل تک پہنچنا ناممکن نہیں رہا تھا۔

وہ بینکاک کی ایک خوشبوؤں بھری فضا کی خوشگوار صبح تھی۔ پورے تھائی لینڈ میں اس روز شاید ''فلاور ڈے'' تھا جو بڑے جوش و خروش سے منایا جا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تھائی لینڈ کے لوگ مجھے امریکا بڑی تمناؤں اور اچھی یادوں کے ساتھ رخصت کرنے والے ہوں۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ آج ہر کسی نے پھولوں کا بوکیٹ نہیں تو ایک عدد پھول ضرور ہاتھ میں تھام رکھا ہوگا۔ غرضیکہ بچہ، بوڑھا ہر ایک نے اپنے ہاتھ میں ایک عدد پھول سجا رکھا تھا۔

منصوبے کے مطابق ہماری سب سے پہلے روانگی کو ماٹگو کے جزیرے تک تھی جس کے مطابق ہمیں سہ پہر کو

روانہ ہوجانا تھا۔ تیاریاں مکمل کرلی گئی تھیں۔ سون اور جان روڈلف اندر سے بے حد خوش تھے کہ انہیں آزادی مل رہی تھی۔ دونوں ہی میرے ... شکرگزار تھے۔

جان روڈلف کے سلسلے میں مجھے کافی حد تک تسلی تھی کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ کیونکہ میں نے اس کی اس وقت جان بچائی تھی جب اس کے اپنے ساتھی اسے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرکے موت کے دہانے پر چھوڑ چکے تھے۔ وہ بیوی بچوں والا بھی تھا اور انہیں دیکھنے کی دوبارہ تمنا میں نے ہی اس کے دل میں جگائی تھی۔

اسپیکٹرم کے بیشتر رکن (تربیت یافتہ ایجنٹوں کو چھوڑکر) لولووش کی انہی غلط پالیسیوں کے سبب ماضی میں بھی اس سے متنفر ہوتے رہے تھے، جن کی مثالیں بھری پڑی تھیں۔ مگر تنظیم نے اپنی روش پھر بھی نہیں بدلی تھی۔ روڈلف بھی ان میں سے ایک تھا۔ وہ اگرچہ اسپیکٹرم کے تربیت یافتہ ایجنٹ گروپ سے تو تعلق نہیں رکھتا تھا مگر سائڈ ونگ کا ایک فعال رکن ضرور تھا۔

کاساپاکو جیسے سفاک آدمی کے خوفناک پنجوں کی گرفت سے نکلنے کا تصور ہی سون اور بالخصوص روڈلف کے لیے جانفزا تھا۔

ٹھیک تین بجے ہمیں کاساپاکو کی رہائش گاہ سے کوچ کر جانا تھا۔ دو بجے تک میں اور کاساپاکو لنچ وغیرہ سے فارغ ہو گئے۔ چائے کافی کا دور چل رہا تھا۔ سانچی حسب سابق اس کے پہلو میں دبکی ہوئی تھی اور میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور نجانے کیوں اس کی طرف ... دیکھ کر میرے دل کو ایک عجیب سی بے چینی لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی مجھے دو ایک بار چور سی نگاہوں سے تکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی.... یا پھر شاید یہ میرا وہم تھا جس کی وجہ اس روز میری اور اس کے درمیان ہونے والی ملاقات تھی۔

ہم جیسے ہی چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے اور روانگی چاہتے تھے کہ اچانک کاساپاکو کے کسی ساتھی نے آکر اسے کوئی اطلاع دی۔ جسے سن کر کاساپاکو کے چہرے پر اچانک ایک رنگ سا ہو کر گزر گیا اور اس کی بے اختیار کچھ سوچتی ہوئی سی نظریں میری جانب اٹھی تھیں جبکہ میری اس کے قریب کھڑی سانچی پر...... مجھے اس کے حسین چہرے پر ایک لمحے کو زہر سا ٹپکتا محسوس ہوا۔ اس کے ہونٹ میری نظر پڑتے ہی تھوڑے سے بھیدوں بھرے انداز میں وا ہوئے تھے۔ جیسے کہہ رہی...... ''اب بچ کے دکھاؤ۔''

''کیا ہوا باس؟ خیریت تو ہے ناں......؟'' میں نے بالآخر اس اعصاب شکن تجسس کو توڑنا چاہا۔

''سب ٹھیک ہے، پریشانی کی ضرورت نہیں۔ وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کا مقامی چیف آیا ہے۔ اس کے پاس سرچ وارنٹ ہے۔ دو گاڑیاں بھی اس کے ہمراہ ہیں۔'' اس نے بتایا اور میں اپنی جگہ سُن ہو کے رہ گیا۔

''تم کیوں پریشان ہو گئے؟ کہا ناں...... ڈونٹ وری......'' وہ میرے چہرے کا شاید بدلتا ہوا رنگ بھانپ کر دوبارہ بولا۔

''پولیس کیوں آئی ہے؟'' میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

''تمہاری تلاش میں......''

''مم...... میری تلاش میں...... لل...... لیکن اسے کیسے معلوم ہوا کہ......'' میری آواز واضح طور پر لڑکھڑانے لگی۔

''اونہوں...... کہا ناں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس اکثر یہاں اپنا وقت ضائع کرنے کے لیے آتی رہتی ہے۔''

''لیکن باس! میں تو یہاں موجود ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ابھی چند سیکنڈوں میں تم باہر ہو گے۔'' اس نے یہ کہہ کر اپنے کچھ ساتھیوں کو ہدایت کی اور پھر ہمیں اس کی رہائش گاہ کے ایک خفیہ تہ خانے سے باہر نکال دیا گیا۔ وہ ایک زیر زمین ٹنل تھی۔ جہاں بچھی ہوئی پٹریوں پر چلنے والی فولادی ٹرالیوں کے ذریعے ہمیں باہر نکالا گیا۔

جس جگہ ہم اُبھرے تھے...... وہ ایک سی پورٹ کے قریب واقع ایک نچلے درجے کی کسی کالونی کا کوئی کشادہ سا مکان تھا۔ اس کے تہ خانے میں ٹھہر کر ہم سب باری باری اوپر ایک زنگ آلود سیڑھی کے ذریعے آئے تھے۔ اس مکان میں ایک ہی ہال نما کمرا تھا اور ہم سب اسی میں جمع تھے۔ ڈین چنگ کے ساتھ اور ساتھی ہرکارے بھی تھے جن کی تعداد چار تھی۔ کمانڈ ڈین کے ہی سپرد تھی، تاہم میں بھی اس میں بہ وقت ضرورت مداخلت کرسکتا تھا۔ جان روڈلف اور سون کو میری طرح ہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ روڈلف کے ہاتھ برہنوز بینڈیج ...... بندھی ہوئی تھی۔ ایک پٹی سے اس کا ہاتھ باندھ رکھا تھا جس کی ڈوری اس کے گلے سے جھول رہی تھی۔

ڈین چنگ فون پر مسلسل کسی کے ساتھ محوِ گفتگو تھا اور میری چست نظریں اس کے چہرے کا بار بار طواف کر رہی

تھیں۔

میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں ہمیں کتنی دیر رکنا پڑے گا۔ ایک موقع پر جب...... ڈین فون سے فارغ ہوا تو...... میں نے ڈین سے پوچھا۔

''وہاں سب خیریت تو ہے ناں مسٹر ڈین؟'' میری مراد کاسپاکو اور اس کی رہائش گاہ سے متعلق تھی۔

''پولیس چیف سرچ کرنے کے بعد باس کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔'' اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا جس پر بالخصوص میرا پریشان ہونا لازمی امر تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''او......نو......پھر اب کیا ہوگا؟''

''انتظار کرنا پڑے گا ہمیں......'' وہ بولا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں، وہ لوگ باس کو عمومی نوعیت کی تفتیش کے لیے پولیس اسٹیٹ لے گئے ہیں۔''

''تو کیا ہم باس کی واپسی تک ادھر ہی رکے رہیں گے؟'' میں نے ڈین کی طرف دیکھتے ہوئے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن میں مسلسل شائی چن سے رابطے میں ہوں۔ وہ اس کے ساتھ ہے......'' اس نے کہا اور اسی وقت اس کے فون کی رنگ گونجی۔ اس نے فوراً فون کان سے لگالیا۔ وہ کچھ سنتا رہا اور تھائی زبان میں کچھ بولتا بھی رہا۔ میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہیں۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا اور پریشان نظر آرہا تھا اور دیکھا جاتا تو اس سے کہیں زیادہ میں، جان رو ڈلف اور سون پریشان تھے۔

''اوکا......'' آخر میں وہ بولا۔ اس کے بعد ہماری طرف دیکھ کر بولا۔

''باس نے ہمارے بارے میں آخری احکامات یہی دیے ہیں کہ ہمیں کو ماٹگو کی طرف کوچ کر جانا چاہیے۔''

اس کی بات سن کر میں بے اختیار سکون کی سانس لے کر رہ گیا، رو ڈلف اور سون نے بھی یقیناً ایسا ہی سانس لیا ہوگا۔

''کیا مجسمہ کو ماٹگو پہنچا دیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے پیدل ساحل تک چلنا ہوگا اور جتنی تیزی کے ساتھ چل سکتے ہو چلو، تاخیر کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ ہمیں فرار کرا دیا گیا ہے۔''

''ہمیں سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیونکہ پولیس تو......'' میرا سوال حلق میں رہ گیا کیونکہ تب تک ڈین تیزی سے باہر نکل چکا تھا۔

''اپنے سوال کو ماٹگو پہنچ کے پوچھ لینا۔ لگتا ہے کوئی خطرناک بات ہوگئی ہے۔ شہزی! نکلنے کی کرو۔'' رو ڈلف نے میرے قریب سے تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے کہا اور پھر اس کے پیچھے سون لپکی۔ سب سے آخر میں گومگو والے انداز میں، میں مکان سے باہر نکلا۔

باہر خنک شام پھیلنے لگی تھی۔ ساحلی علاقہ ہونے کے سبب بڑی کاٹ دار یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں۔ یہ تو شکر تھا کہ ہم نے موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمارے دہانے کسی دخانی انجن کی طرح دھوئیں کے بھاپ چھوڑ رہے تھے۔ ہم سب تیز تیز قدموں سے چلے جارہے تھے۔

''میرا خیال ہے کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے، ڈین کو ہمیں ساری صورتِ حال سے آگاہی دینا چاہیے۔'' سون نے ہمارے ساتھ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو رو ڈلف بولا۔

''صورتِ حال ان کی حد تک بگڑی ہے، شکر کرو اس مینڈک کی نسل کاسپاکو نے ہمارا پروگرام جوں کا توں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔'' لیکن سون کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ مجھ سے بولی۔

''تم تو پوچھ سکتے ہو ڈین سے، آخر معاملہ کیا ہے؟''

''دیکھا جائے گا۔ ابھی تو چلتے رہو۔'' میں نے کہا۔

ڈین اور اس کے چاروں مسلح ساتھی ہمارے آگے آگے چل رہے تھے۔ ہمارے دائیں جانب شہر کی جلتی بجھتی بتیاں نظر آرہی تھیں اور بائیں جانب گہری تاریکی میں دور کہیں کہیں ستاروں کی طرح ٹمٹماتی روشنیاں تھیں۔ یہ شاید کوئی سمندری حدود تھی۔ سامنے تاریکی تھی اور ہم بل کھاتے ایک پختہ راستے پر تھے۔ جس کے دو رویہ پام کے درخت ایستادہ تھے۔ درختوں کے درمیان گھرے.... تاریک راستے پر ہم سب تیز تیز قدموں سے بڑھے چلے جارہے تھے۔ لگ بھگ کوئی پندرہ، بیس منٹ تک مسلسل تیز چلنے کے بعد سون تو بے دم ہونے لگی تاہم ہماری منزل بھی آگئی۔

وہ ایک ساحل تھا جہاں سے موجوں کے شور کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈین اور اس کے چاروں مسلح ساتھی یہاں پہنچ کر رک گئے۔ ہم تینوں بھی ٹھہر گئے اور اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے لگے۔

''لگتا ہے لانچ جا چکی ہے۔'' ڈین نے سامنے

تاریک اور گہرے پانیوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا ہمارے لیے یہاں پہلے سے کوئی لانچ موجود تھی؟'' میں نے ڈین سے سوال کیا۔
''ہاں! اسی کے ذریعے ہمیں... جزیرے تک پہنچنا تھا۔''
''تو پھر وہ ہمیں اپنے ساتھ لیے بنا کیوں چلے گئے؟'' روڈلف بولا۔ ڈین نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور پھر اپنے سیل پر کسی سے بات کرنے لگا پھر مجھ سے بولا۔
''مسٹر شہزاد! موجودہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر لانچ کو کو مانگو جزیرے تک پہنچنے کا حکم دیا جاچکا تھا۔ کیونکہ اس میں مجسمہ لدا ہوا تھا اب وہ اسے وہاں اتارنے کے بعد ہمیں لینے کے لیے یہاں پہنچنے والے ہیں۔''
''اچھا! لیکن کیا ہمیں یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔
''خطرہ تو ہے۔''
''کس کا؟''
''پولیس کا......''
''کیا مطلب؟ پولیس کو ہمارے بارے میں علم ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''علاقے کی پولیس نے چاروں طرف سے ناکا بندی کر رکھی تھی۔ رہائش گاہ کے چاروں طرف تقریباً پچاس کلومیٹر تک......''
''اوہ......'' میرے ہونٹ تشویش آمیز انداز میں سکڑ گئے۔
''سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آخر پولیس کی اس قدر تیز اور اچانک کارروائی کرنے کی وجہ کیا تھی؟'' جان روڈلف نے پوچھا۔ تو ڈین اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تب ہی میرے ساتھ کھڑی سون نے مجھے ہولے سے اپنی کہنی کا ٹھوکا مارا، گویا اپنی پہلے والی بات کا وہ اعادہ چاہ رہی تھی۔ جس نے بالآخر مجھے بھی مہمیز کر ڈالا اور میں نے ڈین سے کھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔
''مسٹر ڈین! کم از کم تمہیں ہم کو تفصیل بتانی چاہیے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ تاکہ ہم بھی اپنی صوابدید پر کوئی فیصلہ کر سکیں۔''
آسمان صاف تھا اور اس کی تاروں بھری روشنی میں ساحلِ سمندر کا پانی جھلملا رہا تھا۔ ڈین نے کہا۔
''مسٹر شہزی! ہمارے خلاف مخبری ہوگئی ہے۔''
''مخبری؟ کیسی مخبری؟ اور کس نے کی ہے؟'' میں اس کی بات پر ایک دم چونک کر بولا۔ میرا دل اس انکشاف پر بے طرح دھڑکنے لگا۔
''اپنے ہی کسی ساتھی کی شرارت ہے یہ...... مخبری مجسمے کی چوری سے متعلق کی ہے بینکاک کے پولیس ڈپارٹمنٹ کو...... اس میں گوتم بدھ کے اس سونے کے بیش قیمت مجسمے سے متعلق بینکاک کے پولیس ڈپارٹمنٹ کو بتایا دیا گیا ہے، لہٰذا اب ایک طرف اس گمنام کال کی تصدیق کے لیے تریتھر کے میوزیم میں خفیہ تفتیش کی جارہی ہے اور دوسری جانب کاساپا کو کو بھی گرفتار کرلیا گیا ہے۔ گمنام کال میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس گریٹ روبری میں دو غیر ملکی بھی شامل ہیں۔ ایک انڈین شہزاد کھان اور دوسرا امریکی جان روڈلف۔''
اپنا نام سن کر میں دنگ رہ گیا۔ یہ تو شکر تھا کہ مخبری کرنے والا مجھے پاکستانی کے بجائے انڈین سمجھا تھا۔
''لل...... لیکن یہ اتنی بڑی خبر آؤٹ کیسے ہوگئی؟'' میں نے کہا۔ تاہم میرے ذہن رسا میں سانچی اور موتو کے ناموں کی بار بار گردان ہونے لگی۔ سانچی سے میری تازہ اور مختصر ملاقات میں مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ روپوش موتو کے اب بھی سانچی کو کاساپا کو کے چنگل سے چھڑانے کے لیے خفیہ رابطے استوار تھے اور کیا بعید تھا کہ اسی نے ہی موتو کو یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں...... سانچی کی مکتی کی کوئی صورت بن سکے۔
''اس کمینی سانچی نے یہ سارا کھیل بگاڑا ہے۔'' ڈین نے بتایا۔ ''وہ اسی وقت سے جانے کہاں غائب ہے جب سے کاساپا کو کو پولیس حراست میں پوچھ گچھ کے لیے لے جاچکی ہے۔''
''باس کو بھی نت نئی بلیاں پالنے کا جو شوق تھا۔ بھگت لے اب یہ سب......'' سون نے منہ بسور کے گویا اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ اس کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔
''باس کے سلسلے میں تمیز سے بات کرو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔'' ڈین بگڑ کر بولا۔
میں نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے ڈین سے کہا۔
''اس طرح تو ہمارا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ جائے گا؟ پولیس آورڈو کے ان قدیمی کھنڈرات کا بھی رخ کر سکتی ہے۔ جدھر ہم نے اس مجسمے کو دبا رکھا تھا۔''
''کہا نا...... کہ یہی تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ مجسمہ

اب وہاں سے نکال کر بہ حفاظت لانچ میں لوڈ کروا کے جزیرے کی طرف روانہ کردیا گیا ہے۔''

''اس صورت میں پولیس یہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا صحیح نہیں ہوگا۔ پولیس ان کے نشانات کی رہنمائی میں کسی بھی وقت یہاں تک بھی......''
ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ڈین کا ایک ساتھی ہولے سے چیخا۔

''وہ دیکھو، پولیس کی گاڑیاں آرہی ہیں ڈین!'' ہم سب کو یکلخت سانپ سونگھ گیا۔ سب نے ہی اس کے اشارے کی سمت بیک وقت گردن موڑ کر دیکھا، تین چار گاڑیوں کی سرخ اور نیلی روشنیاں متحرک سی نظر آئیں۔ ان کا رخ اسی جانب تھا۔

''اوہ...... بالآخر پولیس یہاں بھی پہنچ گئی۔'' ڈین کے منہ سے نکلا۔ ''پوزیشنیں سنبھال لو اور انہیں بھون کر رکھ دو۔''

''یہ بے وقوفی ہم سب کو مہنگی پڑے گی مسٹر ڈین!'' میرے بولنے سے پہلے ہی روڈلف نے اسے خبردار کیا۔ ''ان حالات میں پولیس سے مقابلہ خود کو مزید خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔''

''تم خاموش رہو مسٹر!'' ڈین نے اسے جھڑکا تو میں نے بھی فوراً ہی روڈلف کی تائید میں اس سے کہا۔

''روڈلف ٹھیک کہہ رہا ہے مسٹر ڈین! ان حالات میں جبکہ باس بھی پولیس کی تفتیشی حراست میں ہے، پولیس سے ہمارا مقابلہ نہ صرف خطرناک ہوگا بلکہ ہمارا منصوبہ بھی فیل ہوجائے گا۔ پولیس اس چھوٹے سے ٹاپو تک بھی پہنچ سکتی ہے جہاں یہ مجسمہ لے جایا گیا ہے۔''

''تو پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے خود کو پولیس کے حوالے کردیں؟'' ڈین نے تلخی سے کہا۔

''یہ میں نے کب کہا؟ ہم کہیں قریب میں گھات لگا کر چھپ تو سکتے ہیں؟'' میں بولا۔

''اور اگر اس دوران میں وہ لانچ ہمیں لینے یہاں آن پہنچی تو......؟'' ڈین بولا۔

''میرا نہیں خیال کہ لانچ اتنی جلدی لوٹ آئے گی۔ ٹنوں وزنی مجسمہ اس سے ان لوڈ کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ انہیں دیر لگ جائے گی واپسی میں...... تب تک ہوسکتا ہے ہمیں کوئی اور صورت نظر آجائے۔''

''جلدی سے ایک فیصلہ کرلو، گاڑیاں قریب آتی جارہی ہیں۔'' دفعتاً سون سرسراتی آواز میں بولی۔

''فیصلہ ہوگیا۔'' جان روڈلف دوبارہ بولا۔ ''ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلو اور کوئی لانچ نظر آجائے تو اس پر قابض ہوکے ٹاپو تک پہنچا جاسکتا ہے۔''

ہم نے ابھی ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اچانک خاموشی اور ٹھٹھرتی فضا میں ایک پٹاخہ چھوٹا اور چشم زدن میں اردگرد کا ماحول روشنی میں نہا گیا۔

''زمین پر گرا دو خود کو...... انہوں نے سگنل فائر کر ڈالا ہے۔'' میں چیخا۔ ہم سب زمین پر گر گئے۔ تاریک آسمان پر چند ثانیے تک رنگ برنگی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہیں اس کے بعد دوبارہ تاریکی چھا گئی۔

''اسی طرح تیزی سے آگے رینگتے چلے جاؤ۔ جلدی......'' میں نے کہا اور سب حرکت میں آگئے۔ ابھی ہم بہ مشکل چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ پے در پے دو تین پٹاخے فضا میں پھٹے۔ اب تو جیسے ہمیں کئی گز تک سارا پام کا جنگل ہی روشن ہوتا نظر آگیا، یہی نہیں پولیس کی گاڑیوں کی جھلک بھی نظر آگئی۔ ہم ابھی پوری طرح سے پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ یکایک فضا میں برسٹ چلنے کی آواز گونجی۔ میرا دل یکلخت اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ پولیس سے اتنی جلدی ایکشن لینے کی بالکل توقع نہ تھی۔

''خبردار......! کوئی جوابی فائرنگ نہ کرے......'' یہ جان روڈلف تھا۔ جو ایسے وقت میں خاصا زیرک دماغ اور بیدار مغز ثابت ہورہا تھا۔ اس کی بات صحیح تھی کیونکہ پولیس کے چلائے ہوئے برسٹ کی کوئی گولی ہم تک نہیں پہنچی تھی، یہ پولیس نے اندھا فائر کیا تھا تاکہ ہم بوکھلا کر ان پر گولی داغتے اور وہ ہماری لوکیشن ٹریس کرکے ادھر پہنچ جاتے۔

''آگے بڑھتے رہو۔ رکو مت۔'' میں نے کہا۔ ہم اسی طرح آگے بڑھتے رہے۔ ڈین کے مسلح چاروں افراد ہم سے آگے تھے۔ ممکن تھا ڈین کے پاس بھی کوئی چھوٹا موٹا پستول ہوتا لیکن میں روڈلف اور سون نہتے تھے۔

ڈین کو بھی شاید پولیس کی چالاکی سمجھ میں آگئی تھی اور وہ محتاط ہوگیا تھا۔

اچانک ایک اور برسٹ فائر ہوا۔ گولیوں کی پوری باڑھ ہم سے آگے چند قدموں کے فاصلے پر پڑی۔ جس پر ڈین کے ایک مسلح ساتھی نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرف اپنی گن کا رخ کرکے فائر کردیا۔ اس کی یہی حرکت ہم سب کے لیے سم قاتل ثابت ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے پولیس کی گاڑیوں نے سائرن بجانا شروع کردیا اور

ان کے انجنوں کی آوازیں بیدار ہوگئیں۔ وہ سب اسی طرف دوڑتی آرہی تھیں۔

''مزید کوئی فائر مت کرنا...... بھاگو......'' میں نے چلا کر کہا اور پھر ہم سب اٹھ کر دوڑے۔ ہمارے عقب میں پولیس کی گاڑیاں سمع خراش سائرن بجاتی ہوئی چلی آرہی تھیں۔ یہاں پولیس اور ہمارے درمیان زبردست رن پڑ سکتا تھا۔ اسی سے بچنے کے لیے ہم اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔

اچانک تلے اوپر دو گولیاں داغی گئیں۔ ہم سے آگے اور ساتھ والے دو مسلح ساتھی حلق سے بھیانک چیخیں خارج کرتے ہوئے گرے۔ میں دنگ رہ گیا اور خود کو فوراً گرا دیا۔

''پولیس انفراریڈ اسنائپر استعمال کررہی ہے۔'' میں چلّایا۔ میں نے گرتے ہی لڑھکتے ہوئے خود کو ان دونوں مسلح آدمیوں کے قریب کرلیا، جو ڈین کے ساتھ تھے۔ روڈلف میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور خاصا ہوشیار ثابت ہورہا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ مجھے ''فالو'' کرے۔ یہی وجہ تھی کہ میری حرکت اور آواز سنتے ہی اس نے بھی وہی کیا اور دوسرے ساتھی کی لاش کی گن، بھاگتے بھاگتے اٹھالی۔

ٹھیک اسی وقت دو فائر اور ہوئے ڈین کے باقی دو مسلح ساتھی بھی چیخ مار کر گرے۔

''راستہ بدلو، جلدی...... ورنہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' میں چیخا اور فوراً دائیں جانب دوڑ لگا دی۔ سون، روڈلف اور ڈین نے میری تقلید کی تھی۔

جلد ہی ہم سب ایک ایسی جگہ جا پہنچے جو بادی النظر میں جنک یارڈ کا علاقہ نظر آتا تھا، یہاں لاتعداد اسکریپ پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ کچھ چھوٹی بڑی لانچیں بھی لنگر انداز تھیں۔ لوگ بھی نظر آرہے تھے۔ وہ سب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ایک جگہ اکھٹے ہوتے ہی میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان ڈین سے کہا۔

''کسی لانچ کا فوری دستیاب ہونا ضروری ہے۔ ہمیں ٹاپو کی طرف نکلنا ہوگا، ورنہ یہ پولیس ہمارے تمام راستے مسدود کردے گی۔''

''آؤ...... اس طرف جلدی۔'' ڈین نے میری بات کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھتے ہوئے فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی اور ہم اس کے پیچھے ہولیے۔ شکر تھا کہ پولیس کے ان تباہ کن شوٹرز کے مقابلے میں جلد ہی جائے پناہ مل گئی تھی، ورنہ ایک ایک کرکے ہم سب گولی کا نشانہ بنتے رہتے۔

ڈین ہمیں ایک لانچ کے پاس لے آیا۔ ہم اس میں سوار ہوگئے۔ اس میں دو افراد موجود سگریٹ پی رہے تھے۔ ڈین نے انہیں خبردار کردیا اور حکم صادر کیا کہ ان دونوں کی مشقیں کس کر اسٹور میں پھینک دے۔ خود وہ انجن روم کی طرف چلا گیا۔ میں ریلنگ پر کھڑا اس طرف دیکھنے لگا جہاں...... چار پانچ ہیڈ لائٹس ایک قطار کی صورت میں دکھائی دیں۔ پولیس کی گاڑیاں جنک یارڈ کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی تیزی سے اسی طرف آرہی تھیں۔ مگر ایک مقام پر میں نے انہیں رکتے دیکھا۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، اعصاب تن گئے تھے۔ میرے ہاتھوں میں گن دبی ہوئی تھی۔

بینکاک پولیس کے ساتھ اس معرکہ آرائی کی مجھے بالکل بھی توقع نہ تھی، یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا۔ مگر اچانک کہاں ہوا تھا مجھے ایسے کسی خطرے کی پہلے ہی بو محسوس ہوگئی تھی مگر بدقسمتی سے پتا بعد میں چلا کہ یہ گل سانچی اور موتو نے کھلایا تھا، جبکہ اب بقول ڈین چنگ کے وہ غائب تھی۔ دونوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت افراتفری پھیلادی تھی۔ ہمیں مصیبت میں ڈال کر وہ خود رفوچکر ہوگئی تھی، کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اور موتو ایک ساتھ ہی نکلے ہوں۔ مگر اب جو ہونا تھا، وہ ہوچکا تھا اس پر اب کفِ افسوس ملنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس وقت ہمیں اس مشکل سے نکلنا تھا۔

اچانک میں نے ایک گاڑی کی روشنی کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ نجانے کدھر سے راستہ کاٹ کر قریب آرہی تھی۔ اس کے چیختے سائرن کی آواز بالکل قریب سنائی دینے لگی تھی۔ باقی پولیس اہلکار بھی اپنی پھنسی ہوئی گاڑیوں سے اتر کر اسی طرف آرہے تھے۔

میں نے اپنی گن سیدھی کرلی تھی اور روڈلف میرے ساتھ آن کھڑا ہوا تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے ہلکی ساخت کی مشین گن تھام رکھی تھی جس کا بٹ سینے یا پیٹ پر بہ آسانی جم جاتا تھا اور ایک ہاتھ سے بھی بہ آسانی فائرنگ کی جاسکتی تھی۔

''فائرنگ داغی جائے؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا اور اسی وقت لانچ میں گھر گھراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ ڈین اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کررہا تھا کہ لانچ جلد ہی حرکت میں آجائے۔

''نیچے جھک جاؤ۔'' معاً روڈلف چیخا اور میں نے فوراً

اس کی تقلید کی۔ فائر ہوا اور گولی میرے سر سے صرف چند سوت کے فاصلے سے نکل گئی۔ موت کے تصور سے ہی میرا پورا وجود جھنجھنا کر رہ گیا۔

''اسنائپر شوٹر قریب پہنچ چکے ہیں۔'' روڈلف نے کہا اور اپنی گن سیدھی کر کے اس نے ٹریگر دبا دی۔ اس کی گن کی نال سے شعلے پھوٹنے لگے۔ میں نے بھی دوسری جانب سے پوزیشن بنالی اور پولیس پر فائر کھول دیا۔ دوبدو فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا اور جنک یارڈ کا یہ حصہ میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگا۔

ڈین نے چابک دستی سے اپنا کام نمٹایا اور لانچ کو کھلے سمندر کی طرف لے گیا۔

جنک یارڈ کے ساحل پر پولیس منہ تکتی رہ گئی۔ ہم دونوں وہیل روم میں آگئے۔ وہاں سون اور ڈین موجود تھے۔

''بال بال بچے ہیں۔'' روڈلف نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے ہمیں کا مانگو کے ٹاپو پہنچتے ہی نکلنا پڑے گا۔ پولیس کسی وقت بھی اسپیڈ و بوٹس کے ذریعے یہاں پہنچ سکتی ہے۔'' میں نے ڈین کی طرف دیکھ کر کہا جس کی متلاشی نظریں اسکرین کے پار تاریک پانیوں کو گھور رہی تھیں۔

''مجھے بھی یہی ہدایت ہے، کمپاس نکالو جلدی، کہیں میں بھٹک نہ جاؤں۔ مجھے اس کا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔'' میں اور روڈلف کمپاس تلاشنے لگے تو وہ سون کو مل گیا جسے اس نے فوراً ہی وہیں درمیان میں نصب گول اسٹول پر پھیلا دیا۔ ڈین اس پر جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہیل ایڈجسٹ کرنے لگا۔

''تم تب تک ٹاپو والے ساتھیوں سے رابطہ کر کے موجودہ صورتِ حالات سے تو آگاہ کر دو...... تاکہ فوری طور پر ہماری کومانگو سے روانگی کا بندوبست تیار رکھیں۔'' میں نے ڈین کو صائب مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''اس پر واقعی بہت جلدی عمل ہونا چاہیے۔ بہ صورتِ دیگر پورا کومانگو کا ٹاپو بینکاک کی پولیس سے بھر جائے گا۔'' روڈلف نے بھی رائے دی۔ ڈین اپنے مخصوص ٹرانسمیٹر پر رابطہ کرنے لگا۔ یہاں اس کا سیل کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ خفیہ ٹرانسمیٹر اس کی واچ میں نصب تھا۔ مگر باوجود کوشش کے اس سے بھی رابطہ نہ ہو پایا تو اس نے لانچ کی رفتار بڑھا دی اور چلا کر ہم سے بولا۔

''وہ لوگ تیار ہی ہوں گے اور بے چینی سے ہمارے منتظر بھی۔''

''لیکن انہیں موجودہ صورتِ حالات سے آگاہی دینا ضروری تھا۔'' اس بار سون بولی۔

''ارے وہ دیکھو ٹاپو کی طرف سے کوئی لانچ آرہی ہے۔'' ڈین چلایا۔ ہم پہلے تو ڈر گئے کہ کہیں پولیس تو نہیں مگر دوسرے ہی لمحے ڈین کو ہم نے خوشی سے نعرہ بلند کرتے دیکھا۔

''ٹھہرے...... یہ ہماری ہی لانچ ہے۔ میں انہیں سگنل دیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے کیبن سے ٹارچ اٹھالی۔ اس کے اندر سرخ اور نیلے سلائڈنگ شیشے نصب تھے، وہ انہیں تیزی سے جلانے بجھانے اور بدلنے لگا۔ لانچ قریب آگئی۔ اس میں تین افراد سوار تھے۔ وہ ڈین کو پہچان گئے۔ ہم جلدی سے ایک تختے کے ذریعے دوسری لانچ میں آگئے۔ وہ واپس مڑ گئی جبکہ پہلی والی لانچ کا رخ بدل کر ہم نے اسے آگے روانہ کر دیا۔

ڈین نے ان تینوں کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا، وہ تینوں پریشان ہو گئے۔ ان میں سے ایک خاصی گٹھی ہوئی جسامت والا آدمی ڈین سے کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ لوگ آپس میں تھائی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ لانچ کی رفتار بتدریج بڑھادی گئی تھی۔

''ارے وہ دیکھو روشنیاں......!'' سون ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ڈین کو اس کی چیخ پر جانے کیوں طیش چڑھ گیا اور اس نے مارے طیش کے اپنے ہونٹ بھینچ کر آگے بڑھتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

''کتیا کی بچی! آہستہ نہیں بول سکتی۔'' چٹاخ کی زوردار آواز سے ڈین کے بھاری ہاتھ کا تھپڑ نرم و نازک سون کے لیے خاصا زوردار ثابت ہوا۔ وہ ایک دردبھری چیخ مار کر چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گئی اور ریلنگ سے نیچے پانی میں گرتے گرتے بچی۔ یہ تو شکر تھا کہ سوئے اتفاق اس کے قریب میں کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔ ورنہ وہ ایک خوفناک چھپاکے سے پانی میں جا گرتی۔

''الو کا پٹھا!'' روڈلف کو اس کی حرکت پر غصہ آگیا۔

وہ پُرطیش انداز میں اپنے دانت پیستا ہوا ڈین کی جانب بڑھا تھا کہ اس کے تینوں ساتھیوں نے فوراً گنز نکال کر اس کی طرف تان لیں۔ ڈین بڑی خوف ناک نظروں سے اس کی طرف گھورنے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان لڑائی ہوتی، میں نے چلا کر کہا۔

''پولیس ہمارے تعاقب میں آرہی ہے، حملے کے لیے تیار رہواور لانچ کی رفتار بڑھادو۔''

سون اپنا مضروب گال سہلانے میں مصروف تھی۔ ہواؤں کے تیز شور کے باعث ہمیں چیخ چیخ کر بولنا پڑ رہا تھا۔

اس کے تینوں ساتھیوں نے گنز تان کر ریلنگ کے پاس پوزیشن لے لی۔ روڈلف کے پاس بھی ہتھیار تھا اور میرے پاس بھی۔ ڈین بھی غیر مسلح نہیں تھا۔ ڈین نے دوسری جانب دیکھنے کے بعد کہا۔

''ٹاپو قریب آگیا ہے۔ اس کا رخ اس طرف کرو جیڈ! جہاں کارنیوال کھڑا ہے۔''

ان تینوں مذکورہ مسلح آدمیوں سے ایک پلٹا اور تیزی سے وھیل کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ یہی جیڈ تھا۔ وہ تھائی نہیں تھا اس لیے شاید ڈین نے اس سے انگریزی میں کہا تھا۔

لانچ کا رخ بدلنے لگا۔ ہم ریلنگ پر دھڑکتے دل کے ساتھ موجود تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ پولیس کی اس قدر جلد کیسے پانی تک رسائی ہوگئی؟ میں نے ایک خیال کے تحت ان بڑھتی ہوئی روشنی کی رفتار کا اندازہ لگایا تو ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگر یہ پولیس تھی تو اسپیڈ بوٹس میں نہیں تھی۔ ہماری طرح کوئی لانچ لے کر تعاقب میں نکلے ہوں گے لیکن ایک خطرہ تھا کہ وہ کوسٹ گارڈ سے رابطہ کر کے انہیں ہمارے پیچھے لگا سکتے تھے۔

اچانک مذکورہ روشنیوں کی طرف سے نیلی سرخ لائٹس بلنک کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔

''خبردار! فائر مت کرنا۔'' میں نے چلا کر کہا اور ڈین کو ہدایت دی کی لانچ کی بتیاں ساری گل کردے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

تھوڑی دیر بعد لانچ کی رفتار دھیمی پڑنے لگی اور یہ ایک کیچڑ زدہ ساحل کے قریب لنگر انداز ہوگئی۔ ہم لوگ سب جلدی جلدی چھلانگیں لگا کر نیچے اترے اور میں نے ڈین سے کہا، وہ اپنے تینوں ساتھیوں سے کہیں کہ لانچ میں سوار ہو کے دوسری طرف نکل جائیں تاکہ پولیس بھٹک جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

ہم لوگ تاریک ٹاپو میں آگئے۔ جیڈ اور اس کے ایک ساتھی کی رہنمائی میں ہم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یہ ٹاپو زیادہ جنگلاتی نہیں تھا۔ اس کی زمین اونچی نیچی تھی اور جابجا ٹیلے سے بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کیچڑ زیادہ تھی۔ جس پر ہم کئی بار پھسل کر گرے تھے۔

ایک جگہ ہمیں روشنی نظر آگئی تھی۔ ہم اسی طرف بڑھے۔ آسمان پر تارے غائب ہوگئے تھے، شاید بادل گھر آئے تھے۔ رات جھک آئی تھی۔ اچانک بادلوں کی خوفناک گڑگڑاہٹ ابھری۔ بجلی چمکی اور موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ موسم خراب ہوگیا تھا۔ ہم لوگ گرتے پڑتے ایک نسبتاً کھلی جگہ پر آگئے۔ سامنے ہی الاؤ روشن تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ یہ روشنی کیروسین آئل کی تھی۔ وہاں ایک طیارہ کھڑا تھا۔ یہاں سے ٹاپو کا ساحل نما کنارہ تھوڑی ہی دور تھا۔

وہاں دو افراد ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ڈین نے ان سے کچھ پوچھ گچھ کی، اس کے بعد انہوں نے ہمیں سوار ہونے کا کہا۔ یہ دو انجن والا جہاز تھا۔ جس کے مخصوص فلوٹن اسکو بیک وقت گیلی ریت اور برف کے علاوہ پانی پر بھی بہ آسانی پھسل سکتے تھے۔ ایک بار آسمانی بجلی چمکی تو مجھے اس کی فولادی باڈی پر ایک جیولوجیکل سروے ٹیم کا مخصوص مونوگرام چھپا ہوا نظر آگیا۔

ہم اس میں سوار ہو گئے۔ اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔ ہم سب بُری طرح بدک گئے۔ جہاز کو پائلٹ کرنے والے دو افراد جو ڈین کے ساتھ تھے۔ کنٹرول سسٹم سیٹ پر براجمان ہو چکے تھے۔ ہم جہاز کے دروازے پر ہی تھے کہ ہمیں عقب سے فائرنگ کی... آواز سنائی دی تھی۔ جواب میں ہم نے بھی ان ہیولوں پر گولیاں داغ دیں۔ جہاز کی چونچ میں نصب پنکھ تیزی سے حرکت کرنے لگا تھا اور...... اس نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ڈین کے دو ساتھی جہاز کو دھکا بھی لگا رہے تھے۔ جن کی رفتار چیونٹی سے زیادہ نہ تھی، تب ہی ان میں سے ایک کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔

''نیچے اتر کر مقابلہ کرو......'' ڈین چیخا۔ مخاطب ہم ہی تھے۔ میں نے اختلاف کیا۔

''اب ہمارا نیچے اترنا خطرناک ہوگا، ادھر ہی سے جوابی فائرنگ کرتے رہو۔ جہاز رکنا نہیں چاہیے۔''

جہاز رینگتا رہا اور ہم جہاز کے داخلی دروازے کے دائیں بائیں پوزیشنیں لیے نیچے فائرنگ کرتے رہے، پولیس کی تعداد زیادہ نہیں لگتی تھی، مگر زیادہ ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی، بشرطیکہ ہم اس ٹاپو سے جلدی پرواز نہ کر جاتے۔

جہاز رینگتا ہوا پانی میں آیا اور تب ہی اس کے انجن بیدار ہوگئے۔ اس نے پانی کی سطح پر دوڑنا شروع کر دیا۔ تیز سرد کاٹ دار ہواؤں کے جھکڑ ہمارے چہرے اور جسم سے ٹکرانے لگے۔ ڈین نے دروازہ بند کر دیا اور ہم سب

سیٹوں پر گر کے بُری طرح ہانپنے لگے۔

''مبارک ہو دوستو! ہم بہ حفاظت کو مانگو کے ٹاپو سے پرواز کر چکے ہیں۔'' ڈین نے مبارکباد دیتے ہوئے ہمیں خوش خبری سنائی تو روڈ لف بولا۔

''کیا ہم خطرے کی حدود سے باہر ہیں؟ میرا مطلب فضائی حدود سے ہے۔''

''فضائی حدود میں بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟'' وہ غرور سے بولا۔

''پھر تو تمہاری عقل پر ماتم ہی کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' روڈ لف استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''ہم کوئی کار یا رکشا ٹیکسی لے کر نہیں بھاگے ہیں کہ کسی بھی اندھیری گلی میں روپوش ہو جائیں گے۔ یہ ہزاروں ٹنوں وزنی دیو پیکر آہنی پرندہ ہے۔ اس پر مستزاد اس پر بیش قیمت بدھا کا مجسمہ بھی لدا ہوا ہے۔''

''جہاز اس وقت فضاؤں کی بلندیاں طے کر رہا ہے۔ موسم بھی خراب ہے جو ہمارے حق میں ہو سکتا ہے۔ ہم سے کوئی رابطے میں نہیں ہے۔ نہ ہی ہمیں اپنے بارے میں کسی کو بتانا پڑے گا۔'' ڈین بولا۔

''بتانا بھی پڑے تو کیا ہے۔ ہم اس وقت جیولوجیکل ٹیم کے کارکن ہیں۔'' سون نے بھی ڈین کی حمایت میں کہا۔

''ائر ٹریفک کنٹرولر سے پرمیشن لیے بغیر ہمارا فلائی کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے؟'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''پرمیشن لی جا چکی ہے۔ اس کی فکر مت کرو۔ اب تم لوگ جہاز کے پچھلے حصے میں چلے جاؤ سب اور مخصوص وردیاں پہن لو جا کر..... جلدی۔'' ڈین نے کہا۔ ہم اٹھ کر پچھلے حصے میں آ گئے۔ وہاں نیلی اور خاکی وردیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ ہم نے پہن لیں۔ اس کے بعد ڈین ہمیں چند ہدایتیں دیتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم سیٹوں پر آ کے بیٹھ گئے۔

بڑا سنسنی خیز ایڈونچر تھا ایسا لگتا جیسے کوئی تھرلر وار مووی چل رہی ہو اور ہم اس کا حصہ ہوں۔ کھڑکی سے پار آسمان دھواں دھار ہو رہا تھا۔ تیز شرائے دار بارش ہو رہی تھی اور رہ رہ کہ بجلی چمک جاتی تو دور تک برستا ہوا خلا بڑا ہی ہیبت ناک منظر پیش کرتا تھا۔

ڈین کے دو آدمی جہاز پائلٹ کر رہے تھے، ان میں ایک جیڈ بھی تھا۔ ان دو کو ملا کر ہم کل چھ افراد تھے۔ باقی ٹاپو میں روپوش کر دیے گئے تھے۔

''تھائی ائر ٹریفک کنٹرول ٹاور سے کال آ رہی ہے۔'' جیڈ نے ڈین کے اسپیکر پر بتایا۔ اس کے چہرے پر ہیڈ فون چڑھا ہوا تھا۔

''کال ریسیو کرو اور فریکوئنسی سمیت بتا دو کہ ہمارا تعلق ایک جیولوجیکل سروے ٹیم سے ہے۔'' ڈین نے ہدایت دی۔

''بتا دیا ہے..... لیکن وہ ہمیں تھائی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کی سختی سے ہدایت دے رہے ہیں۔''

''انہیں اجازت نامے کا کوڈ بتا دو..... اور کہہ دو کہ موسم کی خرابی کے باعث سگنل درست ریسیو نہیں ہو رہے ہیں۔''

''یہ بہانہ میں کر چکا ہوں۔'' جیڈ نے جواب دیا۔

''کیا ہم ابھی تک تھائی حدود میں ہیں؟''

''گلف آف تھائی لینڈ کے اوپر پرواز کر رہے ہیں۔''

''بلندی......؟''

''تین ہزار فٹ۔''

''چار تک لے جاؤ۔''

''پانچ سو سے زیادہ اضافہ نہیں کر سکتا۔''

''او کے جتنی بلندی پر لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔ اور انہیں بلف کرو کہ خرابی درست کی جا رہی ہے۔ تب تک ہم ان کی فضائی حدود سے نکل چکے ہوں گے۔''

''او کے سر......!''

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے پھر میں نے ڈین سے پوچھا۔

''کیا تھائی حکومت کے علم میں آ گیا ہے کہ اس جہاز میں گوتم بدھ کا مجسمہ چوری کر کے لے جایا جا رہا ہے؟''

''ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔'' اس نے سرسری سا جواب دیا تو روڈ لف نے اس سے دریافت کرنا چاہا۔

''تم نیچے اپنے ساتھیوں سے رابطے میں تو رہو۔ کاساپا کو کی کیا پوزیشن ہے؟ کیونکہ باقی کی آسانی وہی ہمارے لیے پیدا کر سکتا ہے۔''

ڈین نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ڈین کا روڈ لف کے ساتھ یہ روکھا رویہ کوئی بھی گل کھلا سکتا تھا۔ میں نے روڈ لف کا ہاتھ آہستگی سے دبایا، وہ میرا اشارہ سمجھ کر چپ ہو رہا تو میں نے اس کے کان میں سرگوشی کر ڈالی۔

''ڈین بہتر طریقے سے حالات کو ہینڈل کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے اسے نیچے سے ہدایات موصول ہو رہی ہیں اور وہ ہم سے شیئر کیے بغیر انہی پر عمل کرتا رہے گا۔ ہم اب

ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس لیے صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرتے رہو اور ڈین سے الجھنے کی ہرگز کوشش مت کرنا۔''

''اوکے جون......!'' روڈلف نے ہولے سے کہا۔ سون اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے بھی سرگوشی میں میری بات سن لی تھی، لیکن وہ جواب میں روڈلف کی طرح خاموش نہیں رہ سکی آہستہ سے بولی۔

''لیکن...... ڈین کو ہم سے اپنی باتیں شیئر کرنی چاہئیں۔ اگر ہدایات میں تبدیلی کی گئی ہے تو اسے ہم سے مشورہ تو کرہی لینا چاہیے۔''

''ہاں! تمہاری بات صحیح ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''لیکن ابھی ٹھہرو میں موقع نکال کر اس سے بات کرتا ہوں۔''

سفر جاری تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ...... تھائی لینڈ کی ملٹری یا فضائی فورس ہمارے طیارے کے خلاف کہیں اسالٹ ایکشن نہ لے ڈالے، ایسی صورت میں طیارے کی تباہی یقینی تھی۔ جب میں نے ذرا دیر اپنے اس خدشے کا اظہار ڈین سے کیا تو اس نے میری بات قہقہے میں اڑا دی اور بولا۔

''ہم فضائی حدود کے اجازت نامے کا فریکوئنسی کوڈ بتا چکے ہیں۔ ایسا کوئی ایکشن نہیں لیا جا سکتا۔ اس کی حدود سے نکلتے ہی جوشوا پارٹی ہماری مدد کرے گی۔ تاہم موجودہ حالات کے پیشِ نظر پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کر دی گئی ہے۔''

''کیسی تبدیلی؟'' روڈلف نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کمبوڈیا اور ویت نام کی حدود عبور کرنے کے بعد ہمیں کچھ دن جزائر فلپائن میں اسٹے کرنا پڑے گا۔''

''لیکن باس کے مطابق ہمارا اسٹے بحرالکاہل میں واقع ایک فرضی نام والے جزیرے ڈارک آئی لینڈ میں ہونا تھا؟'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''کہا نا کہ پروگرام میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔''

''یہ تبدیلی باس کے حکم سے کی گئی ہے؟'' اس بار سون نے دریافت کیا۔

''ہاں!'' ڈین نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن باس تو خود پولیس کی گرفت میں ہے۔'' میں نے کہا۔

''باس اپنا پلان پیش کر چکا تھا اور جیڈ اسی پر عمل کر رہا ہے تاہم باس زیادہ دیر پولیس کی کسٹڈی میں نہیں رہ سکتا۔''

''لیکن آگے ہماری کمانڈ کس کے حوالے ہوگی؟'' میں نے سوال کیا۔

''جوشوا پارٹی کو نیا پلان بتا دیا گیا ہے۔ وہ اس حوالے سے ہماری رہنمائی کرے گی۔'' ڈین نے جواب دیا۔ پھر بولا۔ ''اب مجھے ذرا جیڈ سے بات کرنے دو۔'' کہتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے لوکیشن وغیرہ دریافت کرنے لگا۔

میری طرح روڈلف کے ذہن میں بھی ابھی بہت سے سوال گردش کر رہے تھے۔ جس کے بارے میں ہم دونوں وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ہمارا سفر جاری تھا۔ کافی وقت بیت گیا اور یہ وقت ہم نے کبھی سوتے جاگتے بِتایا تھا۔ کافی دیر بعد ڈین نے جوشِ مسرت تلے ہمیں بتایا کہ...... ہم ویت نام کو عبور کر کے ساؤتھ چائنا سی کے اوپر سے فلپائنی جزائر کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں اور گومبورا نامی ایک جزیرے کے ساحل پر اترنے والے ہیں۔ اس جزیرے کی جنوب مشرقی حدود سے انڈونیشیا کی آبنائے ملتی ہیں۔ چونکہ یہ عام فضائی روٹ سے ہٹ کر راستہ اختیار کیا گیا تھا اسی لیے ہمیں ساڑھے تین گھنٹے لگ گئے تھے، ورنہ یہ سفر مقررہ فضائی روٹ سے تقریباً تین گھنٹوں پر محیط ہوتا۔ وقت بھی ایک گھنٹے کے فرق سے آگے پیچھے تھا۔

بارش کا شور ختم ہو چکا تھا۔ یہاں مَطلع صاف تھا اور سورج کی روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔

''تھائی حکومت کو اگر اس امر کا یقین ہو گیا کہ...... کومانگو جزیرے سے فلائی کرنے والے سیبینا کارنیوال بش...... میں ایک ملکی نوادرات کا حامل بیش قیمت مجسمہ چوری کر کے لے جایا جا رہا ہے تو...... وہ انٹرپول کے ذریعے ہمارے خلاف کسی بھی خطے میں کارروائی کر سکتے ہیں۔'' میں نے اپنے دل و دماغ میں کافی دیر سے پلنے والے ایک خدشے سے ڈین چنگ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''انہیں ابھی اس کی تصدیق کرنے میں وقت لگے گا۔ تب تک ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوں گے۔''

''بچوں والی باتیں مت کرو مسٹر ڈین!'' روڈلف نے سرد لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے بازو کی پٹی اتار دی تھی اور تھوڑا بہت ہاتھ ہلانے جلانے لگا تھا۔ تاہم بینڈیج جوں کی توں بندھی ہوئی تھی۔

''مسٹر شہزی کے اس خدشے کو ہم نظرانداز کر کے زیادہ دیر احمقوں کی جنت میں نہیں رہ سکتے۔ بین الاقوامی

قوانین بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں اس سلسلے میں مسٹر ڈین......''

میرے خیالات کا یکساں ہونا ایک اچھی علامت تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اسے اپنے جس پلان سے پہلے ہی آگاہ کر رکھا تھا وہ اس سے ہر طرح مطمئن اور مسرور بھی تھا۔ کیونکہ اس میں اس کی اپنی مکتی بھی نظر آتی تھی۔

فلپائن سے طیارے کے اگلے سفر کے لیے فیول کا بھی بندوبست کرنا تھا اور کاسپاکو اور جیڈ وغیرہ کے مطابق وہاں جوشوا کے دو آدمیوں کو ہمارے ساتھ شامل ہو جانا تھا، فیول کا بندوبست اور آگے روانگی کی ذمّے داری ان کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ڈین چنگ، جیڈ دونوں کھڑکی سے نیچے دیکھنے لگے۔ جیڈ نیچے کہیں اپنی انگلی کے اشارے سے ڈین سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ بھی اپنی سیٹ سے تھوڑا اٹھ کر کھڑکی سے نیچے تکنے لگا، لامحالہ میں نے بھی اپنی طرف کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔

میں نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ فلپائنی جزائر بڑا دیدہ زیب منظر پیش کر رہے تھے۔ حدِ نگاہ پھیلے بحرالکاہل کے گہرے نیلگوں پانیوں میں کوئی جزیرہ دل کی شکل کا تھا اور کوئی پتے اور ٹپکے ہوئے آنسو کی شبیہہ کا نظر آتا تھا۔ مختصر آبنائیں انہیں ایک دوسرے سے ملائے ہوئے دکھائی دی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے خوابوں کی کوئی سرزمین تھی جو ہماری منتظر ہو۔ مذکورہ جزیروں کے ساحلوں پر کشتیاں چھوٹے بڑے شپ اور لوگ باگ ... کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتے دکھائی دے رہے تھے۔

سورج کی نودمیدہ کرنوں کا عکس دور تک جھلملاتے نیلگوں پانیوں میں بڑا شفق رنگ منظر پیش کرتا تھا۔

کومبورا نامی جزیرہ نسبتاً ان سے الگ تھلگ تھا، ایک چھوٹی سی آبی راہ گزر اس سے جڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ طیارے نے اس کے اوپر فضا میں ایک چکر لگایا اور پھر نیچے اُترنے لگا۔ ہمیں سیٹ بیلٹس باندھنے کا ہدایات نامہ جاری کیا جا چکا تھا۔

پھر سے ایک نئے دیس اور اجنبی سرزمین پر اُترنے کا جوش اپنی جگہ تھا، مگر فطری خدشات اور متوقع وغیر متوقع حالات کی کشاکشی کا دھڑکا بھی کسی ممکنہ خطرے کی صورت دامن گیر تھا۔ نجانے اس پرائے دیس میں اب کون سے ہنگامے میرے منتظر تھے؟

جلد ہی مجھے جیڈ اور ڈین کے نیچے دیکھنے کا مقصد معلوم ہو گیا۔ جزیرے کے ساحل سے ایک ڈیڑھ کلو میٹر دور کھلے سے میدان میں ایک سرخ رنگ کی چادر والا ٹینٹ سا نصب دکھائی دیا۔ وہاں دو عدد ''فور وہیل موٹر بائیک'' بھی کھڑی نظر آئیں۔ ایک کا رنگ نیلا اور دوسری کا سرخ تھا۔ ایک لمبی سی جیپ بھی کھڑی تھی۔ چند لوگ بھی کھڑے نظر آرہے تھے۔ جو سر اٹھائے آسمان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ یقیناً ان کی نظریں ہمارے طیارے پر لگی ہوئی تھیں۔

ابھی میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر سیٹ پر سیدھا ہو کے بیٹھا ہی تھا کہ ڈین کی مسرت بھری آواز اُبھری۔

''مبارک ہو دوستو! جوشوا کی ٹیم پہنچ گئی ہے۔''

''کہیں تمہارا اشارہ اس سرخ رنگ کے بڑے سے خیمے کی طرف تو نہیں ہے، مسٹر ڈین؟'' میں نے کسی خیال کے پیشِ نظر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ویل! خوب سمجھے، جوشوا کے چار عدد ساتھی ہمارے لیے پہنچ چکے ہیں۔ اب ہمیں کسی قسم کی چنتا کی ضرورت نہیں......''

اس کی بات سنتے ہی اچانک میری کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ یہ اسپیکٹرم کے رکن تھے۔ ان کی کیا حیثیت تھی، آیا یہ تربیت یافتہ تخریب کار ٹائپ ایجنٹ تھے یا پھر محض فیلڈ اسکواڈ سے متعلق عام سے لوگ......؟ نیز ان میں سے کون ایسا ہو سکتا تھا جو مجھے اسپیکٹرم کا دشمن نمبر ایک کے طور پر پہچان سکتا تھا؟ جوشوا......؟ یا کوئی اور...... جسے میرے سلسلے میں پہلے سے کوئی خاص ہدایت دی گئی ہو؟ اگرچہ میں نے اپنی طرف سے پوری رازداری برتنے کی کوشش چاہی تھی پھر بھی محتاط رہنا ضروری تھا۔

''کیا جوشوا بھی آیا ہوا ہے؟'' دفعتاً روڈلف نے ڈین سے وہی سوال پوچھ لیا جو میں ابھی کرنے والا تھا۔

''وہ اسکوائر سٹی کے ہوٹل میں مقیم ہے۔'' ڈین نے جواب دیا۔

میں روڈلف کے اس سوال کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ جوشوا سے اسے نفرت ہو گئی تھی بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ ہم دونوں ہی کی یہاں جوشوا سمیت ڈین سے بھی کوئی بڑی جنگ ہو سکتی تھی۔ درحقیقت میں نے اور روڈلف نے متفقہ طور پر اسپیکٹرم کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے لانے کا عہد کر لیا تھا... ہمیں انٹرپول سے کسی طرح رابطہ کر کے ان کی اس ''گریٹ روبری'' ......کا منصوبہ ناکام بنانا تھا۔

بہرکیف...... ادھر طیارے نے ایک چکر پورا کرنے

کے بعد سمت کا تعین کیا اور ایک غوطہ لگایا۔ میرا جی الٹنے لگا۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے طیارہ کسی آبی شکاری پرندے کی طرح پانی میں غوطہ لگا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا عین وقت پر طیارے کی بحرانکائل پر جھکی ہوئی آہنی چونچ اوپر کو اٹھی اور اس نے سطحِ آب پر "لینڈ" کرلیا۔

طیارہ تیزی سے تیرتا پانی کے فوارے اچھالتا ہوا سیدھا ہوا اور جزیرے کے ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی رفتار بھی بتدریج کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وہ سطحِ آب پر "ٹیکسی" کرتا ہوا ساحل کی طرف مڑا اور پھر اپنے مخصوص فلوٹن اسکو کی بدولت وہ پانی میں تیرتا ہوا ساحل پر آ گیا۔

طیارے کا انجن رواں تھا اور چونچ پر نصب پنکھ ہنوز تیزی سے گھوم رہا تھا۔ ساحل پر آتے ہی وہ ریت پر رینگنے لگا اور آہستہ آہستہ ہٹ نما بنے خوب صورت خیمے کے قریب پہنچ گیا۔ جہاز سے اُترنے سے پہلے میں نے سب کو اپنے نام کے سلسلے میں محتاط کر دیا تھا کہ جو نام میرا کاسپا کو نے تجویز کیا ہے، وہی چلے گا۔

وہاں چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں ایک جوان عورت تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کا گنجا شخص تھا۔ باقی دو جوان مرد تھے۔ انہوں نے موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔

عورت دلکش خدوخال کی مالک تھی اور دراز قامت تھی۔ وہ ایک ٹھیٹ امریکن نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی ہالی ووڈ کی ایکشن تھرلر فلموں کی اداکارہ ہو، میں اپنی "خاص" بھانپتی ہوئی نظروں سے ان چاروں کی چال ڈھال اور انداز و اطوار کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے مجھے دو تربیت یافتہ ایجنٹ معلوم ہو رہے تھے۔ باقی ادھیڑ عمر اور دوسرا نوجوان عام سے انداز و اطوار کے دکھائی دیتے تھے۔ اول الذکر...... دونوں مرد عورت...... تنے ہوئے جسم اور چست نظریں لیے ہمیں تکے جا رہے تھے۔ ہم سے انہوں مصافحہ بھی کیا تھا باری باری...... میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا تھا کہ دونوں مرد عورت نے بالخصوص روڈلف اور مجھ سے ملتے ہوئے کچھ خاص نظروں سے دیکھا تھا۔

گومبورا کے جزیرے پر بڑی غضب کی سردی تھی۔ بلکہ کہیں کہیں برف بھی گری ہوئی نظر آتی تھی، یوں لگتا تھا جیسے گزشتہ شب ٹھیک ٹھاک برف باری ہوئی ہو۔

پھر جیڈ اور ڈین تو اس ادھیڑ عمر شخص اور دوسرے نسبتاً جوان آدمی سے گفتگو کرنے لگے۔ البتہ وہ دونوں "مشکوک" مرد عورت فوراً خیمے کے اندر گھس گئے تھے۔

میں نے روڈلف کو وہیں کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود سردی کا اثر زائل کرنے کے لیے اپنی "گرمپی" کے کالر کھڑے کرتے ہوئے ٹوپ سر پر چڑھا لیا اور دونوں ہاتھ آپس میں ملنے لگا۔ اس کے بعد دستانے چڑھانے لگا اور جسم کو وارم اپ کرنے کے بہانے خیمے کے اس داخلی حصے کی طرف بڑھ گیا جدھر...... میں نے کن انکھیوں سے ان دونوں کو اندر کی جانب کھسکتے دیکھا تھا۔

"ہیلو، ہیلو بروجیٹ کالنگ، لیس باس! وہ دونوں ساتھ ہیں......روڈلف اور شہزی!"

دفعتاً مجھے جوان مرد کی آواز سنائی دی اور میرے کان یکا یک کھڑے ہو گئے۔ میں تھوڑا اور اندر کھسک آیا۔ چند ثانیے کے لیے خاموشی چھائی رہی جیسے وہ دوسری جانب سے ہونے والی گفتگو غور سے سن رہا ہو۔

"او کے باس! روڈلف کو حادثاتی موت کا شکار کر دیا جائے گا۔ شہزی کو کڈنیپ کرنے کے لیے ماسٹر چیف کا وہی حکم ہے...... باقی ڈین سے سودے بازی کی نوعیت جوں کی توں رہے گی۔ ڈارک آئی لینڈ سے انہیں کیش رقم دے کر لوٹا دیا جائے گا۔" بروجیٹ کی مجھے دوبارہ آواز اُبھری اور میرے اندر چیختے ہوئے سناٹے اُترنے لگے۔

میں نے صرف اپنا نام بدلا تھا، چہرہ نہیں، کیا بعید تھا کہ ان کے ماسٹر چیف لولوش نے میری تصاویر انہیں دکھا رکھی ہو۔ بروجیٹ سمیت کیٹ وغیرہ مجھے پہلے ہی پہچان گئے ہوں۔ اس عورت کا نام کیٹ تھا۔

بہر طور کاسپا کو سے اپنی "ڈیل" کو چھیڑے بغیر انہوں نے میرے اور روڈلف کے لیے پہلے ہی سے پلان تیار کر رکھا تھا اور "ماسٹر چیف" کے ذکر پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کا مطلب لولوش سے ہی تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ اس "کاز" پر اسپیکٹرم کے دو فیلڈ اسکواڈ مشترکہ طور پر کام کر رہے تھے۔ جبکہ میرا یہ قیاس درست ثابت ہوا تھا کہ دونوں مرد عورت اسپیکٹرم کے اسالٹ ونگ سے تعلق رکھتے تھے اور یہی ونگ اسپیکٹرم کے دیگر اسکواڈ پر بالادست حیثیت کا حامل بھی تھا۔

اسی وقت مجھے اس عورت کی آواز سنائی دی، جب میں نے اس کے ساتھی کو "اوور اینڈ آل" کہتے سنا تھا۔

"بروجیٹ! ہمیں یہ کام نہایت محتاط انداز میں اور چابک دستی سے کرنا پڑے گا۔ کیونکہ روڈلف تو نہیں البتہ ہمارا اصل شکار شہزی، ان کا خاص ساتھی ہے۔ اس صورت میں یہ ڈیل متاثر ہو سکتی ہے، کیونکہ اس خدشے کا اظہار جوشوا

بار بار باس اسٹار بک سے کر چکا ہے۔ روڈلف کا تو اتنا نہیں البتہ شہزی کے سلسلے میں ماسٹر چیف ہمیں بار بار احتیاط کے لیے کہہ چکا ہے کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔''

جواب میں بروجیٹ کی آواز ابھری۔ ''اسٹار بک سارے انتظامات کر چکا ہے۔ ڈیواؤ میں اسکوائرسٹی کے ایک ریزورٹ میں بیٹھا وہ جھک نہیں مار رہا۔ ساری پلاننگ وہ تیار کر چکا ہے۔ صرف ہماری طرف سے گرین سگنل دینے کی دیر ہے۔ شہزی کے سلسلے میں اسٹار بک کی بریفنگ اپنی جگہ مگر ماسٹر چیف نے خاص طور پر مجھے بھی اس کے بارے میں یہی ہدایت دی ہے کہ وہ بلا کا چھلاوا صفت، زیرک دماغ اور شاطر آدمی ہے۔ اس کی خطرناکی کو چھیڑے بغیر کام نکالنے کی کوشش کریں گے۔''

اس کی بات سُن کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ لولوش کی میرے خلاف یہ بزدلانہ کارروائی میری طرف سے اس کے لاشعور میں چھپے ہوئے خوف کا پتا دیتی محسوس ہوتی تھی۔ شاید اپنے ایک مقرب خاص کارپرداز...... وزیر جان کے میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام کے بعد سے وہ...... خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ اب جبکہ میری اَپ ڈیٹ کے مطابق عابدہ بھی اس کے قبضے سے کوسوں دور جا چکی تھی۔

''تو پھر کب تک گرین سگنل دینے کا ارادہ ہے؟'' کیٹ نامی اس کی ساتھی ایجنٹ عورت نے پوچھا۔ دونوں دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ ساتھ ہی مجھے باہر سے بھی...... باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جہاں ڈین ان کے دونوں آدمیوں سے مصروفِ گفتگو تھا۔ روڈلف اور سون بھی ان کے ساتھ تھے۔

''گرین سگنل میں نہیں جوشوا دے گا اسٹار بک کو...... کیونکہ گوتم بدھ کے مجسمے والا معاملہ ماسٹر چیف کے سامنے زیادہ اہم ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد پتا چل جائے گا۔ ڈیواؤ کے ریزورٹ (RESORT) میں دونوں اسکواڈ کے باسز ساتھ ہی موجود ہیں۔''

اسی وقت مجھے باہر موجود لوگوں کے بولنے کی آوازیں قریب آتی سنائی دیں۔

''وہ لوگ ادھر ہی آرہے ہیں بروج!'' اچانک اندر سے مجھے عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھی ایجنٹ بروجیٹ سے مخاطب تھی۔ میرے لیے واپسی کا راستہ نہیں بچا تھا۔ اسی لیے میں دائیں جانب سے آگے بڑھ گیا اور...... عقبی حصے سے ہوتا ہوا باہر کھلی فضا میں آگیا۔

سانس لینے کے دوران میں میرے منہ سے بھاپ کی صورت میں دھواں خارج ہو رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھانے لگے تھے۔ موسم ہنوز سرد اور خشک ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے دھوپ کی روشنی پھیلنے لگی تھی جو اب اچانک غائب ہو گئی تھی۔

''مسٹر شہزی......!''

اچانک مجھے کسی نے آواز دی۔ یہ ڈین تھا۔ میں پلٹا اور اسی طرف آگیا۔ مجھے سخت طیش آرہا تھا کہ منع کرنے کے باوجود ڈین نے مجھے شہزی کے نام سے پکارا تھا۔

''تم سردی میں ادھر کیا کر رہے ہو؟ اندر آجاؤ۔'' ڈین نے کہا۔ وہ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں سر ہلاتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا۔

ہم اندر آکر بیٹھ گئے۔ میرے اندر زبردست دھکڑ پکڑ مچی تھی۔ روڈلف کی جان خطرے میں اور خود میں بھی اس سے باہر نہ تھا۔ وہی ہوا تھا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اسپیکٹرم واقعی ایک آکٹوپس کا نام تھا۔ اس کے دونوں اسکواڈ کے باس اسٹار بک اور جوشوا قریبی جزیرے ڈیواؤ کے ایک ریزورٹ میں مقیم تھے۔ اسٹار بک کے ذمے مجھے اور روڈلف کو ٹھکانے لگانا تھا جبکہ جوشوا نے ڈین کے ساتھ بدھا کے مجسمے کے سودے کو پار لگانا تھا۔ گویا اسٹار بک کے ساتھی یہ دونوں ایجنٹ کیٹ اور بروجر تھے جبکہ جوشوا کے ساتھی وہ ادھیڑ عمر اور جوان مرد تھا۔ روڈلف کو ٹھکانے لگانے کی ان کی کیا منصوبہ بندی تھی، اس کا مجھے ابھی علم نہ ہو سکا تھا تاہم پتا چل گیا تھا کہ وہ ہم دونوں کے خلاف کیا کرنے والے تھے۔

روڈلف کو ابھی اس خطرے سے آگاہ کرنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا تھا تاہم میں اس کی طرف سے محتاط تھا۔

خیمے کی ایک وسیع نشست گاہ میں ہم تھوڑی دیر تک بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ادھیڑ عمر آدمی کا نام جوزف اور اس کے ساتھی جوان مرد کا نام گیری معلوم ہوا تھا۔

عورت جس کا نام کیٹ تھا اور بروجر خاموش تھے جبکہ ڈین اور جوزف کے درمیان اسی مجسمے سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ کمرے میں ڈش اینٹینا والے ٹی وی کا بھی بندوبست تھا۔ جو اس وقت آن تھا۔ باقی ضروریاتِ زندگی کی ہر شے وہاں موجود تھیں۔

اچانک ہم سب اس وقت چونک پڑے جب ٹی وی پر بریکنگ نیوز میں ہمارے طیارے کی تصاویر دکھائی جانے

لگیں جس میں تھائی حکومت نے فلپائن حکومت سمیت انٹرپول سے درخواست کی تھی کہ تھائی کی فضائی حدود سے ایک سیبینا کار نیوال بش طیارہ گزشتہ شب پرواز کر کے گلف آف تھائی لینڈ سے ساؤتھ چائنا سی چینل کے اوپر پرواز کرتا ہوا فلپائنی فضائی حدود میں داخل ہوا ہے۔ ایک اور خاتون خبر سناتے ہوئے بتانے لگی۔

اس طیارے میں بینکاک کے تریتر میوزیم سے چوری کیا گیا بدھا کا بیش قیمت اور نادر مجسمہ لے جایا گیا ہے۔ ایک امریکی ٹی وی چینل کے مبصر تھائی لینڈ حکومت کو اپنے ''صائب'' مشورے سے آگاہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ تھائی حکومت کو بین الاقوامی معتبر ادارے ''اسپیکٹرم'' سے بھی اس سلسلے میں مدد لینی چاہیے۔ جس کی شہرت اس حوالے سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ......وہ ایسے چوری شدہ نوادرات کو اس کے جائز اور صحیح مقام تک لانے میں بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

''اوہ...... تھائی حکومت کا انٹرپول سے رابطہ کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔'' جوزف متفکر لہجے میں بولا۔ اس کا ساتھی گیری بھی تشویش زدہ نظر آنے لگا۔ لیکن بروجیٹ اور کیٹ کے بشروں سے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ بظاہر نارمل ہی نظر آرہے تھے۔ البتہ ڈین، جوزف کی طرف دیکھ کر بولا۔

''انٹرپول سے تھائی حکومت کا مدد لینا ہمارے لیے ایک بڑے خطرے کی علامت ہے۔'' پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ جوزف کی طرف سے اپنے سوال کے جواب انتظار کیے بغیر میری طرف دیکھ کر مزید بولا۔

''جون! تمہارا خدشہ تو بالکل درست ثابت ہوا۔ کمال ہے تمہیں اس کا کیسے ادراک ہوگیا تھا؟''

ڈین کے اس پرلے درجے کے بے وقوفانہ سوال پر میں اندر سے تلملا کر رہ گیا۔ میرے خیال میں اسے بلاوجہ یہ بات، وہ بھی ان سب کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تاہم میں نے فوراً مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو عام سی بات ہے۔ حالات جیسے نظر آرہے تھے ان کی رو سے میں نے اندازہ لگایا تھا جو اتفاق سے درست ثابت ہوا۔''

جوزف کے چہرے پر ہنوز گہرے تفکر کے سائے لرزاں تھے، جبکہ بروجیٹ اور کیٹ میری طرف بڑے غور اور تیکھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ روڈلف کا چہرہ مجھے کچھ سرخ سا نظر آرہا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ان چاروں نے روڈلف کے بارے میں ذرا سی بھی شناسائی کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''اس میں تم لوگوں کی بھی غلطی ہے۔ تمہیں روانہ ہوتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کاسپا کو اتنا ہی گیا گزرا آدمی ہے کہ......اس کا کوئی بھی آدمی یوں بہ آسانی اس سے متنفر ہونے کے بعد پولیس کو اس کے خلاف کرسکتا ہے؟'' بروجیٹ نے کہا۔ اس کا لہجہ طنزیہ اور خار کھایا ہوا تھا۔ جوزف نے بھی اس کی بات کی تائید میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

میں نے دیکھا اس کی بات پر ڈین نے برا سا منہ بنایا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک روڈلف نے بروجیٹ کو تنگڑے جواب سے نوازدیا۔

''نیت میں فتور ہو تو معاملات اسی طرح بگڑنے لگتے ہیں۔ ہمارا پہلے والا منصوبہ بے حد خفیہ اور شاندار تھا۔ لیکن جوشوا کی بدنیتی کے سبب تاخیر اس کی وجہ بنی اور کاسپا کو کے کسی اپنے ہی باغی آدمی میں سے ایک نے تھائی پولیس کو گمنام کال کر کے مجسمے کی چوری سے متعلق آگاہ کردیا، یہ بات اپنی جگہ درست سہی، لیکن اس معاملے کی خرابی کی اصل وجہ وہی ہے جو میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔'' سب قدرے چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

اس کی بات پر اچھے بھلے دوستانہ ماحول میں پل کے پل کشیدگی کا سا سناٹا طاری ہوگیا۔ روڈلف اندر سے جلا ہوا تھا اور دل کے پھپھولے پھوڑے بنا نہ رہ سکا۔ مجھے اس کا یوں بولنا ایک لحاظ سے درست بھی لگا، جو فیکٹ تھا وہ اس نے اگل دیا تھا۔

''یوشٹ اَپ۔'' اچانک ہی بروجیٹ نے روڈلف کو غصے سے جھڑک دیا۔

''باس کی شان میں ایسا کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''میں نے باس جوشوا کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی۔'' روڈلف بدستور جلے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''جو حقیقت ہے، وہی بیان کررہا ہوں میں۔''

''ایسا تمہاری اپنی نیت کی خرابی کے بل بوتے پر ہوا تھا۔'' بروجیٹ بحث پر اتر آیا۔ دونوں ہی اگرچہ اسپیکٹرم کے کارکن تھے۔ مگر دونوں کی اسپیکٹرم میں نوعیت مختلف تھی۔ روڈلف کے فیلڈ اسکواڈ کے مقابلے میں اسالٹ ونگ کو سب پر فوقیت حاصل تھی۔ روڈلف فیلڈ اسکواڈ سے تعلق رکھتا

تھا۔ یوں تو اسپیکٹرم میں اس ونگ کی بھی کوئی معمولی حیثیت نہیں تھی کیونکہ اسپیکٹرم کی ساکھ کو عالمی تناظر میں ''معتبر'' بنائے رکھنا اسی کی ذمے داری تھی اور فضائی حد تک انہیں بھی لڑائی بھڑائی اور اسلحہ وغیرہ کی تربیت ہوتی تھی۔

''میرا اب منہ مت کھلواؤ بروجیٹ!'' روڈلف زخمی لہجے میں بولا۔ تو کیٹ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے ثالثی کا کردار ادا کیا۔

''تم دونوں کی آپس کی بحث بے معنی اور فضول ہے۔ نیت جس کی بھی خراب تھی، وہ معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے پا چکا، اب آگے کی سوچو۔''

''ہماری یہاں سے اب جلد از جلد روانگی کا بندوبست کر دینا چاہیے۔'' ڈین نے بھی مصلحتاً کسی بحث میں پڑے بغیر کہا تو میں بولا۔

''لیکن اب ہمارا کم از کم جہاز کے ذریعے فلائی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ ہمیں امریکا روانگی کا کوئی اور بحری بندوبست کرنا ہوگا۔''

''بہتر ہوگا کہ جوشوا اور اسٹاربک کو ادھر بلا لیا جائے۔ ہم سب اس وقت خطرے میں گھر چکے ہیں۔ اور جہاز سے بھی ہمیں پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔'' روڈلف نے بھی مشورہ دیا۔

ڈین نے اس کی بات کی تائید کے انداز میں ہی ان لوگوں سے کہا۔ ''یہی بہتر ہوگا کہ ہم یہاں آپس میں سر جوڑیں وقت ضائع نہ کریں، ان دونوں کو ادھر ہی بلا لیا جائے۔''

وہ چاروں سوچتی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بالآخر جوزف نے بروجیٹ سے کہا۔

''میں تو اپنے باس مسٹر جوشوا سے بات کرنے لگا ہوں، یقیناً یہ خبریں انہوں نے بھی سن لی ہوں گی۔ تم کیا کہتے ہو بروجیٹ؟''

اس کی بات پر بروجیٹ نے کیٹ کی طرف دیکھا۔ میں ان دونوں کی اپنے اور روڈلف کے سلسلے میں فتورِ نیت سے آگاہ ہی تھا کہ اپنے دلوں میں ہم دونوں کے لیے کیسا خطرناک منصوبہ چھپائے ہوئے تھے۔ اسی سبب وہ مخمصے کا شکار نظر آنے لگے۔ تب ہی کیٹ نے کہا۔

''میرا خیال ہے پھر ہمیں اسٹاربک سے بات کر لینی چاہیے۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک خیمے کے محدود ماحول میں تیز سی ''بپ...... بپ......'' کی آواز اُبھری اور بروجیٹ نے چونک کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے منہ کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

''اوہو...... شاید باس نے خود ہی رابطہ کر لیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے واچ ٹرانسمیٹر پر چند مخصوص الفاظ ادا کیے اور دوسری جانب سے اپنے باس اسٹاربک سے باتیں کرتا رہا اور آخر میں یہی بولا کہ ''یس باس! ہم بھی یہاں اسی سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔''

پھر وہ اسی طرح رسٹ واچ اپنے منہ کے قریب کیے ہوئے ہم سے معذرت کر کے اٹھا اور باتیں کرتا ہوا خیمے کے دوسرے بعید ترین گوشے کی طرف چلا گیا۔ میں کن انکھیوں سے اسی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

روڈلف کے چہرے پر بھی کچھ الجھن کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ جبکہ کیٹ میری طرف بہ غور تکنے لگی۔ ہم دونوں کے سوائے کسی نے بھی بروجیٹ کے اس طرح واچ ٹرانسمیٹر پر باتیں کرتے کرتے اٹھ کر جانے کو خالی از علت نہیں جانا تھا، میرے ذہن میں تو پہلے ہی سے تھا کہ بروجیٹ اسٹاربک سے میرے اور روڈلف کے سلسلے میں موجودہ حالات میں کوئی نئی ''ہدایت'' یا ''منصوبہ'' لینے کے لیے اس طرح اٹھ کر گیا تھا کہ تنہائی میں وہ اسٹاربک سے اس نوعیت کی گفتگو کر سکے۔

میں بے چین سا ہو گیا۔ ہم بظاہر بروجیٹ کی اس حرکت کو نظر انداز کر کے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر مزید بیتی تو کیٹ نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی اور وہ اٹھ کر اسی طرف بڑھ گئی جہاں اس کا ساتھی بروجیٹ گیا تھا۔ پل کے پل میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ نجانے اب ہمارے بارے میں ان خبیثوں نے کون سا نیا منصوبہ بنا لیا ہوگا؟ اس کا مجھے پتا نہ تھا۔ تاہم کسی متوقع واقعے کو ''حادثے'' کا رنگ دینے والی بات مجھے یاد تھی جو پہلے ہونے والی گفتگو میں بروجیٹ نے اسٹاربک سے کہی تھی۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ حادثہ کون سا اور کس نوعیت کا ہوتا۔

''ہمیں ذرا ایکسکیوز کریں، پلیز......!'' میں نے ان لوگوں سے معذرت چاہی اور اچانک روڈلف سے کہا۔

''روڈلف! ذرا میرے ساتھ آنا۔'' وہ حیران حیران سا میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں تب تک خیمے کے نکاسی والے دروازے سے باہر آ گیا۔

میں دانستہ خیمے سے آٹھ، دس قدم چلتا ہوا دور آ گیا

تھا۔ روڈلف حیران و پریشان سا چلتا ہوا میرے پیچھے آ گیا۔

''خیریت تو ہے شہزی!'' وہ میرے قریب آ کر رکتا ہوا بولا۔

''خیریت نہیں ہے روڈلف!'' میں نے منہ سے بھاپ کے مرغولے چھوڑتے ہوئے کہا۔ سردی زوروں کی پڑ رہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔

''وہ تو میں بھی دیکھ ہی رہا ہوں کہ خیریت نہیں ہے، جس کا تم پہلے ہی اس کم عقل ڈین سے بار بار اظہار کرتے رہے ہو۔'' روڈلف بولا۔ وہ اب بھی میری بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا سمجھتا بھی کیسے؟ میں نے ابھی تک اسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا جس سے وہ لاعلم تھا اور جب میں نے اسے اسٹار بک اور بروجیٹ سمیت کیٹ کے ہولناک منصوبے سے اسے آگاہ کیا تو روڈلف کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

''مائی گاڈ، مسٹر شہزی! تم تو میری سوچ سے بھی زیادہ چوکنے اور بیدار مغز ہو۔'' ساری کتھا سننے کے بعد وہ حیران سا ہو کر مجھ سے بولا۔

''میری تعریفیں کرنے سے زیادہ بہتر ہوگا کہ ہمیں اپنے منصوبے پر جلد از جلد عمل کرنے کا سوچ لینا چاہیے، قبل اس کے کہ دشمن اپنا وار کر جائے یا انٹرپول یہاں آ کر ہمیں بھی دھر لے۔'' میں نے اپنے ہاتھوں کے دستانے درست کرتے ہوئے اس سے کہا اور آگے بولا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میری اپنی عقل بھی کام نہیں کر رہی ہے کہ ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ڈز...... ڈز......''

اچانک دو فائر ہوئے۔ میں اور روڈلف باتیں کرتے ہوئے بُری طرح ٹھٹکے......

''ہوشیار......! خیمے کے اندر کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' روڈلف لرزتے لہجے میں بولا، خود میرے اعصاب ایک دم تن گئے تھے۔ پل کے پل فیصلہ کرنا تھا کہ اندر کیا ہو سکتا تھا۔ صرف چند ثانیوں کے لیے میرے ذہن میں گزشتہ لمحوں کا خاکہ ابھرا اور پھر میں چلایا۔

''دوڑو روڈلف! خطرہ......!'' کہتے ہی میں ایک سمت کو دوڑا، روڈلف بھی متحرک ہوا۔ ہمارے اردگرد ایک ڈیڑھ کلومیٹر تک سپاٹ گھاس کا میدان تھا۔ اگر ایسے وقت میں خیمے کے اندر سے کوئی مسلح شخص باہر نکل آتا تو بہ آسانی ہم دونوں کو بھی گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا، اسی خطرے کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے میں نے قریب کھڑی فور وہیل بائیک کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

''میرے پیچھے آتے رہو، ورنہ مارے جاؤ گے روڈلف......!'' میں نے روڈلف کو اپنے پیچھے آنے کے بجائے دوسری جانب دوڑتے دیکھ کر کہا تو جیسے اسے میری بات سمجھ آ گئی مگر تب تک اسے دیر ہو چکی تھی۔

میں نے دوڑنے کے دوران خیمے کی طرف نظر رکھی تھی، وہاں سے میں نے بروجیٹ اور کیٹ کو برآمد ہوتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں شاٹ پسٹل نظر آ رہے تھے۔ میں تب تک بائیک پر سوار ہو چکا تھا۔ چابی لگی ہوئی تھی۔ مجھے ایسی بائیک کے چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ مگر اس کا سسٹم کم و بیش عام سی بائیک جیسا ہی تھا۔ اگرچہ یہ ''کک'' کے بجائے سیلف اسٹارٹ تھی۔ (کچھ ہیوی بائیکس بھی سیلف اسٹارٹ ہوتی ہیں)

بائیک اسٹارٹ ہوتے ہی میں نے ایکسیلیٹر گھما دیا۔ انجن غرایا، بائیک اچھلی۔ اسی وقت گولی چلی، میرے کانوں میں روڈلف کی چیخ ابھری۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں نے ذرا گردن موڑ کر دیکھا، کیٹ مجھ پر گولی چلانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ جبکہ بروجیٹ نے روڈلف کو نشانہ بنایا تھا، مجھے خطرے کا پورا احساس تھا کہ میں اتنے قریب سے کیٹ جیسی گھاگ ایجنٹ کی فائرنگ سے بچ کر نہیں بھاگ سکتا، اسی سبب پل کے پل میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ وہی فیصلہ...... یعنی جان جانے کے یقینی خطرے میں...... آر یا پار...... تخت یا تختہ...... بائیک غراتی ہوئی اچھلی۔

میں نے پہلے ہی اس کا رخ قریب کھڑی کیٹ کی طرف کر دیا تھا۔ اس کا اگلا حصہ اوپر کو اسی وقت اٹھا تھا جب کیٹ نے بھی مجھ پر گولی داغ دی۔ وہ بائیک کے نچلے حصے میں کہیں لگی، مگر تب تک بائیک غراتی ہوئی کیٹ سے ٹکرائی، وہ اچھل کر پرے جا گری۔ بروجیٹ بالکل اس کے ساتھ ہی پوزیشن سنبھالنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے اسے بھی زد میں لینے کی کوشش چاہی تو وہ بروقت اچھل کر ایک طرف کو ہو گیا۔ اس نے قدم جماتے ہی مجھ پر پستول سیدھا کیا، مجھے اس کی متوقع حرکت کا اندازہ تھا، اسی سبب میں نے بائیک اسی طرف موڑ دی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ میری بائیک سے ٹکرانے سے پہلے ہی مجھ پر گولی داغ دے گا، یہی وجہ تھی کہ میں نے ایکسیلیٹر پورا گھما کر بائیک کی رفتار میں تیزی لاتے ہی اس پر سے اچھل گیا۔

بروجیٹ کو میری چالاکی اس وقت سمجھ میں آئی جب

وہ مجھ پر ''خالی'' فائر کرنے کا شوق پورا کر چکا تھا۔ گولی چلی، مگر میں بائیک چھوڑ چکا تھا اور نیچے گرا، خالی بائیک غراتی ہوئی اس سے ٹکرائی تھی، میں نے اٹھنے میں ذرا بھی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، محل و موقع، مرحلہ وار فاسٹ ایکشن لینے کا تھا۔

بروجیٹ چند سیکنڈوں کے لیے گیا تھا، تب تک کیٹ سنبھل رہی تھی، میں نے اٹھتے ہی اس پر چھلانگ لگائی، وہ کرولنگ کرتی ہوئی قریب گرے پڑے اپنے پستول کو زمین سے اچکنے کی کوشش میں تھی کہ میں اس پر جا پڑا۔

وہ کسی بلی کی طرح غرا کے تڑپی اور اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا پوری قوت سے میرے پیٹ پر رسید کر دیا۔ اس سے مجھے ایسی ہی پھرتی کی توقع تو تھی لیکن یہ حملہ اس کا غیر معمولی سرعت کا.... مظہر تھا۔ میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ سی نکل گئی۔ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ پھر اپنے قریب پڑے پستول کی طرف لپکی۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے جنگلی بلی کی طرح غراتی ہوئی چیخ نکلی، اسی وقت کوئی مجھ پر وحشیانہ غراہٹ کی طرح پل پڑا۔

یہ بروجیٹ تھا۔ چاہتا تھا وہ کہ مجھے مکوں اور گھونسوں کی زد میں لیتا۔ کیونکہ اسی وقت اس نے اپنے ہاتھوں پیروں کو مشینوں کی طرح حرکت دینا شروع کر دی تھی، میں نے ایک موقع تاک کر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو جوڑا اور ایک زوردار ڈبل پنچ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ یوں اس کا نہ صرف دایاں جبڑا بری طرح متاثر ہوگیا بلکہ اس کی گردن کو بھی ایک زبردست جھٹکا لگا۔ جس کے باعث وہ تھوڑی دیر کے لیے بالکل ہی بے سدھ ہوگیا۔

اسی وقت مجھے کیٹ کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''خبردار! اب حرکت مت کرنا...... ورنہ......'' اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا پستول لیتے ہوئے مجھے دھمکایا اور اسی وقت میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی جس کے باعث بس! لمحہ بھر کو ہی وہ الجھی تھی کہ اسے عقب سے ایک زبردست دھکا لگا۔ اس نے گولی چلا دی۔ بلاشبہ یہ اس کا غیر ارادی مگر میرے لیے ایک خطرناک عمل ہوسکتا تھا، کیونکہ گولی مجھے بھی لگ سکتی تھی۔ لیکن دھکا لگنے سے فائر ہوا میں کھل گیا۔

میں اس کے عقب میں روڈلف کو لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور میرے ہونٹوں پر ابھرنے والی زہریلی مسکراہٹ کی وجہ یہی تھی۔ روڈلف زخمی ہونے کے باوجود محض ہمت اور اپنی قوتِ ارادی کے جذبے تلے یہاں تک کسی طرح کھسک آیا تھا۔

ادھر دھکا لگنے سے کیٹ کے قدم نہ صرف بہک گئے تھے، بلکہ اس اچانک کارروائی سے وہ اپنا توازن بھی برقرار نہ رکھ سکی تھی۔ اسی سبب وہ گری تھی اور میں اس پر جھپٹا تھا۔

سب سے پہلے میں نے اس کا پستول اپنے قبضے میں کیا اور مجبوراً اسے اسی حال میں چھوڑ کر روڈلف کو سنبھالنے کے لیے لپکا جو خود بھی بے سدھ سا ہو کر گر پڑا تھا۔ خیمے کی طرف سے مجھے دو افراد نمودار ہوتے اور یہ سب کارروائی دیکھتے نظر آئے۔ میں نے ان کی طرف دو فائر جھونک دیے۔ وہ ترنت اندر بھاگ گئے۔ ان کا تعلق اسپیکٹرم کے فیلڈ اسکواڈ سے تھا اسی لیے وہ زیادہ دیر میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

میں نے زخمی روڈلف کو سنبھالا اور اسے سہارا دیتا ہوا الٹی پڑی بائیک تک لایا۔ اسی دوران میری گردشی نظروں نے کیٹ اور بروجیٹ کو بیک وقت حرکت کرتے دیکھا۔ وہ قریب پڑے آخری پسٹل کی طرف کھسک رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف تلے اوپر دو فائر جھونک مارے۔ ایک گولی، کیٹ کی ٹانگ پر اور دوسری بروجیٹ کے بازو پر لگی۔ وہ حلق کے بل چیخے۔ یقیناً اس پسٹل کی مار تباہ کن تھی۔ ضرور ان کی ہڈیاں متاثر ہوئی ہوں گی۔

میں نے جلدی سے بائیک کو سیدھا کیا۔ روڈلف کو سیٹ پر جمایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اگلے چند سیکنڈوں کے اندر میں اسے دوبارہ اسٹارٹ کر کے ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا چکا تھا۔

اس فور وہیل بائیک میں دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ روڈلف کو پہلو میں کہیں گولی لگی تھی۔ وہاں سے بھل بھل خون نکل رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں روڈلف؟'' میں نے پوچھا۔ بائیک کو میں طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا۔

''گولی پہلو کو چیرتی نکل گئی ہے۔ خون بند ہوجائے، ورنہ......'' وہ کراہا۔ بے چارے کا پہلے ہی ایک ہاتھ زخمی تھا اور اب یہ مہلک زخم بھی اسے سہنا پڑ رہا تھا۔

''ویسے تم بہت دلیر اور اچھے خاصے فائٹر نکلے۔ تم نے ایسے ہی نہیں کاسپا کو جیسے گینگسٹر کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔'' وہ آخر میں مسکرایا۔

مجھے اس کی زخمی حالت میں بھی یہ زندہ دلانہ مسکراہٹ اچھی لگی تھی مگر میں اس کی طرف سے تشویش کا بھی شکار ہونے لگا تھا، وہ خاصا زخمی نظر آرہا تھا۔

بہرطور...... میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''خطرے کے زون سے نکل جائیں...... اس کے بعد میں کچھ کرتا ہوں۔''

''ہاں...... ہاں...... ٹھیک ہے۔'' اس نے بہ مشکل کراہتے ہوئے جواب دیا۔

میں بائیک کو ایک مناسب رفتار سے زیادہ نہیں دوڑا پار ہا تھا۔ اس کا ہینڈل لرز رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ مجھے اسے چلانے میں قدرے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں بھی دیکھا تھا۔ سرِدست کوئی ہمارے تعاقب میں نہ تھا۔

میں نے بائیک دو تین کلومیٹر تک دوڑانے کے بعد اطمینان کیا اور پھر ایک نیم جنگلاتی علاقے میں آ کر ویران جگہ پر بائیک روک دی۔ کیٹ کا پسٹل میرے پاس تھا۔

میں نے بائیک روکتے ہی زخمی روڈلف کو سنبھال کے نیچے اتارا اور اس کے پہلو کے طرف کی شرٹ کا حصہ پھاڑ کر اس کے زخم کا جائزہ لینے لگا۔ گولی واقعی اس کے پہلو سے ''چماؤ'' ہو کے کھال کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ شکر تھا کہ اندرونی اعضا میں کوئی گہرا زخم نہیں آیا تھا۔ میں نے فوراً اسی کی شرٹ کا حصہ پھاڑ کر اس پر پٹی سی بنا کر باندھ دی تاکہ جریانِ خون بند ہو سکے۔ اسے سردی لگنا شروع ہو گئی تھی۔ شاید خون بہنے کے باعث ایسا ہو کمزوری سے ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اُتار کر اسے پہنا دی۔

''یہ سب کیا ہو گیا دوست؟ کک...... کچھ اندازہ ہے تمہیں؟'' روڈلف نے پوچھا۔ میں نے اردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کسی بات پر ڈین وغیرہ کی ان سے اَن بن ہو گئی ہو گی۔''

''یہ اَن بن تو ہونا ہی تھی۔'' وہ زخمی ہونے کے باوجود تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''موجودہ حالات میں ڈین اور ہماری اہمیت ان کی نظروں میں ختم ہو چکی تھی۔

بروجیٹ جب آخری کال اٹینڈ کرنے خیمے کے اندر گیا تھا تو میں اس وقت ہی سمجھ گیا تھا کہ اسے اسٹار بک یا جوشوا کی طرف سے کوئی نئی ہدایت ملی ہو گی۔''

''ہوم...... تم صحیح کہتے ہو۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں تائیداً کہا۔ ''ٹی وی پر چلنے والی خبریں اور انٹرپول کے ہمارے پیچھے لگنے پر ہی یہ نیا فیصلہ صادر ہوا ہو گا۔ ہم ان پر بوجھ بن گئے ہوں گے۔''

''میرا خیال تھا کہ یہ کاسپا کو کی بے وقوفی تھی کہ اس نے مجسمے کی چوری کا راز فاش ہونے کے باوجود اس ڈیل جاری رکھتے ہوئے ہمیں روانہ کر دیا۔'' روڈلف بولا۔

''کاسپا کو بلا کا لالچی اور حریص آدمی ہے۔ وہ اس سودے کو کسی صورت میں بھی ضائع نہیں جانے دینا چاہتا ہو گا۔'' میں نے خیال پیش کیا۔ ''تھائی پولیس کے ہاتھوں مجسمہ برآمد کر لیے جانے کا بھی اسے خوف ہو گا اور اس نے ہمیں فوراً بینکاک سے مجسمے سمیت کوچ کر جانے کا حکم اسی لیے دیا ہو گا کہ کم از کم یہ ڈیل تو اپنے انجام کو پہنچ جائے۔''

''ڈیل تو اب گئی اور وہ مجسمہ بھی مگر اس کے ساتھی بھی لگتا ہے مار دیے گئے ہیں، یعنی ڈین اور جیڈ وغیرہ۔''

''چلو ٹھیک ہے، کچھ بھی سہی تم اور ہم تو بچ گئے اور کاسپا کو سے بھی جان چھوٹی۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم بھی کاسپا کو سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے؟''

''یقیناً! میں کوئی اس کا زرخرید آدمی نہیں تھا۔ خیر! اب کیا کیا جائے؟''

''اسی وقت سٹی اسکوائر چلو۔ ہم انٹرپول پولیس کو انفارم کر دیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ یہ قیمتی مجسمہ ان لوگوں کے لیے گرم حلوہ ثابت ہو جائے گا۔ اسپیکٹرم کو امریکی حکام کی طرف سے بڑی سپورٹ حاصل ہے۔ وہ ان کا راستہ خود ہی صاف کر دیں گے۔''

اس کا خدشہ غلط نہ تھا۔ اسپیکٹرم سے منحرف ہونے کے بعد روڈلف کے دل میں بھی ان کے لیے نفرت پروان چڑھنے لگی تھی۔

''شہزی! تمہارا شکریہ، تم نے مجھے ان درندوں سے بچایا ورنہ......'' وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا تو میں نے دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے کہا۔

''دوست بھی کہتے ہو اور شکریہ بھی ادا کرتے ہو، یہ میرا فرض تھا اور تم نے بھی تو زخمی ہونے کے باوجود کیٹ پر عقب سے بروقت حملہ کر دیا تھا، ورنہ تو میں اس خونخوار بلی کی گولی کا نشانہ بن چکا ہوتا۔'' میری بات پر وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ شکر تھا کہ اسے کوئی کاری زخم نہیں پہنچا تھا۔ مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔

''نکل چلو...... اس سے پہلے کہ وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح ہماری خون کی بُو سونگھتے ہوئے ادھر نکل آئیں۔'' روڈلف بولا۔

میں نے اسے سہارا دیا اور بائیک پر بٹھانے لگا تو

بُری طرح چونک گیا۔ بائیک کے نیچے سے بہت سارے آئل کی دھار بہہ رہی تھی۔

”اوہو...... یہ آئل کیسے لیک ہو گیا؟“ میرے منہ سے بے اختیار تشویش زدہ انداز میں برآمد ہوا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ...... حملہ کرتے وقت وقت کیٹ نے جب اپنے شارٹ پسٹل سے مجھ پر گولی چلائی تھی تو میں نے گولی سے بچنے کے لیے بائیک کا ایکسیلیٹر گھما دیا تھا جس کے باعث اس کا اگلا حصہ اوپر کو اٹھا تھا اور گولی میرے بجائے اس کے نچلے حصے میں کہیں لگی تھی۔ اسی گولی نے آئل لیک کر ڈالا تھا۔

تاہم پھر بھی میں نے بائیک کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ یہ بھی شکر تھا کہ وہ یہاں تک آ گئی تھی۔

”اس کا آئل بہہ چکا ہے۔ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر پیدل آگے نکلنا ہو گا۔“ روڈلف بولا۔

میں نے اسے سہارا دیا اور چل پڑے۔ ہم دونوں پیدل ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ سرِدست ہمیں اپنی منزل کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس جزیرہ نما سرد علاقے کا کون سا راستہ ایسا تھا جس پر گامزن رہتے ہوئے ہمیں اسکوائرسٹی تک پہنچنے میں آسانی ہوتی۔ اس سے ہم بالکل ہی ناواقف تھے۔ روڈلف کی حالت الگ خراب تھی۔ اسے بہرحال طبی امداد کی ضرورت تھی، ورنہ زخم خراب ہو کے سیپٹک بن سکتا تھا۔ مجھے تو اس کے بازو اور ہاتھ کے زخم بھی کھلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ کیونکہ بینڈیج خون سے پھر سرخ ہونے لگی تھی۔

میرے امریکا والے مشن میں جان روڈلف کا ساتھ میرے لیے انتہائی اہم ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے ادراک تو تھا کہ وہ اسپیکٹرم ہی نہیں بلکہ لولوش اور عابدہ کے حوالے سے ٹائیگر ٹیگ اور باسکل ہولارڈ سمیت جے۔ بی۔ سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کے بارے میں بھی بہت کچھ جان کاری رکھتا ہو گا۔ ابھی مجھے اس سے متعلقہ معاملات کے بارے میں صراحت سے گفتگو کرنے کا موقع بھی کہاں ملا تھا۔

”آہ...... ذرا رک جاؤ...... شہزی! میرا زخم درد کر رہا ہے۔“ اچانک روڈلف نے چلتے چلتے کہا اور میں اسے سنبھالے ہوئے رک گیا۔ ہم دونوں ایک گھنے درخت تلے گھاس پر بیٹھ گئے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہم اس جزیرے کی خوب صورتی کا نظارہ کر کے لطف اندوز ضرور ہوتے۔

بادی النظر میں یہ جزیرہ ایک پیڑے کی شکل میں نظر آتا تھا۔ عین درمیان سے ابھرا ہوا جس کے کنارے ڈھلانی جیسے تھے۔ ان پر حدِ نگاہ گھاس کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ سرسبز میدان اور گھنے درخت، خوش رنگ پھولوں بھری قدِ آدم جھاڑیاں، کہیں زمین سطح مرتفع تھی اور کہیں ڈھلانی۔ ان کے دامن میں کہیں کہیں سفید اور نیلے رنگ کے چوبی مکانات بڑے بھلے محسوس ہوتے تھے۔ ایک جگہ پر گولف کا میدان بھی نظر آیا۔ آبادی کے آثار بھی نظر آ رہے تھے مگر بہت کم۔

آسمان پر ہنوز گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ان کا رنگ سرمئی ہونے لگا تھا جس کا واضح مطلب تھا کہ اب تب میں دوبارہ بارش ہونے والی تھی۔ ایسا ہوتا تو ہم دونوں ہی سردی میں اکڑ کر رہ جاتے۔ اسی لیے میری کوشش تھی کہ جلد از جلد کہیں محفوظ پناہ گاہ مل جاتی تو روڈلف کو بھی تھوڑی بہت طبّی امداد کی میسر آ سکتی تھی۔

مجھے اپنے دائیں جانب ذرا دور ایک اونچی زمین پر چھوٹا سا مکان نظر آ رہا تھا۔ یہ چوکور مکان تھا جس پر سفید اور نیلا رنگ تھا۔ اس کے آگے چھوٹا میدان اور لکڑی کا جنگلا نظر آتا تھا، جو شاید احاطے کے طور پر مستعمل تھا۔

”روڈلف! میرے دوست...... ذرا ہمت پکڑو، وہ مکان دیکھ رہے ہو، وہاں شاید ہمیں کچھ مدد مل جائے۔“

”چلو! قسمت آزمائی میں کیا حرج ہے۔“ وہ زندہ دلی سے مسکرایا مگر ساتھ ہی تھوڑا کراہ کے بھی رہ گیا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا اور ہم آگے چل پڑے۔ ابھی ہم مذکورہ مکان سے تیس چالیس گز کے فاصلے پر ہی پہنچے تھے کہ اچانک بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پانی کے اس قدر موٹے موٹے قطرے گرنے لگے کہ سر اور چہرے پر چبھنے لگے تھے۔ یوں جیسے اولے پڑ رہے ہوں۔

”ایسی بارش میں تو میرا زخم کھل جائے گا۔ شہزی!“ روڈلف کراہا۔

”فکر نہ کرو...... مکان چند قدموں کے فاصلے پر ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

شرائٹے دار بارش ہو رہی تھی۔ میں نے روڈلف کو سنبھالتے ہوئے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ یہاں تک کہ مکان کے چوبی جنگلے والے احاطے کے قریب جا پہنچے۔ لکڑی کا چھوٹا سا پھاٹک بند تھا۔ اسے دھکیل کر ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے تھے کہ اچانک ایک کتا بھونکتا ہوا ہمارے آگے آ گیا۔ ہم رک گئے۔ بارش میں اس کے جسم کے گھنے بال بھیگ کر چپک گئے تھے جنہیں وہ بار بار اپنے جسم کو جھٹکے دے

کر جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بال اس قدر تھے کہ وہ اس کی پیشانی اور آنکھوں تک کو ڈھانپتے محسوس ہو رہے تھے۔

''یہ پوپی کتا ہے، ڈرو نہیں کاٹتا نہیں ہے۔'' روڈلف نے کہا۔ ''مگر اب حرکت مت کرنا۔ اندر سے کوئی نکل آئے گا۔''

وہی ہوا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر مکان کا پہلے سنگل پٹ والا دروازہ کھلا۔ دھواں دھار بارش کے باعث میں دیکھ نہیں پایا کہ کون تھا۔ مگر جب اس کے بعد جالی دار شٹر ہٹا تو میں نے دیکھا...... ایک چھوٹے قد کی لڑکی برآمد ہوئی۔ عمر بہ مشکل چودہ، پندرہ سال ہوگی۔ اس نے شارٹ نیکر اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس برستے سرد موسم میں یہ ایسے لباس میں تھی۔ اس کے بال سرخی مائل تھے اور چہرہ گول تھا۔ بال بوائے کٹ تھے۔ وہ خاصی شوخ نظر آ رہی تھی مگر اس کا انداز محتاط تھا۔ وہ پہلے تو دروازے پر ہی کھڑی ہمیں جالی دار شٹر سے دیکھتی رہی۔

اس کے ہاتھ میں ایک کارتوس والی سنگل بیرل بندوق بھی تھمی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ جالی دار شٹر والا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پوپی بدستور ہم پر بھونکے جا رہا تھا۔ لڑکی نے ابھی اسے جانے کا نہیں کہا تھا۔

''ہے بے بی! ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔'' میرے بجائے روڈلف نے اس پیاری سی لڑکی سے کہا۔

اس لڑکی نے بندوق ہم پر تان لی۔ پوپی نے اچانک بھونکنا بند کر دیا۔

''کون ہو تم لوگ......؟'' اس نے شک بھری نظروں سے ہماری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بے بی! ڈرو نہیں، ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' روڈلف اس سے بدستور انگریزی میں بولا۔ لڑکی بھی شستہ اور رواں انگریزی بول رہی تھی۔

''مگر تم نے بتایا نہیں کون ہو تم دونوں......؟ اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ یہ تمہارا ساتھی ہے؟'' لڑکی نے سوال کیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی محتاط نظر آ رہی تھی۔ مگر مہربان بھی نظر آتی تھی۔ تاہم وہ اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔

''دیکھو بے بی! ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ ہم سیاح ہیں...... میرا نام جون ہے، یہ میرا ساتھی روڈلف ہے اور ہماری اسٹیمر کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ یہ چوٹ اسی وجہ سے لگی ہے میرے ساتھی کو۔ ہمیں بس اس کی مرہم پٹی کا سامان مل جائے، ہم فوراً لوٹ جائیں گے۔'' اس بار میں نے بڑی ملائمت آمیزی سے کہا۔ لڑکی نے ایک نگاہ میرے سراپا پر ڈالی اس کے بعد اس نے کتے سے کچھ کہا، وہ فوراً پلٹ گیا۔ لڑکی نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کر دیا اور خود پلٹ گئی۔

ہم اس کے پیچھے چل پڑے۔ جب دروازے سے اندر داخل ہوئے تو مجھے اس لڑکی کے مختصر لباس پہننے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ گھر سینٹرلی ہیٹڈ تھا۔ گرم فضا میسّر آتے ہی جسم و جاں کو سکون کا احساس ہوا۔ ایک کمرے میں صوفے پر میں نے روڈلف کو بٹھا دیا۔

''تمہارا بہت شکریہ بے بی......!'' میں نے مسکراتے ہوئے لڑکی سے کہا تو وہ بولی۔

''میں بے بی نہیں ہوں، میلانو سیفنز برگ نام ہے میرا۔'' وہ خاصے دبنگ لہجے میں بولی۔ ''ویسے لوگ مجھے ملی کہتے ہیں۔''

''گڈ......! بہت پیارا نام ہے......'' روڈلف نے تکلیف کے باوجود مسکرا کر کہا۔ ''بالکل...... تمہاری طرح...... تم ایک اچھی لڑکی ہو۔''

''تھینکس۔'' ملی ہولے سے بولی۔

''کوئی فرسٹ ایڈ باکس تو ہوگا گھر میں ملی......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔

''میں لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کو قریب رکھی ایک کرسی کے ساتھ ٹکایا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے پھر سے اسے اچک لیا اور کمرے سے نکل گئی۔ ملی کی اس حرکت پر میں اور روڈلف دونوں ہی سر جھٹک کر مسکرائے تھے۔

''خاصی محتاط ہے لڑکی مگر تھوڑی بے وقوف بھی۔'' روڈلف بولا۔ میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔

''ہاں! ذرا ڈری ہوئی بھی لگتی ہے۔ شاید یہ گھر میں اکیلی ہے۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور اسی طرف کو بڑھا۔ جدھر وہ لڑکی گئی تھی۔ روڈلف نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

میں دوسرے کمرے میں آ گیا۔ کمرے چھوٹے مگر پُرتزئین تھے۔ یہاں مجھے ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔ جو تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ وہ شاید کوئی چھوٹا سا اسٹور تھا۔ دروازے سے تھوڑے فاصلے پر ایک دیوار سے لڑکی کی بندوق ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ اٹھا لی۔

اسی وقت اندر سے ملی برآمد ہوئی، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا باکس تھا۔ وہ یوں اچانک مجھے اور میرے ہاتھ

میں اپنی بندوق لیے کھڑا دیکھ کر ڈر گئی اور اس کے ہاتھ سے باکس چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

''سوری! میں نے تمہیں شاید ڈرا دیا۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا اور چند قدم اس کی طرف آیا اور مسکراتے ہوئے بندوق اس کی طرف بڑھا دی۔ جسے اس نے فوراً جھپٹ لی پھر میں نے جھک کر باکس اٹھالیا اور پلٹا۔

کمرے میں واپس آکر میں نے روڈلف کے زخم کی پٹی کرنا شروع کر دی۔ زخمی بازو کی بینڈیج ہی اوپن کر کے اس کی بھی دوبارہ پٹی کر دی۔ کچھ پین کلرز بھی تھیں۔ قریب فریج تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ملی، پیچھے کھڑی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں بندوق نہیں تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ جواب میں، میں بھی مسکرا دیا۔ اس معصوم سی خوبصورت لڑکی کا ڈر اب نکل چکا تھا اور یہی میں چاہتا تھا۔

''پلیز، پانی کا ایک گلاس مل جائے گا؟''

''شیور۔'' وہ بولی اور پانی کا گلاس بھر لائی۔ روڈلف کو میں نے دو اسپرین کی گولیاں دیں۔ کچھ اینٹی بائیوٹک کیپسول رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی میں نے اسے نگلنے کے لیے دے دیے۔

''دوست! تم تو پورے پورے ڈاکٹر ہو۔'' روڈلف کو کچھ سکون ملا تو وہ ہنس کر بولا۔ میں نے جواب میں محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اب میں کیا اسے بتاتا کہ یہ سب میری کمانڈو ٹریننگ کا حصہ تھا۔ ابھی تو اس نے مجھے مائنر سرجری کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ یوں بھی وہ اگر کیٹ اور بروجیٹ کی طرح اسپیکٹرم کے اسالٹ ونگ کا تربیت یافتہ ایجنٹ ہوتا تو شاید یہ سوال نہ پوچھتا مجھ سے۔

''میں آپ دونوں کے لیے کچھ کھانے پینے کے لیے لاتی ہوں۔'' ملی نے ہم سے کہا اور پاس بنے کچن کی طرف پلٹنے لگی تو میں نے اسے پکارا۔

''ہیلو، بے بی!'' وہ رک گئی اور میری جانب گھومی۔ اس کا منہ بن گیا۔ میں نے کہا۔

''دیکھو، تم ہمارے لیے ایک چھوٹی سی اور گڑیا سی پیاری بچی ہی ہو اور ہم تمہارے انکل ہیں۔ اسی لیے برا مت مناؤ، ہم تمہیں بے بی ہی کہیں گے۔'' اتنا کہہ کر میں نے تھوڑا توقف کیا۔ اب اس کی آنکھوں میں کچھ دلچسپی کی جھلک نظر آئی تھی۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ اور ہمیں یہ بتاؤ کہ یہاں اور کون کون رہتا ہے؟ اور وہ لوگ کہاں گئے ہوئے ہیں؟''

میں نے دیکھا کہ میرے اس سوال پر ملی کی خوبصورت آنکھوں میں ایک بار پھر شکوک کے سائے لہرائے تھے۔ مگر پھر فوراً ہی عنقا ہو گئے۔ وہ پورے اعتماد سے جواباً بولی۔

''میری مما اور میرے گرینڈ پا رہتے ہیں میرے ساتھ...... وہ گاڑی میں اسکوائر سٹی گئے ہوئے ہیں۔ سودا وغیرہ لانے کے لیے۔ اب بارش کی وجہ سے شاید انہیں لوٹنے میں کچھ دیر ہو جائے۔''

''اور تمہارے ڈیڈی؟'' اس بار روڈلف نے سوال کیا۔ جس پر ملی خاموش ہو رہی۔ میں نے کچھ سمجھتے ہوئے روڈلف کے سوال کو طرح دے ڈالی اور ملی سے بولا۔

''اوکے بے بی! اٹس گڈ۔ یہ بتاؤ۔ تمہارے گھر میں فون موجود ہے؟''

''ہاں۔ دوسرے کمرے میں رکھا ہے مگر وہ دو دن سے ڈیڈ پڑا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوکے سویٹ بے بی! بس تم ہمارے لیے دو کپ کافی بنا لاؤ۔ بہت شکریہ تمہارا۔''

''اوکے مائی سویٹ روڈلف اینڈ جون انکل......!'' وہ بھی مسکرا دی اور کچن کی طرف چلی گئی۔

''بڑی پیاری اور اچھی بچی ہے..... ! مگر...... مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ ہماری وجہ سے کسی خطرے کا شکار نہ ہو جائیں......'' روڈلف نے اس کے جانے کے بعد ہولے سے بالآخر اسی خدشے کا اظہار کیا تھا جو میرے ذہن میں بھی سر اُبھار رہا تھا۔

''یہی میں بھی سوچ رہا تھا روڈلف!'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے، کافی کو چھوڑو...... ہم نکل چلتے ہیں یہاں سے......'' روڈلف کسی اندیشناک خیال کے پیشِ نظر سنجیدگی سے بولا۔ ''زخم کی مرہم پٹی ہو گئی یہی بہت ہے۔ اسپیکٹرم والے اپنے مفادات کے لیے بہت بے رحم اور بے حس ہوتے ہیں۔ یہاں آن پہنچے تو ہماری وجہ سے اس چھوٹے سے خوبصورت گھر کو جہنم بنا ڈالیں گے۔''

جان روڈلف...... کا تعلق چونکہ فیلڈ اسکواڈ سے تھا اسی لیے وہ ان سے، بالخصوص بروجیٹ اور کیٹ سے کترا رہا تھا۔ کیونکہ وہ تربیت یافتہ اور جنگجو تھے، خود روڈلف ویسا نہ تھا اور ایسے حالات کا وہ اتنا زیادہ تجربہ نہ رکھتا ہوگا۔ یوں بھی وہ خاصا زخمی بھی تھا۔ لیکن...... میری بات اور تھی۔ میں ان

سے خوف زدہ نہیں تھا، کوئی اور موقع ہوتا تو میں ان کے خیمے سے بھاگنے کی کوشش نہ کرتا۔ بلکہ اس بات کا کھوج لگانے کی سعی کرتا کہ آخر اندر ایسا ہوا کیا تھا؟ لیکن حالات ایک دم ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ روڈلف کی زندگی بچانے کے لیے مجھے فرار ہونا پڑا۔ تاہم میں نے روڈلف کو زخمی کرنے کا بدلہ بروجیٹ اور کیٹ کو زخمی کر کے لے لیا تھا۔

میں نے جواب میں ایک گہری سانس لے کر روڈلف سے کہا۔ ''روڈلف! اس تیز اور طوفانی بارش میں ہمارا یوں بے سروسامانی کی حالت میں نکلنا مناسب نہ ہوگا۔ بروجیٹ اور کیٹ کو میں بھی ٹھیک ٹھاک زخمی کر چکا ہوں۔ پھر ہماری آئندہ کی پلاننگ کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے اور مقامی افراد کے تعاون کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ جو میرا خیال ہے کہ یہاں رہتے ہوئے ہمیں مل سکے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شہزی!'' روڈلف میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''...... اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کم تم بھی نہیں ہو، لیکن اس وقت اسپیکٹرم کے دو اسکواڈ اپنے دونوں باس اسٹار بک اور جوشوا سمیت میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ کیٹ اور بروجیٹ ابھی زندہ ہیں۔ اسٹار بک بھی کم نہ ہوگا اور جوشوا بھی تربیت یافتہ ہی ہوگا کیونکہ...... اسپیکٹرم کے ہر اسکواڈ یا ونگ کو ایک تربیت یافتہ چیف ہی کنٹرول کرتا ہے۔ ان کے پاس اس وقت جدید اسلحہ بھی ہو سکتا ہے جبکہ ہمارے پاس ان سے چھینی ہوئی محض ایک پسٹل ہے۔''

''میں ان ہتھیاروں کو ایک حد تک فوقیت دیتا ہوں دوست!'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میرا سب سے بڑا اور اصل ہتھیار میرا وہ جذبہ ہوتا ہے جسے میں ایمان کا درجہ دیتا ہوں اور وہ ہے باطل کے خلاف حق کی جنگ...... جب میں سر بکف ہو جاتا ہوں تو مجھے پورا یقین ہوتا ہے کہ میرا اللہ میری رہنمائی ہی نہیں بلکہ میری مدد بھی فرمائے گا۔ یہی یقین میرا وہ ہتھیار بن جاتا ہے جس کے سامنے پھر...... میرا بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں ٹھہر پاتا۔ تم خاطر جمع رکھو۔ ایسا کچھ ہوا تو میں سنبھال لوں گا۔''

''گریٹ ورڈز شہزی!'' وہ متاثر کن لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ان باتوں کی سچائی کی جھلک میں دیکھ ہی چکا ہوں۔ وزیر جان کا تم نے جو حشر کیا اور پھر کاسپا کو اور یہاں تک میں تمہیں جس جوانمردی سے لڑتا دیکھ رہا ہوں، میں اسے کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔ آئی لائک یو مائی ڈیئر فرینڈ!'' اس نے دوستانہ انداز میں اپنے ایک ہاتھ کا انگوٹھا مجھے دکھایا۔ میں ہنس دیا۔

باہر بادل گرج رہے تھے اور دھواں دھار بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں گاہے بہ گاہے کھڑکی کے پاس جا کر اردگرد کا جائزہ لے لیا کرتا تھا۔ ہر سو ویرانی کا راج تھا۔ یوں بھی طوفانِ باد و باراں میں ہر سمت دھواں نما دھند کے سوا کچھ دکھائی بھی نہیں پڑتا تھا۔

اتنے میں للی...... ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھائے چلی آئی۔ ٹرے میں سینڈوچز، بسکٹ اور کافی کے دو مگ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس نے ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھ دی۔ ٹرے میں پانی کی بوتل اور دو گلاس بھی رکھے نظر آ رہے تھے۔

ہم نے للی کا شکریہ ادا کیا اور پہلے ایک ایک گلاس پانی پیا پھر سینڈوچز کی طرف ہاتھ بڑھایا، ساتھ ہی گرما گرم کافی کے گھونٹ بھی بھرنے لگے۔

''واؤ...... گریٹ بے بی! کافی اور سینڈوچز تو بہت ہی مزیدار ہیں۔ تم نے بنائے ہیں؟'' میں نے سینڈوچ کا ایک بڑا سا بائٹ اور کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد للی کی طرف دیکھتے ہوئے توصیفی لہجے میں کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

''یس انکل روڈلف! یہ میں نے ہی بنایا ہے، مکس ویجی ٹیبل اور چکن میش ڈال کر۔ گرینڈ پا کو بھی میرے ہاتھ کے بنے سینڈوچز بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''ضرور لگتے ہوں گے۔ بھلا اتنی پیاری اور معصوم سی بیٹی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز کسے نہیں اچھی لگتی ہوگی۔'' روڈلف نے بھی کھلے دل سے کہا۔ میری نظریں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، اس کے معصوم سے چہرے پر بچوں والی مسکراہٹ تھی، لیکن میں نے دیکھا کہ روڈلف کی بات پر اچانک اس کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم مغموم سا ہو گیا۔

''کیا ہوا سویٹ بے بی؟ تمہیں ہماری کوئی بات بُری لگی؟''

''اوہو...... نو نو...... جون انکل! ایسی بات نہیں ہے......'' وہ ایک دم زبردستی کی مسکراہٹ سے بولی۔ ''وہ بس انکل (روڈلف) کی بیٹی والی بات پر مجھے اپنے پاپا یاد آ گئے تھے۔''

''تو پھر تمہارے پاپا کہاں ہیں سویٹی؟'' روڈلف نے اس سے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ للی ایک آزردہ سی ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولی۔

''میں اپنے پاپا سے بہت محبت کرتی تھی، وہ بھی مجھے بے حد چاہتے تھے۔ مگر...... مما سے ان کی نہیں بنی...... وہ بے تحاشا شراب پیتے تھے لیکن اس کی وجہ بھی مما ہی ہیں۔''

اچانک باہر ایک آواز پر ہم چونک پڑے۔

''اوہو مما اور گرینڈ پا آ گئے...... میں دیکھتی ہوں، یہ انہی کی گاڑی کی آواز ہے۔'' ملی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بولی اور دروازے کی طرف لپکی۔

روڈلف اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بھویں اچکا دیں۔ تھوڑی دیر گزری، کمرے میں ملی ایک عمر رسیدہ شخص کا بڑی محبت سے ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئی۔ وہ ایک دبلا پتلا درمیانے قدوقامت کا شخص تھا۔ سر اور بھوؤں کے بال سفید تھے۔ کمر بھی سیدھی تھی، ورنہ اتنی عمر...... جس کا اندازہ میں نے ستر، اسّی سال کے درمیان لگایا تھا۔ وہ سیدھا سا بوڑھا تھا، جسے ''ساٹھا پاٹھا'' کہا جاتا ہے۔ خاصا ایکٹو بھی نظر آتا تھا۔ اس نے سفید شرٹ اور گیلس والی پینٹ پہن رکھی تھی، حیرت کی بات تھی کہ اس نے سردی کی مناسبت سے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ اس کے ہمراہ...... ایک جوان سی عورت تھی۔ وہ کچھ...... فربہی مائل اور چھوٹے قد کی مالک تھی۔ چہرے پر کرختگی اس کی فطرت کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی صورت میں ملی کی شبہات نظر آتی تھی۔ وہ اس کی ماں ہی تھی۔ اس نے رین کوٹ پہنا ہوا تھا۔ ملی شاید انہیں ہمارے بارے میں بتا چکی تھی۔ وہ ہم دونوں کی طرف بڑی شاکی نگاہوں سے گھور رہی تھی جبکہ عمر رسیدہ آدمی جو ملی کا ''گرینڈ پا'' ہی تھا، ہمیں الجھی ہوئی نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

''کون ہو تم دونوں؟ اور ایک اکیلی انڈر ایج لڑکی...... گھر میں موجود ہونے کے باوجود تم دونوں نے جرأت کیسے کی یہاں گھسنے کی؟'' وہ عورت تیوریوں پر بل ڈالے ہماری جانب غصے سے گھورتے ہوئے بولی تو ملی جلدی سے ماں سے بولی۔

''نو مما! یہ بہت اچھے لوگ ہیں، انہوں نے تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے بلکہ یہ تو مجھے بیٹی......''

''شٹ اَپ!'' ماں نے ملی کو بری طرح جھڑک دیا۔

اسی وقت عمر رسیدہ شخص نے عورت سے کچھ کہا اور پھر ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہائے گائیز! آپ دونوں کون ہو؟ اور کیا یہ اچھی بات ہے کہ تم ایک انڈر ایج بچی کے ہوتے ہوئے اس مکان میں داخل ہوئے؟''

روڈلف دانت پیس رہا تھا، اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا کہا۔ مجھے اس عورت پر ہی نہیں بلکہ اس عمر رسیدہ آدمی پر بھی غصہ آ گیا تھا جو عورت کا باپ اور ملی کا گرینڈ پا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے پہلے کچھ سمجھدار آدمی لگا تھا مگر شاید بیٹی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اپنے تیور بدل لیے تھے۔

''ہم سب سے پہلے ملی کے مشکور ہیں، یہ فرشتہ صفت بچی مشکل وقت میں ہمارے کام آئی لیکن افسوس ہوا کہ آپ لوگوں کی باتوں پر، آپ انڈر ایج کی رٹ لگا کر کیا کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کوئی کرمنلو ہیں؟ جبکہ تمہاری بچی تمہارے سامنے ہے۔ اگر تمہیں اس کے انڈر ایج ہونے کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر اس ویرانے میں اسے اکیلا کیوں چھوڑ کر گئے تھے؟''

میری جوابی لفاظی نے اس اکھڑ مزاج عورت کے کس بل تو کھول ہی دیے تھے، مگر ساتھ ہی اس کے چہرے کی کرختگی اور آنکھوں میں اتری ہوئی درشتی کم نہیں ہوئی تھی، اس کے مقابلے میں گرینڈ پا کچھ خفت سی محسوس کرنے لگا۔ عورت نے کچھ کہنا چاہا مگر گرینڈ پا ہم سے بول پڑا۔

''اٹس او کے! تمہارا کام ہو گیا۔ اب تم دونوں جا سکتے ہو۔''

''نہیں پا......! میں پہلے اپنی جیولری اور کیبنٹ چیک کروں گی، اس کے بعد انہیں جانے دوں گی۔ یہ بچی کو بے وقوف بھی بنا سکتے ہیں۔'' عورت بولی۔ وہ مجھے پرلے درجے کی ایک گھٹیا ذہنیت والی عورت لگی تھی اور انتہا سے زیادہ شکی مزاج...... بھی۔

''یہاں پولیس آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتی۔'' اس نے آخر میں تہدید بھی کر ڈالی۔

''خاتون! ہم خود پولیس کو فون کرنا چاہتے تھے مگر آپ کا فون ڈیڈ تھا، اب خرابیِ موسم کے باعث شاید سیلولر رابطہ بھی ممکن نہ ہو سکے۔'' اس بار روڈلف سے نہ رہا گیا اور تلخی سے بولا۔ ''لیکن خیر......! آپ پلیز اپنا شک جلد دور کر لیں تاکہ ہم آپ کے اطمینان کر لینے کے بعد یہاں سے چلے جائیں۔''

اچانک میرے کانوں سے ایک مخصوص آواز ٹکرائی۔ جسے پہچان کر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ باہر شوریدہ طوفانِ باد و باراں کے باوجود مجھے یہ آواز سنائی دے گئی تھی، اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ میری سماعتیں باہر کی متوقع اضافی آواز کے لیے غیر معمولی محتاط تھیں۔ دوسرے یہ، دروازہ اور کھڑکیاں بند ہونے کے سبب بارش کا شور کچھ دبا دبا سا ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کے بیچ کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاتی آواز مجھے سنائی دے گئی تھی۔

''سب لوگ ادھر ہی رک جاؤ۔کوئی دروازے پر آنے کی کوشش نہ کرے۔'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا اور کیٹ سے چھینا ہوا اشارٹ پسٹل نکال لیا۔سب کو یک دم سانپ سونگھ گیا۔میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھتے ہی عورت کے حلق سے دبی دبی چیخ خارج ہوئی تھی۔متوقع خدشے کے پیشِ نظر......روڈلف کا چہرہ ست کے رہ گیا تھا۔

میں بہ سرعت دروازے کی طرف بڑھا اور سنگل پٹ والے دروازے کے اوپر فریم میں لگے شیشے سے پردہ ذرا سرکا کر باہر جھانکا تو شیشہ دھندلایا ہوا تھا۔میں نے آہستگی سے اس کی کنڈی کھولی،مگر سیفٹی چین لگی رہنے دی اور جھری بنا کر جھانکا تو بُری طرح چونک گیا۔باہر کا منظر میری توقع کے بالکل برخلاف تھا۔تاہم میرے چہرے پر تشویش کے آثار ضرور نمودار ہو گئے تھے۔

باہر پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور تین افراد کار سے اترتے نظر آئے۔اپنے مخصوص بلیو یونیفارم میں وہ پولیس مین ہی لگتے تھے مگر صرف دو،تیسرا آدمی کوئی عام سا مرد تھا۔اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور شیو کی بھی یہی حالت تھی۔پولیس کے دو افراد میں ایک مرد اور عورت تھی۔

میں جیسے ہی پلٹا کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا،وہ وہی غصیلی عورت تھی۔اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی تھی۔

''سوری میڈم! میں کچھ اور سمجھا تھا۔اچھا ہوا پولیس آگئی۔دروازہ کھول کر انہیں اندر بلالو۔''

اس نے برہم سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔

میں اس کے عقب میں کھڑا رہا۔

''گڈ ایوننگ آفیسرز......! آپ بہت اچھے وقت پر آئے لیکن......میں اس شخص کو اندر نہیں آنے دوں گی۔''

وہ تینوں دروازے پر آکر رک گئے تھے۔میں نے دیکھا مارتھا نامی وہ تلخ مزاج عورت بار بار اس بڑھے ہوئے بالوں والے شخص کی طرف اپنی انگلی سے نفرت انگیزی سے اشارہ کر رہی تھی۔

گرینڈ پا بھی دروازے پر آگیا تھا اور اس کے ساتھ ملی تھی۔

''پاپا......!'' ملی خوشی سے چلاتی ہوئی دروازے سے باہر دوڑ گئی اور اس لمبے بالوں والے شخص سے جا کر لپٹ گئی،اس آدمی نے بھی بڑی محبت سے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔مارتھا یہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گئی اور ''کم آن ملی......'' کہتی ہوئی باہر کو لپکی پھر ملی کو بڑے غصے سے اس شخص سے الگ کر کے بازو سے پکڑے پلٹی۔

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ اندر آچکے تھے۔میں نے پسٹل دوبارہ شرٹ کے اندر بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

''آفیسرز......! پہلے ان دونوں کو گرفتار کرلو......یہ دونوں چور ہیں۔'' مارتھا زہریلے لہجے میں ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے پولیس والوں سے بولی۔

دونوں نے فوراً اپنے ہولسٹرز سے پستول نکال کر ہم پر تان لیا۔روڈلف اور میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' مرد نے ہم سے درشت لہجے میں کہا۔دونوں مرد عورت جوان اور خوبرو تھے۔

''ان خاتون کو غلط فہمی ہوئی آفیسرز......! ہم غلط لوگ نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے،اس کے پاس پسٹل بھی ہے۔'' مارتھا بدستور ہمارے خلاف زہر اگلنے میں مصروف تھی۔اس بات پر مجھے تشویش ضرور ہوئی تھی کیونکہ......ظاہر ہے پسٹل میرے پاس بغیر لائسنس کا تھا۔

ٹھیک اسی وقت باہر ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں اُبھریں۔ہم سب چونکے۔میرا تو یہ آوازیں سن کر رُواں رُواں مرتعش ہو گیا۔

''تم سب ادھر ہی ٹھہرو......میں دیکھتا ہوں۔'' مرد آفیسر نے کہا اور پستول سمیت دروازے کی طرف پلٹا تو میں نے چلّا کر کہا۔

''آفیسر! ٹھہر جاؤ...... مجھے جانے دو......'' کہتے ہوئے میں نے اپنے ہاتھ گرا دیے اور آگے بڑھا مگر لیڈی پولیس نے اپنا سروس ریوالور مجھ پر تانے رکھتے ہوئے رعب دار آواز میں سرزنش کر ڈالی۔

''خبردار......! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔''

میں رک گیا۔میری نظریں اسی پولیس مین پر جمی ہوئی تھیں جو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا،وہ ابھی پستول تانے دروازے کے قریب بڑھا ہی تھا کہ اچانک دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور ساتھ ہی گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔میری جلتی سلگتی نظروں نے اس خوبرو جوان پولیس مین کو بغیر آواز نکالے گرتے ہوئے دیکھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

گربہ شناس

تنویر واسطی

پیار و محبت... انسیت ہونے کے باوجود لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا تکلیف دہ ہوتا ہے... وہ سب ایک ڈرامے میں کام کر رہے تھے... مگر اچانک ہی کرداروں نے حقیقی رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا...

اپنے مالک کی رمز شناس بلی کا کارنامہ

جو ریڈ کلف نے گرینگ ہال کے ڈائننگ روم میں میز پر سینڈوچ کی ڈش رکھی اور ڈراما کی کاسٹ کو کھانے کے لیے بلا لیا۔ وارڈ روب اور کھانے کا انتظام کرنے والی ملڈرڈ بلوم، آئس ٹی کا مگ لیے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں نے وہ معما حل کر لیا ہے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔“

”کون سا؟“ جو نے پوچھا۔
”میں نے اپنے پڑوسی کے بارے میں بتایا تھا نا کہ جب سے اس کی بیوی گئی ہے وہ اپنے عقبی صحن میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ وہاں ایک جھروکا بنا رہا ہے تاکہ جب اس کی بیوی اپنی نومولود پوتی کو دیکھ کر واپس آئے تو حیران رہ جائے۔“
سارہ فشر اس کرسی پر آکر بیٹھ گئی جو ولیم لاسن اس کے لیے پکڑے ہوئے تھا۔ ”اوہ میری مما کو ہمیشہ سے اس کی خواہش تھی۔“
”پوتی کی؟“ چارلوٹ ڈریک نے سارہ اور ولیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔
سارہ کے گال سرخ ہوگئے، وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ”جھروکا لیکن ہم لندن میں رہتے تھے۔“
”کوئی بات نہیں۔“ ملڈرڈ نے کہا۔ ”اب تم اپنے شوہر سے کہہ سکتی ہو کہ وہ اپنے عقبی صحن میں ایسا ایک جھروکا بنا دے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری ماں اسے دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔“
”ہاں۔“ چارلوٹ بولی۔ ”تم پیار سے کہو گی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔“
ولیم نے خشمگیں انداز میں چارلوٹ کو دیکھا۔ وہ ڈرامے میں سارہ کے شوہر کا کردار ادا کر رہا تھا۔
ویوین اولیور بولی۔ ”مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ ہمارے لیے کھانا بنانے کا شکریہ ملڈرڈ۔“
”شروع کرو ویوین۔“ ملڈرڈ بولی۔ ”ہوورڈ۔ کیا تم آئس ٹی لینا پسند کرو گے؟“
”بالکل، اس سرد شام میں گرم چائے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔“ وہ بولا۔
”ڈرامے کے ہدایت کار بارٹن اسٹیونس کے آنے کے بعد بھی ان کی گفتگو جاری رہی۔ کھانے کے بعد ملڈرڈ نے سب اداکاروں سے کہا کہ وہ باری باری ملاقاتی کمرے میں آکر اپنے ملبوسات پہن کر دیکھ لیں۔ اس کے بعد وہ تہ خانے میں اپنے کمرے میں چلی گئی تاکہ ہوورڈ کی ڈنر جیکٹ کا ڈھیلا بٹن ٹھیک کر سکے۔
بغیر کھڑکیوں والے آڈیٹوریم سے وہ باہر کی روشنیاں دیکھ سکتے تھے لیکن بادلوں کی گرج نے پوری عمارت کو ہلا دیا۔ سارہ نے ایک چیخ ماری اور اس کے ہاتھ سے کاک ٹیل کا گلاس گر گیا۔ پانی کے چھینٹے سفید میز پوش پر پڑے اور گلاس کے ٹکڑے لکڑی کے فرش پر بکھر گئے۔ سارہ اپنی کرسی سے اٹھی اور گلاس کے ٹکڑے اکٹھا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس سے پہلے کہ جو اُسے خبردار کرتی وہ اپنا ہاتھ زخمی کر چکی تھی۔ جو نے اسکرپٹ رکھ دیا اور فرسٹ ایڈ بکس لینے چلی گئی جو اس نے چھ ہفتے پہلے اسٹیج کے پیچھے رکھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ملڈرڈ نے ریہرسل کے دوران کاک ٹیل گلاس میں پانی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ اگر وہ سنگاپور سلنگو (سنگاپوری کاک ٹیل) کے متبادل کے طور پر فالسے کا جوش اور لیمن استعمال کرتے تو انہیں اگلے روز کے شو کے لیے سفید میز پوش تبدیل کرنا پڑتا۔
لیکن اس دن کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ موسم گرما کا گرم ترین دن ہونے کے باوجود شدید طوفان نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بارٹن اور اس کے اداکار مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس کی پریشانی کو سمجھتی تھی۔ وہ اس ڈرامے پر بہت زیادہ انحصار کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ کل ان شوقیہ اداکاروں کی کارکردگی کی بدولت وہ میئر اور ویلج کونسل کو قائل کر سکے گا کہ وہ کمیونٹی تھیٹر شروع کرنے میں اس کی مدد کریں۔
وہ اسٹیج پر ٹہل ٹہل کر اپنے پانچوں اداکاروں کو لیکچر دے رہا تھا کہ کس طرح انہیں مکالموں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کرنا ہے۔ اس نے اپنی توجہ ولیم پر مرکوز کی جو سارہ کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ اسی وقت جو، سارہ کے پاس آئی جو نیپکن سے زخمی انگلی کو دبائے ہوئے تھی۔
”پہلے میں تمہاری انگلی پر پٹی باندھ دوں پھر ہم فرش صاف کرلیں گے۔“ اس نے کہا۔
سارہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ بارٹن کے لیکچر کے دوران بھی ولیم کی نظریں سارہ پر جمی ہوئی تھیں۔ سارہ کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر جم فشر پہلے فوج میں افسر تھا۔ بعد میں اس نے وکالت کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اس وقت بھی وہ بفیلو میں کسی مقدمے کی کارروائی میں مصروف تھا لیکن اس نے سارہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈراما دیکھنے ضرور آئے گا۔
جو نے پٹی کرنے کے بعد کہا۔ ”اب یہ زخم جلدی ٹھیک ہوجائے گا۔“
”بالکل۔“ بارٹن نے کہا۔ ”اسی ہاتھ میں اسے شادی کی انگوٹھی پہننی ہے جو وہ ڈرامے کے دوسرے کرداروں کو دکھائے گی۔“
”کل شام تک اس کی پٹی کھل جائے گی اور اگر اس

نے احتیاط کی تو زخم بہت جلدی بھر جائے گا۔''

''جو ایک اچھی نرس ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔'' ہوورڈ نے کہا۔

وہ یوڈورا ہیرالڈ میں رپورٹر تھا اور اس ڈرامے میں مشہور مصنف سرسٹ ماہم کا کردار ادا کر رہا تھا جبکہ ویوین دو مرتبہ کی طلاق یافتہ عورت اور چارلوٹ اس کی سوشل سیکریٹری بنی تھیں۔ جو نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اس ہنگامے کے دوران خاموش بیٹھی رہیں۔

ویوین جب آڈیشن دینے آئی تو جو کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔ ملڈرڈ نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے بتایا کہ اس کا شوہر ایمبر وز جو سیونگ اینڈ لون کا صدر تھا۔ گزشتہ موسم سرما میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ ایک بہت بڑے خالی مکان میں تنہا رہتی تھی۔ اسے یقیناً اپنے لیے کوئی مصروفیت درکار تھی اسی لیے اس نے طلاق یافتہ عورت کا کردار قبول کر لیا۔

چارلوٹ اسکول کے زمانے میں سب سے زیادہ مقبول لڑکی تھی جب جو گاؤں واپس آئی تو اس کا خیال تھا کہ چارلوٹ کی شادی ہو گئی ہو گی لیکن جنگ نے تمام پروگرام درہم برہم کر دیے۔ اب وہ دونوں اکتیس سال کی ہو چکی تھیں لیکن جو کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کی زندگی مرد کے بغیر بھی آرام سے گزر رہی تھی لیکن شاید چارلوٹ مطمئن نہیں تھی کہ وہ والدین کے گھر بیٹھی رہے۔

بارٹن نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم ایک بار پھر آخری سین کی ریہرسل کرتے ہیں اور اس مرتبہ......''

ایک بار پھر بادل گرجے، بجلی چمکی اور اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

سارہ بولی۔ ''مجھے طوفان سے نفرت ہے اور یہ شور تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

''تم بالکل محفوظ ہو۔'' ولیم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

چارلوٹ ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو نے سوچا کہ کیا وہ کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کے لیے موقع تلاش کر رہی ہے۔

بارٹن نے سارہ سے کہا۔ ''تم وہیں سے شروع کرو جہاں......''

عین اسی وقت بجلی چلی گئی اور سارہ کچھ بولنے سے پہلے ہی خاموش ہو گئی۔

''میرے پاس لائٹر ہے۔'' ہوورڈ نے کہا۔ ''کیا تم موم بتیوں کا انتظام کر سکتی ہو؟''

''ہاں، میں دو موم بتیاں لے کر آئی تھی۔ وہ اسٹیج کے پیچھے رکھی ہوئی ہیں۔''

ہوورڈ اسے لائٹر کی روشنی دکھاتا ہوا اسٹیج تک لے کر آیا، وہاں انہیں میز پر رکھی ہوئی دو موم بتیاں مل گئیں۔

''کیا پورے گاؤں کی بجلی چلی گئی ہے؟' جو نے پوچھا۔

''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اس نے سوچا کہ نیچے تہ خانے میں جا کر ملڈرڈ کو دیکھنا چاہیے لیکن وہ باقی لوگوں کو اندھیرے میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ واپس اسٹیج پر گئی اور موم بتی میز کے وسط میں رکھ دی۔ پانچ منٹ بعد ہوورڈ واپس آ گیا۔ ''لگتا ہے کہ پورے گاؤں میں بجلی نہیں ہے۔ اب ہمیں یہیں رک کر انتظار کرنا ہو گا۔''

جو بولی۔ ''میں ملڈرڈ کو لینے جا رہی ہوں۔ واپسی میں مزید موم بتیاں لیتی آؤں گی۔''

دور کہیں سے بجلی کڑکنے کی آواز آئی۔ ہوورڈ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''احتیاط سے جانا۔ کہیں کوئی اندھیرے میں گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔''

''خاموش ہو جاؤ ہوورڈ۔'' چارلوٹ نے کہا۔ ''کیوں ہماری ننھی مہمان کو ڈرا رہے ہو؟'' اس کا اشارہ سارہ کی طرف تھا۔

''بہت بہت شکریہ چارلوٹ۔'' سارہ نے کہا۔ ''میں مہمان نہیں ہوں۔''

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم یہاں رہنے کا فیصلہ کر لو۔''

''میرا یہی ارادہ ہے۔ مجھے یہ جگہ پسند ہے۔''

جو نے اُن دونوں کی نوک جھونک پر کوئی توجہ نہیں دی اور موم بتی سنبھال کر تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ ایک بار پھر بجلی کڑکی۔ لگتا تھا کہ طوفان زور پکڑ رہا ہے جس کی وجہ سے بجلی آنے میں کئی گھنٹے لگ سکتے تھے۔ اس نے اسٹور روم کا دروازہ کھول کر آواز لگائی۔

''یہ مت کہنا کہ تمہیں موم بتی جلانے کے لیے ماچس نہیں ملی۔''

جب کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''ملڈرڈ تم کہاں ہو؟''

وہ اندھیرے میں راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھی پھر جو کچھ اس نے دیکھا۔ وہ ناقابلِ یقین تھا۔ ملڈرڈ پشت کے

بل چت پڑی ہوئی تھی اور اس کے سینے میں برف کاٹنے کا سُوا گھسا ہوا تھا جو ملڈرڈ ہی لے کر آئی تھی لیکن بعد میں فیصلہ ہوا کہ اسے ہائی اسکول کے طالب علم کے ہاتھ میں نہیں دیا جائے گا جو ڈرامے میں بارٹینڈر کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس لیے ملڈرڈ نے اسے اسٹور روم میں رکھ دیا۔

جو گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے موم بتی کی روشنی میں ملڈرڈ کے بلاؤز کا کالر ہٹایا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ ملڈرڈ زندگی کی بازی ہار چکی ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر موم بتی اونچی کی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ہوورڈ کی ڈنر جیکٹ ایک ہینگر میں لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی میز کے برابر میں پڑے قالین پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ جو کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کے لیے گہرے سانس لینا شروع کیے۔ جب وہ باہر آئی تو اسے لباس میں چابیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے کمرے کے دروازے کو تالا لگا دیا۔

پہلے تو کسی کو یقین نہیں آیا پھر سب نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی جانب لپکے لیکن جو نے کسی کو چابی نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ریہرسل کے دوران دو مرتبہ ایسا موقع آیا جب ان میں سے کوئی چھپ کر تہ خانے میں جا سکتا تھا۔ ریہرسل شروع ہونے سے پہلے بارٹن ملاقاتی کمرے میں اسکرپٹ دیکھ رہا تھا جبکہ ولیم ہال میں کھڑا ریہرسل شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور سارہ فون پر اپنی ہاؤس کیپر سے بات کر رہی تھی۔ ہوورڈ ایک پرانی جنتری کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ چارلوٹ اور ویون لیونگ روم میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

ویون نے باری باری سب کو دیکھا اور سوچنے لگی کہ ان دس پندرہ منٹوں کے درمیان کوئی بھی تہ خانے میں جا سکتا تھا یا پھر بعد میں جب بارٹن نے ایک سین دوبارہ لکھنے کا فیصلہ کیا تو سب اِدھر اُدھر ہو گئے اور دس منٹ تک ریہرسل رکی رہی۔ اس دوران بھی کوئی نیچے جا سکتا تھا۔

بارٹن کہہ رہا تھا۔ ”ممکن ہے کہ اس نے کسی وجہ سے تہ خانے کا دروازہ کھولا ہو اور کوئی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا ہو۔“

”یقیناً۔“ ہوورڈ نے کہا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس طوفان میں باہر ٹہل رہا ہو۔“

”لیکن ایسی کوئی بات ضرور ہے۔“ ویوین بولی۔ ”اگر ہم میں سے کسی نے اسے قتل نہیں کیا تو ضرور وہ باہر کا شخص ہوگا۔“

”اور اگر وہ چلائی ہوگی۔“ سارہ نے کہا۔ ”تو طوفان اتنا شدید تھا کہ ہم اس کی آواز نہیں سن سکے۔“

بارٹن نے چشمہ اتارا، اور اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بہت بڑا نقصان ہے۔“

ہوورڈ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ کل کا شو ملتوی کرنا پڑے گا۔ یہ بھی اچھا ہے کہ فاؤنڈرز ڈے تین ہفتے بعد ہے۔“

”یہ تم ابھی سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ ویوین نے کہا۔

”تمہارے مرحوم شوہر کا کہنا تھا کہ یہ دن مقامی آبادی کے لیے بہت اہم ہے۔ دور دور سے سیاح آتش بازی کا نظارہ دیکھنے آتے ہیں اور دکان داروں کی خوب آمدنی ہوتی ہے۔“

چارلوٹ بولی۔ ”اور اس سال ویلج کونسل اسے رضا کارانہ خدمات کے حوالے سے یاد کر سکتی ہے۔“

”انہیں یاد کرنا چاہیے۔“ ویوین بولی۔ ”اس نے ہائی اسکول کے زمانے سے ہی رضا کار کے طور پر کام شروع کر دیا تھا۔“

جو بولی۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ تم اور ملڈرڈ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتی تھیں۔“

”ملڈرڈ اور میرا سب سے بڑا بھائی کلاس فیلو تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان اس سے بھی گہرا تعلق تھا لیکن وہ جنگ میں مارا گیا۔“

چارلوٹ نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”پولیس والے کب آئیں گے؟“

”شاید وہ طوفان کے تھمنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

اسی وقت گھنٹی کی آواز آئی۔ جو بولی۔ ”وہ آ گئے ہیں۔ میں انہیں اندر لے کر آتی ہوں۔“

پولیس والے اپنے ساتھ لالٹینیں اور زیادہ طاقت والی ٹارچیں لے کر آئے تھے۔ پولیس چیف ایلی گورڈن بھاری جسامت والا شخص تھا۔ اس نے دیر سے آنے پر معذرت کی اور جو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم ریڈکلف کی نواسی ہو؟“

”ہاں، وہ میری ماں کی خالہ تھیں۔“

”سب سے پہلے تم نے ہی لاش دیکھی تھی؟“

”ہاں۔“ جو نے اسے تہ خانے میں جانے کے بارے میں بتایا۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ یہاں پر موجود لوگوں میں سے کسی ایک نے اُسے قتل کیا ہوگا؟''

''نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتی۔ وہ بہت اچھی عورت تھی۔''

''اس کے باوجود کسی نے اسے قتل کر دیا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو؟''

''ہاں، اس سے یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ کوئی باہر سے آیا ہوگا۔''

''اگر وہ چوری کی نیت سے آیا تھا تو کیا تہ خانے میں کچھ قیمتی چیزیں تھیں؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ یہی سوچ کر آیا ہو۔''

''مجھے بارٹن نے بتایا ہے کہ ملڈرڈ ڈراما کے لیے ضرورت کی چیزیں لوگوں سے ادھار یا عطیہ کے طور پر بھی لیتی تھی؟''

''ہاں، کیونکہ ہمارے پاس زیادہ بجٹ نہیں ہے اور ملڈرڈ یہاں رہنے والے زیادہ تر لوگوں کو جانتی تھی اور اسے معلوم تھا کہ ان کے اسٹور اور تہ خانوں میں کیا سامان رکھا ہوا ہے۔ جب ہمیں ضرورت کا فرنیچر نہیں ملتا تو وہ فرنیچر کی دکان سے میز کرسیاں ادھار لے لیتی۔''

''کیا اس نے ایسے سامان کی کوئی فہرست بنائی تھی جو ابھی واپس کرنا ہو؟''

''ہم ہر چیز کا ریکارڈ لاگ بک میں رکھتے ہیں۔''

''میں نے اسے ملڈرڈ کی میز پر دیکھا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس قتل سے ان چیزوں کا کوئی تعلق ہے؟''

''میرے ذہن میں جو سوالات آرہے ہیں' وہ پوچھ رہا ہوں یہاں زیادہ قتل نہیں ہوتے۔ آخری قتل اس وقت ہوا جب سپاہی جنگ سے واپس آرہے تھے۔ ایک سپاہی کو معلوم ہوا کہ بیوی نے اس سے بے وفائی کی ہے اور اس کا انتظار نہیں کیا۔ سپاہی نے اسے گولی ماردی اور بعد میں اپنے آپ کو مارنے کی کوشش کی۔''

جو بولی۔ ''میں نے بھی اس کے بارے میں پڑھا تھا جب میں واشنگٹن میں تھی۔''

''تم یہاں اسٹیج منیجر ہو۔ تمہیں یہ ملازمت کیسے ملی؟ کیا بارٹن نے تم سے کہا تھا؟''

''براہِ راست تو نہیں البتہ اس نے پبلک ہیلتھ نرس اینی یونگ سے تذکرہ کیا تھا کہ اسے اسٹیج منیجر کی ضرورت ہے۔ وہ کسی زمانے میں اسکول نرس ہوا کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا۔ اس طرح مجھے یہ ملازمت مل گئی۔''

''اگر ہم دوسرے ایکٹرز کی بات کریں۔'' چیف گورڈن بولا۔ ''تو مسز فشر اور بارٹن کے علاوہ سب یہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے لیکن بارٹن بھی یہاں سات آٹھ سال سے رہ رہا ہے۔ صرف سارہ فشر ہی نو وارد ہے اور تم...... لیکن تم بھی گھر واپس آگئی ہو۔''

''ہاں۔'' جو بولی۔ ''میرا صرف یہی ایک گھر ہے۔''

''میں وہ لاگ بک دیکھنا چاہوں گا کہ کہیں کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔ کیا تم کل صبح دس بجے مل سکتی ہو؟''

''ہاں۔''

جو گھر آئی تو پالتو بلی ڈیسی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اس کے لیے پانی کا پیالہ بھرا اور خود ایک پلیٹ میں روسٹ چکن نکال کر کھانے لگی پھر اپنے لیے برانڈی کا ایک گلاس بنایا اور لباس تبدیل کر کے بستر پر نیم دراز ہوگئی۔ برانڈی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا ریہرسل میں حصہ لینے والے کسی شخص نے ملڈرڈ کو قتل کیا ہوگا۔ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ البتہ اسے سُن گن لینے کی عادت تھی اور جو بات بھی اسے معلوم ہو جاتی۔ اسے دوسروں تک پہنچا کر لطف اندوز ہوتی تھی۔ کہیں اس کے قتل کی یہ وجہ تو نہیں کہ اسے کسی کا راز معلوم ہو گیا ہو اور قاتل کو یہ خطرہ ہو کہ وہ اسے دوسروں پر ظاہر کر دے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ کون ایسا شخص ہے جس کا کوئی راز ملڈرڈ کو معلوم ہو گیا ہو اور وہ اسے خاموش کرنا چاہ رہا ہو۔

اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی آنٹی میگ کی فریم شدہ تصویر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں اپنا راز چھپانے کے لیے کسی کو قتل کر دوں گی۔ میں نہیں سمجھتی کہ ایسا کر سکوں گی۔''

دوسری صبح وہ بستر میں تھی کہ بارٹن کا فون آگیا۔ وہ کہہ رہا تھا، میری گرینج کے صدر سے فون پر بات ہوئی ہے۔ اسے ملڈرڈ کے بارے میں معلوم ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ گزشتہ شب چیف گورڈن نے اسے فون کیا تھا۔ وہ میئر اور ولیج کونسل سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ شاید وہ ہم سے ڈرامے کی نئی تاریخ مقرر کرنے کے لیے کہیں۔''

یہ وقت ان باتوں پر توجہ دینے کا نہیں، ہمیں ملڈرڈ......''

''میں یہ بات جانتا ہوں لیکن میں نے اس پر بہت محنت کی ہے۔ یہ صرف میرا ڈراما نہیں بلکہ ہم کمیونٹی تھیٹر کے لیے......''

''وہ اب بھی بنے گا۔'' جو بولی۔ ''تم نے کچھ کھایا۔ ناشتے پر ملاقات کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
''میں ناشتا نہیں کرتا۔''
''تمہیں ناشتا ضرور کرنا چاہیے۔ دراصل میں تم سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہوں کہ ہم ملڈرڈ کے اعزاز میں کیا کر سکتے ہیں۔''
''میرا بھی یہی خیال ہے......''
''ٹھیک ہے۔ ہم ایک گھنٹے بعد گرین میں مل رہے ہیں۔''
جب وہ گرین پہنچی تو بارٹن باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ جو بولی۔ ''اس سے پہلے کہ ہم کافی پینے جائیں۔ چند منٹ کے لیے یہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔''
وہ دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔ بارٹن بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ پھول بھیجنا ٹھیک رہے گا۔''
جو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے۔''
''میں نہیں سمجھتا کہ اس کا یہاں کوئی رشتے دار ہے۔''
''اس نے بتایا تھا کہ وہ چھٹیوں میں اپنے کزن اور اس کی فیملی سے ملنے ڈیلاویر جاتی ہے۔''
''میرا خیال ہے کہ لاش ملنے کے بعد وہی لوگ تجہیز و تدفین کا انتظام کریں گے۔''
''مجھے معلوم نہیں کہ اس میں کتنا وقت لگے گا لیکن جیسے ہی تدفین کی تاریخ کا اعلان ہوا تو ہم اس موقع پر پھول بھیج دیں گے۔''
''یہ بات ہم فون پر بھی کر سکتے تھے۔''
''نہیں۔'' جو بولی۔ ''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ ''تمہارے خیال میں ملڈرڈ کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟''
''میں کیا کہہ سکتا ہوں اور تم بھی اپنا دماغ مت کھپاؤ۔ یہ کام پولیس کے کرنے کا ہے۔''
''گزشتہ رات بہت سوچنے کے بعد میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ قاتل ہم میں سے ہی ہے جس کا کوئی راز ملڈرڈ کو معلوم ہو گیا تھا۔''
''جہاں تک میں سمجھتا ہوں، میرا کوئی ایسا راز نہیں جو ملڈرڈ جانتی تھی۔ اس لیے میں نے اُسے قتل نہیں کیا۔''
''ٹھیک ہے، چلو، ناشتا کرتے ہیں۔ مجھے دس بجے چیف گورڈن سے بھی ملنا ہے۔ اس نے لاگ بک منگوائی تھی۔''

''کیوں؟''
''وہ جاننا چاہتا ہے کہ کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔ اس طرح ڈکیتی کے نظریے کو تقویت ملے گی۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے تہ خانے کے دروازے پر انگلیوں کے نشانات بھی دیکھے ہوں گے۔''
''یہ کیا ہے؟'' چیف گورڈن نے لاگ بک کے صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو یہ پائپ لگ رہا ہے۔''
''ہاں۔'' جو بولی۔ ''اس ڈرامے کا ایک کردار سمرسٹ ماہم پائپ پیتا تھا اور یہ ویوین کے مرحوم شوہر کا پائپ ہے جو اس نے ہمیں ادھار دیا تھا۔''
''اس کے علاوہ تم نے کوئی اور چیز دیکھی؟''
''نہیں، زیادہ تر چیزیں جو ہمیں استعمال کرنی تھیں۔ وہ پہلے سے اوپر بھیج دی گئیں۔ نیچے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جسے قیمتی کہا جا سکے۔''
''کوئی جیولری وغیرہ؟'' گورڈن نے پوچھا۔
''اداکار اپنی جیولری خود لاتے تھے اور گزشتہ شب انہوں نے ڈریس ریہرسل کے لیے اپنے ملبوسات بھی پہن رکھے تھے۔ سوائے ہوورڈ کے۔ ملڈرڈ اس کی جیکٹ میں بٹن لگانے کے لیے نیچے آئی تھی۔''
چیف گورڈن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم نے کمرے میں رکھی ہوئی ساری چیزیں دیکھ لی ہیں اور ان میں سے کچھ بھی غائب نہیں ہے۔''
''بیرونی دروازے کے بارے میں کیا کہو گے؟ کیا تم نے اس پر انگلیوں کے نشانات دیکھے؟''
''ہاں لیکن ہم ابھی تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ یہ کس کے ہو سکتے ہیں۔''
''ان میں سے کچھ کام کرنے والے مزدوروں کے بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ تہ خانے کے دروازے کے ذریعے سامان لاتے اور لے جاتے رہے ہیں۔''
''یہی تو مسئلہ ہے۔'' گورڈن بولا۔ ''اس دروازے کو کئی لوگوں نے استعمال کیا ہے۔''
''لیکن تم نے کسی اجنبی شخص کے امکان کو مسترد نہیں کیا ہے؟''
''میں نے اپنا ذہن کھلا رکھا ہے۔''
''کیا تم اسے پولیس کے کام میں مداخلت تو نہیں سمجھو گے، اگر میں اپنے طور پر ان لوگوں سے بات کروں جو گزشتہ شب یہاں موجود تھے۔''
''تم پہلے ہی یہ کام کر رہی ہو۔ کیا تم نے آج صبح

بڑا آدمی

بڑا آدمی بننے کے لیے کوئی نصب العین رکھو جس کا تعلق ملک کے حقیقی مفاد سے ہو، پھر دل و جان سے اس کے لیے کوشاں رہو۔ لوگ تمہاری مخالفت کریں گے تم پروا نہ کرو اور مسلسل کام کیے جاؤ، کسی کی ناجائز طرف داری نہ کرو اور نہ کسی کو دھوکا دو۔ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھو بلکہ حقیر کمزور اور بے وسیلہ جانو، مگر کسی غیبی مدد کے منتظر نہ رہو یقیناً تم ایک دن بڑے آدمی بن جاؤ گے۔

شجاع آباد سے محمد اعظم ترین کا خیال

ناشتے پر بارٹن سے ملاقات نہیں کی؟“

”کیا تم ہماری جاسوسی کر رہے تھے؟“

”نہیں، مجھے یہ بات دوسرے لوگوں سے معلوم ہوئی ہے۔ اب تک سب کو ملڈرڈ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔“

”یعنی تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

”میں تمہیں لوگوں سے بات کرنے سے نہیں روک سکتا اور اگر تمہیں کوئی خاص بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتانا۔“

”ضرور بتاؤں گی۔ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ یہ کیس جلد از جلد حل ہو جائے۔“

☆☆☆

جب جو نے یوڈورا ہیرالڈ کے دفتر فون کیا تو ایڈیٹر نے بتایا کہ ہوورڈ کسی کا انٹرویو کرنے البانی گیا ہوا ہے۔

”کیا وہ شام تک آ جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔

”اسے آ جانا چاہیے۔“ ایڈیٹر نے کہا۔

”کیا تم اس تک میرا پیغام پہنچا دو گے۔ کہنا کہ میں نے فون کیا تھا۔“

پھر وہ چارلوٹ سے ملنے گئی۔ اس کی ماں نے بتایا۔ ”بہت سے لوگ اسے فون کر کے ملڈرڈ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ فون سنتے سنتے تنگ آ گئی۔ اس لیے میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ میٹنی شو دیکھنے چلی جائے۔“

”شکریہ۔ میں وہیں چلی جاتی ہوں۔“

فلم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور ہال آدھا خالی تھا۔ اس نے دیکھا کہ چارلوٹ پچھلی قطار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جو اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری ماں نے کہا تھا کہ تم یہاں ملو گی۔“

”میں جا رہی ہوں۔“ چارلوٹ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ جو نے اس کا فوری تعاقب کرنے کے بجائے وہاں کچھ دیر رکنا مناسب سمجھا۔ جب وہ باہر آئی تو چارلوٹ تیز تیز قدموں سے سڑک پر جا رہی تھی جو بھی اس کے پیچھے چل دی۔ چارلوٹ نے مڑ کر دیکھا اور بولی۔ ”تم کیا چاہتی ہو جو؟“

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”لیکن میں تم سے یا کسی اور سے ملڈرڈ کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کیسے مری۔ تم نے تہ خانے کا دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ اس لیے ہم اس کی لاش بھی نہ دیکھ سکے بلکہ میں لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ اگر وہ اس بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں تو تم سے پوچھیں۔“

”شکریہ چارلوٹ۔ اس کے باوجود میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں کیونکہ جو لوگ وہاں موجود تھے۔ تم انہیں مجھ سے بہتر جانتی ہو۔“

”کیونکہ تم یہاں عرصے سے نہیں رہ رہی تھیں۔“

”تمہارا ولیم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ سارہ پر ڈورے ڈال رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ اس سے مزے لے رہی ہے اور وہ اتنا احمق ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ وہ اسے کس طرح بے وقوف بنا رہی ہے۔“

چارلوٹ سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن جو نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے۔ وہ بولی۔ ”جنگ شروع ہونے سے پہلے جم فشر کسی اور سے......“

”اگر تم جم فشر کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو اس سے خود پوچھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس میرے بارے میں کہنے کے لیے بہت کچھ ہوگا۔“

یہ کہہ کر چارلوٹ آگے بڑھ گئی۔ جو اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ حقیقت جاننے کے لیے وہ جم فشر سے ضرور ملے گی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ لنچ کر کے واپس آ گیا ہوگا۔

سیکریٹری نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا اور جم فشر کو اطلاع دینے اس کے کمرے میں چلی گئی۔ دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور جم فشر خود باہر آ گیا۔ ”اندر آ جاؤ مس ریڈکلف۔“

”معذرت خواہ ہوں کہ ملاقات کا وقت طے کیے بغیر چلی آئی۔“ جو نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ آج میرے پاس کچھ وقت ہے۔ کیا کوئی قانونی مسئلہ ہے؟''

''نہیں لیکن میں کچھ پریشان ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم بھی سارہ کے لیے فکرمند ہو گے۔''

''غالباً تم ملڈرڈ کی موت کے حوالے سے بات کر رہی ہو؟''

''ہاں، وہ بے چاری قتل ہو گئی اور ہم سب پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک قاتل کا اگلا نشانہ ہو سکتا ہے۔ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کسے یہ بات بتاؤں۔ میں نے سوچا کہ تم......'' پھر وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''سارہ کیسی ہے؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔ گھر پر آرام کر رہی ہے؟''

''اچھی بات ہے۔'' جو نے کہا۔ ''آج میری چارلوٹ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ مجھے تم سے بات کرنی چاہیے۔''

''کس بارے میں؟''

''میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن شاید اس کا اشارہ تمہارے اور اس کے تعلقات کے بارے میں تھا۔''

''ہمارے درمیان کبھی ایسے تعلقات نہیں رہے۔''

''کیونکہ تم نے سارہ سے شادی کر لی جبکہ اسے امید تھی کہ تم اُس سے......''

''چارلوٹ اور میں؟ یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟ چارلوٹ کبھی یہ بات نہیں کہہ سکتی۔''

''نہیں، اس نے براہِ راست نہیں کہا لیکن جب وہ تمہارا اور سارہ کا ذکر کر رہی تھی تو مجھے کچھ پریشان لگی۔''

جم فشر نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور بولا۔

''اس کے علاوہ کوئی اور بات؟''

جو کا دل چاہا کہہ دے کہ ولیم تمہاری بیوی پر ڈورے ڈال رہا ہے لیکن وہ بولی۔ ''نہیں، اب مجھے چلنا چاہیے۔ تمہارے قیمتی وقت کا شکریہ۔''

وہ کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ ''اگر تمہیں وکیل کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔''

''شکریہ لیکن مجھے امید ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہو گی۔''

وہاں سے واپسی پر وہ ولیم سے ملنے ڈرگ اسٹور گئی۔ وہ اسے دیکھ کر باہر آ گیا اور بولا۔

''مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے۔ آؤ کسی کھلی جگہ پر چلتے ہیں۔''

وہ عقبی دروازے سے نکل کر گلی میں آ گئے۔ ولیم نے اسے سگریٹ پیش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ولیم نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم نے چیف گورڈن کو لاگ بک دکھائی تھی؟''

''ہاں لیکن وہاں سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔''

''میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ کوئی باہر سے آیا تھا۔ مجھے یقین نہیں کہ قاتل ہم میں سے کوئی ہے۔''

''میں بھی ایسا نہیں سمجھتی۔ میری بارٹن، چارلوٹ اور جم فشر سے بات ہو چکی ہے۔''

''جم فشر؟ کیا تم اس کے گھر گئی تھیں؟''

''نہیں، اس کے دفتر میں ملاقات ہوئی تھی۔''

ولیم بولا۔ ''اسے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ سارہ کو اس کی ضرورت ہے۔''

''اس کا کہنا ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔''

''وہ تو یہی کہے گا۔''

جو بولی۔ ''تم اور سارہ...... لگتا ہے کہ تمہیں اُس کی بہت فکر ہے۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں ایک شادی شدہ عورت کو تنہا چھوڑ دوں۔''

''یہ تم دونوں بلکہ تینوں کا معاملہ ہے۔ شوہر کی بات پر مجھے یاد آیا۔ ملڈرڈ نے بتایا تھا کہ ویوین کے شوہر کی موت اچانک ہو گئی تھی۔''

ولیم نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں لیکن اُس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' جو بولی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ جب ویوین سے بات ہو تو کچھ غلط کہہ دوں۔''

''اُسے بھول جاؤ۔ وہ ایک گھنٹا پہلے دوا لینے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ یوٹیکا جا رہی ہے۔''

''وہ کس لیے؟''

''مصوری کا سامان خریدنے۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ دوبارہ مصوری شروع کرے گی۔''

جب شام کو اس نے ویوین کو فون کیا تو وہ بولی۔ ''آج میں بہت تھک گئی ہوں۔ ہم کسی اور دن مل سکتے ہیں۔''

''کل کیسا رہے گا؟''

''نہیں، اس وقت تھوڑی سی پریشان ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو نارمل کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ پہلے

میرے شوہر کا انتقال ہوا، اور اب ملڈرڈ بھی قتل ہوگئی۔‘‘
’’میں سمجھتی ہوں اور مجھے تمہارے شوہر کے انتقال پر بہت افسوس ہوا لیکن میں توقع کر رہی تھی کہ تم سے بات ہو سکتی ہے۔‘‘
’’کیوں نہ ہم اگلے ہفتے ملاقات کریں۔ تم بدھ کے روز تین بجے آجاؤ۔‘‘ یہ کہہ کر ویوین نے فون بند کر دیا۔
ہوورڈ کو اس کا پیغام ملا تو وہ خود ملنے چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں بیکری کا سامان تھا۔ اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا۔ ’’کافی ملے گی؟‘‘
’’اندر آجاؤ۔ میں کافی بناتی ہوں۔‘‘
وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا کچن تک آیا۔ ’’میں نے سنا ہے کہ تم اس قتل کی تحقیقات میں چیف گورڈن کی مدد کر رہی ہو۔‘‘
’’میں نے صرف اُسے لاگ بک دکھائی تھی۔‘‘
’’تمہارا کیا خیال ہے۔ قاتل کوئی باہر سے آیا تھا یا ہم میں سے کوئی ایک؟‘‘
’’میں نے اپنے آپ کو مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا ہے اور چیف گورڈن کو تم پر بھی شک نہیں ہے ورنہ وہ تمہیں قصبے سے باہر نہ جانے دیتا۔ ہمارے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟‘‘
’’لیکن کیوں؟ کیا کسی کو ملڈرڈ سے خطرہ تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ولیم، سارہ کے لیے پاگل ہو رہا ہے لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔‘‘
’’بارٹن بھی نہیں ہو سکتا۔‘‘ جو بولی۔ ’’کیونکہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی ہال سے باہر نہیں گیا۔ چارلوٹ شاید کسی وجہ سے اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہی ہے لیکن اس میں کوئی راز نہیں ہے جو وہ کسی سے چھپائے۔‘‘
’’اب صرف ویوین ہی باقی رہ جاتی ہے۔ کیا تم اُس پر شک کر رہی ہو؟‘‘
’’میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ حالانکہ وہ ایسی عورت نہیں ہے کہ شوقیہ کسی ڈرامے میں کام کرے لیکن ملڈرڈ کا کہنا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتی ہے۔‘‘
’’ہو سکتا ہے۔ ملڈرڈ نے اس کے بارے میں اور کیا کہا تھا؟‘‘
’’یہی کہ اس کا شوہر گزشتہ موسم سرما میں انتقال کر گیا تھا۔‘‘
’’میں نے سنا ہے کہ وہ اس کی سیکریٹری تھی۔‘‘ ہوورڈ

نے کہا۔
’’کیا واقعی؟‘‘
’’اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کئی لوگ اپنی سیکریٹری سے شادی کرتے ہیں۔ خاص طور پر اگر وہ جوان اور پُرکشش ہو۔‘‘
جو نے ایک کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ’’ان کی عمر میں بھی فرق ہوگا؟‘‘
’’وہ ستر کے قریب تھا۔‘‘
’’جبکہ ویوین چالیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔‘‘
’’لیکن بات وہیں گھوم پھر کر آجاتی ہے کہ قاتل کون ہے اور اس نے ایسا کیوں کیا؟‘‘

☆☆☆

جو اپنے بستر میں لیٹی ہوئی تھی کہ اسے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ کوئی بڑی احتیاط سے دبے قدموں چل رہا تھا۔ جو نے بستر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک ہتھوڑا نکالا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہوگئی پھر جیسے ہی دروازہ کھلا وہ گھومی اور اس نے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنی۔ وہ لیمپ کی طرف لپکی اور اس کی روشنی میں دیکھا کہ کوئی ہڈ سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں برف توڑنے کا سُوا دیکھ کر اس نے ہتھوڑے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ اُسے پہچان گئی تھی۔
’’ولیم، یہ تم ہو؟‘‘ جواب میں اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔
’’ویوین ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ تم ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہو۔‘‘
’’تم دونوں نے مل کر اس کے شوہر کو قتل کیا۔ اسے وہ دوا کھلائی جو دل کے دورے میں دی جاتی ہے۔‘‘

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ وہ گولیاں اس کے جسم میں جا کر ریزہ ریزہ ہوگئی تھیں۔''

جو نے اپنی سانس پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولی۔ ''اور چند گھنٹوں بعد اس کی علامات......''

''لیکن اس کی محبت کرنے والی بیوی کے علاوہ اس کا کوئی گواہ نہیں تھا اور کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ دل کے دورے کے علاوہ کچھ اور ہوسکتا ہے۔''

''ملڈرڈ کو کیوں مارا؟'' وہ کیا جانتی تھی؟''

''وہ ہوورڈ کی جیکٹ لے کر جارہی تھی کہ اس نے سیڑھیوں کے پاس مجھے اور ویوین کو باتیں کرتے دیکھ لیا۔''

''سارہ کے بارے میں؟''

''ویوین میرے منصوبے سے متفق تھی کہ سارہ کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیا جائے پھر جب سارہ مجھے اپنے شوہر کی خاطر مسترد کر دیتی تو میرا دل ٹوٹ جاتا۔ ویوین میری دلجوئی کرتی اور اس طرح ہم ایک ہوجاتے گو کہ ہماری عمروں میں فرق تھا۔''

''لیکن وہ سمجھ رہی تھی کہ تم سارہ کے لیے واقعی پاگل ہورہے ہو؟''

''بدقسمتی سے ملڈرڈ وہاں آگئی جب ویوین مجھ سے بحث کررہی تھی۔''

جو نے کہا۔ ''اور ملڈرڈ کو شک ہوگیا ہوگا۔''

''میں نے اُسے بتایا کہ ہم دونوں ڈرامے کے ایک سین کی ریہرسل کررہے تھے۔ اس پر وہ تھوڑی سی متعجب ہوئی پھر معذرت کرتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔''

''لیکن جب وہ پورا ڈراما دیکھتی تو اسے معلوم ہوجاتا کہ اس میں ایسا کوئی سین نہیں تھا۔''

''اس نے پہلے ہی ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ تماشائیوں میں بیٹھ کر یہ ڈراما دیکھنا چاہتی ہے۔''

''لہٰذا تم خوف زدہ ہوگئے اور اُسے قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔''

''نہیں، میں خوف زدہ نہیں ہوا بلکہ میں نے سوچا کہ اس معاملے کو درست کرسکتا ہوں لہٰذا میں نیچے گیا اور اس سے کہا کہ میں ہوورڈ کی جیکٹ اسے دے دوں گا لیکن اس نے بکواس شروع کردی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ پہلے سے ہی میرے اور ویوین کے تعلق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''اور اس نے ویوین کے شوہر کے بارے میں سوچنا شروع کردیا ہوگا۔''

''جس طرح تم سوچ رہی ہو۔ اس لیے اب تم قاتل کا دوسرا نشانہ بننے والی ہو۔''

''تم یہ ہڈ کیوں نہیں اتار دیتے جبکہ میں تمہیں پہچان چکی ہوں۔''

''میں نہیں چاہتا کہ تم میرے چہرے پر خراشیں ڈالو اور اگر کسی نے مجھے تمہارے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ پہچان نہ سکے۔''

یہ کہہ کر وہ اس طرف بڑھنے لگا۔ جو چلّائی اور اس نے اپنا ہتھوڑا گھمایا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ سوا اس کے کندھے میں چبھ گیا ہے۔ اس نے پوری قوت سے اسے ٹکر ماری اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ سیڑھیوں پر کھڑی تھی جب ولیم نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ ہتھوڑا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

پھر ایک زوردار چیخ سنائی دی جیسے کوئی شیر دہاڑ رہا ہو۔ ولیم زور سے چلّایا۔ وہ اپنی پیٹھ پر سے ڈیکی کو ہٹانے کی کوشش کررہا تھا۔ چاند کی روشنی میں جو لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور ہال میں پڑی ہوئی میز پر سے بک اینڈ اٹھا کر ولیم کے سر پر دے مارا۔ اس کے حلق سے ایک خراہٹ نکلی اور وہ وہیں گر پڑا۔

جو نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر چیف گورڈن کو فون کیا اور خود دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ چند منٹ بعد گورڈن کچھ سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بے ہوش ولیم کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اسے لے جا کر گاڑی میں ڈال دیں پھر وہ جو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں۔'' وہ پیار سے اپنی بلی کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''آج اِس نے مجھے بچایا ہے ورنہ وہ میرے سینے میں بھی سُوا گھونپ دیتا۔''

''مجھے پہلے دن سے ہی شک تھا اور میں نے اس پر نظر رکھی ہوئی تھی لیکن کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ تم اپنے طور پر جو کارروائی کررہی تھیں، اس سے یہ گھبرا گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ویون کچھ نہ اگل دے۔ اس لیے اس نے تمہیں بھی راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر تمہاری بلی اس پر حملہ نہ کرتی تو شاید یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا۔ بہرحال آئندہ کبھی پولیس کے کام میں مداخلت مت کرنا۔ ضروری نہیں کہ ہر بار یہ بلی تمہاری حفاظت کے لیے موجود ہو۔''

جو نے بلی کو پیار سے دیکھا اور اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''وہ شکار کرنے آیا تھا لیکن خود شکار ہوگیا۔''

بزدل

نسرین منصور

جس عمل کو ہم احساسِ جرم کی وجہ سے کمزوری سمجھتے ہیں... وہ بعد میں مکمل زنجیر میں ایک اہم کڑی بن جاتے ہیں... ہر عمل کا ردِعمل ضرور سامنے آتا ہے... وہ برسوں سے اس کے سلوک کے عادی تھے... اور وہ کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے... جس پر ان کی روح کا ہر تار بکھر جاتا تھا... ساز و سوز میں ڈوبے وہ اس گھڑی کے منتظر تھے... جو اس کی آخری گھڑی ہوتی...

ایک شریف اور بدمعاش شخص کے درمیان ہونے والا سنگین ٹکراؤ......

سارجنٹ جوئے ریزو بغیر نمبر پلیٹ والی پولیس کار سے اُترا تو اس کی نظر اس کافی شاپ پر گئی جو بروکلین کی 65 ویں اسٹریٹ پر واقع تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کا ساتھی سراغ رساں مارک گریگ اس کے برابر میں آن کھڑا ہوا۔

''وہ کافی شاپ دیکھ رہے ہو گریگ؟''

گریگ نے ریزو کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے

کہا۔ ''ہاں دیکھ رہا ہوں۔ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''پہلے کبھی یہ بچوں کا پسندیدہ طعام خانہ تھا جہاں ہلکا پھلکا لنچ ملتا تھا۔ میں اپنی سب سے بڑی بیٹی کو یہاں لے کر آتا تھا جب وہ چار یا پانچ سال کی تھی۔''

''پھر؟'' گریگ نے ہاتھوں پر دستانے چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''اس وقت یہ 'بورڈ واک کیفے' کہلاتا تھا لیکن میری نے اس کا نام منکی اسٹور رکھ دیا کیونکہ ہوٹل کے اندر ایک سواری تھی۔ اس میں ٹوکن ڈالنے پر وہ اوپر نیچے اور آگے پیچھے حرکت کرنے لگتی۔ دیکھنے میں وہ بالکل جیپ کی طرح لگتی تھی اور اس کی پسنجر سیٹ پر ایک بڑا سا پلاسٹک کا بندر رکھا ہوتا تھا۔ میری اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر ہارن بجاتی تو بندر خوشی سے آوازیں نکالتا۔ وہ لنچ سے زیادہ اس تفریح کو پسند کرتی تھی۔''

ریزو نے دوبارہ کافی شاپ پر نظریں جما دیں۔ اس کے دماغ میں اس طعام خانے کا خیال گردش کر رہا تھا جو کافی عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا۔ ''میری کا ستمبر میں کالج کا دوسرا سال شروع ہو جائے گا لیکن وہ منکی اسٹور آج بھی اسے یاد ہے۔''

گریگ کو اس کافی ہاؤس کی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ وقت ضائع کرنے کا قائل تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''ہاں جوئے، بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ اس منکی اسٹور کو بھول جاؤ۔ ہمیں ہارڈ ویئر اسٹور کی عقبی گلی میں ایک لاش کی موجودگی کا علم ہوا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

وہ تنگ اور طویل گلی ہارڈ ویئر اسٹور اور لانڈری کے درمیان ایک ویران پٹی کے مانند تھی۔ اس کے دونوں طرف لکڑی کے بھاری دروازے لگے ہوئے تھے جن میں سے ایک ہارڈ ویئر اسٹور اور دوسرا لانڈری میں کھل رہا تھا۔ گلی کے اختتام پر ایک ویئر ہاؤس کی اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار تھی جس میں کوئی کھڑکی یا دروازہ نہیں تھا۔

چار باوردی پولیس والے اس دیوار کے پاس کھڑے زمین پر دیکھ رہے تھے جہاں ایک لاش چت پڑی ہوئی تھی۔ اس کی بے نور آنکھوں کا رخ پولیس والوں کی جانب تھا۔ جیسے ہی دونوں لاش کے پاس پہنچے تو ریزو نے نوٹ کیا کہ ان میں سے ایک بڑی عمر والا پیٹرول آفیسر باب ہیرس اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں سراغ رسانوں کو مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

''ہیلو، سارجنٹ مارک! تم پہلے اچھی خبر سننا چاہو گے یا بُری؟''

''کوئی اچھی خبر بھی ہو سکتی ہے؟'' گریگ نے پوچھا۔

''ہاں، مرنے والا وکٹر اینٹی یوف تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور تم بھی پہچان لو گے۔ اس طرح بروکلین سے ایک بدمعاش کم ہو گیا۔ یہ بہت ہائی پروفائل کیس ہے اور تم محض خانہ پری کر کے فائل کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔''

ریزو نے دستانے چڑھائے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر لاش کو دیکھنے لگا۔ لاش کا زرد چہرہ صاف پہچانا جا رہا تھا۔ اینٹی یوف بدنام زمانہ برائٹن بیچ گینگ کا سب سے اہم اور تجربہ کار رکن تھا۔ اس گروہ کی سربراہی روسی نژاد اولیگ یوکلوف کر رہا تھا۔ پولیس اور جرائم کی دنیا میں وہ صرف ایک بے رحم اور سفاک قاتل ہی نہیں بلکہ یوکلوف کے قابلِ اعتماد ساتھی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ لاش پر نظر پڑتے ہی ریزو کے ذہن میں کئی طرح کے خدشات جنم لینے لگے۔ یہ قتل پولیس کے لیے کئی مسائل پیدا کر سکتا تھا۔

ریزو کھڑا ہو گیا اور ہیرس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''تم نے اچھی اور بُری خبر کا کہا تھا، وہ بری خبر کیا ہے؟''

''تم بھی اس بارے میں سوچو سارجنٹ، اگر اولیگ یوکلوف نے خود اسے راستے سے ہٹایا ہے تو ہمارے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں لیکن اگر یہ اس کے حریف اطالوی گروپ یا کسی مخالف کی کارروائی ہے تو زبردست گینگ وار شروع ہو جائے گی جسے روکنا پولیس کے بس میں نہیں ہو گا۔''

ریزو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میڈیکل ایگزامنر آنے والا ہے۔ ڈپارٹمنٹ کو فون کر کے کہو کہ وہ دو یا تین مزید سراغ رساں یہاں بھیج دیں اگر وہ ان کو فارغ کر سکتے ہیں۔ اس گلی کو ٹیپ لگا کر بند کر دو اور سڑک پر گن تلاش کرو۔''

''ہم گن تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔ اگر قاتل کوئی پیشہ ور ہے تو وہ گن یہیں پھینک دیتا یا اپنے ساتھ لے جاتا۔ اناڑیوں کی طرح کسی کوڑے کے ڈبے میں نہ پھینکتا۔''

ریزو کے چہرے پر سختی آ گئی۔ ''ہاں، میں نے بھی وہ فلم دیکھی تھی لیکن فلموں اور حقیقی زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی امکان کو رد نہیں کر سکتے۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ یہ قتل کسی پیشہ ور نے کیا ہے یا اناڑی نے، اس لیے ہم قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ گن اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔ اگر میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی تو یہ وردی اُتار دو۔ تم اس کے لائق نہیں ہو ورنہ وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔''

آفیسر نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''ٹھیک ہے باس۔'' پھر وہ دوسرے پولیس والوں کی طرف بڑھ گیا اور وہ ایک قطار بنا کر گلی سے باہر چلے گئے۔

ریزو دوبارہ لاش کی طرف متوجہ ہوا۔ گریگ اس کے

برابر میں گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں بازو رانوں پر تھے۔

''اس کا سارا خون یہاں جمع ہو گیا ہے۔'' اس نے ایک چوڑے اور گہرے خون کے تالاب کی طرف اشارہ کیا جس نے نیم پختہ کنکریٹ کی سطح پر جگہ بنالی تھی۔ ''اسے اس جگہ گولی لگی ہے۔''

ریزو نے زمین پر رومال بچھایا اور اس پر ایک گھٹنا رکھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

''سینے میں ایک ہی گولی لگی ہے۔'' وہ لاش کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس کی قمیص پر کوئی سوراخ نظر نہیں آرہا اور نہ ہی بارود کے ذرے دکھائی دے رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ گولی چلانے والا کم از کم پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔''

''لگتا ہے کہ یہ کسی اکیلے آدمی کا کام ہے؟'' گریگ نے کہا۔

''ہاں۔'' ریزو بولا۔ ''بالکل ایسا ہی ہے۔ اگر زیادہ لوگ ہوتے تو اسے کئی گولیاں لگتیں جن میں سے کم از کم ایک سر میں گھس جاتی۔ اس کے علاوہ قمیص پر کئی سوراخ اور بارود کی تلچھٹ بھی نظر آتی۔''

''اور یہ گلی......'' گریگ نے مزید کہا۔ ''کسی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے اچھی جگہ ہے لیکن ضرب لگانے کے لیے نہیں۔ قاتل یہاں آکر پھنس گیا کیونکہ گلی آگے سے بند ہے اور نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ رالف نامی ایک شخص اپنے کتے کو سیر کروا رہا تھا۔ اس نے فائر کے بعد ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح تمہیں کم از کم ایک شہادت تو مل گئی۔''

ریزو نے گردن گھما کر گلی کے وسط میں دونوں دروازوں کو دیکھا اور بولا۔ ''بشرطیکہ وہ ان میں سے کسی ایک دروازے سے نہ نکل گیا ہو۔''

''اس کے لیے ضروری ہے کہ دروازے کا تالا کھلا ہوا ہو۔'' گریگ نے کہا۔ ''ایسی صورت میں یہ بھی امکان ہے کہ قاتل کا تعلق ہارڈ ویئر اسٹور یا لانڈری سے ہو۔''

''ہم پہلے ہی کسی گینگ کے ملوث ہونے کے امکان کو مسترد کر چکے ہیں۔''

''نہیں، ہم نے مکمل طور پر اس امکان کو مسترد نہیں کیا۔ میں نے محض اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ خود یوکلوف کی حرکت ہے تو ہم اسے بھی ثابت نہیں کر سکیں گے اور کوئی ہم سے اس کی توقع بھی نہیں کرے گا۔ کیوں نہ ہم کافی ہاؤس میں جا کر ہلکا پھلکا لنچ کریں۔''

کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر ریزو اور گریگ نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دبلا پتلا طویل قامت شخص ان کی طرف آرہا تھا۔ اس کی عمر پینسٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ انہوں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ڈپٹی میڈیکل ایگزامنر ڈاکٹر جوشوا لٹن تھا۔

اس نے مصافحہ کرنے کے بجائے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور سیدھا لاش کی طرف گیا۔ اس نے ہاتھ کی دو انگلیاں لاش کے ماتھے اور پھر شہ رگ پر رکھیں اور سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''مرد، سفید فام، عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان، مردہ، زیادہ امکان یہی ہے کہ سینے کے بائیں جانب ایک گولی لگی ہے۔ خون کی مقدار کو دیکھتے ہوئے میں کہوں گا کہ اس نے شہ رگ کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی موت فوراً واقع ہو گئی اور اسے مرے ہوئے بارہ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ جسم پر ایسا کوئی زخم نہیں جس سے پتا چلتا ہو کہ اس نے مزاحمت کی تھی۔ تم مجھے اپنا کارڈ دے دو تاکہ میں تمہیں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھیج سکوں۔ اب تم لاش کا معائنہ کر سکتے ہو اور اسے اسپتال بھجوانے کا انتظام کرو۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

''ہمیں رپورٹ کب تک مل جائے گی؟'' ریزو نے پوچھا۔

''بہت جلد۔'' ڈاکٹر نے چلتے چلتے جواب دیا۔

گریگ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہائے ڈاکٹر، تم سے بہت اچھی گفتگو رہی۔''

ضروری کارروائی سے نمٹنے کے بعد وہ دونوں دفتر واپس آگئے۔ اب وہ انٹرویو روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ گریگ نے پوچھا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ اینٹی یوف جیسا شخص ایک بند گلی میں کس طرح گولی کا نشانہ بن گیا؟''

ریزو کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں خود حیران ہوں۔ وہ اتنی آسانی سے کسی کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ لگتا یہی ہے کہ کسی نے گھات لگا کر اس پر بے خبری میں حملہ کیا۔''

چند لمحوں بعد ریزو نے پوچھا۔ ''اب تک ہم کیا معلوم کر سکے؟''

''ایک مشہور روسی بدمعاش بینسن ہرسٹ کے علاقے میں مردہ پایا گیا۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اسے اطالوی گینگ نے مارا ہو گا جو اپنے علاقے میں مداخلتِ بے جا کرنے والے کو موت سے کم کی سزا نہیں دیتے۔'' گریگ نے کہا۔ ''کیونکہ اس میں جگہ کے انتخاب سے لے کر شوٹنگ کے انداز تک پیشہ ورانہ مہارت کا فقدان نظر آتا ہے۔ کوئی بھی خوددار مافیا کا شخص اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔''

ریزو کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم جانتے ہو

مارک۔ بعض اوقات حماقت ہوسکتی ہے۔ احمق آدمی کے لیے بے پروائی آسان ہے۔ اسی کیس میں دیکھ لو۔ گولی مارنے والا احمق ہے۔ اس نے غلط جگہ کا انتخاب کیا اور غلط طریقہ اختیار کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا ہم محض اندازے لگا رہے ہیں اور وہ احمق ہماری دسترس سے دور ہے۔''

''اینٹی یوف کے والٹ میں چھ بڑے نوٹ تھے۔ اس نے دس ہزار ڈالر کی گھڑی اور ہیرے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ ڈکیتی کی واردات نہیں ہے۔''

''لانڈری اور ہارڈ ویئر اسٹور نے بتایا ہے کہ گلی کی طرف والے دروازے برسوں سے نہیں کھولے گئے۔ چند چوری کی وارداتوں کے بعد انہوں نے ان دروازوں میں آہنی چادریں لگوادیں اور انہیں مقفل کر دیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ گولی چلانے والا گلی سے نکل کر سیدھا سڑک پر چلا گیا یا پھر دونوں مالکان جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''اگر ڈاکٹر والٹن ہمیں موت کا صحیح وقت بتا دے تو ہم کسی گواہ کو تلاش کریں۔''

ریزو نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''لاش صبح ساڑھے سات بجے دریافت ہوئی۔ یہ سڑک عام طور پر گیارہ بجے تک سنسان ہوجاتی ہے۔ غالباً اسے گزشتہ شب گیارہ بجے کے بعد گولی ماری گئی۔''

''اب ہم کہاں سے شروع کریں جوئے؟''

''میں لوئی کواٹروپا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر اطالوی گینگ کے کسی شخص نے یہ قتل کیا ہے تو اس میں لوئی کی رضامندی شامل ہوگی گو کہ وہ اور اولیگ یوکلوف ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں لیکن دونوں ہی بالادستی کے خواہش مند ہیں اور انہیں کوئی بہانہ چاہیے۔ اگر لوئی اس قتل کا ذمے دار ہے تو یوکلوف اسے نہیں چھوڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اطالوی بھی محتاط ہوگئے ہوں گے، اگر وہ بھی مقابلے کی تیاری کررہے ہیں تو ہم اس کا بہ آسانی پتا لگا سکتے ہیں۔''

''اور یوکلوف کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کیا ہمیں اس سے بھی بات کرنی ہے؟''

''یقیناً بلکہ ہمیں اس سے پہلے ملنا چاہیے۔ وہ اسے اپنی عزت افزائی سمجھے گا۔ بہرحال اینٹی یوف اس کا خاص آدمی تھا اور وہ اسے بہت اہمیت دیتا تھا۔''

گریگ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ پہلے لوئی کواٹروپا سے ملنا چاہیے، اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ اینٹی یوف کے معاملے میں سچ بول رہا ہے کہ اس نے اسے نہیں مروایا تو ہمیں یوکلوف کا ذہن پڑھنے میں تھوڑی سی آسانی ہو جائے گی جیسا کہ ہمارا اندازہ ہے کہ شاید اس نے خود ہی اپنے آدمی کو قتل کروایا ہو۔ وہ شخص بہت چالاک ہے اور میں نے ہمیشہ اس کو سمجھنے میں مشکل محسوس کی۔''

ریزو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بھی۔ یوکلوف ہو یا روستوسکی۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی ذہن نہیں پڑھا جاسکتا۔ چلو پہلے لوئی سے بات کرتے ہیں۔''

لوئی کواٹروپا بادامی رنگ کی جلد اور سیاہ آنکھوں کی وجہ سے دیکھنے میں ایشیائی لگتا تھا۔ وہ گزشتہ چھ برس سے بروکلین کی طاقتور مافیا کا سربراہ تھا اور ریزو اب تک جتنے لوگوں سے ملا، ان میں سب سے زیادہ حقیقت پسند اور عملی شخص تھا۔ بظاہر اسے قانون نافذ کرنے والے افسروں سے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ ان لوگوں نے کیریئر کا انتخاب کرنے میں غلطی کی ہے۔ اس کا باپ مزدور تھا اور کئی سال تک ہاتھ کی ٹرالی کے ذریعے تعمیراتی ملبا ڈھوتا رہا۔ اسے پہلے کمر کی تکلیف ہوئی پھر جوڑوں کے درد نے اس کے ہاتھ پاؤں بے کار کردیے۔ باپ کا حشر دیکھ کر لوئی نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کبھی کوئی مشقت والا کام نہیں کرے گا بلکہ اپنی طاقت اور ذہن سے پیسے کمائے گا۔

ریزو اور گریگ ایک چھوٹی میز پر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی یہ ملاقات لوئی کے ہیڈ کوارٹر کے ایک لاؤنج میں ہورہی تھی۔

''کیا میں آزادانہ گفتگو کرسکتا ہوں جوئے؟'' لوئی نے کہا۔ ''امید ہے کہ یہ گفتگو آف دا ریکارڈ رہے گی۔''

''دراصل میں اور مارک ذاتی حیثیت میں آئے ہیں۔ اس لیے تم کھل کر بات کرسکتے ہو۔''

''تم میری بات سمجھ لو جوئے، اس آدمی کے قتل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ مرگیا لیکن مجھے یہ طریقہ پسند نہیں ہے اور نہ ہی میرے آدمی اتنے احمق ہیں کہ میرے علم میں لائے بغیر اتنی بڑی واردات کریں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔''

''ٹھیک ہے لوئی، مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔''

''یہ میرے حق میں اچھا ہے لیکن اب ایک اور مسئلہ ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یوکلوف بھی یہ بات سمجھ جائے کہ میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں۔ ممکن ہے کہ اس نے خود ہی اپنے آدمی کو مروا دیا ہو تو ایسی صورت میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا لیکن اگر اس نے ایسا نہیں کیا اور وہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے اس شخص کو قتل کروایا ہے تو وہ ہمارے پیچھے ضرور آئے گا اور فرض کرو کہ میں اس سے مقابلے کی تیاری کرتا ہوں اور اسے اس کا علم ہوجاتا ہے تو وہ اس تیاری کو اس بات کا ثبوت سمجھے گا کہ میں نے ہی اس کے آدمی کو قتل کروایا ہے۔ تم میری پوزیشن سمجھ رہے

ہو؟''

ریزو سوچتے ہوئے بولا۔ ''اگر اس قتل کے پیچھے یوکلوف کا ہاتھ ہے تو وہ چپ رہے گا لیکن مجھے شک ہے کہ اس نے ایسا کیا ہوگا اور میرے پاس ایسا سمجھنے کی وجہ بھی ہے۔ یہ کسی ناتجربہ کار شخص کا کام ہے لیکن اگر یہ کسی اندرونی شخص کی حرکت ہے تو یوکلوف اسے ہرگز نہیں چھوڑے گا اور اپنے طور پر انصاف کرے گا۔ اگر ہمیں کسی روسی یا البانوی شخص کی سرکٹی لاش ملی تو ہم اس کیس کو بند کر سکتے ہیں لیکن فی الحال جہاں تک میں سمجھ رہا ہوں۔۔۔۔ یہ کسی ناتجربہ کار آدمی کی حرکت ہے۔''

لوئی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس کے کسی آدمی نے اپنے طور پر یہ کارروائی کی ہے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ یوکلوف اسے پاگل پن یا غیر ارادی فعل سمجھے گا اور اپنے نام نہاد انصاف کے مطابق اس کا فیصلہ کرے گا لیکن اگر اس نے میرے ٹھکانے کا رخ کیا اور میرے آدمیوں کو نقصان پہنچایا تو ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ یہاں نہیں رہ سکے گا۔ اسے ماسکو واپس جانے دو۔ وہ وہاں کا حکمران بننا چاہتا ہے۔''

ریزو اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ گریگ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ''ٹھیک ہے لوئی۔'' ریزو نے کہا۔ ''معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔ میں یوکلوف تک تمہارا پیغام پہنچا دوں گا کہ تم یا تمہارے کسی ساتھی نے اینٹی یوف کو قتل نہیں کیا اور اسے سمجھاؤں گا کہ ہماری تفتیش مکمل ہونے تک وہ صبر سے کام لے۔''

لوئی بھی کھڑا ہوگیا پھر وہ گھوم کر میز کے دوسری طرف آیا اور اس نے ریزو کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب جوئے، تم پولیس کے لیے بالکل مناسب ہو۔''

اس نے رسماً گریگ کو بھی سرخم کر کے الوداعی اشارہ دیا پھر دونوں سراغ رساں اس سے رخصت ہو کر باہر سڑک پر آ گئے جب وہ اپنی کار کے پاس پہنچے تو گریگ نے کہا۔

''مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب میں تمہیں لوئی جیسے لوگوں سے بات کرتے دیکھتا ہوں ورنہ وہ تو پولیس والوں کو قریب نہیں آنے دیتا۔''

ریزو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ یوکلوف سے کل ملیں گے۔''

اولیگ یوکلوف کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا بدن مضبوط اور گٹھا ہوا تھا اور وہ جسمانی طور پر کافی طاقتور دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی ملاقات برائٹن بیچ کے علاقے میں واقع ایک بار میں ہوئی جہاں اس نے اپنا چھوٹا سا دفتر بنا رکھا تھا۔

''کیا وہ اطالوی اتنا رعایت یافتہ ہے کہ وہ دو پولیس والوں کو پیغام رساں کے طور پر بھیج سکتا ہے؟''

ریزو نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ یوکلوف کے مخبر لوئی کے آس پاس موجود ہیں اور اس کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں تاہم اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے بات کرو اولیگ۔ یہاں کوئی بھی پیغام رسانی نہیں کر رہا۔ وکٹر اینٹی یوف مر چکا ہے اور ہم اس کے نتائج سے واقف ہیں۔ لہٰذا ہمیں کھل کر بات کرنی چاہیے۔ تمہارے پاس یہ یقین کرنے کی معقول وجوہات ہیں کہ لوئی نے تمہارے آدمی کو قتل کروایا ہے لیکن ہم نے اپنے طور پر تحقیق کر لی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لوئی بے گناہ ہے۔ دیگر امکانات کیا ہو سکتے ہیں، یہ سوچنا تمہارا کام ہے اور شاید اس سلسلے میں تم نے کچھ کیا ہو اور اگر نہیں تو ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں تاکہ لڑائی کی نوبت نہ آئے اور ہم سب ایک بڑی مشکل سے بچ جائیں۔''

یوکلوف کے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہوگئیں۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''وکٹر میرے لیے بھائیوں جیسا تھا اور ریکارڈ کی درستگی کے لیے یہ نوٹ کر لو کہ میں عام قاتل نہیں ہوں اور اگر ہوتا تب بھی وکٹر کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا مجھے تو معاف ہی رکھو لیکن میں ابھی تک تمہارے آنے کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ کیا تم مجھ سے کسی اعتراف کی امید رکھتے ہو؟''

اب گریگ کے بولنے کی باری تھی۔ ''دیکھو یوکلوف! ہمیں اس معاملے کو یہیں ختم کر دینا چاہیے۔ ہم یہاں اسی مقصد کے لیے آئے ہیں۔ دراصل ہم لمبی چوڑی کاغذی کارروائی سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لوئی اس معاملے میں بے قصور ہے۔ چاہے تم یقین کرو یا نہیں لیکن اگر تم نے اس سے الجھنے کی کوشش کی تو وہ بھی پلٹ کر جوابی کارروائی کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو وہ بروکلین میں اتنے روسی مار دے گا جتنے اسٹالن نے سائبیریا میں بھی نہیں مروائے ہوں گے۔ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔ مستقبل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ہم ابھی حال کی بات کر رہے ہیں۔ تمہارا گروپ بہت چھوٹا ہے اور لوئی کو تم پر سبقت حاصل ہے۔ تمہارے ایک آدمی کے مقابلے میں اس کے پاس بیس آدمی ہیں اور وہ تمہارے مقابلے میں زیادہ ہوشیار اور تربیت یافتہ ہیں۔ تم خود اندازہ لگا سکتے ہو۔''

''مجھے بھی یہی کہنا ہے۔'' ریزو نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''میرے ساتھی کی بات میں وزن ہے اگر تم نے لوئی سے لڑائی کی تو ہار جاؤ گے۔ جیت اسی کی ہوگی۔''

یوکلوف کرسی سے ٹیک لگا کر سوچنے لگا پھر بولا۔ ”مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دو۔ زندگی ایک ریلے ریس کے مانند ہے۔ تم اپنے باپ سے ڈنڈا پکڑتے ہو۔ وہ مر جاتا ہے تو تم اسے لے کر کچھ عرصہ دوڑتے رہو پھر اپنی اولاد کے حوالے کر دیتے ہو لیکن کبھی کنارے پر بیٹھ کر یہ نہیں دیکھتے کہ کون جیت رہا ہے۔ نہیں، تم دوڑتے رہتے ہو۔ یہاں کوئی آخری لکیر نہیں۔ کوئی سونے کا تمغا نہیں۔ کوئی فاتح نہیں۔ دوڑ جاری رہتی ہے اور اس کی کوئی منزل نہیں۔ اس دوڑ میں کوئی نہیں جیتے گا۔ نہ میں نہ لوئی اور نہ ہی تم۔ لہٰذا مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو کہ کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ وکٹر کا قتل لوئی کے آدمیوں یا اس نے خود کیا ہے تو خدا کی قسم، میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔“

وہ اپنی میز کی طرف جھکا۔ اس کی سرد سیاہ آنکھیں باری باری ریزو اور گریگ کو دیکھ رہی تھیں۔ ”میں نے وکٹر کو نہیں مارا، اور نہ ہی مجھے اس کا اختیار تھا، اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ کون اس کا ذمے دار ہے تو اسے اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں لوئی پر نظر رکھوں گا اور تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

واپسی میں گریگ گاڑی چلا رہا تھا اور ریزو اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ گریگ نے کہا۔ ”یہ دونوں جنگ شروع کرنے کے لیے اینٹی یوف کی موت کو بہانہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ میرا خیال ہے کہ ان دونوں میں سے ایک جھوٹ بول رہا ہے۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔ تم نے وہ لاشیں دیکھی ہوں گی جو یوکلوف سڑکوں پر چھوڑ دیتا ہے۔ ان کے سر میں کئی گولیاں ماری جاتی ہیں۔ وہ سینے میں ایک گولی مارنے پر اکتفا نہیں کرتا اور لوئی تو کوئی لاش سڑک پر چھوڑتا ہی نہیں۔ وہ اسے کتے کی خوراک کے ڈبوں میں بند کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی لاش مل جائے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی پیغام بھیج رہا ہے۔ ہم ایک عرصے سے ان لوگوں کی کارروائیاں دیکھ رہے ہیں۔ اینٹی یوف کو کسی گروہ نے نہیں مارا۔ یہ کسی کا انفرادی فعل ہے۔ اگر ہم قاتل کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک بڑی جنگ سے بچ جائیں گے۔“

”یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ بدمعاشوں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ اس قتل کا محرک کچھ اور ہے۔“

”زیادہ امکان یہی ہے۔ اگر اینٹی یوف کی کسی اور گروپ ممبر سے ذاتی عداوت تھی تب بھی کوئی اسے قتل کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ وہ یوکلوف کے لیے بہت قیمتی اور اس کے بے حد قریب تھا۔“

”کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا۔“ گریگ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس بات کی بالکل پروا نہیں کہ اس بدمعاش کو کس نے قتل کیا۔ اب ہم اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس کیس کی فائل بند کر کے ہم اپنا وقت اس لٹیرے کو پکڑنے میں صرف کریں جو سوشل سیکیورٹی کے چیک ملنے والے دن بوڑھی عورتوں کو لوٹتا ہے۔“

”میں تم سے متفق ہوں لیکن ہمیں اندازہ تو لگانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہم اسے ثابت نہ کر سکیں لیکن اندازہ تو لگا سکتے ہیں۔ میری چھٹی حس آگے بڑھنے پر اکسا رہی ہے۔ ہم جلد ہی اس لٹیرے کو بھی پکڑیں گے لیکن میں کم از کم دو دن اس کیس کو اور دینا چاہتا ہوں۔“

گریگ نے کندھے اچکائے اور ایکسلیریٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے تم جو مناسب سمجھو وہی کرو لیکن مجھے اُمید ہے کہ تمہارے پاس کوئی پلان ہوگا۔“

”ہاں، ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ حملہ نہیں بلکہ قتل ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہر قتل کا کوئی محرک ہوتا ہے۔ یقیناً اینٹی یوف کے بے شمار دشمن ہوں گے لیکن وہ دشمنی ان کے کام کے حوالے سے ہوگی۔ اگر ہم اولیگ اور لوئی کی تردید کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ بات خارج از امکان ہے کہ کسی حریف بدمعاش نے اسے قتل کیا ہوگا۔ کوئی بدماش اوپر والوں کی اجازت کے بغیر یہ قتل نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔“

”پھر۔“ گریگ نے کہا۔ ”کیا ہمیں اس کی ذاتی زندگی میں جھانکنا ہوگا؟“

”بالکل ٹھیک، اور تم جانتے ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔ ہمیں اس کی بیوی سے شروع کرنا ہوگا۔“

ریزو کی نظر ایک فون بوتھ پر گئی۔ اس نے کہا۔ ”گاڑی روکو۔ مجھے ایک فون کرنا ہے۔“

چند منٹوں بعد وہ واپس آ گیا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق موت کی وجہ وہ گولی ہے جو سینے کو چھیدتی ہوئی اوپر کی جانب گئی اور اس نے شہ رگ کو نقصان پہنچایا۔ اس واردات میں اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور استعمال ہوا۔ گولی کا خول بھی نکال لیا گیا ہے اور اگر پستول مل جائے تو بہ آسانی اس کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ موت کا وقت منگل کی شام ساڑھے سات اور بدھ کی صبح ساڑھے سات بجے کے درمیان ہے۔“

”اس رپورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے ہمیں

مددل سکے۔" گریگ نے کہا۔

"نہیں۔"

"کیا اب ہمیں اس کی غمزدہ بیوہ کے پاس جانا چاہیے؟" ریزو نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، ہمیں بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔"

مسز یولیا اینٹی یوف کی عمر انتیس برس تھی۔ اس کے دو بچے تین اور پانچ سال کی عمر کے تھے۔ وہ سنجیدگی سے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ رسمی اظہارِ تعزیت کے بعد ریزو نے قدرے دھیمے لہجے میں سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"تم نے آخری بار اپنے شوہر کو کب دیکھا؟"

"اس کی لاش ملنے سے ایک دن پہلے سہ پہر تین بجے۔"

"تمہاری اس سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟"

"یہیں اپنے گھر میں۔"

"کیا وہ کہیں جانے کی تیاری کررہا تھا؟"

"ہاں، اپنے کام پر۔" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "وہ امیر لوگوں کو لانے لے جانے کے لیے لیموزین کار چلاتا تھا۔"

"ہم اس کے کام کے بارے میں جانتے ہیں۔ کیا تم نے اس کے بعد یا رات میں کسی وقت اس سے بات کی؟"

"نہیں۔"

"کیا یہ غیر معمولی بات نہیں تھی؟"

"نہیں، وہ گاڑی چلاتے وقت بہت مصروف ہوتا تھا۔"

"تم منگل کی سہ پہر تین بجے سے لے کر لاش کی اطلاع ملنے تک کہاں تھیں؟"

"یہیں اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ۔"

"کیا تم اس دوران گھر میں اکیلی رہیں؟"

"نہیں، میرا بھائی یہاں تھا۔"

"تمہارا بھائی؟ وہ کون ہے؟"

"لیو کروپن۔ وہ میرا بھائی ہے۔"

"اس کی کیا عمر ہوگی؟"

"تیس سال۔"

"وہ کس وقت آیا اور کتنی دیر یہاں رہا؟"

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنی نظریں دیوار پر جمادیں۔ "وہ شام ساڑھے چھ بجے آیا تھا۔ ہم نے رات کا کھانا ساتھ ہی کھایا۔ پھر ٹی وی سیریز فریزر دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ٹی وی پر خبریں دیکھیں۔ لیو یہیں کاؤچ پر لیٹ گیا۔ میں نے اس پر کمبل ڈالا اور گیارہ بجے سونے چلی گئی۔ میرا خیال تھا کہ وکٹر کے آنے پر لیو اپنے گھر چلا جائے گا لیکن وکٹر رات بھر گھر نہیں آیا۔"

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ تمہارا بھائی یہاں سے کب گیا؟"

"اگلے روز صبح سات بجے۔ اسے ساڑھے سات بجے اپنی دکان کھولنی ہوتی ہے۔"

"کیا تم نے رات گیارہ اور صبح سات بجے کے درمیان اسے کسی وقت دیکھا؟"

"ہاں نصف شب کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ میں سیڑھیاں اتر کر وکٹر کو دیکھنے نیچے آئی لیکن وہ اس وقت تک نہیں آیا تھا البتہ لیو کاؤچ پر سو رہا تھا۔"

ریزو تمام باتیں اپنی نوٹ بک میں لکھ رہا تھا۔ اس نے لیو کروپن کے گھر اور کاروبار کے متعلق بھی تفصیلات نوٹ کیں پھر یولیا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"تمہارا گھر خاصا گرم ہے؟"

"ہاں، وکٹر ہمیشہ گھر کو گرم رکھنا چاہتا تھا۔"

"لیکن تم نے پوری آستین کا بلاؤز پہن رکھا ہے۔" ریزو مسکراتے ہوئے بولا۔ "شاید تم چھوٹی آستینوں والے بلاؤز میں زیادہ آرام دہ محسوس کرتیں۔"

گریگ نے کہا۔ "میرا دس سالہ بیٹا فٹ بال کھیلتا ہے۔ چند ہفتے قبل اس کے چہرے پر گیند لگ گئی تاہم دو ہفتے بعد اس کا زخم ٹھیک ہوگیا لیکن کئی دنوں تک اس کا چہرہ تمہارے جیسا نظر آتا رہا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے بائیں رخسار کی ہڈی بدرنگ ہورہی ہے۔ تم فٹ بال تو نہیں کھیلتیں؟"

"نہیں۔" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیا کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟" ریزو نے پوچھا۔

"نہیں، کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ کیا مزید کچھ پوچھنا باقی ہے؟ مجھے اپنے بچوں کو بھی دیکھنا ہے۔"

"بس دو سوال اور......" گریگ نے کہنا شروع کیا۔

"نہیں، اتنا ہی کافی ہے۔" ریزو بولا۔ "ہم بعد میں بھی آسکتے ہیں۔"

دفتر واپس آنے کے بعد اس نے 61 ویں ڈیٹیکٹیو اسکواڈ کو فون کیا۔ دوسری جانب سارجنٹ مور نے فون اٹھایا۔ "کہو کیا بات ہے سارجنٹ ریزو؟"

"مجھے وکٹر اینٹی یوف کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں۔ وہ تمہارے علاقے میں رہتا تھا۔ تم اپنا ریکارڈ دیکھ کر بتاؤ کہ اس گھر سے گھریلو تشدد کی کوئی اطلاع تو نہیں ملی؟"

"میں کیسے چیک کرسکتا ہوں جب تک صحیح تاریخیں اور وقت معلوم نہ ہو لیکن اینٹی یوف خاصا مشہور ہے۔ ہم سب اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے گھر سے ایسی کوئی شکایت نہیں

آئی لیکن کوئی آئی لینڈ اسپتال سے تین چار فون ضرور آئے تھے۔ ایک سپروائزر یہ فون کیا کرتا تھا۔ ہم نے دو مرتبہ اس کے خلاف اپنی بیوی کو مارنے کے الزام میں کارروائی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی بیوی نے ذاتی طور پر کبھی شکایت نہیں کی اور ہمیشہ یہی کہا کہ وہ گر گئی تھی یا چلتے ہوئے پھسل گئی۔ بائی دا وے اسے کس نے قتل کیا؟ لوئی یا اولیگ؟"

ریزو مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ تمہاری مدد کا شکریہ۔"

اس نے فون بند کیا اور گریگ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "زبردست۔"

گریگ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس کی بیوی کے چہرے پر زخم دیکھے تھے۔ ایک اس کی دائیں آنکھ کے اوپر اور دوسرا ٹھوڑی پر تھا پھر اس نے پوری آستین کا بلاوز پہن رکھا تھا۔ شاید ہاتھوں اور بازوؤں پر پڑے نیل چھپانے کے لیے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کے بھائی سے بھی ملنا چاہیے۔" ریزو نے پُرخیال انداز میں کہا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی سراغ رساں انجیلا پالسن آگئی۔ "جوئے، میں نے کروپن کے بارے میں مطلوبہ معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس نے دو سال پہلے پستول کا لائسنس حاصل کیا تھا اور وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ نقد کاروبار کرتا ہے اور اس کے علاقے میں لوٹ مار کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔"

ریزو نے اس کے ہاتھ سے کاغذات لے لیے اور پوچھا۔ "اس کے پاس کون سا ہتھیار ہے؟"

"مجھے اندازہ لگانے دو۔" گریگ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور۔"

ریزو نے کاغذات پر نظر ڈالی اور بولا۔ "ہاں، اسمتھ اینڈ ویسن ماڈل تھرٹی سکس۔"

انجیلا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "یہ تو لڑکیاں استعمال کرتی ہیں۔"

ریزو مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہی ریوالور ہمیں قاتل تک لے جائے گا۔"

☆☆☆

لیو کروپن انٹرویو روم میں لکڑی کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ریزو اور گریگ اس کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ گریگ اس کے کان کے پاس جھکتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ کسی نے دکان سے تمہارا پستول چرا لیا۔ کوئی ڈکیتی نہیں ہوئی اور نہ ہی چھینا جھپٹی۔ ایک شخص دکان میں داخل ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ چند درازیں کھولیں اور پستول لے کر چلا گیا۔ یہی تمہاری کہانی ہے؟"

"ہاں...... ہاں، وہ چوری ہو گیا۔"

"لیکن تم نے اس کی رپورٹ درج نہیں کرائی؟"

"ہاں، پریشانی سے بچنے کے لیے۔ ماسکو میں پولیس......"

ریزو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ بروکلین ہے لیو۔ میں ماسکو کے بارے میں نہیں جانتا لیکن یہاں کی پولیس فوراً جھوٹ پکڑ لیتی ہے۔"

"تم اس رات کہاں تھے جب تمہارے بہنوئی کا قتل ہوا؟" گریگ نے سختی سے پوچھا۔

"میں...... میں اپنی بہن کے گھر پر تھا۔ میں وہاں ساڑھے چھ بجے پہنچا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ ٹی وی دیکھا۔ خبریں سنیں پھر میں سو گیا۔ دوسری صبح سات بجے میں گھر سے چلا گیا تاکہ ساڑھے سات بجے دکان کھول سکوں۔"

گریگ نے ایک کرسی کھینچی اور کروپن کے سامنے بیٹھ گیا۔ "تم یہ بتانا بھول گئے کہ کھانے میں چکن اور کارن تھا اور یہ کہ تم نے ٹی وی پر فریزر، دیکھی۔ لگتا ہے کہ تمہیں اسکرپٹ یاد نہیں رہا۔"

کروپن کو پسینے آنے لگے۔ ریزو نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں میں ہلکا سا رعشہ آگیا ہے اور گردن کی رگیں ابھر آئی ہیں۔ وہ تھوڑا سا آگے جھکا اور دونوں بازو باندھ لیے۔

ریزو نے ذہن میں ایک مفروضہ ترتیب دیا اور بولا۔ "ہم جانتے ہیں کہ کیا ہوا۔ تم اپنی بہن کو پٹتے دیکھ کر تنگ آچکے تھے اور تمہارا اینٹی یوف سے جھگڑا بھی ہوا۔ اس نے تمہیں خاموش رہنے کے لیے کہا اور دھمکی دی کہ وہ تمہیں بھی مار سکتا ہے۔ تم وہاں سے چلے گئے۔ اپنا پستول نکالا، اس کا پیچھا کیا اور اسے گولی مار دی۔"

"نہیں۔" کروپن چلّایا۔ "میں شریف آدمی ہوں۔ جرائم پیشہ نہیں۔ مجھے یہاں کی شہریت لیے پانچ سال ہو گئے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ لیکن میری بات غور سے سنو۔ ابھی میں نے صرف وہ بتایا ہے جو ہم جانتے ہیں اور اب میں وہ بتاؤں گا جو ہم ثابت کر سکتے ہیں۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ تمہاری بہن روز روز کی مار پیٹ سے تنگ آچکی تھی۔ اس نے تمہیں فون کر کے بلایا اور تم پستول سمیت چلے آئے۔ تم اس کے بچوں کے پاس بیٹھے رہے اور اس نے

اینٹی یوف کو قتل کر دیا۔ گو کہ ہم جانتے ہیں کہ اس میں تمہارا ہاتھ ہے لیکن اس نے یہ جرم اپنے سر لے لیا۔"

پھر وہ گریگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا کوئی شریف آدمی یہ حرکت کر سکتا ہے؟"

"نہیں۔" گریگ بناوٹی صورت بناتے ہوئے بولا۔

"یہ وہی کارروائی ہے جو کوئی بدمعاش کر سکتا ہے۔" پھر وہ کھڑا ہو گیا اور ایک بار پھر کروپن کے کان کے قریب جھکتے ہوئے بولا۔ "تم یا تمہاری بہن۔ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہتر ہے کہ تم سچ سچ بتا دو۔"

ایک بج کر دس منٹ پر کروپن نے اپنا اعترافی بیان ریکارڈ کروایا۔ اس انٹرویو کے دوران جو سوال جواب ہوئے وہ کچھ یوں تھے۔

"اس رات تم پستول لے کر کیوں پھر رہے تھے؟"

"میرے پاس اسے اسٹور میں رکھنے کا اجازت نامہ ہے لیکن میں ہر رات حفاظت کے خیال سے گھر جاتے وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔"

"اب وہ پستول کہاں ہے؟"

"جمیکا بے، میں نے بدھ کی رات اسے وہاں پھینک دیا تھا۔"

"تمہاری کب اور کیسے اینٹی یوف سے ملاقات ہوئی جس رات اسے گولی لگی؟"

"میں بہن کے گھر سے نکل کر کافی پینے گیا تھا؟"

"کس وقت؟"

"میں گیارہ بجے بہن کے گھر سے چلا گیا تھا۔"

"یعنی تم اس کے گھر میں کاؤچ پر نہیں سوئے جیسا کہ تم نے ہمیں پہلے بتایا تھا۔"

"نہیں، میں کافی پینے گیا تھا۔ وہ جگہ 65ویں اسٹریٹ پر ہے۔ جب میں باہر آیا تو میری نظر وکٹر پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا ڈبا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ہمارے درمیان ہلکی سی جھڑپ ہو گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مجرم ہو۔ تم بیوی کو مارتے ہو، اس پر وہ مشتعل ہو گیا اور بولا۔ "تم بزدل ہو۔ اگر کوئی میری بہن کو مارے تو میں اس کا گلا کاٹ دوں اور اس کا خون شراب کی طرح پی جاؤں لیکن تم...... تم بزدل ہو۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"اس نے کہا کہ میرے ساتھ آؤ اور ثابت کرو کہ تم بزدل نہیں ہو۔ اگر مرد ہو تو مجھ سے مقابلہ کرو ورنہ بزدلوں کی طرح چلے جاؤ۔ میں تمہاری بہن کو مارتا رہوں گا اور تم خاموشی سے دیکھتے رہو گے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"وہ سڑک پار کر کے گلی میں چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا غصے سے کانپتا رہا۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن وکٹر بہت مضبوط اور سخت جان تھا۔ اس کے دل میں رحم نہیں تھا۔ اس لیے میں خوف زدہ ہو گیا پھر میں نے پستول کی موجودگی محسوس کی۔ میں گلی میں چلا گیا۔ جیب سے پستول نکالا اور اس کا نشانہ لے لیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسا اور زمین پر تھوکتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے لیے ہے۔ اب میں تم سے یہ پستول چھین لوں گا اور اس سے تمہیں کتوں کی طرح ماروں گا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"میں نے اسے گولی ماردی اور وہاں سے بھاگ گیا۔"

☆☆☆

ریزو نے فون بند کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وکٹر کے قتل کو دس روز ہو چکے تھے۔ وہ چلتا ہوا گریگ کی میز پر آیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ابھی ہاربر یونٹ کے باس نے بتایا ہے کہ اس کے غوطہ خوروں کو پندرہ فٹ گہرے پانی میں عین اسی جگہ جو کروپن نے بتائی تھی، ایک اسمتھ اینڈ ویسن ماڈل چھتیس کا ریوالور ملا ہے۔"

"انہوں نے اس کا سیریل نمبر بھی دیکھا ہوگا؟"

"ہاں، یہ ریوالور یقینی طور پر کروپن کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اس میں سے ایک گولی چلائی گئی ہے۔"

"وہ اعتراف تو کر ہی چکا ہے۔ ریوالور کے پلاسٹک تجزیے کے بعد پکا ثبوت مل جائے گا۔"

"ہاں لیکن اگر کوئی اچھا وکیل مل جائے تو کروپن اپنے دفاع میں کہہ سکتا ہے کہ اس سے یہ قتل غیر ارادی طور پر سرزد ہوا۔ بہرحال اسے اینٹی یوف نے دھمکی دی تھی جو ایک خطرناک مجرم تھا۔"

"ایسی صورت میں اسے پانچ سال کی سزا ہوگی اور وہ پیرول پر رہا ہو جائے گا۔"

"مجھے ڈر ہے کہ جیل سے باہر آنے کے بعد وہ کسی نامعلوم گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔" ریزو نے فکرمندی سے کہا۔ "اولیگ یوکلوف اپنے آدمی کے قاتل کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔"

"کون جانے اس وقت تک وہ زندہ بھی رہتا ہے یا نہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی ہے۔"

"بہرحال مجھے ایک بات کی خوشی ہے۔" ریزو بولا۔ "وکٹر جیسے بدمعاش کو قتل کر کے کروپن نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بزدل نہیں ہے۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''سراغ رساں لیفٹیننٹ اینی ریورز حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان ٹیلی وژن کیمروں کو دیکھنے لگی جو اس عظیم الشان ولا میں ہر جگہ نظر آ رہے تھے۔

''کیا تم نے 'روم میٹس آفٹر آورز' نامی ریئلیٹی شو کبھی نہیں دیکھا؟' سراغ رساں اینی کے پارٹنر سارجنٹ مائیکل نے پوچھا۔

''نہیں۔ مجھے ان نام نہاد ریئلیٹی شوز سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔''

''یہ تو بہت بُرا ہے۔'' سراغ رساں کے عقب سے ایک آواز اُبھری۔ ''ہمارا شو ہر ہفتے ٹاپ فائیو میں شامل ہو رہا ہے۔''

سراغ رساں اینی آواز کی سمت گھوم گئی۔

سامنے سانولی رنگت والا ایک دراز قامت شخص موجود تھا۔ جس نے گہرے رنگ کی ایک ڈھیلی ڈھالی پتلون اور کھلے کالر کی ایک ڈریس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

''میں اس ریئلیٹی شو کا پروڈیوسر ٹوڈ گڈ مین ہوں۔'' اس دراز قامت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ہی تم لوگوں کو فون کیا تھا۔''

لیفٹیننٹ اینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تم نے فون پر بتایا تھا کہ تمہارے شو کے افراد میں سے ایک فرد غائب ہے۔''

''اس کا نام سینڈی کارلسن ہے۔'' ٹوڈ گڈ مین نے کہا۔

''وہ کل سہ پہر ولا سے نکلی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔''

''ولا سے نکلی تھی؟'' لیفٹیننٹ اینی نے قدرے حیرانی سے کہا۔ ''میں سمجھی تھی......''

''ہمارا شو دیگر شوز سے قطعی مختلف ہے۔'' پروڈیوسر نے سراغ رساں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنے مقابلے میں حصہ لینے والوں کو دنیا سے کاٹ کر اپنے شو تک محدود نہیں رکھتے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام کاج پر چلے جاتے ہیں، ڈیٹس پر بھی باہر نکلتے ہیں اور اپنی نارمل زندگی بسر کرتے ہیں۔ البتہ شام ڈھلنے کے بعد یہاں واپس آ جاتے ہیں اور پھر ہمارے کیمرے چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔''

''اور تم چاہتے تھے کہ مس سینڈی کارلسن تمہارے شو میں لوٹ آئے...... کیوں؟'' سراغ رساں اینی نے پوچھا۔

''سینڈی ہمارے شو کی مستقل حصہ لینے والی وہ ممبر ہے جس سے ہمارے ناظرین نفرت کرنے سے پیار کرتے ہیں۔ وہ منہ پھٹ، ناپسندیدہ اور کائیاں ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے ریئلیٹی شو کے ناظرین کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا ہے اور ہماری ریٹنگ بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کے بغیر ہمارا شو ایک عام سا شو رہ جائے گا۔'' ٹوڈ گڈ مین نے کہا۔

''کن لوگوں کو پتا ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں ہوگی؟''

''شاید ان تینوں کو معلوم ہو جو اس کے ساتھ مقابلے میں حصہ لیتے ہیں۔'' ٹوڈ گڈ مین نے کہا۔ ''وہ تینوں چھوٹے کمرے میں موجود ہیں۔''

لیفٹیننٹ اینی نے پروڈیوسر کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ انہیں اس بڑے وِلا کے عقبی حصے میں بنے ہوئے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک خاتون اور دو مرد بیٹھے ہوئے تھے۔

اپنا تعارف کرانے کے بعد سراغ رساں اینی ان سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میں یہاں اس لیے موجود ہوں کہ تمہارے شو کے شرکاء میں سے ایک سینڈی کارلسن غائب ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم لوگ اس کو تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔''

''میری خواہش تو یہ ہے کہ تم اسے تلاش نہ کر پاؤ۔'' ایک دراز قامت شخص نے کہا۔

''کیوں؟''

''سینڈی خبطی ہے اس لیے۔ وہ ہمارے شو کے دو سابقہ ساتھیوں کو خوف زدہ کر کے یہاں سے چھوڑ کر جانے پر مجبور کر چکی ہے۔''

''ایکسکیوز می؟''

''اسے جب پتا چلا کہ ایک لڑکی مکڑیوں سے مرنے کی حد تک ڈرتی ہے تو وہ ربڑ کی بنی ہوئی ڈھیر ساری مکڑیاں خرید کر لے آئی اور انہیں اس لڑکی کے تکیے، اس کی ڈریسنگ ٹیبل اور اس کے جوتوں میں ڈال دیا۔ وہ لڑکی خوف زدہ ہو کر شو چھوڑ گئی۔''

''یہ بالکل درست ہے۔'' اس گروپ کی خاتون نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے روم میٹس میں سے ایک شخص کو مونگ پھلیوں سے الرجی ہے تو وہ اس شخص کے سامنے پی نٹ بٹر کھانے لگی اور مونگ پھلی کے تیل میں کھانے پکانے لگی۔ وہ شخص اپنی زندگی بچانے کی خاطر شو چھوڑ کر چلا گیا۔ میں سینڈی سے نفرت کرتی ہوں۔ وہ سراسر شیطان اور ستم ایجاد ہے۔''

''اور تم کیا کہنا چاہو گے؟'' سراغ رساں اینی نے دوسرے شخص سے پوچھا۔ ''تمہارا مس سینڈی کارلسن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میرے خیال سے اس شو میں اس کی موجودگی کا واحد جواز یہ تھا کہ پروڈیوسر کو معلوم تھا وہ بڑی ریٹنگ تخلیق کر رہی تھی۔ وہ جتنی پُرآزار اور اذیت ناک تھی تو عرصہ پہلے لوگ اس شو کے مقابلے میں دیگر شوز کو ووٹ دے کر کامیاب کر چکے ہوتے لیکن اس عورت کی چالیں اور پُرآزار شرارتیں ناظرین کو متوجہ کرتی رہیں اور وہ اس شو کی جانب کھنچے چلے آئے۔ اور ریٹنگ میں بہتری کا مطلب ایڈورٹائزرز کے لیے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔''

''کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتی ہوں، پلیز۔'' اینی ریورز نے جاننا چاہا۔

''کیا تم یہ شو نہیں دیکھتی ہو؟'' دراز قامت شخص نے کہا۔ ''جو کوئی بھی ہمارا شو دیکھتا ہے وہ ہمارے ناموں سے واقف ہے۔''

''سوری۔'' سراغ رساں نے شانے اچکا دیے۔

''میں جون میک گریوی ہوں۔'' دراز قامت نے بتایا۔

''اور میرا نام لوسی اوورٹن ہے۔'' عورت نے کہا۔

''اور میں بوب لیرامی ہوں۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

''کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ مس سینڈی کارلسن کہاں ہو سکتی ہے؟''

''وہ ایک پیشہ ور بیچ والی بال پلیئر ہے۔'' لوسی اوورٹن نے کہا۔ ''تم ان ساحلوں کو چیک کرو جہاں وہ اور اس کی ٹیم کے ساتھی پریکٹس کرتے ہیں۔''

''یا پھر ان اسٹورز میں جاؤ جو عملی مذاق والی اشیا یا لطیفے فروخت کرتے ہیں۔'' جون میک گریوی نے بتایا۔ ''وہ اپنا بیشتر وقت اور پیسا ان چیزوں پر خرچ کرتی ہے تاکہ ہمارے ساتھ شرارتیں اور عملی مذاق کر سکے۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتی یا کہاں جاتی ہے۔'' بوب لیرامی نے کہا۔ ''اور مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔ وہ کبھی بھی کوئی اچھی عورت نہیں رہی۔ کوئی بھی اس شو میں اس کا ساتھ دینا پسند نہیں کرتا۔ میری خواہش یہی ہے کہ تم اسے کبھی تلاش نہ کر پاؤ۔''

تب عین اسی وقت سارجنٹ مائیکل نے سراغ رساں اینی ریورز کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

''مجھے اسٹیشن سے ابھی ابھی فون آیا ہے۔'' اس نے سراغ رساں کو بتایا۔ ''سینڈی کارلسن کی لاش شہر کے وسط سے ایک گلی میں پڑی پائی گئی ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔''

''دلچسپ!'' سراغ رساں اینی نے کہا۔ ''ان تینوں افراد سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے یہ سن کر حقیقت میں کوئی حیرانی نہیں ہوئی اور میرے خیال میں ان تینوں میں سے کوئی ایک مس سینڈی کارلسن کی موت کا ذمے دار ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' سارجنٹ مائیکل نے پوچھا۔

تب سراغ رساں اینی، سارجنٹ کو ایک طرف کونے میں لے گئی اور دبے لفظوں میں بتانے لگی۔ ''ان تینوں روم میٹس سے گفتگو کے دوران میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ان میں سے ایک سینڈی کارلسن کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے لیے مسلسل فعل ماضی استعمال کر رہا تھا۔ جیسے کہ اسے معلوم تھا کہ وہ اب زندہ نہیں ہے۔''

''وہ کون فرد ہے؟''

''بوب لیرامی!'' سراغ رساں اینی نے کہا۔ ''جاؤ اسے حراست میں لے لو۔''

موسم

شاکر لطیف

انسان کے مزاج کی طرح موسم کا بھی کوئی اعتبار نہیں... دونوں کا مزاج تغیر پذیر ہے... کبھی روز و شب پر مہینوں ایک ہی رُت... ایک ہی یاسیت آمیز یکسانیت طاری رہتی ہے... یا پھر پل بھر میں وہ اپنا رنگ بدل لیتا ہے... فریبی موسم۔ انسانی فطرت اور موسمِ فطرت کے دلنشیں... دل آویز... اور پُرفریب امتزاج کا یادگار احوال...

موسم کی نذر ہو جانے والے دو کرداروں کی منفرد و دلچسپ داستان.....

راجر سے میرا پہلا تفصیلی تعارف اس وقت ہوا جب ہم دونوں جیل کے کچن میں اکٹھے ہوئے۔ ہماری ڈیوٹی برتن دھونے پر لگائی گئی تھی اور ہمیں اس کام پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی ہم قیدی تھے۔ اعتراض کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے۔ جیل کے ہر قیدی کو کوئی نہ کوئی کام کرنا ہی پڑتا تھا۔ ایک لحاظ سے تو ہم دونوں خوش قسمت تھے کہ ہماری ڈیوٹی کچن میں لگائی گئی تھی۔ ورنہ اگر ہمیں باتھ روم دھونے پر بھی مامور کر دیا جاتا تو ہم کیا کر سکتے تھے۔ راجر بھی میری طرح نوجوان تھا۔ میں نے اس سے کبھی اس کی عمر تو نہیں پوچھی۔ تاہم میرا اندازہ تھا کہ وہ پچیس سے زیادہ کا نہیں ہے۔ مجھے اس جیل میں آئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو چلا تھا جبکہ راجر ابھی نو وارد تھا۔ وہ ایک ماہ پہلے ہی پابندِ سلاسل ہوا تھا۔ اسے منشیات اسمگلنگ کے جرم میں پانچ سال کی سزا ہوئی تھی جبکہ میری سزا اس سے کہیں زیادہ تھی۔

میرا نام الفرڈ ہے۔ میں ایک امریکی شہری ہوں اور امریکا کی ایک جیل میں قتل کے جرم میں بیس سال کی قید کاٹ رہا ہوں۔ راجر امریکی نہیں تھا۔ وہ میکسیکو نژاد تھا اور میکسیکو سے منشیات اسمگلنگ کی کوشش میں امریکی بارڈر پر گرفتار ہوا تھا۔ وہ چوڑے شانوں والا ایک قدآور اور کڑیل جوان تھا۔ چہرے پر ایک طرف زخم کے نشان نے اس کی شخصیت کو خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔ بادی النظر میں وہ ایک غنڈا ہی معلوم ہوتا تھا اور رہی سہی کسر اس کی قدآور اور رعب دار شخصیت نکال دیتی تھی۔

تاہم اس کا اندازِ گفتگو اس کی ظاہری شخصیت کے برعکس خاصا مہذبانہ تھا۔ اگرچہ اسے جیل میں آئے ایک ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا مگر میری اس سے ہیلو ہائے اس وقت شروع ہوئی، جب ہماری ڈیوٹی کچن میں لگائی گئی۔ ہمارے خیالات خاصے ملتے تھے۔ اسی ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے چند ہی دنوں میں ہم گہرے دوست بن گئے۔ ہم دونوں برتن دھونے کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ بھی کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ٹائم بھی اچھا پاس ہو جاتا اور بیزاری کا احساس بھی نہ ہوتا۔

ان دنوں ہمیں ایک ہی لاک اَپ میں بند کیا جانے لگا۔ جس کی وجہ سے گپ شپ کا سلسلہ بھی طوالت پکڑ گیا۔ ہم دونوں ہی خاصے باتونی واقع ہوئے تھے اسی لیے آپس میں خوب جمتی تھی۔ ہم لاک اَپ میں اپنے اپنے بستروں پر دراز ہوتے تو ہمارے درمیان مباحثہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کسی ایک کو نیند نہ آجاتی۔ ہر لاک اپ میں دو قیدیوں کی ہی گنجائش تھی اس لیے ہمارے لاک اَپ میں بھی کوئی تیسرا قیدی موجود نہیں تھا۔

آج بھی ہم اپنے کام سے فارغ ہوئے تو حسبِ معمول شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تمام قیدیوں کو گنتی کے بعد حوالات میں بند کیا جا چکا تھا۔ ہم بھی اپنے لاک اپ میں موجود تھے۔ میں اس وقت اپنے بستر پر بیٹھا تھا جبکہ راجر بھی اپنے بستر پر دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ جیل کی لائبریری سے یہ کتاب اس نے آج ہی جاری کروائی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس... کتاب کا موضوع کیا ہے۔ تاہم کیونکہ وہ بڑے انہماک سے کتاب کے مطالعے میں مگن تھا اس لیے میں نے بھی اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آج موسم میں بھی اچانک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ یکلخت برف باری کا آغاز ہو گیا تھا جس کی وجہ

سے سردی کی شدت میں بھی خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ میں اگرچہ اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا لیکن میں نے بھی لحاف اپنے کندھوں تک اوڑھ رکھا تھا۔ برف باری کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جلد... رکنے والی نہیں......

''یہ موسم نے اچانک ہی اپنی جون تبدیل کر لی ہے۔'' راجر نے کتاب ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے لاک اَپ کے اکلوتے روشن دان سے باہر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ویسے یہ کتاب بھی بدلتے موسموں کے موضوع سے متعلق ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''انسان کی طرح اس موسم کا بھی کوئی اعتبار نہیں کہ کب بدل جائے، ویسے اگر آج میں جیل میں ہوں تو اس میں ان موسم کی مہربانی بھی شامل ہے۔''

''کیا مطلب؟'' راجر نے حیرت سے استفسار کیا۔

ہم دونوں اچھے دوست بن چکے تھے۔ ہمارے درمیان تقریباً مختلف موضوعات پر کھل کر بات چیت بھی ہوتی تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ راجر میرے بارے میں بس اتنا جانتا تھا کہ میں قتل کے جرم میں بیس سال کی سزا کاٹ رہا ہوں اور اس کے بارے میں بھی میری معلومات بس اس حد تک ہی محدود تھیں کہ وہ منشیات اسمگلنگ کے جرم میں پانچ برس کی سزا کاٹ رہا ہے۔ اس سے زیادہ نہ ہم نے ایک دوسرے کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی ہمیں اس کی تمنا تھی۔ اگر آج میں اپنے پکڑے جانے کا تذکرہ نہ کرتا تو شاید آج بھی وہ یہ سوال نہ کرتا۔

''مطلب یہ میرے دوست کہ یہ موسم بھی بڑی عجیب شے ہیں۔ کبھی کبھی اس کی تبدیلی بڑی خوشگوار اور رومان پرور معلوم ہوتی ہے اور کبھی یہی موسم وبالِ جان بن جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ماجرا ہوا تھا۔''

''میں تمہاری کہانی سننا چاہوں گا۔'' میرا جواب سُن کر وہ سنجیدگی اور بے تابی سے بولا۔ ''آج سے پہلے ہماری اس موضوع پر کبھی بات چیت نہیں ہوئی مگر آج میں جاننا

چاہتا ہوں کہ تم قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ کیسے پکڑے گئے؟ اور اس سلسلے میں موسم کو موردِ الزام کیوں ٹھہرا رہے ہو؟''

''تم نے قتل کو ایک بھیانک جرم قرار دیا ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''مگر تم خود بھی منشیات اسمگلنگ کے جرم میں جیل آئے ہو، کیا یہ بھیانک جرائم کے زمرے میں نہیں آتا؟''

''میرا مقصد تمہارا مذاق اڑانا نہیں تھا۔'' اس نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ''میرا تعلق جرم کی دنیا سے ہے اور اس دنیا میں پیسا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جرم کی نوعیت کئی پردوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ جب مقصد دولت کا حصول ہو۔ اگر تمہارا تعلق بھی اسی دنیا سے ہے تو پھر میرا سوال غلط ہے۔ کیونکہ ہماری دنیا میں کسی کو قتل کر دینا عام سی بات ہے۔ اگر تمہارا تعلق جرائم کی دنیا سے نہیں ہے تو پھر میں اس سوال کو کرنے میں حق بجانب ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا، وہ کون سے محرکات تھے کہ تم قتل جیسا اقدام کرنے پر مجبور ہو گئے؟''

''شاید میں ضرورت سے زیادہ اشتعال میں آگیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اسکاٹ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں کا بچپن نیویارک میں گزرا ہے۔ وہاں ہماری گہری دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ میرا ایسا دوست تھا جسے میں اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ میرا کوئی حقیقی بہن بھائی نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ تاہم میں نے بھائی کی کمی ہمیشہ اسکاٹ کو بھائی قرار دے کر پوری کی۔''

''اور تم نے اسی بھائی جیسے دوست کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار ڈالا؟'' راجر نے حیرت سے استفسار کیا۔

''ہاں۔'' میں نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''انسان جب کسی کو دل سے اپنا دوست سمجھتا ہے...... کسی پر حد سے زیادہ بھروسا کرتا ہے تو پھر اعتماد شکنی بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ میں بھی نہیں کر پایا۔ اسی لیے تو میں حد سے زیادہ مشتعل ہو گیا اور اسکاٹ کو جان سے ہی مار ڈالا۔ ہم دونوں کا بچپن نیویارک میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ بچپن کا زمانہ بڑا حسین اور خوب صورت ہوتا ہے۔ کوئی فکر و غم قریب نہیں آتا۔ ہر موسم اچھا لگتا ہے۔ ہم دونوں بھی اپنے بچپن کو خوب انجوائے کرتے تھے۔ ہمارا ساتھ کالج لائف میں بھی برقرار رہا۔ اچھے دوست ہونے کے باوجود میری اور اس کی طبیعت میں بہت فرق تھا۔ میں خاصا جھگڑالو قسم کا انسان تھا اور کالج میں ایک غنڈے کی سی شہرت رکھتا تھا جبکہ اسکاٹ کو میرے برعکس کالج میں ایک مہذب اور شائستہ نوجوان کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اگر اس کی کچھ منفی شہرت تھی بھی تو وہ محض میرے ساتھ گھومنے پھرنے کی وجہ سے تھی۔ اس کا کالج میں جب کبھی بھی کسی سے جھگڑا ہوتا تو وہ میری خدمات ہی حاصل کیا کرتا تھا۔ میں اسے تنگ کرنے والوں کو خوب مزہ چکھاتا تھا۔ میں لڑائی بھڑائی میں طاق تھا اور موقع پر حساب چکتا کرنے کا عادی بھی، اور پھر کوئی اسکاٹ کے ساتھ زیادتی کرے، مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا۔''

''لیکن اس کے باوجود تم نے اسے قتل کر ڈالا؟'' راجر نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہماری دوستی ہی ایسی تھی کہ اس میں اعتماد شکنی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کم از کم میری سوچ تو ایسی ہی تھی۔ اس وقت تک یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اسکاٹ ایک خودغرض اور موقع پرست انسان ہے اور اس کے لیے اصل اہمیت دوستی کی نہیں بلکہ پیسے کی ہے۔ شاید اسی لیے اس نے عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی گولڈ کا بزنس شروع کیا تھا۔ کیونکہ اس بزنس میں تیزی سے پیسا کمایا جا سکتا تھا۔ میں نے بھی اپنا ایک چھوٹا سا بزنس شروع کیا تھا اور اس سلسلے میں شہر کے مرکزی تجارتی حصے میں ایک دفتر بھی بنا لیا تھا۔ میرے والدین وفات پا چکے تھے۔ تاہم وہ میرے لیے خاصی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ اسی لیے میں نے نوکری کے بجائے اپنے والدین کی جائداد بیچ کر کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرا کام بھی ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اس لیے مجھے معاشی طور پر کسی تنگی کا سامنا نہیں تھا۔

''میری بربادی کا آغاز اس وقت شروع ہوا جب میں نے اسکاٹ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے گولڈ کے بزنس میں پیسا انویسٹ کیا۔ ایک دن وہ میرے دفتر آیا اور مجھ سے کہا کہ میں گولڈ کے بزنس میں اپنا پیسا لگاؤں۔ میرا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی کہ میں کسی دوسرے کاروبار میں پیسے لگاتا مگر مشورہ دینے والا اسکاٹ تھا، میرا بچپن کا سب سے عزیز دوست اس لیے میں نے اس کی بات توجہ اور دلچسپی سے سنی۔

''مگر مجھے تو اس بزنس کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔'' اس کی بات سن کر میں نے متذبذبانہ لہجے میں کہا۔

''اس سلسلے میں تم میرے تجربے سے استفادہ حاصل کر سکتے ہو۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''تمہیں بس پیسے انویسٹ کرنے ہیں۔''

''مگر......'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''کیا مجھ پر اعتماد نہیں؟'' اس نے مجھے ٹوک دیا۔

''مجھے تم پر سو فیصد اعتماد ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر تمہاری جگہ کوئی اور یہ آفر لے کر آتا تو میں فوراً انکار کر دیتا مگر تمہیں انکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی میں جاننا چاہوں گا کہ تم گولڈ کو کس قیمت پر خریدو گے اور مجھے کتنا منافع حاصل ہونے کی توقع رکھنی چاہیے۔''

''اگر تم آج پیسے دو گے تو میں آج ہی گولڈ میں انویسٹ کر دوں گا۔'' اسکاٹ نے پرزور لہجے میں کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ آج سے پہلے میں نے تمہیں کبھی گولڈ میں پیسے انویسٹ کرنے کا نہیں کہا۔ کسی نئے کاروبار میں پیسا لگانے والے کے تحفظات تو ہوتے ہی ہیں۔ ہر شخص اپنی رقم کی سیکیورٹی چاہتا ہے۔ میں اس سلسلے میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ تمہاری اصل رقم محفوظ رہے گی اور تم ایک ماہ میں بیس فیصد تک منافع بھی کماؤ گے۔ گولڈ کی قیمتوں میں ایسا پُرکشش اتار چڑھاؤ کبھی کبھی ہی آتا ہے۔ کسی وقت بھی گولڈ کی قیمتوں میں ریکارڈ اضافہ ہو سکتا ہے۔''

ایک ماہ میں بیس فیصد کا سن کر میں وقتی طور پر ششدر رہ گیا۔ میرے اکاؤنٹ میں اس وقت دو لاکھ ڈالر کی خطیر رقم موجود تھی۔ یعنی اگر میں ساری رقم انویسٹ کرتا تو ایک ماہ میں ہی چالیس ہزار ڈالر کما لیتا۔ مجھے اسکاٹ پر پورا بھروسا تھا مگر پھر بھی پیسوں کا معاملہ تھا اس لیے میں اپنی پوری تسلی چاہتا تھا۔

''میرے خیال میں گولڈ کی قیمت کے بارے میں مائیکل کی رائے بھی لی جانی چاہیے۔'' میں نے تجویز پیش کی۔ مائیکل بھی گولڈ کا بزنس کرتا تھا۔ اور اسکاٹ کا گہرا دوست تھا۔ میرا بھی اس سے تعارف اسکاٹ کے توسط سے ہی ہوا تھا۔ اسکاٹ میرے سامنے اکثر مائیکل کی تعریف کیا کرتا تھا۔ بقول اس کے مائیکل کی گولڈ مارکیٹ پر بڑی گہری نظر تھی اور گولڈ کی قیمت کے بارے میں اس کی رائے کم ہی غلط ثابت ہوتی تھی۔ اسے خود بھی مائیکل سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ مائیکل کی صلاحیتوں کا تہِ دل سے معترف تھا۔ اس وجہ سے اکثر میرے سامنے اس کی مداح سرائی کرتا رہتا تھا اسی لیے میں نے مائیکل سے مشورہ لینے کی تجویز پیش کی تھی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اسکاٹ نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ''میں کل اس کے ہمراہ دوبارہ یہاں آؤں گا۔ تم اس سے بات کر کے اپنی مکمل تسلی کر سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا پیسے کمانے کا اس سے نادر موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ میں نے اپنا سارا پیسا... اس وقت گولڈ میں انویسٹ کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے گھر کی ضمانت پر بینک سے لون لے کر بھی اس کاروبار میں لگا دیا ہے۔ اگر اس وقت بھی میں اپنے تمام سودے کلیئر کر دوں تو مجھے پندرہ فیصد خالص منافع حاصل ہو گا۔ مگر میں ابھی انتظار کر رہا ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ سے زیادہ منافع کما سکوں۔'' اسکاٹ کی باتوں میں وزن تھا۔ اس کے دلائل پُراثر تھے۔ میں دل ہی دل میں قائل ہوتا چلا گیا۔ بہرحال میرا فائنل فیصلہ اگلے دن مائیکل کی ملاقات تک ٹل گیا۔ اسکاٹ کافی پی کر رخصت ہو گیا۔

اگلے دن وہ تقریباً بارہ بجے کے قریب مائیکل کے ہمراہ میرے آفس پہنچ گیا۔ مائیکل نے بھی اسکاٹ کی اس بات کی تائید کر دی کہ گولڈ کی قیمت میں ریکارڈ اضافہ متوقع ہے اور اس وقت اس میں پیسا لگا کر بھاری منافع کمایا جا سکتا ہے۔ مائیکل کی تائید کے بعد اب کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ پھر بھی میں اپنے ذہن میں اٹھنے والے کچھ سوالات کے جوابات چاہتا تھا۔

''مگر اس میں تمہارا کیا فائدہ ہو گا؟'' میں نے اسکاٹ سے سوال کیا۔

''میری کمیشن ہو گی۔'' اسکاٹ نے جواب دیا۔ ''بیس فیصد تک منافع تمہارا اور اس سے اوپر ہمارا۔''

''اور اگر بیس فیصد سے زیادہ منافع نہ ہوا تو؟'' میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میں اپنا حصہ وصول نہیں کروں گا، سارا کا سارا پروفٹ تمہارا۔''

''مجھے کتنی رقم انویسٹ کرنی چاہیے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جتنا تمہارے پاس کیش کی صورت میں موجود ہو سب کا سب انویسٹ کر دو۔'' اسکاٹ کے بجائے مائیکل نے میری بات کا جواب دیا۔ ''مال کمانے کا اس سے نادر موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔'' ہونہہ میں نے ہنکارا بھرا۔

اس وقت میرے اکاؤنٹ میں دو لاکھ ڈالر کی رقم موجود تھی۔ اگرچہ مجھے اپنے ذاتی کاروبار کے سلسلے میں بھی کچھ افراد کو رقم ادا کرنا تھی لیکن میرا خیال تھا کہ انہیں ایک دو

ماہ تک آسانی سے ٹالا جاسکتا ہے۔ اسکاٹ اور مائیکل ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ ایسے مواقع روز روز نہیں ملتے۔

''اوکے، میں کل تمہیں دو لاکھ ڈالر کی رقم دے دوں گا۔'' فیصلے پر پہنچتے ہی میں نے اسکاٹ سے کہا۔ ''مگر تم پیسے کیش میں وصول کرنا چاہو گے یا چیک کی صورت۔''

''کیش کی صورت میں۔'' اسکاٹ نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اگرچہ ہم کاروباری افراد عام طور پر ایک دوسرے کو پے منٹ چیک یا پے آرڈر کے ذریعے ہی کرتے تھے اور اس کی یہ ڈیمانڈ مجھے عجیب بھی لگی۔ تاہم میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ویسے بھی جب میں اس پر بھروسا کرتے ہوئے پیسے دینے کی ہامی بھر چکا تھا تو پھر وہ پیسے کیش میں وصول کرتا یا چیک کے ذریعے، مجھے کیا فرق پڑتا تھا۔ اصل اہمیت تو میرے اعتماد اور بھروسے کی تھی۔ اہم بات تو اس کے اور میرے برسوں پرانے دوستی کے رشتے کی تھی۔

اگلے دن میں نے بینک سے رقم نکلوالی اور اسکاٹ مجھ سے آکر رقم لے بھی گیا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا کہ وہ آج شام تک یہ تمام پیسے گولڈ میں انویسٹ کر دے گا۔ میں انٹرنیٹ پر گولڈ کی کرنٹ پرائز دیکھ سکتا ہوں۔ وعدے کے مطابق اس نے شام کو فون کر کے مجھے بتا دیا کہ اس نے کون سے ریٹ پر گولڈ میں پیسا انویسٹ کیا ہے۔ میں نے بھی انٹرنیٹ اور آس پاس کے ایک دو گولڈ ڈیلرز سے گولڈ کی کرنٹ پرائز کنفرم کر لی۔ میرا پیسا کاروبار میں لگ چکا تھا۔ اب مجھے بس ایک دو ماہ کا انتظار کرنا تھا اور پھر بیس فیصد منافع میری جیب میں ہوتا۔

اگلے ایک ہفتے تک میرا اسکاٹ یا مائیکل سے کوئی رابطہ نہ ہوسکا۔ میں اپنے کاروباری معاملات میں الجھا رہا۔ مجھے جن افراد کے پیسے ادا کرنے تھے۔ ان سے بات چیت کر کے دو ماہ کی مہلت بھی لے لی۔ اس دوران میں اس بات سے بھی لاعلم رہا کہ اس وقت گولڈ کی قیمتوں میں کس قسم کا اتار چڑھاؤ جاری ہے؟

میں نے دوبارہ گولڈ کی قیمت کو اس وقت چیک کیا جب ٹی وی پر اس کی قیمت میں ریکارڈ کمی کے بارے میں خبر چلی۔ گولڈ کی کرنٹ پرائز چیک کرتے ہی گویا میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سونے کی قیمت میں ریکارڈ کمی واقع ہو چکی تھی۔ موجودہ ریٹ کو دیکھ کر میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ مجھے پچاس ہزار ڈالر سے زائد کا نقصان ہو چکا ہے۔ میں ایک بزنس مین تھا۔ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ کاروبار کی دنیا میں نقصان اور منافع ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مجھے اتنا نقصان اٹھانے کے بعد بھی اسکاٹ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔ شاید اس سے اور مائیکل سے اندازے کی غلطی ہو گئی تھی۔ تاہم اب میں مزید نقصان اٹھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے اپنا موبائل اٹھایا اور اسکاٹ کا نمبر ڈائل کر دیا تاکہ اسے کہوں کہ وہ میرے گولڈ کے سارے سودے کلیئر کر دے۔ میں اس سے زیادہ رسک نہیں لینا چاہتا مگر اسکاٹ کا موبائل آف جا رہا تھا۔ میں نے مائیکل کا نمبر ملایا۔ تو وہاں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ میں نے جھنجلا کر فون ایک جانب رکھ دیا۔ اب شام ہونے کو آئی تھی۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ اپنی گاڑی پر اسکاٹ کے فلیٹ پر جاؤں مگر باہر ہونے والی ہلکی ہلکی برف باری نے اچانک شدت اختیار کر لی تھی۔

تغیر چاہے موسم کا ہو یا مزاج کا کبھی کبھی وبالِ جان بن جاتا ہے۔ میں نے برف باری کی شدت دیکھتے ہوئے اسکاٹ سے ملاقات کا ارادہ کل تک ملتوی کر دیا۔ کبھی مجھے برف باری کا موسم بڑا اچھا لگتا تھا۔ تاہم آج اسی برفانی موسم نے مجھے گھر میں مقید ہونے پر مجبور کر دیا۔'' اپنی کہانی سناتے ہوئے میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''پھر کیا ہوا؟ کیا اسکاٹ سے تمہاری ملاقات ہوئی؟'' مجھے خاموش ہوتے دیکھ کر راجر نے اپنی محویت سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''اگلے دن میں اسکاٹ کے فلیٹ پر گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ایک دو ہمسایوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ تین دن پہلے اسے ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر کہیں جاتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کے فلیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔ میں نے وہیں سے مائیکل کی رہائش گاہ کا رخ کیا تو وہاں بھی ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ آس پاس کے ہمسایوں سے علم ہوا کہ موصوف چند دن پہلے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ آسٹریلیا نقل مکانی کر چکے ہیں۔

میں مایوس ہو کر اپنے گھر واپس آگیا۔ اس وقت میری ذہنی حالت بڑی عجیب تھی۔ طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے ذہن میں جنم لے رہے تھے۔ اسکاٹ کہاں چلا گیا تھا۔ مائیکل بھی آسٹریلیا جا چکا تھا۔ کیا میرے ساتھ میرے سب سے عزیز دوست نے فراڈ کیا تھا۔ میں جیسے

جیسے سوچتا گیا، میرے شک کو تقویت ملنے لگی۔ یہ ممکن تھا کہ مائیکل کی طرح اسکاٹ بھی کسی دوسرے ملک جا چکا ہو۔ وہ میرے پیسے لے کر فرار ہو چکا تھا۔ میں پولیس کے پاس بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ میرے پاس اسکاٹ کو پیسے دینے کا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ اسکاٹ نے کیش میں رقم کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔

اگرچہ اس نے رقم وصول کرنے کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا مگر وہ میری جھگڑالو فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ جانتا تھا کہ میں اپنی رقم کی وصولی کے لیے کس حد تک جا سکتا ہوں۔ شاید اسی لیے وہ اپنے فلیٹ کو چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ ویسے بھی یہ فلیٹ اس نے کرائے پر حاصل کر رکھا تھا۔

اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ میرے پیسے گولڈ کے کسی کاروبار میں انویسٹ ہی نہیں کیے گئے۔ یہ بس اسکاٹ کی مجھ سے پیسے ہتھیانے کی ایک چال تھی اور مائیکل نے بھی اس سلسلے میں اس کی معاونت کی تھی۔ یہ ممکن تھا کہ حصہ بھی وصول کیا ہو۔

اگلے چند دن تک میں لگاتار اسکاٹ کے فلیٹ کے چکر لگاتا رہا۔ میرے دل میں اب بھی ایک موہوم سی امید باقی تھی کہ شاید میرا شک غلط ثابت ہو۔ شاید اسکاٹ کسی ضروری کام کی وجہ سے کہیں گیا ہو اور واپس آ جائے۔ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ بھلا میرے اعتماد اور بھروسے کو کیسے ٹھیس پہنچا سکتا تھا۔ میں خود کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ تاہم ایک ہفتہ گزرنے کے بعد میری امیدیں بھی دم توڑ گئیں اور سو فیصد یقین آ گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ اسکاٹ نے مجھے میری تمام جمع شدہ پونجی سے محروم کر دیا تھا۔

دو ہفتے یونہی گزر گئے۔ اسکاٹ واپس نہ آیا۔ یہ ویک اینڈ کا دن تھا۔ آج موسم کے تیور ایک بار پھر بدلے ہوئے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو گئی تھی۔ ٹی وی پر محکمۂ موسمیات کی طرف سے آئندہ پانچ چھ گھنٹوں تک شدید برف باری کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ میں امریکا کے شہر نیویارک کا رہائشی تھا اور اس شہر کے باسیوں کے لیے برف باری معمول کی بات ہے۔ بعض اوقات تو اتنی شدید برف باری ہوتی ہے کہ یہاں کے باسی کئی کئی دن تک گھروں میں مقید ہو جاتے...... میں اس وقت اپنے گھر میں ایک آرام دہ صوفے پر براجمان کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی لمحے میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک پڑا۔ نمبر دیکھتے ہی میں نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مائیکل کی کال میرے لیے غیر متوقع تھی۔

''ہیلو مائیکل یہ تم ہو؟'' فون اٹینڈ کرتے ہی میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم اور اسکاٹ اچانک کہاں غائب ہو گئے ہو؟''

''میں آسٹریلیا منتقل ہو چکا ہوں۔'' مائیکل نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''میرے پیسے کہاں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہارے پیسے اسکاٹ کے پاس ہیں۔ اس نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ پیسے گولڈ میں انویسٹ کر رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ گولڈ کی قیمتوں میں کمی کا امکان ہے پھر ہم اس میں سرمایہ کاری کیسے کر سکتے تھے؟''

''تو اسکاٹ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور تم نے بھی اس معاملے میں اس کا ساتھ دیا؟'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''جہاں تک میری بات ہے تو مجھے اس جھوٹ کی قیمت دی گئی تھی۔'' اس نے دیدہ دلیری سے اعتراف کیا۔

''اگر تمہیں قیمت دی گئی تھی تو پھر اب مجھے کیوں مطلع کر رہے ہو؟'' میں نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

''تا کہ تمہیں بتا سکوں کہ یہ ممکن ہے کہ اسکاٹ ابھی بھی نیویارک میں ہی موجود ہو۔ میرے پاس اس کا ایڈریس ہے اور اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ وہ اس پتے پر موجود ہوگا۔''

''تم نے مجھ سے پیسے ہتھیانے میں اس کی معاونت کی اور اب خود ہی مجھے اس کا پتا بھی فراہم کر رہے ہو؟'' اس کی بات سُن کر میری حیرت دو چند ہو گئی۔

''ہاں۔'' مائیکل بولا۔ ''کیونکہ اس نے میرے ساتھ بھی دھوکا کیا ہے۔ اس نے مجھے تم سے حاصل ہونے والی رقم میں سے تیس فیصد حصہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر تم سے رقم لیتے ہی وہ اپنے وعدے سے پھر گیا اور مجھے صرف دس فیصد پر ٹرخا دیا۔ مجھے اس کے اس بلف گیم پر غصہ تو بہت آیا۔ مگر میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے آسٹریلیا منتقل ہونا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے بدلہ لینے کی یہی صورت سمجھ میں آئی کہ میں تمہیں اس کے بارے میں اطلاع کر دوں تاہم یہ بھی بتا دوں کہ تم سے مال بٹورنے کے بعد اس کا ارادہ بھی امریکا چھوڑ کر کسی اور ملک میں سیٹل ہونے کا تھا۔''

''اور اگر وہ بھی جا چکا ہوا تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تو پھر میں تمہاری مزید کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

مائیکل نے جواب دیا۔ ''اس کا یہ ٹھکانا بھی ایک اتفاق کی وجہ سے میرے علم میں آ گیا تھا۔ وہ اس بات سے لاعلم ہے کہ میں اس کی نئی رہائش گاہ کے بارے میں جانتا ہوں۔ ورنہ وہ میرے ساتھ دھوکا دہی کے ارتکاب کے بعد اس خطرے کے پیشِ نظر کہ میں تمہیں اطلاع کر دوں گا وہاں بھی نہ جاتا۔''

''اس کا پتا بتاؤ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور پھر مائیکل کے پتا بتاتے ہی فون کاٹ دیا۔ اس وقت میرے اندر غصے، نفرت اور انتقام کے ملے جلے جذبات کا ایک لاوا سا کھول رہا تھا۔ میرے بچپن کے دوست نے مجھ سے دغا کیا تھا اگر وہ کاروبار میں نقصان کر بیٹھا تھا تو مجھ سے ویسے ہی مدد طلب کر لیتا۔ میں اسے کبھی انکار نہ کرتا۔ میں نے اس کے لیے ہمیشہ اچھا سوچا تھا اور اس نے میرے پُرخلوص جذبات کے جواب میں میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ میرے سامنے بیٹھ کر کس قدر پُراعتماد لہجے میں مجھ سے جھوٹ بولتا رہا، مجھے فریب دیتا رہا۔ میں نے اس پر اندھا اعتماد کرتے ہوئے اسے دو لاکھ ڈالر کی رقم تھما دی اور اس نے میرا برسوں کا اعتماد، بھروسا...... لمحوں میں کرچی کرچی کر ڈالا۔ اگرچہ باہر موسم مزید خراب ہو گیا تھا اور ایسے سرد موسم میں نیویارک کے باشندے گھروں میں مقید رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ برف باری کی وجہ سے بعض اوقات راستے وغیرہ بھی بند ہو جاتے ہیں مگر اسکاٹ کا پتا ملنے کے بعد مجھے موسم کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک آگ سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آناً فاناً اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے بتاؤں کہ الفرڈ کے ساتھ دھوکا کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور جب دھوکا دہی کا ارتکاب کرنے والا اس کا عزیز ترین دوست ہو تو پھر انجام کہیں بھیانک ہو سکتا ہے۔

میں صوفے سے اٹھا، اپنا رین کوٹ پہنا اور پھر دراز سے گاڑی کی چابیاں اور اپنا ریوالور نکال کر گھر سے باہر نکل آیا۔ میں نے گیراج سے گاڑی نکالی اور پھر مائیکل کے بتائے ہوئے پتے کی جانب روانہ ہو گیا۔ ریوالور میں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کر لیا تھا۔ اس وقت میرا ذہن خالی تھا میں نے ریوالور ساتھ لے تو لیا تھا مگر یہ سوچا تک نہ تھا کہ میں اس کا استعمال بھی کر ڈالوں گا۔ میں بس ایک دفعہ اسکاٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے میرے برسوں کے اعتبار کو لمحوں میں چکنا چور کر ڈالا۔ ایک بار بھی نہ سوچا کہ میں نے اس کی خاطر کیا کچھ کیا تھا۔ کالج میں اس کی خاطر کتنے زخم کھائے تھے مگر اسے بھلا میرے مخلصانہ جذبات کی کیا پروا تھی؟ وہ ایک ایسا خودغرض انسان تھا جسے پیسا ہتھیانے کے لیے اپنا عزیز دوست سب سے آسان ٹارگٹ لگا تھا اور اپنی توقع کے عین مطابق وہ مجھ سے رقم اینٹھنے میں کامیاب بھی رہا تھا۔

میں اسکاٹ کے بارے میں جتنا سوچ رہا تھا میرے غصے میں اتنا ہی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس وقت میں مین روڈ پر محوِ سفر تھا۔ یہاں گاڑیوں کا خاصا رش تھا جس کی وجہ سے ٹریفک خاصی سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے مین روڈ سے ٹرن لیا، گاڑیوں کا رش گویا چھٹ سا گیا۔ اگرچہ یہ روڈ خالی تھی۔ تاہم پھر بھی برف باری کی وجہ سے سڑکوں پر پھسلن پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے میں یہاں بھی سست روی سے ڈرائیونگ کرنے پر مجبور تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مزید ڈرائیونگ کے بعد میں مائیکل کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ یہ گھر دوسرے گھروں سے قدرے ہٹ کر واقع تھا۔ میں نے اس گھر پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پھر گاڑی ایک سائڈ پر کھڑی کر کے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی شدید سرد موسم نے میرا استقبال کیا۔ ورنہ گاڑی میں ہیٹر آن ہونے کی وجہ سے زیادہ سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ تاہم دروازے پر لگا تالا دیکھ کر مجھے شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ تو گویا اندر اسکاٹ موجود نہیں تھا۔ شاید وہ بھی امریکا چھوڑ کر جا چکا تھا اور میں بس لکیر پیٹنے کے لیے رہ گیا تھا۔

میں کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے گھر کے دروازے کو تکتا رہا اور پھر کندھے اچکاتا ہوا واپسی کے لیے مڑ گیا مگر جیسے ہی میں اپنی کار میں بیٹھا عین اسی لمحے اسکاٹ کے گھر کے بالکل سامنے ایک ٹیکسی کو رکتے دیکھ کر چونک پڑا۔ ٹیکسی سے ایک شخص برآمد ہوا اور میں نے پہلی ہی نظر میں اسکاٹ کو پہچان لیا۔ اس نے کرایہ ادا کیا اور پھر ٹیکسی سے ایک بڑا سا بریف کیس نکال کر گھر کی جانب بڑھ گیا جبکہ ٹیکسی بھی موڑ کاٹتے ہوئے واپسی کی راہ پر روانہ ہو گئی۔ اسکاٹ کی نگاہ ابھی تک میری گاڑی پر نہیں پڑی تھی۔ اگر پڑی بھی تھی تو اس نے توجہ نہیں کی تھی۔ ویسے بھی میری کار نے اس وقت برف کی سفید چادر اوڑھ لی تھی۔ شاید اسی لیے اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ چکا ہوں۔

موسم اور مزاج کا تغیر بڑی تیزی سے رونما ہوتا ہے۔ انسان پل بھر میں ایسے فیصلے کر گزرتا ہے جن کا عام حالات میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسکاٹ کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میری رگوں میں خون کے بجائے پارا دوڑ رہا ہو۔ مجھے خود پر قابو نہیں رہا تھا شاید غصے کی شدت سے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکالا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کی جانب بڑھ گیا۔

''اسکاٹ!'' اس کے پیچھے جاتے ہی میں نے گرج دار لہجے میں آواز لگائی۔ میری آواز سنتے ہی وہ یوں اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر میرے ہاتھوں میں ریوالور دیکھتے ہی اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

''اسکاٹ! تم نے مجھ سے دھوکا کیا، اپنے بچپن کے دوست سے؟'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس جگہ کا پتا کیسے ملا؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔ وہ میری غیر متوقع آمد کے وقتی جھٹکے سے اب سنبھل چکا تھا۔

''تم ایک ازلی کمینے اور خود غرض انسان ہو۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''تم نے تو میرے ساتھ ساتھ مائیکل کو بھی چکما دے ڈالا؟''

''اوہ۔'' اس کے حلق سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ مائیکل کا نام سن کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

''میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ مائیکل میرے اس ٹھکانے کے بارے میں جانتا ہے۔'' قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''بہرحال اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟''

''میرے پیسے کہاں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔ اس وقت شدید برف باری کی وجہ سے آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اب اپنے ریوالور کا رخ اس کی جانب کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے بشرے پر سراسیمگی کے تاثرات نمایاں ہو گئے تھے اور پھر اس کی گھبراہٹ فطری سی بات تھی۔ ایک تو میرے ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرا وہ میری غصیلی طبیعت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ جانتا تھا کہ میں غصے میں اس پر گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ شاید اسی لیے مجھ سے مصالحت آمیز لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ تاہم مجھے اس کے مفاہمت آمیز لہجے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ میرا پارا مسلسل چڑھتا جا رہا تھا۔

''پیسے میں اپنے ایک عزیز کے پاس فرانس بھجوا چکا ہوں۔ آج میں بھی نیویارک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر فرانس جا رہا تھا مگر مجھے ائرپورٹ سے واپس آنا پڑا کیونکہ خراب موسم کی وجہ سے تمام فلائٹس منسوخ کر دی گئی ہیں۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ موسم بھی بڑی عجیب شے ہے۔'' اس کا جواب سُن کر میں ہذیانی انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ ''شدید برف باری کی وجہ سے میں گاڑی پر ادھر آتے ہوئے اس موسم کو کوس رہا تھا مگر تمہاری باتوں سے پتا چلا کہ اگر آج یہ موسم میری مدد نہ کرتا تو میری تم سے ملاقات ہی نہ ہو پاتی۔ یہ موسم کبھی کسی کے لیے زندگی کی نوید بن جاتا ہے تو کبھی یہی موسم کسی کی موت کا پروانہ بھی بن جاتا ہے۔''

''تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو، بہتر ہے کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔ میں تمہارے ساتھ فراڈ کرنے کا اعتراف کر لوں گا۔'' اس نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا۔ شاید میرے لہجے کی وحشت نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ میں اس وقت کسی بھی لمحے اس پر گولی چلا سکتا ہوں۔

''پولیس۔'' اس وقت مجھے خود بھی اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ ''شاید تم یہ کہتے ہوئے میرے ماضی کو فراموش کر گئے ہو، ورنہ تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ میں اپنا حساب خود چکتا کرنے کا عادی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے یکلخت ٹریگر دبا دیا۔ میرے ریوالور کا رخ اس کے سر کی جانب تھا۔ ٹریگر دبتے ہی ایک زوردار دھماکا ہوا اور میرے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی سیدھا اس کے سر میں پیوست ہو گئی۔ گولی لگتے ہی وہ چاروں شانے چت زمین پر جا گرا۔ سر میں لگنے والی گولی نے اسے تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ وہ چند ثانیوں میں ہی اس دنیا کی رنگینیوں سے ہمیشہ کے لیے بے خبر ہو چکا تھا۔ میں خاموشی سے کھڑا اس کے بے جان جسم کو تکتے جا رہا تھا۔ اسکاٹ مر چکا تھا۔ جب میں گھر سے ریوالور لے کر نکلا تھا تو میرا ارادہ اسے جان سے مارنے کا نہیں تھا۔ میرا اصل مقصد اس سے اپنی رقم واپس حاصل کرنا تھا مگر اس کے جواب نے میرے صبر کے سارے پیمانے لبریز کر دیے تھے اور میں نے اس پر گولی چلا ڈالی۔ انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب اسے خود پر قابو نہیں رہتا۔ شاید میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کر چکا

تھا۔ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہونے لگے تھے۔ مزاج کے تغیر کے نتیجے میں طاری ہونے والی ہیجانی کیفیت آہستہ آہستہ دور ہونے لگی تھی۔ عقل نے کام کرنا شروع کیا تو یہ احساس بھی ہونے لگا کہ میں نے غصے اور اشتعال کے عالم میں کیا کر ڈالا ہے۔ میں ایک امریکی شہری تھا اور اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھا کہ امریکا جیسے ملک میں کسی کو جان سے مار دینے کی کیا سزا ہوسکتی تھی۔ اگرچہ آس پاس ابھی بھی کسی ذی روح کا نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا مگر یہ ممکن تھا کہ دھماکے کی آواز نے کسی کی توجہ اس جانب مبذول کروا دی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ کسی نے پولیس کو بھی اطلاع کر دی ہو۔ وہاں سے فوراً نکل جانا ہی بہتر تھا۔

میں نے ریوالور دوبارہ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور تیزی سے چلتا ہوا اپنی کار میں سوار ہوگیا۔ کچھ ہی دیر میں میں وہاں سے دور جا چکا تھا۔ میں، مین روڈ پر پہنچا تو میرے اعصاب پر چھایا ہوا دباؤ خاصی حد تک کم ہوگیا تھا۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اسکاٹ کی لاش دریافت ہوتے ہی پولیس قاتل کی تلاش میں سرگرداں ہو جائے گی۔ اس وقت مجھے یہی مناسب لگ رہا تھا کہ میں بھی امریکا چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلا جاؤں تاہم اس کے لیے بھی مجھے چند دن تو لگ ہی جاتے اور چند دنوں تک اس بات کا قوی امکان تھا کہ پولیس مجھے ٹریس کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ فوری طور پر ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ میں اپنے فلیٹ پر پہنچوں، اپنا ضروری سامان سمیٹوں اور پھر اس کار پر میکسیکو نکل جاؤں۔ حکومت کی جانب سے میکسیکو آنے جانے کی قانونی اجازت موجود تھی۔ اگر قتل کا عقدہ کھلنے اور پولیس کو میرے بارے میں معلوم ہونے سے پہلے میں امریکی بارڈر کراس کر جاتا۔ تو فوری طور پر امریکی پولیس کی گرفت میں آنے سے محفوظ ہوجاتا اس وقت میری سمجھ میں قانون کی گرفت سے بچنے کا یہی طریقہ آیا تھا اور میں نے اس پر عمل کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا مگر یہ تو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جس موسم نے اسکاٹ کو فرار نہیں ہونے دیا، وہ مجھے بھی نہیں ہونے دے گا۔

میں اس وقت مین روڈ پر کار ڈرائیو کررہا تھا یہاں ٹریفک کا رش تھا۔ میرے آگے اور پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطاریں موجود تھیں۔ پھسلن کی وجہ سے تیز رفتاری ممکن نہیں رہی تھی اس لیے میں بھی مجبوراً سست روی سے کار ڈرائیو کررہا تھا۔ اسی لمحے میرے آگے موجود گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں۔ شاید آگے کہیں ٹریفک بلاک ہوگئی تھی۔ شدید برف باری کی وجہ سے آگے کہیں راستہ بند ہوگیا تھا۔ میرے پاس انتظار کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں پیدل بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ کار کے باہر خون جما دینے والی سردی میری منتظر تھی۔ چھ گھنٹے تک ٹریفک بلاک رہی اور پولیس نے مجھے اسی جگہ سے گرفتار بھی کرلیا۔ کسی نے اسکاٹ کی لاش دیکھ کر پولیس کو اطلاع کردی تھی اور پولیس نے آس پاس کے گھروں میں لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی مدد سے میری گاڑی کو بھی بطور ایک مشتبہ کار مارک کرلیا تھا جس کے بعد میری کار کی تلاش شروع کر دی گئی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرے کوٹ کی جیب سے ریوالور برآمد ہونے کے بعد پولیس کے لیے یہ تعین کرنا مشکل نہیں تھا کہ اسکاٹ کو قتل میں نے ہی کیا ہے۔ یوں میں پکڑا گیا اور آج تمہارے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو راجر بھی مسکرا دیا۔

''گویا موسم نے اسکاٹ کو مروانے اور تمہیں پھنسانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ورنہ یہ حقیقت تھی کہ اگر تم میکسیکو نکل جانے میں کامیاب ہوجاتے تو شاید فوری طور پر امریکی پولیس کی دسترس سے دور ہوجاتے مگر خراب موسم کی وجہ سے تم پھنس گئے۔''

''ہاں۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے مگر... غور کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میرے پکڑے جانے اور اسکاٹ کی موت میں موسم کا بڑا اہم کردار ہے اگر پروازیں منسوخ نہ ہوتیں تو نہ اسکاٹ مرتا اور نہ میں جیل میں ہوتا۔''

''ویسے میری کہانی بھی تم سے ملتی جلتی ہے۔'' راجر نے کہا۔ ''تم جس خراب موسم کی وجہ سے پکڑے گئے، اسکاٹ جس خراب موسم کی وجہ سے مارا گیا، میں نے اسی موسم کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ تم یہ تو جانتے ہو کہ میں ہیروئن اسمگلنگ کے جرم میں سزا کاٹ رہا ہوں مگر یہ نہیں جانتے کہ میں کیسے پکڑا گیا؟''

''میں نے اپنی کہانی سنا دی ہے اب تمہاری باری ہے۔'' میں نے جواب دیا تو راجر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر تک خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا گویا اپنے ماضی کو یاد کررہا ہو اور پھر بولا۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب امریکا اور میکسیکو

کے بارڈر پر منشیات اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے انتہائی غیر معمولی اور سخت اقدامات کیے گئے تھے۔ امریکا میں زیادہ تر منشیات میکسیکو سے ہی اسمگل ہوتی ہے۔ تاہم ان دنوں سپلائی بالکل بند ہو چکی تھی جس کی وجہ سے امریکا میں منشیات کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ اسی وجہ سے میں نے بھی ہیروئن لے کر امریکا جانے کا فیصلہ کیا۔ ورنہ اس سے پہلے میرا دھندا میکسیکو تک ہی محدود تھا۔ سپلائی بند ہونے کی وجہ سے امریکا میں منشیات کے جو نرخ تھے، وہ کسی بھی منشیات فروش کے لیے باعثِ کشش تھے۔ میں نے پیدل سفر کرتے ہوئے منشیات لے کر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''پیدل سفر؟'' اس کی بات سُن کر میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر اس طرح تو یہ سفر خاصا طویل اور دشوار گزار ہو جاتا اور پھر منشیات کا بیگ وغیرہ اٹھا کر تو یہ سفر مزید مشکل تھا جبکہ راستہ بھی پہاڑی اور پتھریلا ہے۔''

''اس بارے میں تمہاری معلومات بالکل درست ہیں۔ مجھے بارڈر پار کرنے کے لیے تقریباً پندرہ کلومیٹر کا سفر طے کرنا تھا جس میں تقریباً دس کلومیٹر پہاڑی علاقہ اور باقی میدانی علاقہ تھا۔'' راجر نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر گاڑی پر منشیات لے کر جانا زیادہ خطرناک تھا۔ کیونکہ ایسے راستے جہاں سے گاڑیاں گزر سکتی تھیں ان کو سختی سے چیک کیا جا رہا تھا جبکہ پیدل سفر کرتے ہوئے سرحدی محافظوں کی نگاہوں سے بچا جا سکتا تھا۔

''امریکا اور میکسیکو کا سرحدی علاقہ خاصا طویل ہے۔ سارے علاقے پر نظر رکھنا ممکن نہیں ہے۔ پہاڑی راستوں تک تو تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے مگر چٹیل میدان میں تو تم دور سے ہی دیکھ لیے جاتے۔'' میں نے ایک بار پھر قطع کلامی کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''جہاں تک میری معلومات ہیں کہ میکسیکو سے امریکا داخل ہونے کے لیے سب سے مختصر راستہ وہی ہے جہاں تقریباً پانچ کلومیٹر طویل چٹیل میدان واقع ہے اور پھر سرحدی محافظوں کے پاس جدید دوربینیں بھی موجود ہوتی ہیں جو رات کے اندھیرے میں بھی کارآمد ہیں۔ تم نے سرحد پار کرنے کے لیے اس راستے کا انتخاب کیوں کیا، یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''یہیں سے موسم کا کردار شروع ہوتا ہے میرے دوست۔'' راجر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''ان دنوں امریکا اور میکسیکو کے سرحدی علاقوں پر شدید دھند کا راج تھا۔ یہ دھند صبح چھ بجے سے لے کر تقریباً دو تین بجے تک پوری شدت کے ساتھ چھائی رہتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ چھٹنا شروع ہو جاتی تھی۔ یہ دھند اتنی شدید تھی کہ حدِ نگاہ صرف چند فٹ تک ہی رہ جاتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ آلودہ دھند تھی جسے اسموگ کہا جاتا ہے سرحد پر تعینات محافظوں کے پاس جو دوربینیں تھیں، وہ اس آلودہ دھند میں کارآمد نہیں تھیں اور یہی وہ پوائنٹ تھا جس کا میں فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ دھند دورانِ سفر مجھے ایک طرح سے چھپنے کے لیے اوٹ فراہم کرتی اور میں سرحدی محافظوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا۔ پانچ چھ برس پہلے میں ایک دفعہ اس راستے کا استعمال کر چکا تھا اگرچہ میں امریکا داخل نہیں ہوا تھا صرف سرحد سے کچھ پہلے ہی مال کی ڈیلیوری دے کر واپس آ گیا تھا مگر وہ سارا راستہ اب بھی میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ میں کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر امریکا میں داخل ہو جاؤں گا۔

مجھے سرحد سے ملحق ایک چھوٹے سے امریکی قصبے تک ہی پہنچنا تھا جہاں میں امریکی ڈرگز ڈیلر کے حوالے منشیات کر دیتا اور پھر پیسے وصول کر کے واپس آ جاتا۔ اس سلسلے میں، میں نے بہت بااعتماد اور کھرے ڈرگز ڈیلر کا انتخاب کیا تھا ورنہ اس دھندے میں کسی کا بھروسا کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ اس بات کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ امریکن بارڈر کے پار کرتے ہی مجھ سے ہیروئن وصول کرنے والے مجھے گولی مار دیتے۔ مجھے پیسے دینے سے ان کے لیے مجھے گولی مار دینا زیادہ آسان تھا۔ اسی وجہ سے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اس ڈیلر کا انتخاب کیا تھا اگرچہ یہ جرم کی دنیا ہے اور اس دنیا میں بھروسا و اعتماد بے معنی سے الفاظ ہیں مگر اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ اس دنیا میں بھی کچھ اصول اور ضابطے رائج ہیں اور جو ان ضابطوں پر سختی سے عمل پیرا ہو، اس کے پاس کام بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس امریکی ڈیلر کا بھی اس سلسلے میں خاصا نام تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے دھوکا دہی نہیں کرے گا۔

اس سے ڈیل کنفرم ہوتے ہی میں نے بیس کلو کی عمدہ کوالٹی ہیروئن کا بندوبست کر لیا۔ میں نے ایک ایک کلو کے بیس پیکٹ بھی بنا لیے۔ اب مجھے بس روانہ ہونا تھا، میں جانتا تھا کہ اگر میں کامیاب ہو گیا تو مجھے ایک کے بیس کے حساب سے منافع حاصل ہو گا، میں ورزشی جسامت کا ایک کڑیل جوان ہوں۔ اس لیے بیس کلوگرام وزن اٹھا کر پیدل یہ سفر طے کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے اگلے دن تقریباً

صبح چار بجے منہ اندھیرے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ چند کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اتنا وزن اٹھا کر یہ سفر طے کرنا ایک جاں گسل کام ثابت ہوگا۔ پہاڑی راستوں میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں اور چڑھائی چڑھتے وقت خاصی قوت صرف ہوتی ہے۔ میری سانسیں بھی پھولنا شروع ہوگئیں مگر میں نے ہمت کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ صبح چھ بجے کے قریب اندھیرا چھا گیا اور آلودہ دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ میں راستے میں صرف ایک جگہ کچھ دیر کے لیے رکا تاکہ اپنی بے ترتیب سانسیں بحال کر سکوں۔ اس کے بعد میں نے مسلسل اپنا سفر جاری رکھا۔ نو بجے کے قریب دھند نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ میرے لیے چند فٹ سے آگے دیکھ پانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

میں ابھی بھی پہاڑی راستوں پر ہی محوِ سفر تھا اس لیے بہت سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے اطراف میں بعض جگہ گہری کھائیاں بھی موجود ہیں۔ میری ذرا سی غلطی مجھے موت کی عمیق گہرائیوں میں دھکیل سکتی تھی۔ کبھی کبھی چلتے چلتے ٹھوکر بھی لگ جاتی تاہم کیونکہ میں احتیاط سے چل رہا تھا اس لیے کسی چوٹ سے محفوظ رہا۔ کئی گھنٹے کے متواتر سفر کے بعد میں نے پہاڑی راستہ طے کر لیا۔

اب میں چٹیل میدان میں تھا اور میری معلومات کے مطابق یہ میدان پانچ چھ کلومیٹر سے زیادہ طویل نہیں تھا۔ میں اپنے سفر کا ایک بڑا حصہ طے کر چکا تھا۔ اب کامیابی مجھ سے زیادہ دوری پر نہیں تھی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ میں درست راستے پر گامزن ہوں۔ ورنہ اس دھند میں جہاں چند فٹ سے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، راستہ بھٹکنے کا قوی امکان موجود تھا۔ اگرچہ اب میں اندازے سے ہی آگے بڑھ رہا تھا مگر مجھے تسلی تھی کہ میں ٹھیک راستے پر جا رہا ہوں۔ اس وقت صبح کے گیارہ بج رہے تھے مگر آلودہ دھند نے صبح کے اجالے کو نگل لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آس پاس کہیں امریکی سرحدی چیک پوسٹ بھی واقع ہوگی اگر عام موسم ہوتا تو شاید اب تک وہ مجھے دیکھ بھی چکے ہوتے مگر اس دھند میں یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ دھند ایک طرح سے مجھے اوٹ فراہم کر رہی تھی۔ میں گویا اس کے پیچھے چھپ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ اس موسم میں راستے کا تعین کرنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ تاہم راستے میں حائل ہونے والے چند چھوٹے ٹیلوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں بالکل درست سمت میں ہی جا رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ مزید ایک گھنٹے پیدل چلنے کے بعد میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا مگر شاید یہ میری خوش فہمی تھی۔ میں پکڑا گیا اور مجھے پانچ سال کی سزا ہوئی۔ میرا وکیل بہت کائیاں تھا۔ اس نے اس کیس پر بہت زبردست طریقے سے جرح کی۔ شاید اسی لیے مجھے کم سزا ہوئی۔ بہرحال سزا چاہے کم ہو یا زیادہ۔ ہوتی تو سزا ہی ہے۔''

''مگر تم پکڑے کیسے گئے؟'' میں نے حیرت سے استفسار کیا۔ ''تمہاری کہانی سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم دھند کی اوٹ میں کامیابی سے آگے بڑھ رہے تھے۔''

''ہاں۔'' راجر نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''بشرطیکہ دھند قائم رہتی۔''

''کیا مطلب؟'' اس کا جواب سُن کر میری حیرت دوچند ہوگئی۔

''مطلب یہ کہ میرے دوست اس موسم کا بھی انسان کی طرح کوئی بھروسا نہیں جانے کب بدل جائے۔'' راجر نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''دھند کی وجہ سے مجھے اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ آسمان پر بادل چھا چکے ہیں۔ محکمۂ موسمیات کی طرف سے بھی بارش کی کوئی پیش گوئی میرے علم میں نہیں تھی... بلکہ میری معلومات کے مطابق موسم خشک رہنے کی پیش گوئی کی گئی تھی مگر کبھی کبھی موسم ایسے رنگ بدلتا ہے کہ تمام کی تمام پیشگوئیاں دھری رہ جاتی ہیں۔ مجھے بادلوں کی آمد کا اس وقت علم ہوا جب انہوں نے گرج کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور پھر اچانک بارش شروع ہوگئی۔ اگرچہ بارش صرف پندرہ بیس منٹ کے لیے ہی ہوئی تھی.. مگر یہ بہت تیز اور موسلا دھار تھی۔ اس تیز بارش کی وجہ سے یکلخت آلودہ دھند چھٹ گئی اور مطلع صاف ہوگیا۔ میں اس وقت چٹیل میدان میں تھا۔ دھند کے باعث دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل مگر جیسے ہی مطلع صاف ہوا، دور موجود امریکی سرحدی محافظوں نے اپنی دوربینوں کی مدد سے مجھے دیکھ لیا۔ وہ آناً فاناً اپنی تیز رفتار جیپوں میں مجھ تک پہنچ گئے۔ پیدل ہونے کی وجہ سے میں فرار نہ ہو سکا اور پکڑا گیا۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان اور موسم کا مزاج بڑا ملتا جلتا ہے، کب تغیر رونما ہو جائے، کچھ پتا نہیں چلتا اور تغیر چاہے انسان کے مزاج کا ہو یا موسم کا کبھی کبھی وبالِ جان بن جاتا ہے۔''

جنگیں ختم تو ہو جاتی ہیں... مگر اپنے پیچھے اَن گنت داستانیں چھوڑ جاتی ہیں... جنگ کے لمحات نہایت دردناک اور فیصلہ کن ہوتے ہیں... ایسے ہی فیصلے کن لمحوں کا اختتام جب اپنی زندگی بچانے کے لیے دوسرے کی موت از حد ضروری تھی... چونکا دینے والے انجام کی دردناک کہانی...

خوف و بربریت کی فضا میں سانس لینے والوں کا کٹھن امتحان......

دشمن

وسیم بن اشرف

گولیوں کی تڑتڑاہٹ، دھماکوں کی گونج، توپوں سے نکلے سماعت شکن گولے...... جابجا فائرنگ سے ہر طرف دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ شہر بھر میں سراسیمگی کا عالم۔ انسان تو انسان کُتے بھی کونے کھدروں میں جان بچانے کے لیے چھپ گئے تھے۔ سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں ہُو کا عالم تھا۔ کبھی خاموشی کا یہ عالم ہوتا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دیتی اور کسی وقت فائرنگ اور دھماکوں سے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوتے تھے۔ جون کا سورج اپنی تمازت و تپش کی گٹھڑی لپیٹے آخری جھلک دکھا کر دور دریائے لفی (آئرلینڈ) کے کناروں میں گم ہو چکا تھا۔ بادلوں سے جھانکتا چاند ماحول کی خوفناک تاریکی سے اپنے طور پر نبرد آزما تھا۔ رات اپنا دامن پھیلائے ہر چیز کو اندھیرے میں لپیٹ رہی تھی۔ ڈینی ایک مکان کی چھت پر بڑے محتاط انداز میں لیٹا آنے والے لمحات پر غور کر رہا تھا۔ یہ سول وار کے دن تھے۔ جوں جوں اندھیرا اپنے پھن پھیلا رہا تھا توں توں آگ اور بارود کی بارش میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ ری پبلکن اور فری اسٹیٹر ز کے درمیان جاری اس جنگ نے آئرلینڈ کے فورکورٹ شہر کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

جس مکان کی چھت پر ڈینی نے پوزیشن سنبھال رکھی تھی، وہ پُل کے قریب تھا۔ ڈینی نے رائفل کو تیار حالت میں ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی دوربین تھی۔ اس جدید دوربین سے اندھیرے میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ طاقتور رینج کا پستول پتلون میں اُڑسا ہوا تھا اور تیز دھار خنجر کمر کے ساتھ چمڑے کے کور میں موجود تھا۔ دو ہینڈ گرینیڈ بھی ایک مضبوط تھیلے میں ڈال کر وہ چھوٹا سا تھیلا بلکہ اسے تھیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، مضبوط ڈوری کے ساتھ کمر سے باندھ رکھی تھی۔ وہ ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے اور مرنے یا مارنے کی مکمل تیاری کے ساتھ چھت پر دم سادھے لیٹا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے تھوڑا سا زاویہ بدلا اور چھت سے نیچے

جھانکا، اس کا چہرہ کالج کے نئے طالب علم کی طرح معصوم اور سماج کے ظلم و ستم، جبر و استبداد سے پاک صاف معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، محسوس ہوتا تھا وہ کسی بھی لمحے، جنونی کیفیت میں موت کی طرح اپنے دشمنوں پر جھپٹ پڑے گا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ بقا اور فنا کی اس جنگ میں وہ ہر لمحہ چوکس و چوکنا ہے۔ وہ صبح سے بھوکا تھا، کسی فاقہ کش کی طرح اس نے لیٹے لیٹے ہی سینڈوچ نگلنا شروع کر دیا، زور کی بھوک لگ رہی تھی اُسے، نہ جانے دوسرا سینڈوچ اس کے نصیب میں بھی ہو یا نہ ہو، یہ سوچ کر اس نے دوسرے سینڈوچ سے بھی پیٹ کا جہنم سرد کیا، اس نے جیب سے وہسکی کا فلاسک نکال کر ایک گھونٹ لیا، تھوڑے سے توقف کے بعد اسے تمباکو کی طلب ہوئی، اس نے سوچا کیا اس کھلی چھت پر وہ سگریٹ سلگانے کا رسک لے سکتا ہے۔ سامنے متعدد عمارتیں تھیں، کسی بھی چھت پر دشمن ہو سکتا تھا اور روشنی دیکھتے ہی فائر نہ ہو، یہ کیسے ممکن تھا۔ اس نے اپنی اس خواہش کو کچل دیا، فطرت کو کون مات دے، کسی خواہش کو دبانے کی کوشش کی جائے تو اس کی سرکشی اور بڑھ جاتی ہے۔ اُسے لگا زندگی دھوئیں کے چند مرغولوں سے زیادہ اہم نہیں رہی۔ بالآخر اس نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

☆☆☆

خواہشات خطرات کو خاطر میں نہ لائیں تو نتائج بھیانک بھی ہو سکتے ہیں، اس نے سگریٹ سلگانے کے لیے جونہی لائٹر جلایا ایک گولی سنسناتی ہوئی عین اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی، اس کے ہاتھ سے لائٹر گر گیا، بڑبڑانے کے انداز میں ملغلظات نکلنے لگے، گولی سامنے والی چھت سے چلائی گئی تھی، قسمت یاوری کر گئی ورنہ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو چکی ہوتی، اس نے تلملاتے ہوئے سگریٹ کو ہاتھ سے مسل کر پھینک دیا۔ وہ رائفل کو سینے سے لگائے سرکتا ہوا چھت کے آخری سرے پر موجود چمنی کی طرف گیا، چمنی کی اوٹ لے کر اس نے خود کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا، سڑک کے پار سامنے والی چھت کا جائزہ لیا، اسے کچھ دکھائی نہ دیا، گویا اس چھت پر بھی جو کوئی تھا، وہ اسی کی طرح اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔

ڈینی نے پُل کی طرف دیکھا، اس طرف سے ایک بکتر بند گاڑی سڑک کی جانب آتی دکھائی دی۔ گاڑی مکان سے کچھ دور رک گئی۔ اسے بکتر بند گاڑی کے انجن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، گاڑی دشمنوں کی تھی۔ اس نے سوچا گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دے، پھر اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا، ایسا کرنا بے سود تھا، اس کی چلائی ہوئی گولیاں گاڑی کے آہنی خول کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ دفعتاً ایک گھر کا دروازہ کھلا اور بوڑھی عورت وہاں سے نکل کر گاڑی کے قریب گئی، اس کا سر اور منہ ایک شال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی میں موجود شخص سے کوئی بات کی اور پھر اس چھت کی طرف اشارہ کیا جہاں ڈینی چھپا ہوا تھا۔ ”تو یہ بُڑھیا بھی مخبر ہے“ اس نے تلخی سے سوچا۔ فوراً ہی بکتر بند گاڑی کا دروازہ کھلا، ایک شخص نے اپنا آدھا دھڑ نکالا اور چھت کی طرف دیکھا۔ ڈینی نے چشم زدن میں رائفل سیدھی کی اور فائر کر دیا۔ گاڑی سے جھانکنے والے کا سر پائدان پر جھول گیا۔ مخبر بُڑھیا نے فرار کی کوشش کی اور دوسری سمت کے فٹ پاتھ پر چڑھ گئی، ڈینی کے دوسرے فائر نے بُڑھیا کو وادیٔ عدم روانہ کر دیا، گولی لگتے ہی وہ اچھل کر فٹ پاتھ پر موجود کھلے مین ہول پر اوندھے منہ گر گئی۔ اچانک سامنے والی چھت سے گولی چلی، رائفل ڈینی کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، چھت پر رائفل گرنے سے آواز پیدا ہوئی اور پھر وہی پہلے والا سناٹا چھا گیا، ڈینی نے رائفل اٹھانے کی کوشش نہیں کی، وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ گولی نے اس کے ہاتھ کو ناکارہ کر دیا تھا۔

”اوہ میرے خدایا“ وہ بڑبڑایا۔ ”مجھے بھی گولی چاٹ گئی۔“ وہ آہستگی سے چمنی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کے زخم کو ٹٹولنے لگا، اسے تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ ایک ایسی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا جو ہاتھ کٹ جانے پر پورے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دائیں جیب میں موجود چاقو نکالا اور اس سے آستین چیر ڈالی، اس کے ہاتھ میں جس جگہ گولی گھسی تھی وہاں ایک سوراخ تھا، اس نے ہاتھ گھما کر دیکھا، دوسری جانب کوئی سوراخ نہ تھا، گویا گولی اس کے ہاتھ کی کسی ہڈی میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ یقیناً وہ ہڈی بھی ٹوٹ چکی ہو گی، اس نے زخم کے نیچے سے ہاتھ کو گھمایا تو وہ جھول گیا، درد کی شدت پر قابو پانے کے لیے اس نے سختی سے نچلے دانتوں پر اوپر والے دانت جما لیے۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد تکلیف کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس نے کندھے سے لٹکا ابتدائی طبی امداد کا تھیلا چاقو کی مدد سے کھولا۔ چاقو کی مدد سے ہی بوتل کا ڈھکن کھول کر زخم پر پائیوڈین انڈیلی تو درد کی شدید لہر سے اس کا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔ اس نے ہمت کر کے زخم پر روئی رکھی، پٹی لپیٹنے کا دشوار مرحلہ طے کرنے کے بعد دانتوں کی مدد سے اچھی طرح گرہ باندھ دی، وہ چھت پر لیٹ گیا اور درد کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ نیچے سڑک ایک بار پھر سائیں سائیں کر رہی تھی، سناٹے کا دور دورہ تھا۔ بکتر بند گاڑی کا ڈرائیور اسے تیزی سے پُل کی

طرف دوڑا کر لے گیا تھا۔ اس مخبر بُڑھیا کا بے جان جسم ابھی تک گٹر کے اوپر ساکت پڑا تھا۔ ڈینی چھت پر لیٹا درد میں کمی کا انتظار کررہا تھا، گولی نے ہاتھ کو جس طرح متاثر کیا تھا، اس سے نہیں لگتا تھا کہ تکلیف کم ہوجائے گی۔ اس کا ذہن وہاں سے فرار کے بارے میں سوچ رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ دشمنوں سے گھرے اس علاقے میں اسے سورج کا سامنا نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ایسے میں اس کے فرار کے امکانات صفر ہوجاتے اور وہ بے موت مارا جاتا۔ سامنے کی چھت پر موجود اسنائپر بھی ان لمحات میں اس کے فرار کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا اسے ہر حال میں اس دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا کیونکہ اس کی موت ہی اس کی زندگی کی ضمانت تھی، وہ زخمی بھی تھا اور اس حالت میں بھاری اسلحہ کا استعمال اس کے لیے محال تھا۔ اس کے پاس صرف ایک ریوالور رہ گیا تھا، اس کے ذریعے اسے اپنے دشمن کا کام تمام کرنا تھا، اسے کچھ حوصلہ محسوس ہوا کہ حفاظت کے لیے کچھ تو اس کے پاس ہے بصورت دیگر جو قدرت کو منظور۔

اچانک اسے ایک ترکیب سوجھی، دشمن کا قلع قمع کرنے کا شاندار اور محفوظ راستہ۔ کامیابی نے قدم چومے تو اس کا راستہ صاف ہوجائے گا، اس نے سر سے کیپ اتاری اور آہستہ آہستہ اسے رائفل کے درمیانی حصے میں وہاں لٹکا دیا جہاں رائفل کا کندا ختم ہوتا تھا۔ اس نے لبلبی دبائی تو نتیجہ فوراً سامنے آیا، فائر کی آواز کے ساتھ ہی رائفل اور اس کی کیپ دونوں سڑک پر جاگریں، اس نے اپنا دھڑ چمنی سے نیچے سرکاتے ہوئے آہستہ سے چھت پر گرادیا، گرنے کے بعد وہ کرالنگ کے انداز میں بائیں جانب گھسٹتا چلا گیا۔ اس کی تدبیر کارگر رہی، جیسے ہی ٹوپی اور رائفل سڑک پر گرنے سے گہرے سناٹے میں ہلکا سا شور ہوا، چند لمحوں بعد ہی سامنے والی چھت پر چھپا دشمن چمنی کی اوٹ سے نکل آیا، اس نے اندازہ لگالیا کہ اس کا دشمن ہلاک ہوچکا ہے، اب وہ کھلے آسمان تلے، اپنی چھت پر بے فکری سے کھڑا سامنے والی چھت پر چمنی کے قریب اندھیرے میں ڈینی کی لاش ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا۔ ڈینی مسکرایا، اس نے بائیں ہاتھ میں تھاما ہوا ریوالور سیدھا کیا، ہدف اور اس کے درمیان بمشکل 50 فٹ کا فاصلہ ہوگا، اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے ریوالور دائیں ہاتھ میں منتقل کیا۔ اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کی ہتھیلی میں تیز دھار خنجر گھونپ دیا ہو، اس نے نشانہ لیا، نچلے لب پر بالائی لب جمایا، ناک سے گہرا سانس کھینچا اور ٹریگر دبا دیا، دھماکا ہوا، ساتھ ہی ہتھیلی میں تکلیف کی اتنی شدید لہر اٹھی کہ درد کے مارے چند لمحوں کے لیے اندھا سا ہوگیا۔

لمحاتی درد کا ریلا گزر گیا تو اس نے پلکیں جھپکا کر دیکھا، اس کے حلق سے خوشی کا نعرہ نکلا، دشمن چھت سے لڑھکتا ہوا نیچے گررہا تھا، گولی نے اپنا کام کر دکھایا تھا، دشمن کا بے جان جسم رائفل سمیت نیچے حجام کی دکان کے سامنے والے کھمبے سے ٹکرایا اور فٹ پاتھ پر آڑھا ترچھا گر پڑا۔

ڈینی نے لاش کو دیکھا تو اسے جھرجھری سی آگئی، لڑائی ختم ہوچکی تھی، لہٰذا وہ ہنگامی صورت حال بھی اختتام کو پہنچ گئی، جس نے اسے کچھ اور سوچنے سے اپاہج بنا رکھا تھا۔ اس کی پیشانی اور دونوں ہاتھ پسینے سے تر ہوچکے تھے، انہی لمحات میں اسے ہر چیز سے بیزاری کا احساس ہونے لگا، اپنے دشمن سے، سول وار سے حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی بیزاری محسوس ہونے لگی۔

فائر کرنے کے بعد اس نے ریوالور بائیں ہاتھ میں تھام لیا، اس نے ریوالور والے ہاتھ کی طرف دیکھا جو پسینے سے تربتر تھا، دشمن انجام کو پہنچ چکا تھا چنانچہ عدم تحفظ بھی اس خیال کے ساتھ ہی رخصت ہوگیا۔ ریوالور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی، ذہن سے خوف کے بادل چھٹ گئے اور وہ مسکرانے لگا۔

اس نے جیب سے فلاسک نکالا اور ایک ہی سانس میں ختم کردیا۔ اس سے پیاس تو کیا بجھنی تھی تاہم انگور کی بیٹی نے تھوڑی دیر کے لیے اسے مفلوج سا کرکے رکھ دیا۔ اس نے سوچا اب چھت کو چھوڑ دینا چاہیے، یہاں سے فرار ہوکر اپنے کمپنی کمانڈر کے پاس جانا چاہیے۔ جس قدر جلد ممکن ہو، اس واقعے کی رپورٹ دینی چاہیے، نیچے اب سناٹا تھا اور پُل کے مخالف رخ جانے میں کوئی خطرہ ہیں تھا۔ اس نے ریوالور جیب میں ڈالا اور سیڑھیاں اترتا ہوا اس خالی گھر سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

سڑک پر آتے ہی اس نے سوچا مکمل رپورٹ دینے کے لیے کم از کم اپنے دشمن کو ایک نظر دیکھ لے تو بہتر ہوگا، مرنے والا اس سے کم اچھا نشانے باز نہیں تھا۔ ممکن ہے وہ اپنی ہی کمپنی سے بھاگا ہوا کوئی سپاہی ہو، وہ جیسے ہی سڑک کے درمیان پہنچا اچانک ہی ایک مشین گن نے موت کا قہقہہ لگایا، ڈینی نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں خود کو سڑک پر گرالیا، فائرنگ بہت دور پُل کی طرف سے کی گئی تھی، اس لیے کوئی گولی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

لیٹے لیٹے ہی وہ کھسک کر لاش کے قریب ہوگیا پھر پاؤں سے اوندھی پڑی لاش کو سیدھا کیا، اُسے زوردار جھٹکا لگا۔ زمین نیچے سے کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، دیدے پھٹنے کی حد تک پھیل گئے، اس کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا، جسم میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ آنکھوں میں دنیا جہان کا غم سموئے اپنے چھوٹے بھائی کارل کی بے نور آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

انجانا کھیل

امجد جاوید

بعض اوقات چلتے چلتے زندگی میں اچانک ایسے موڑ آجاتے ہیں.... جو یکدم اصل راستے سے بھٹکا دیتے ہیں... مجبوریاں اسے الجھا کے غلط راستوں کے انتخاب پر مجبور کردیتی ہیں... جبکہ ہر لمحہ اس کا ضمیر اکساتا ہے... ملامت کرتا ہے کہ وہ تائب ہو کے راہِ راست پر آجائے... مگر بے ضمیر اور مجرم اپنے مفادات کے لیے اسے ناکردہ جرائم میں ملوث کرتے چلے جاتے ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کو پیش آنے والا حادثہ جس نے اس کی زندگی کے آنے والے دنوں کو یکسر بدل ڈالا...

جانے انجانے میں شروع ہونے والے جرم کے کھیل کے اتار چڑھاؤ......

رات کے پچھلے پہر چلنے والی سرد ہوا لہو جما رہی تھی۔ خرم سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ اپنی سوچوں میں گم لان میں بیٹھا تھا۔ ملگجی روشنی میں وہ اندھیرے ہی کا حصہ لگ رہا تھا۔ وہ یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے موسم ہی سے نہیں، ہر طرف سے بے پروا ہو چکا ہو۔

وہ آج شام ہونے والی اپنی انتہائی ذلت و رسوائی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی اپنی ہی بے وقوفی کے باعث ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ایسی ذلت جو ظالمانہ طور پر مسلط کر دی جائے۔ اپنے ذرا سے فائدے کے لیے دوسروں کو رگید کر رکھ دیا جائے۔ حسد کی وجہ سے دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے برباد کر دیا جائے۔ ایسے میں بے بسی کے ساتھ غصہ آگ ہی نہیں، قہر بن جاتا ہے۔ یہی قہر بھری آگ اس وقت خرم کے اندر الاؤ کے مانند روشن تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے حالات کا بھی سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ اس نے خود کو بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی، اپنے آپ پر قابو پانے کی سو تاویلیں خود کو دیں، کئی طرح کی دلیلوں سے بھی خود کو ٹھنڈا کرنے کی سعی کی لیکن اس کا اندر مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کی سوچوں میں صرف انتقام سلگ رہا تھا۔ وہ کچھ اور سوچنے کے بجائے یہی سوچ رہا تھا کہ اپنی ذلت، رسوائی اور بے عزتی کا بدلہ کیسے لے؟ یہی سوچتے ہوئے وہ ہر طرف سے بے نیاز ہو چکا تھا مگر اسے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ دو گھنٹے سے وہ اسی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے خود سے لڑتا ہوا بے بس ہو گیا تھا۔

اس نے بنگلے کی جانب نگاہ اٹھائی تو ایک دم سے بے بسی نے اسے چاروں جانب گھیر لیا۔ اس کے سوئے ہوئے دوستوں نے شاید اس سے بہت کم ذلت محسوس کی ہو گی۔ ورنہ اس قدر ذلت و رسوائی کے بعد نیند کہاں آتی ہے؟ کتنے خواب تھے اُن کے اور تعبیر کی پہلی سیڑھی پر اتنی ذلت کہ اسے اپنا آپ بُرا محسوس لگنے لگا تھا۔ کل شام تک وہ کتنے

خوش تھے۔ خوابوں، جذبوں، امنگوں اور توانائی سے بھرپور تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے ساتھ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

وہ سات دوست تھے۔ ہاشم، ایان، ولید، ارسلان، میرب، ملائکہ اور وہ خود۔ یونیورسٹی کے دنوں میں وہ ایک دوسرے کے دوست بنتے چلے گئے۔ ان میں دوستی کی وجہ میوزک تھی۔ بہت سارے خوابوں کے ساتھ انہوں نے اپنا ایک میوزک بینڈ بنانے کا سوچا تھا۔ ایان اور ولید گٹار بجالیتے تھے، ہاشم بہت اچھا ڈرم بجاتا تھا۔ ملائکہ کی بورڈ کی ماہر تھی۔ اس کے والد شہر کے معروف بزنس مین تھے۔ ارسلان کے والد کسی دور میں مشہور موسیقاروں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اس لیے ارسلان کی گھٹی میں ہی موسیقی سے محبت تھی۔ ارسلان اور میرب دونوں بہت اچھا گا لیتے تھے، ان کی آواز بھی بہت سُریلی تھی اور وہ خود الیکٹرانک آلات میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ سبھی مختلف طرح کے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یونیورسٹی کے فوراً بعد وہ اپنا ایک میوزک بینڈ ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

وہ بہت خوش تھے۔ پہلے وہ میرب کے گھر میں اکٹھے ہو کر مشق کرتے رہتے تھے۔ کبھی کسی دُھن پر طبع آزمائی ہوتی اور کبھی کسی گیت کو اچھے انداز سے گانے کی کوشش ہوتی رہتی۔ پھر انہوں نے یہی بنگلا کرائے پر لے لیا۔ یہاں وہ ریاضت کرتے تھے۔ وہ بہت خوش تھے اور میوزک بینڈ کو بہتر سے بہترین بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ خود کو متعارف کروانے کے لیے ایک بڑا پروگرام کریں گے۔ جس میں شہر بھر کے نوجوانوں کو اکٹھا کیا جائے گا۔ آخر ایک دن ان کا یہ خواب پورا ہونے کو آ گیا۔ انہوں نے ایک پروگرام ترتیب دے لیا۔ انہوں نے اس پروگرام کے لیے بہت محنت کی۔ ایک دن انہوں نے پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جس قدر پبلسٹی ہو سکتی تھی انہوں نے کی۔ ہال

بک کرلیا گیا۔ شہر بھر میں چند اہم جگہوں پر ہورڈنگ بھی لگ گئے...... اور بہت سارے لوگوں کو باقاعدہ مدعو بھی کرلیا گیا۔

اس پبلسٹی میں ان دنوں تیزی سے مقبول ہونے والی فلم وٹی وی اسٹار سائرہ کا نام بھی شامل تھا۔ اس کی خاص پرفارمینس بھی اس پروگرام کے لیے عوام کو متجسّس کررہی تھی۔ مقامی اخبار بھی اس میوزک شو کو اہمیت دے رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ پروگرام سے دو ہفتے پہلے اسے ایک اجنبی نمبر سے فون کال ملی۔

''خرم ہی ہونا، سینڈ ڈیونز والا۔'' اجنبی نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا

''ہاں بولو۔'' اس نے تحمل سے کہا۔

''بات یہ ہے سوھنا، تم نے ہمارے علاقے میں، ہم سے پوچھے بغیر اتنا بڑا پروگرام رکھ لیا۔ یہ کیا کردیا تم نے؟'' اس بار اس نے تمسخر اڑانے والے لہجے میں پوچھا تو خرم نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں تم کون ہو اور کیا کہنا چاہتے ہو؟'' خرم نے پوچھا۔

''ہاں، تم ہمیں نہیں جانتے، یہی تمہارا قصور ہے، ہمیں جانتے ہوتے تو پہلے ہم سے اجازت لیتے، خیر، اب بھی اجازت لے سکتے ہو۔'' اس بار اس نے کافی حد تک سنجیدگی سے کہا۔

''اجازت؟ میں سمجھا نہیں، میرا مطلب ہے تم کسی سرکاری محکمے سے ہو جس سے ہم نے اجازت......'' اس نے پوچھنا چاہا تو وہ بات کاٹتے ہوئے قہقہہ لگا کر بولا۔

''ہم خود سرکار ہیں۔ اس علاقے میں ہمارا راج ہے جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے اور تم ہو کہ گانے بجانے کا پروگرام کررہے ہو۔''

''اچھا تم سرکار ہو گے، تمہارا راج بھی ہوگا، بولو فون کرنے کا مقصد کیا ہے؟'' خرم نے سیدھی بات کرتے ہوئے پوچھا

''تم ہمیں نہیں جانتے ہو، اس لیے ہم تمہاری یہ غلطی معاف کرتے ہیں مگر اجازت پھر بھی لینا ہوگی، تمہیں دو لاکھ روپیہ ہم تک پہنچانے ہوں گے۔'' اس نے پھر اسی تمسخر بھرے لہجے میں کہا۔

''یار، تم جو کوئی بھی ہو، ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا، کیوں دماغ خراب کرتے ہو۔ اپنا کام کرو۔'' اس بار خرم نے اُسے جھڑک دیا۔

''تو پھر جو چاہتے ہو، وہ ہو نہیں سکتا سوھنا۔'' اس نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا تو خرم سخت لہجے میں بولا۔

''اچھا یار تم سے جو ہوسکتا ہے کرلینا۔ آئندہ مجھے فون مت کرنا سمجھے۔''

''بہت پچھتاؤ گے۔ ہاں اگر سمجھ آجائے تو اسی نمبر پر کال کرنا، تمہیں بتا دوں گا کہ کہاں رقم پہنچانی ہے اور سنو تمہاری اس بے وقوفانہ دھمکی کے بعد اب رقم ہے تین لاکھ۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔

خرم پورا دن اس فون کال کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی کو اس دھمکی کے بارے نہیں بتایا۔ اس کا اپنا یہ خیال تھا کہ اگر اس نے فون کال کے بارے انہیں بتایا تو ممکن ہے ان کا دھیان بٹ جائے اور وہ بہترین پرفارمینس نہ دے سکیں۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ سو حاسد ہوتے ہیں، ان میں سے کسی نے انہیں ڈسٹرب کرنے کے لیے حماقت کی ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ حاسد اس دھرتی کا بوجھ ہیں۔ ان سے خیر کی توقع نہیں ہوتی انہیں نظرانداز کردینا ہی سب سے بڑا انتقام ہوتا ہے۔ اس نے یہی سمجھا کہ اس کے اردگرد کوئی حاسد ہوگا، جو یہ برداشت نہیں کرپارہا ہے۔ سو اس نے اس فون کال کو نظرانداز کیا اور پروگرام کو کامیاب بنانے میں لگ گیا۔ مگر اس کے دماغ میں یہ کال رہی۔ اس نے اپنے مختلف ذرائع سے معلوم کرنا چاہا۔ چند ایسے دوستوں سے پوچھا جو دو نمبر قسم کے لوگوں سے تعلقات رکھتے تھے۔ ایک باخبر دوست کے کہنے پر اس نے جس نمبر سے کال آئی تھی، وہ نمبر بھی اُسے دے دیا۔

پروگرام سے چند دن قبل اسے پتا چل گیا کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس سے بھتّا مانگ رہے ہیں۔ وہ شہر میں موجود غنڈوں کا ایک گینگ تھا جس کا سرغنہ ساجھا چوہدری تھا۔ وہ بھتّا لینے کے علاوہ کئی دوسرے جرائم میں بھی ملوث تھے۔ اس کے دوست وجاہت نے اسے بتایا کہ ساجھا چوہدری اور اس کا گینگ شہر کا مشہور گینگ ہے جو پولیس کو مطلوب ہے اس لیے ساجھا چوہدری اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا ہے۔ دوست نے اسے ساجھا کے تین چار ٹھکانوں کے بارے بھی بتایا اور مشورہ دیا کہ وہ نئی تعمیر ہونے والے ٹاؤن کے ایک بنگلے میں رہتا ہے۔ وہاں جا کر اس سے اجازت مانگ لو اور منت وغیرہ کرکے بھتّے کی رقم میں کمی کروانے کی کوشش کرو۔ خرم پریشان ہوگیا۔ پریشانی اس مسئلے کا حل نہیں تھی۔ اب وہ دوستوں کو بتاتا تو بھی کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے سب کچھ وقت کے حوالے کردیا۔ حالانکہ اس کے دوست نے

وضاحت سے بتایا تھا کہ ساجھا جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ اگر اس نے کہا ہے کہ ویسا نہیں ہوگا جیسا خرم چاہتا ہے تو وہ اس پر عمل کرے گا۔

پروگرام والے دن ان کی توقع سے بھی بڑھ کر لوگ آئے تھے۔ ہال بھر گیا تھا۔ انہوں نے پہلا گیت چھیڑا تو ہال سے بے تحاشا حوصلہ افزائی ہوئی۔ نوجوان اُمنڈ پڑے تھے۔ انہوں نے بہترین پرفارمنس دی تھی۔ وہ تیسرا گیت تھا، لوگ خوشی سے جھوم رہے تھے۔ نوجوان طبقے کا جوش دیدنی تھا۔ ایسے میں اچانک اسٹیج پر ٹماٹر، انڈے اور خالی بوتلیں پڑنے لگیں۔ اسی دوران ہال میں ایک کریکر چلا تو ہال میں بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ لوگ اسٹیج پر چڑھ گئے۔ انہوں نے گٹار چھینے اور توڑ دیے۔ آرکسٹرا کو توڑ دیا۔ وہ سب اپنی جانیں بچا کر اسٹیج سے بھاگ گئے۔ چند منٹ میں اس قدر افراتفری مچی کہ انہیں سمجھ ہی نہ آسکی۔ اسے خود پتا نہیں چل رہا تھا کہ اچانک یہ ہو کیا گیا ہے۔ وہ موسیقی کے آلات توڑ رہے تھے۔ اس کے ساتھ جس کا دل کرتا ان کے مُکّے، تھپڑ بھی جڑ دیتا۔ وہ خود برقی آلات بچا رہا تھا کہ دو چار افراد اسے بھی مارنے لگے۔ اسے یہ پتا ہی نہ چلا کون کون مار کر چلتا بنا ہے۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ بدن سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ ہو گیا جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہ سب جان بچا کر یہیں آگئے تھے۔ پہلے تو ان کا پلان تھا کہ یہاں آکر پروگرام کے کامیاب ہو جانے کی خوشی منائیں گے لیکن اس وقت وہ ذلت میں ڈوبے اپنی بے بسی کے ساتھ کچھ دیر لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ ہر کسی کا اپنا تبصرہ تھا لیکن خرم جانتا تھا کہ یہ سب کن لوگوں نے کیا ہے۔ میرب اور ملائکہ اپنے گھروں کو چل دیے تو باقی سونے چلے گئے۔ وہ لان میں آبیٹھا۔ ٹیسیں اور درد کی لہریں اُسے اذیت اور ہزیمت کا احساس دلا رہی تھیں۔ یہ اس کے شوق کی موت تھی، وہ خود کو کس قدر گھٹیا محسوس کر رہا تھا، اسے اپنے آپ سے شرم آرہی تھی۔ وہ خود پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ اس سے اپنی ذلت برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ خنک ہوا کی ایک تیز لہر سے اس کا وجود کپکپا اٹھا۔ وہ اٹھا تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ وہ اس ذلت سے مر جانا بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے لمحوں میں کچھ سوچا اور اٹھ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا۔ الماری کھولی، اس میں سے پسٹل نکالا، اس کا میگزین دیکھا، ساتھ میں پڑا ایک میگزین اٹھایا اور پلٹ کر باہر آگیا۔ پورچ میں اس کی بائیک کھڑی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا۔

اسے بنا اسٹارٹ کیے پورچ سے باہر نکالا۔ باہر آکر گیٹ کو لاک کر دیا۔ وہ بائیک پر بیٹھا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ رات کا آخری پہر شروع ہونے کو تھا۔ وہ بائیک بھگاتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ شہر کے اس علاقے میں آگیا تھا جہاں نیا ٹاؤن بنا تھا۔ وہاں بہت سارے بنگلے بن چکے تھے۔ وہ اسی ٹاؤن میں مڑ گیا۔ اس نے ساجھا چوہدری کا ٹھکانا معلوم کر لیا تھا۔

ساجھا چوہدری کی طاقت یہ تھی کہ شہر کا سب سے بڑا بزنس مین مختار خان اس پر ہاتھ رکھتا تھا۔ اسے پولیس کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پولیس نے پکڑ بھی لیا تو کچھ دیر بعد اسے چھوڑنا ان کی مجبوری ہے۔ بظاہر اس کا سامنا کرنے والا کوئی نہیں تھا سوائے مخالف سیاست کے غنڈے مجیدے بھنڈر گینگ کے۔ اسے پولیس سے زیادہ بھنڈر گینگ سے خطرہ رہتا تھا۔ ان دنوں ساجھا چوہدری جس نو تعمیر شدہ بنگلے میں رہتا تھا، اس کے نچلے پورشن میں کام چل رہا تھا۔ خرم وہاں تک جا پہنچا۔ کچھ دیر بنگلے کو دیکھتے رہنے کے بعد خرم نے اپنی بائیک چار دیواری کے ساتھ لگا دی۔ پھر پسٹل نکال کر اِدھر اُدھر دیکھ کر بائیک پر چڑھا اور بنگلے کے اندر کود گیا۔

پورچ میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک شخص اس پر پڑا سو رہا تھا۔ اس کے قریب ایک لاٹھی پڑی تھی۔ اس کے سرہانے ہی ایک ٹارچ بھی رکھی تھی۔ وہ بے آواز قدموں سے اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ چوکیدار تھا مگر بے خبر سو رہا تھا۔ خرم نے سرہانے کے پاس چابیاں تلاش کرنے کی کوشش کی، چند لمحے ہاتھ سرسراتا رہا، پھر چوکیدار کے جاگ جانے کے باعث پیچھے ہٹ گیا۔ وہ خواہ مخواہ کا شور نہیں چاہتا تھا۔ اس نے پہلے داخلی دروازے پر کوشش کرنے کا سوچا۔ وہ دروازے تک گیا اور اس کی ناب گھما کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ چند لمحے رک کر سن گن لی پھر اندر چلا گیا۔ ایک کمرے میں لائٹ روشن تھی۔ اس کی ملگجی روشنی ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ خرم کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ اوپر کی جانب سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ ساجھا چوہدری وہیں رہتا تھا۔ خرم کو یہ خوف تھا کہ اس کے علاوہ وہاں کچھ اور لوگ ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہی ساجھا چوہدری اس کے دماغ میں آیا، اس کے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ اس کے سامنے چار دروازے تھے۔ ان میں سے کسی ایک میں ساجھا چوہدری ہو سکتا تھا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا اور ہر دروازے پر کان لگا کر سننے لگا۔ اس نے اوپر کے سارے پورشن میں دبے قدموں چکر لگایا سبھی

کمرے دیکھے، ان میں کسی میں بھی اسے کوئی شخص محسوس نہیں ہوا۔ ایک کمرے سے آوازیں آرہی تھیں۔ چند لمحے بعد اسے یقین ہوگیا کہ وہ اسی کمرے میں ہے۔ اس نے ناب گھمائی تو وہ اندر سے بند تھا۔

خرم نے ایک لمحے کو سوچا پھر دستک دے دی۔ اندر اچانک خاموشی چھا گئی۔ اس نے پھر زوردار دستک دی تو اندر سے انتہائی غصے میں گالی سمیت آواز آئی

''کون ہے بہن......''

''پولیس، دروازہ کھولو۔'' اس نے رعب دار انداز میں کہا اور ساتھ ہی دستک دے دی تو اندر سناٹا چھا گیا۔ دو منٹ گزرے ہوں گے، دروازے کی جھری کھلی اور ساجھے چوہدری نے جھانکا، خرم نے زوردار ٹھوکر ماری تو دروازہ کھل گیا۔ اس وقت تک ساجھے چوہدری نے خرم کو دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ گالیاں بکنے لگا۔ سامنے بیڈ پر ایک نیم برہنہ لڑکی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ خرم سمجھ گیا کہ وہ اکیلا ہی یہاں رنگ رلیاں منا رہا تھا، تبھی اس کے پاس کوئی دوسرا نہیں ہے۔

''اوئے تیری ہمت کیسے پڑی یہاں تک آنے کی؟''

ساجھے چوہدری نے دانت پیستے ہوئے حقارت سے کہا تو خرم نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ پسٹل سیدھا کرکے اس پر فائر کردیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہاں سے خون اُبلنے لگا۔ ساجھے چوہدری کی آنکھوں میں حیرت جم گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ تب تک خرم نے دوسرا فائر کردیا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ تیسرا فائر اس نے اس کے ماتھے پر نال رکھ کر مارا۔ وہ تڑپا اور وہیں ساکت ہوگیا۔ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اس پر جیسے سکتہ ہوگیا تھا۔ خرم نے پسٹل اس کی طرف کیا تو وہ نہ نہ کہنے کے انداز میں لرزنے لگی۔ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ تبھی خرم نے سرد لہجے میں کہا۔

''سوری، میں چشم دید گواہ نہیں چھوڑنا چاہتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فائر کردیا۔ وہ بیڈ پر گر کر تڑپنے لگی۔ خرم نے دوسرا فائر کیا اور انتہائی سرعت کے ساتھ وہاں سے نکلا۔

وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ باہر سویا ہوا چوکیدار اندر داخل ہوا۔ اس نے وہیں سے اس پر چھلانگ لگادی۔ وہ نیچے تھا۔ خرم نے اس کا سر پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھا اور باہر کی جانب بھاگا۔ وہ گیٹ کی طرف جانے کے بجائے اسی طرف گیا جہاں سے کودا تھا۔ خرم نے ساتھ کھڑے درخت کی مدد لی اور چار دیواری پر چڑھ کر دوسری جانب کود گیا۔ اس نے تیزی سے اپنی بائیک سیدھی کی اور اسے اسٹارٹ کرکے نکلتا چلا گیا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ اتنے کم وقت میں کیا کرکے آگیا ہے۔

☆☆☆

فون کی بیل مسلسل بجتی چلی جارہی تھی۔ انتہائی خاموشی میں سائڈ ٹیبل پر دھرے بجتے ہوئے سیل فون نے بیڈ روم میں ہلچل مچادی تھی۔ انسپکٹر صارم دو گھنٹے پہلے ہی سویا تھا۔ اس لیے گہری نیند میں ہونے کے باوجود اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں ابھی رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے کال پک کرنے سے پہلے اسکرین پر دیکھا، وہ پولیس اسٹیشن سے اس کے اسسٹنٹ ثاقب کی کال تھی۔ اس نے وقت دیکھتے ہوئے خمار آلود آواز میں کہا۔

''ہیلو، کوئی ایمرجنسی ہے کیا؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں، ساجھا چوہدری قتل ہوگیا ہے، کسی نے اسے فائر کرکے مارا ہے۔'' ثاقب نے تیزی سے رپورٹ دیتے ہوئے کہا تو انسپکٹر صارم.... چونک اٹھا اور پورے حواس میں آتے ہوئے پوچھا۔

''کہاں مارا؟''

''اس کے گھر، مطلب جہاں وہ آج کل رہ رہا تھا اسی کے ایک بیڈ روم میں۔ میں وہیں سے بات کر رہا ہوں۔ یہاں ساتھ میں ایک لڑکی کی لاش بھی ملی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ۔'' اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا، پھر لمحہ بھر بعد بولا۔ ''مجھے تم تک پہنچنے میں تھوڑا وقت لگ جائے گا، تب تک تم ضروری کارروائی کرو۔ میں آرہا ہوں۔''

''اوکے سر۔'' اس نے کہا اور کال ختم کردی۔

جس وقت انسپکٹر صارم جائے واردات پر پہنچا تب تک صبح کی نیلگوں روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ وہ اپنی جیپ پورچ میں روک کر لاؤنج میں گیا تو وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ وہیں اُسے بتایا گیا کہ قتل اوپری منزل کے ایک کمرے میں ہوا ہے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر مطلوبہ کمرے تک پہنچا تو اس کے اسٹاف نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ ساجھے چوہدری کی لاش قالین پر پڑی تھی۔ جس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ قالین پر خون پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح بیڈ پر ایک لڑکی کی لاش پڑی تھی۔

ساجھے کے ماتھے پر ایک سوراخ تھا۔ ایک سینے میں دائیں طرف ایک پیٹ میں تھا۔ اس کے ایک ہاتھ کے پاس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہی پستول پڑا ہوا تھا۔ اسی طرح بیڈ پر ایک لڑکی کی لاش تھی، اس پر بھی چادر تھی اور بیڈ پر خون ابھی تک جما نہیں تھا۔ نوجوان لڑکی تھی اس لیے کافی خون بہا تھا اور بیڈ کے نیچے خون کا تالاب سا بن گیا تھا۔ جب وہ لاشوں کو دیکھ چکا تو اسسٹنٹ ثاقب آگے بڑھا اور مؤدب لہجے میں بولا۔

''سر، دونوں قتل ایک ہی پسٹل سے کیے گئے ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قاتل ایک ہی تھا۔ ہمارے اندازے کی تصدیق چوکیدار کررہا ہے۔ اس نے ایک ہی بندے کو دیکھا تھا جو سیڑھیوں سے چھلانگ لگا کر اس پر گرا اور اسے زخمی کرکے بھاگ گیا۔''

''چوکیدار کہاں ہے؟'' انسپکٹر صارم نے سکون سے پوچھا۔

''وہ دوسرے کمرے میں پڑا ہے، ابھی بلاتے ہیں۔'' ثاقب نے کہا اور ایک ماتحت کو اشارہ کیا۔ انسپکٹر صارم کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کہیں بھی افراتفری دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ جو کوئی بھی قاتل تھا، اس کا مقصد لوٹ مار نہیں تھا، وہ آیا اس نے قتل کیا اور واپس چل دیا۔ جب تک چوکیدار نہیں آیا، وہ یہی سب دیکھتا رہا۔ جیسے ہی وہ آیا تو انسپکٹر صارم نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا بندہ تھا۔ اس نے چوکیدار کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے کیا دیکھا؟''

''میں سو رہا تھا اور......''

''تم سو رہے تھے، مطلب چوکیدار تو پہرا دیتا ہے؟'' انسپکٹر صارم نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا تو وہ بولا۔

''وہ چوہدری صاحب نے مجھے بے فکر ہوکر سو جانے کو کہا تھا۔ اس نے تو دروازہ بھی کھلا رکھنے کو کہا تھا، اس کے کچھ دوست آنے والے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ میں جاگ رہا ہوں، تم سو جاؤ۔'' چوکیدار نے کہا۔

''کب سے یہاں ملازم ہو؟'' انسپکٹر صارم نے پوچھا۔

''پچھلے چار برس سے جی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے وضاحت کردی، ''میں جی سیٹھ واحد کا ملازم ہوں جن کا یہ بنگلا ہے، جب سے یہ بنگلا بن رہا ہے تب سے میں یہیں ہوں۔ یہ ساجھا چوہدری تو تقریباً ڈیڑھ ماہ سے یہاں ہے۔ میں اس کا ملازم تو نہیں ہوں۔''

''اوہ اچھا، تم نے کیا دیکھا، مطلب کیسا تھا وہ بندہ؟ دوبارہ دیکھنے پر پہچان لوگے؟'' انسپکٹر صارم نے پوچھا۔

''جی، امید تو یہی ہے جی۔''

''ٹھیک ہے، تمہیں چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟'' انسپکٹر صارم نے پوچھا۔

''بس خون نہیں نکلا، باقی......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

انسپکٹر صارم نے سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ پولیس کے عملے نے اپنی کارروائی مکمل کی اور دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردیں۔

انسپکٹر صارم پر اوپر سے دباؤ بڑھ گیا۔ تھانے تک جاتے ہوئے اسے تین چار کالز آچکی تھیں کہ قاتل کو جلد از جلد ڈھونڈا جائے۔ ابھی وہ تھانے پہنچا ہی تھا کہ اردلی نے حکومتی پارٹی سے تعلق رکھنے والے سیاست داں اکرم چوہدری کے آنے کی اطلاع دی۔

''اکرم چوہدری صاحب کو میرے پاس ہی بھیج دو۔'' انسپکٹر صارم نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھے جاسکتے تھے۔ لیکن جب اکرم چوہدری آیا تو اس سے اٹھ کر ملا۔ علیک سلیک کے بعد اکرم چوہدری اپنی اصل بات پر آ گیا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو ساجھے کے قاتل کو ڈھونڈ نکالو۔'' وہ ایک لمحے کو رکا، غور سے انسپکٹر کے چہرے کو دیکھا، کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''ساجھا اپنا بہت خاص بندہ تھا۔ اس سے سمجھو ہماری کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔''

انسپکٹر صارم نے اسے یقین دلایا کہ جتنی جلدی ممکن ہوا وہ قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچا کے دم لے گا۔ اور اپنی پوری ٹیم کو اسی کام کے لیے وقف کردے گا۔ اکرم چوہدری جاتے جاتے اسے یہی تاکید کرتا رہا۔ اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اگر انسپکٹر صارم نے ساجھے چوہدری کے قاتل نہ پکڑے تو وہ انسپکٹر کو ہی قتل کردے گا۔ اس کے جانے کے بعد انسپکٹر کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اسی وقت اس کا اسسٹنٹ ثاقب کمرے میں داخل ہوا۔ انسپکٹر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ساجھا کیا بلا تھی یار، اب تک مجھے اس کا قاتل تلاش کرنے کے بارے میں اوپر سے بھی کالز آچکی ہیں اور یہ اکرم چوہدری بھی اسی سلسلے میں آیا تھا۔'' اسسٹنٹ ثاقب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے باس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار دیکھ کر انسپکٹر صارم نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اپنا دوست سمجھو اور سب سچ بتا دو۔''

''وہ شہر کا سب سے بڑا غنڈا تھا۔ اب شہر میں مجیدے بھنڈر ہی سب سے بڑا بدمعاش ہے۔ آپ چونکہ نئے آئے

ہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔ ساجھا اصل میں ایک بڑے بزنس مین مختار خان کا اہم ترین بندہ تھا۔ وہ اکرم چوہدری کے لیے کام کرتا تھا۔ اور اکرم چوہدری کا شمار علاقے کے بااثر افراد میں ہوتا ہے۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا، پھر کہتا چلا گیا۔ ''یہ ایک غنڈوں کی فوج ہے۔ پورا شہر سمجھیں ان کے قبضے میں تھا۔ اکرم چوہدری اس کی ہر طرح سے سپورٹ کرتا تھا۔ ان کا کام مخالفین کو دبا کر رکھنا۔ بھتا خوری، قبضہ کرنا، بلیک میلنگ وغیرہ ہے۔''

انسپکٹر صارم نے سمجھنے والے انداز میں سر کو ہلایا اور نرم لہجے میں ثاقب سے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں ساجھے کو کون قتل کرسکتا ہے؟''

''میرا یقین کی حد تک خیال ہے کہ یہ کام مجیدے بھنڈر گینگ کا ہی ہے۔ کیونکہ ان کے علاوہ ساجھا پر ہاتھ ڈالنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔''

''اب مجیدے بھنڈر کے بارے بھی بتا دو۔'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ساجھے سے پہلے اس شہر کا وہی سب سے بڑا غنڈا تھا۔ اسے بھی دوسری پارٹی کے سیاست داں سپورٹ کرتے ہیں۔ اس پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو بھنڈر گروپ پر یکے بعد دیگرے مقدمات ہونے لگے، ان کے تین اہم افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح ساجھا گروپ سب سے بڑا گروپ بن گیا۔ بھنڈر گروپ نے اپنا بدلہ لینے کے لیے یہ قتل کیا ہوگا۔''

''ہوں۔'' انسپکٹر نے سب سمجھتے ہوئے لمبا ہنکارا بھرا۔ اب اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار تھا۔ پھر ایک خیال کے آتے ہی اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور تلاش کر کے ایک نمبر ملایا۔ کال اٹینڈ ہوئی تو اس نے صرف اپنا نام بتایا اور کافی دیر تک دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر فون منقطع کر دیا۔ اس دوران ثاقب اسے غور سے دیکھتا رہا۔ جیسے ہی انسپکٹر صارم نے فون بند کیا تو ثاقب نے پوچھا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے۔''

''ان سب کی لسٹ بناؤ جن سے حال میں ہی ساجھا گروپ کی مخالفت چل رہی تھی یا جن کو انہوں نے ٹارگٹ کیا ہو، یا جو ساجھے کے قتل سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ان سب کو پکڑ لاؤ۔ مجید بھنڈر کے جتنے بندے ہاتھ آتے ہیں، سب کو ادھر لے آؤ۔''

''جی بہتر۔'' کہہ کر ثاقب اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے باس کو زور سے سیلیوٹ مارا اور کمرے سے نکل گیا۔ صارم نے دوبارہ کسی کو کال ملا کر اس سے گفتگو شروع کر دی۔ اس کی گفتگو کا موضوع ساجھا گروپ اور بھنڈر گروپ ہی تھا۔

☆☆☆

خرم جب واپس گھر میں پہنچا تو دن نکلنے کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں آیا تو اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ ایک عام آدمی سے قاتل بن چکا ہے۔ قتل تو اشتعال میں آکر اس نے کر دیا تھا لیکن اب پچھتاووں نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس نے چپکے سے ریوالور وہاں رکھا جہاں سے اٹھایا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے سامنے کئی ایک سوال آچکے تھے۔ سب سے اہم سوال اس کے لیے یہی تھا۔ اس سے دو قتل ہو چکے تھے۔ کیا وہ محفوظ ہے بھی یا نہیں؟

ان کا پہلا تعارفی پروگرام تباہ ہو چکا تھا۔ موسیقی میں وہ اپنا برباد ہوتا ہوا مستقبل دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر دو افراد کا خون تھا۔ اس کے ساتھیوں نے تو یہی مشورہ دیا تھا کہ ظلم کرنے والے کو آخرت کے حوالے کر کے پھر سے محنت کرنی چاہیے۔ لیکن وہ اپنی ذلت پر سمجھوتا نہیں کر پایا تھا۔ ظلم ہو رہا ہو تو وہ خاموشی سے سہہ جاتا۔ اس سے ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کا خاندان تھا۔ اس کا باپ بشیر احمد فوج میں میجر تھا۔ اپنے پورے خاندان میں وہ واحد فرد تھا جسے موسیقی کا شوق تھا اس لیے وہ ہمیشہ ہتک آمیز رویّے کا شکار رہا۔ روز روز کی چخ چخ سے تنگ آکر اس نے گھر کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس نے بہانہ تعلیم کو ہی بنایا تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جہاں اس کے ہم مشغلہ دوست بنتے چلے گئے۔ اور ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' بن گیا۔ اس بینڈ گروپ کے پسِ پردہ فلم اسٹار سائرہ تھی۔ جس کی ملاقات خرم سے تین سال قبل ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ میڈم سائرہ جس پر لاکھوں افراد مرتے تھے، وہ خرم پر مرتی تھی۔ ان سب نے مل کر ایک پُرسکون جگہ پر بنگلا کرائے پر لے لیا تھا۔ دن رات ایک کر کے اپنے نام کے لیے محنت کی تھی۔ جو ساجھے چوہدری نے ایک جھٹکے میں برباد کر دی تھی اور خود اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

قتل ایک لمحے کے پاگل پن میں ہوتا ہے۔ ایسا عام طور پر شدید غصے میں ہوتا ہے۔ جب انسان عقل و شعور کھو دیتا ہے۔ قتل کرنے کے یا ہونے کے اور بھی درجنوں اسباب ہوسکتے ہیں۔ آدمی منصوبہ بندی سے بھی قتل کرتا ہے لیکن خرم سے یہ قتل شدید اشتعال کی حالت میں ہوا تھا۔ خرم کے دل میں پچھتاوے اور شکستگی کا احساس پوری طرح

جاگ اٹھا تھا۔ شدید گھبراہٹ، بے چینی اور خوف سے اس کی ہتھیلیاں پسینہ اُگلنے لگیں۔

وہ بینڈ اور میوزک کے ساتھ شغل کرنے والا نوجوان تھا۔ جسم و روح کی جدائی کے تماشے سے اس کا دور دور تک تعلق نہیں تھا۔ اس لیے اشتعال میں اپنے ہاتھوں سے قتل جیسے ارتکاب پر اس کا گھبرانا لازمی تھا۔ پریشانی بہت زیادہ بڑھی تو کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کے دوست ہاشم، ارسلان، ولید اور ایان سو رہے تھے۔ سوچیں اسے پاگل کر رہی تھیں۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب وہ اٹھا تو دن چڑھ آیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے ناشتا کیا۔ اس کے سبھی دوست جا چکے تھے۔ وہ چائے لے کر لاؤنج میں آکر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس دن سبھی چینل پر سجاد عرف ساجھا کے قتل کی اسٹوری کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا جا رہا تھا۔ دبے لفظوں میں اس کے قتل کا ذمے دار مجید بھنڈر کو گردانا گیا تھا۔ اسے کسی حد تک حوصلہ ملا۔ کسی دوسرے پر شک کا مطلب، اصل قاتل سے نگاہ ہٹ بھی سکتی تھی۔ وہ موجودہ صورتِ حال پر تیزی سے سوچنے لگا۔ اس نے چائے ختم کی اور باہر لان میں آگیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سائرہ کو فون کرے گا تاکہ اس سے بات کر کے اپنا دھیان بٹا سکے۔ ورنہ وہ اکیلا سوچ سوچ کر پاگل ہو جائے گا۔

وہ ابھی لان میں آیا ہی تھا کہ گیٹ پر دستک ہوئی۔ اس نے جیسے ہی گیٹ کھولا، سامنے چند پولیس والے کھڑے تھے۔ گیٹ سے ذرا ہٹ کر پولیس وین کھڑی تھی۔ اس نے پریشانی میں پولیس والوں کو دیکھا تو ایک نوجوان آگے بڑھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''میرا نام خرم ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''اچھا، سینڈ ڈیونز بینڈ تمہارا ہی ہے نا۔''

''جی بالکل، ہمارا ہی بینڈ ہے۔'' اس نے تصدیق کی تو پولیس والا بولا۔

چلو بیٹھو وین میں ہمارے ساتھ۔''

''کیوں میں نے کیا، کیا ہے؟'' خرم نے اعتماد سے کہا لیکن گھبراہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ جو قاتل ہوتا ہے، اسے قتل کی سزا کا علم بھی ہوتا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے پھانسی کا پھندا جھول رہا ہوتا ہے۔ اس نے سوچنے میں چند لمحے لگا دیے۔ ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر اس کو ایک بازو سے پکڑ کر کھینچا تو اسے

اچانک جیسے ہوش آگیا۔ اس نے آرام سے پولیس والے سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے کیوں پکڑا ہے، میں نے کیا کیا ہے؟''

''اس کیوں کا جواب تو بڑوں بڑوں کو نہیں ملتا۔ باقی تھانے چلو وہاں علم ہو جائے گا کہ تمہارا قصور کیا ہے۔'' ایک قدرے نرم مزاج پولیس والے نے اسے کہا۔ غالباً وہ ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

''میں یہاں گھر میں اکیلا ہوں۔ کیا میں گھر لاک کر سکتا ہوں؟''

''ہاں کرلو۔'' اس نے کہا تو وہ اندر کی جانب مڑ گیا۔ وہ اپنے کسی عمل سے گھبراہٹ ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل اس کے ساتھ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کے ساتھ وین میں بیٹھا پولیس اسٹیشن جا رہا تھا۔

خرم کو جاتے ہی حوالات میں ڈال دیا گیا۔ وہاں مزید لوگ بھی تھے۔ جن سے حال میں ہی ساجھا گروپ کے اختلافات چل رہے تھے۔ ان میں بھنڈر گروپ کے بھی دو چار افراد شامل تھے۔ جب خرم کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ انہیں صرف شک میں گرفتار کیا گیا ہے تو اسے حوصلہ ہوا لیکن دل ہی دل میں وہ خوف زدہ تھا۔ وہ خود کو تسلی دینے کے لیے وہاں موجود افراد سے اس بارے پوچھتا رہا کہ انہیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ شہر کا معروف بدمعاش قتل ہو چکا ہے۔ اس کے قتل کا ان پر شک ہے۔ ایک بندے نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ یہ خانہ پُری ہے۔ تب وہ کافی حد تک بااعتماد ہو گیا۔

شام چار بجے تک پولیس نے شہر سے دس بارہ افراد کو پکڑ لیا تھا۔ وہ سبھی حوالات میں بند تھے۔ ان سب کو نکال کر ایک کمرے میں لایا گیا۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر صارم کے ساتھ چند کانسٹیبل اندر آگئے۔ ان کے ساتھ وہی چوکیدار تھا جس کا سامنا خرم سے ہوا تھا۔ خرم کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یہ چوکیدار کسی موت کے فرشتے کے مانند آن وارد ہوا تھا۔ سبھی قطار میں کھڑے لوگوں کی طرف دیکھ کر انسپکٹر صارم نے چوکیدار سے کہا۔

''ان سب کو غور سے دیکھو اور پہچانو، کون تھا وہ؟''

چوکیدار ان سب کو غور سے دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کو لگا کہ وہ خرم کو پہچان جائے گا لیکن وہ اس کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ خرم نے سکون کا سانس لیا لیکن اس کے دل کی دھڑکن اب بھی تیز تھی۔ سب کو غور سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

''ان میں سے تو کوئی نہیں ہے جی۔''

''تم نے تسلی کر لی ہے؟'' انسپکٹر صارم نے پوچھا۔
''جی، کر لی۔'' اس نے دبے دبے لہجے میں کہا تو انسپکٹر صارم اسے لے کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے نام پتے لکھ کر انہیں بھی جانے دیا۔

پولیس اسٹیشن سے نکلتے وقت خرم حیران تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا آمنا سامنا چوکیدار سے ہوا تھا، وہ اسے پہچان سکتا تھا لیکن اس نے پہچانا کیوں نہیں؟ کیا وہ بھول چکا ہے؟ کیا اس نے جان بوجھ کر نہیں پہچانا؟ اسے کوئی خوف تھا؟ یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ جو کچھ بھی تھا، اس کی وجہ سے وہ فوری طور پر بچ گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے دو بجے انسپکٹر صارم کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کسلمندی سے آنکھیں کھولیں اور فون اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف ثاقب کا تھا۔
''سر، مل ایریا میں تین افراد قتل ہو چکے ہیں۔''
یہ سنتے ہی صارم کی نیند اُڑ گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کا فطری سوال تھا۔
''کیسے قتل ہوئے؟''
''فائرنگ سے، لگتا یہی ہے کہ دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی تھی۔'' ثاقب نے بتایا۔
''او کے، میں آ رہا ہوں۔ تم نفری لے کر فوراً وہاں پہنچو۔''

انسپکٹر صارم موقع واردات پر پہنچا تو صبح کے تین بج رہے تھے۔ مل ایریا کے ایک کوارٹر میں دو افراد کی لاشیں پڑی تھیں جبکہ تیسری لاش باہر دیوار کے ساتھ پڑی تھی۔ اس کی پیشانی میں سوراخ تھا۔ اس لاش کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اندر ایک لاش بالکل دروازے کے پاس پڑی تھی اس کے پیٹ کو چھلنی کر دیا گیا تھا۔ دور سے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس پر کلاشنکوف کا برسٹ مارا گیا ہے۔ تیسری لاش کمرے کے درمیان پڑی تھی۔ اس کے سینے میں تین چار سوراخ تھے۔ صارم نے اندازہ لگایا اس کی پشت پر کافی بڑا شگاف ہوگا۔ اس کے آنے سے پہلے ایمبولینس آ چکی تھی۔ اس نے باقی پولیس والوں سے مل کر ضروری کارروائی مکمل کی۔ تینوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا۔ وہاں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ جن میں قریبی کوارٹروں کے رہائشی بھی تھے۔ انسپکٹر صارم نے دائیں ہاتھ پر بنے کوارٹر کے رہائشی سے پوچھا جو شکل سے ہی مل مزدور نظر آ رہا تھا۔
''کیا تم نے حملہ آوروں کو دیکھا ہے؟''
''میں اپنے کوارٹر میں سو رہا تھا کہ گولیوں کی آواز سن کر بیدار ہوا۔'' اس نے بتایا تو انسپکٹر صارم نے جلدی سے پوچھا۔
''اچھا۔ پھر آگے بتاؤ۔''
''کافی دیر گولیاں چلتی رہیں۔ جب گولیاں چلنا بند ہو گئیں تو ہم سب باہر نکلے۔ تب تک یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔'' اس نے عجیب سے ڈرے ہوئے لہجے میں بتایا تو انسپکٹر صارم نے پوچھا۔
''کتنے حملہ آور تھے؟''
''یہ تو نہیں پتا جی۔'' اس نے کہا تو وہاں موجود ایک اور آدمی نے انسپکٹر کو بتایا۔
''وہ گاڑی پر تھے۔ تعداد کا علم نہیں، میں نے خود گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''
''گاڑی کا نمبر، رنگ، ماڈل میں سے کچھ بتاؤ۔'' اس نے کہا۔
''ان باتوں کا تو علم نہیں جی۔'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔
''ان قتل ہونے والوں کو کون جانتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
اس سوال کا اسے جواب انکار میں ملا۔ انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ مزید دو گھنٹوں میں وہ اتنا ہی جان پایا تھا کہ ایک گاڑی پر چند افراد آئے، انہوں نے قتل کیے اور فرار ہو گئے۔ مقتولین کو بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کسی مل میں کام نہیں کرتے تھے لیکن انہوں نے وہاں کرایہ پر کوارٹر لیا ہوا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ صبح جاتے، رات گئے ان کی واپسی ہوتی۔ بعض اوقات وہ دو دو دن کسی کام پر نہیں جاتے تھے۔ انسپکٹر صارم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مرنے والے کون تھے اور مارنے والے کون تھے۔ یہ بھی کہ ان بے چارے مزدوروں کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ یہاں سب سے الگ رہتے تھے۔ ایک طرح سے یہ جگہ انہوں نے آرام کرنے کے لیے یا چھپنے کے لیے کرائے پر لی تھی۔ وہ کسی فیکٹری میں ملازم نہیں تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس نے چار افراد کے نام لکھ لیے اور ان کو بتا دیا کہ انہیں تھانے بلوایا جائے گا۔

☆☆☆

وہ صبح صبح بیدار ہو گیا۔ خرم کا گھر اس کے سپنوں کی طرح ویران ہو چکا تھا۔ اس کا خواب بکھر چکا تھا۔ اس نے بڑی محنت سے ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' بنایا تھا۔ اب کچھ نہیں رہا

تھا۔ گھر میں موسیقی کے ٹوٹے ہوئے آلات پڑے تھے۔ اس نے سوچا اسے بھی چند دن کے لیے گاؤں چلے جانا چاہیے۔ پھر خود ہی اپنے اس ارادے کو رد کر دیا۔ وہ پولیس سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ فرار ہو جانے کی صورت میں اس پر شک پختہ ہو جاتا۔ شناخت پریڈ میں سے بچ کر نکل آنے سے وہ بہت پُراعتماد ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ساجھے کو قتل کرنے والے بہت ہو سکتے تھے۔ وہ ابھی کسی سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ سائرہ کا کئی بار فون آچکا تھا لیکن اس نے ہر بار بہانہ کر کے ٹال دیا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ کر کے ہی سائرہ اور اپنے دوسرے دوستوں سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

اب جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ اسے نئی زندگی کی پھر سے شروعات کرنی ہے۔ وہ ملک کا نامور گلوکار بننا چاہتا تھا۔ اپنی پہچان بنانا چاہتا تھا۔ اس نے نئے سرے سے پلان کر کے دوبارہ سے ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' کو ایکٹو کرنے کا سوچا لیکن فی الحال ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کے ساتھیوں کے ہمت نہیں رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اُمید رکھتا تھا۔ کیونکہ یہی ایک راستہ تھا جس سے وہ اپنی مصروفیت بنا سکتا تھا۔ جس سے شاید پولیس کی نگاہ اس پر نہ پڑتی۔ یہ اس کا گمان تھا۔

وہ انہی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے بھوک کا احساس ہوا تو یاد آیا، اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ کچن کی طرف چلا گیا۔ فریج میں کھانے کے لیے کافی کچھ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے لیے ناشتا بنایا اور لاؤنج میں بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس وقت وہ چائے پی رہا تھا جب اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے دیکھا ایک اجنبی نمبر تھا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا۔

''خرم سلطان ہی بول رہے ہو نا؟'' دوسری طرف سے نسوانی آواز میں سنجیدگی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا۔

''جی، میں خرم ہی بول رہا ہوں۔ میں آپ کو پہچان نہیں سکا؟''

''میں چشم دید گواہ ہوں ساجھے کے قتل کی۔'' اس نسوانی آواز نے اپنا تعارف کیا کروایا اسے لگا جیسے اس کے کان کے قریب بم پھٹ گیا ہو۔ اس کی زبان یوں گنگ ہوئی کہ باوجود کوشش کے وہ ایک لفظ بھی بول نہ سکا پھر خود پر قابو پا کر سختی سے بولا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''میں جانتی ہوں کہ تم نے ساجھا کو قتل کیا ہے۔'' نسوانی آواز اس کی سماعت میں دوبارہ اتری تو اس کے خون کی گردش بڑھ گئی۔

''کون ہو تم؟ میں کسی ساجھے ماجھے کو نہیں جانتا۔'' اس نے درشتی سے کہا تو اسے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن صاف محسوس ہوا۔

''میں بھی کل تک تمہیں نہیں جانتی تھی جانِ من۔'' لوفرانہ انداز میں کہے گئے جواب میں طنز پوری طرح شامل تھا۔

وہ خاموش رہا۔ یہ نئی مصیبت تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ اس نے اسے ایسے نیچے رکھ دیا جیسے اپنے نئے بنانے والے سبھی منصوبوں کو رکھا ہو جو وہ ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' کو کامیاب بنانے کے بارے میں ابھی چند لمحے پہلے بنا رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا تم کون ہو، شاید تم نے رانگ نمبر ملایا ہے۔''

خرم نے ٹھہری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ جیسے خود کو تسلی دے رہا ہو کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

''سنو فون بند نہیں کرنا۔ میرے پاس اس واقعے کے مکمل ثبوت ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس قتل کی عینی شاہد ہوں تو غلط نہ ہوگا۔'' عورت کا لہجہ راکھ کی تہ سے شعلے پیدا کرنے والا سا ہو گیا تھا۔ خرم اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے مضبوطی سے بولا۔

''کون ہو تم۔'' اسے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔

''میں جو بھی ہوں، بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔ یہی سمجھ لو، تمہاری دوست ہوں، اگر دشمن ہوتی تو سارے ثبوت پولیس اسٹیشن پہنچا دیتی۔'' نسوانی آواز میں روکھا پن اس نے واضح محسوس کیا۔

''میرے پیچھے کیوں پڑی ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، یہ کیا کہہ رہی ہو۔'' اس نے مضبوط انداز میں کہا۔

''تم ایسے نہیں مانو گے۔ پہلے اپنی بات کی سچائی کے لیے کچھ ثبوت تمہارے فون پر بھیج رہی ہوں۔'' خرم سلطان کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی، یہ نئی مصیبت اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ اس کی سوچ بکھر گئی تھی۔

''کون سے ثبوت؟''

''نیٹ آن کر کے خود ہی دیکھ لینا اور ہاں زیادہ پریشان نہ ہونا یہ ثبوت ابھی تک صرف میرے پاس ہیں۔ اچھا گڈ بائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کال بند کر دی۔

خرم کا دماغ خالی ہو چکا تھا۔ وہ ایسے شخص کی طرح تھا جو ڈوب رہا ہو۔ نہ جانے وہ کتنی دیر ایسے ہی بیٹھا رہا۔ بے

حس، بے حرکت، بے سروساماں' وہ خود کو قید محسوس کرنے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ ایسے ہی خاموش خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا رہا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کے فون پر ٹون بجی۔ اس نے سیل فون دیکھا۔ ایک چھوٹی سی ویڈیو تھی۔ اس نے دیکھا، وہ سی سی کیمرا قسم کی فوٹیج تھی۔ اس میں وہ خود صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جو اسے موت کے پھندے تک لے جا سکتا تھا۔ ویڈیو فوٹیج نے اس کے اندر گہرائی تک سناٹے بکھیر دیے۔ جس میں پستول چلاتا ہوا دیکھا جا سکتا تھا۔ پستول سے نکلنے والی گولیوں کا ہدف، ساجھا کا اذیت میں ڈوبا چہرہ اور لہولہو جسم، لڑکی کا خون آلود جسم تڑپ رہا تھا۔ اس کی ذات کی اندرونی سطح میں احساسِ جرم ایک بار پھر تازہ ہو کر اپنا جبر پھیلاتا چلا گیا۔ وہ موت کے سکوت کا دوام لیے کسی مسافر پرندے کی طرح تھک ہار کر چپ خاموش بیٹھ گیا۔ اردگرد کی فضا اس کے لیے ہیبت گاہ بن گئی تھی۔ اس کی سانسوں پر خوف کی مہر لگ چکی تھی۔ کمرے میں آنے سے لے کر واپس باہر نکل جانے تک سب صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ پسینے سے بھر گیا۔ وہ شاید پولیس سے بچ جاتا لیکن یہ سب اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔

دوبارہ فون کی گھنٹی بجی تو وہ ایک دم لرز گیا۔ اس نے سیل فون کو نفرت سے دیکھا، سائرہ کا نام بلنک کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے ریسیو کیا۔

''کہاں گم ہو تم؟ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے ہو؟''

''مم...... میں کہیں نہیں ہوں۔'' اس نے بے ساختہ لرزتی ہوئی آواز میں کہا تو سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''خرم تم ٹھیک تو ہو، کہاں ہو؟''

''میں گھر...... گھر پر ہوں۔'' باوجود خود پر قابو پانے کے پھر بھی اس کی آواز لرز گئی تھی۔ تبھی سائرہ نے پوچھا۔

''کیا بات ہے آواز سے بڑے پریشان لگ رہے ہو؟''

''میں بُری طرح پھنس گیا ہوں سائرہ۔'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا تو وہ حیرانگی سے بولی۔

''کیا مطلب؟''

''اگر تمہارے پاس وقت ہے تو آ جاتا ہوں یا تم آ جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''اسی لیے میں نے فون کیا تھا کہ آج کوئی شوٹنگ نہیں تھی۔ میں تمہارے ساتھ تھوڑا وقت گزارنا چاہتی تھی۔ خیر، تم وہیں رہو میں آ رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

سائرہ کی والدہ اس کوچے سے تعلق رکھتی تھی جسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اسے اپنے باپ کا علم ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں اپنی بیٹی کی قیمت بڑھانے کے لیے اسے پڑھا لکھا کر اشرافیہ میں موجود گاہکوں کے سامنے لانا چاہتی تھی۔ سائرہ پڑھ تو گئی لیکن شعور نے اسے اپنی دنیا سے نفرت پیدا کر دی۔ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پستی رہی۔ وہ اپنی دنیا کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن باہر والی دنیا اسے قبول نہیں کرتی تھی۔ وہ جھوٹ بول کر اگر اس معاشرے میں کوئی گھر بسا لیتی تو پتا لگنے پر نکال دی جاتی۔ وہ آگہی کا عذاب جھیلتے ہوئے احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے اس نے کتابوں سے مدد لی۔ لائبریری میں اکثر جانا آنا ہوا۔ خاموش طبع تھی۔ سب سے الگ الگ رہتی۔ دوسرے بھی اسے اچھا خیال نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک الگ ہی دنیا تھی۔ وہیں خرم سے اس کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان کتابوں اور خرم کی دوستی نے اس کی زندگی بدل دی۔ اس کے اندر خود اعتمادی آتی چلی گئی اور پھر یہ معمول بن گیا۔ شامیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ پھر اس کی والدہ کی وفات ہو گئی تو اس نے اپنا ناتا اس محلے سے توڑ لیا۔ اس مشکل وقت میں خرم نے اس کی مدد کی۔ سائرہ کے نام اس کی والدہ کروڑوں روپے چھوڑ گئی تھی۔ اس نے ایک الگ شاندار بنگلا خرم کی مدد سے لیا اور اپنی تعلیم مکمل کرنے لگی۔ پھر ایک موقع اسے مل گیا۔ اس کی والدہ کا جاننے والا ایک پروڈیوسر اس سے ملنے آیا تو اسے دیکھ کر اپنی نئی فلم میں کام کرنے کی آفر کی جو اس نے خرم سے مشورے کے بعد قبول کر لی۔ فلم بنی تو سائرہ کی دھوم مچ گئی۔

جس رات ساجھا گروپ نے ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' کے پہلے پروگرام کا ستیاناس کیا تھا تب سائرہ وہاں پہنچی نہیں تھی۔ اس سے پہلے ہی افراتفری پھیل گئی تھی۔ اس بات کو تین دن گزر گئے تھے۔ خرم پر ان تین دنوں میں کیا کیا قیامت گزر گئی تھی۔ وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ ان باتوں کا سائرہ کو علم نہیں تھا۔ وہ آئی تو خرم اسے یوں ملا جیسے کوئی ہمدرد مل گیا ہو۔ وہ اس کے سینے سے لگ گیا۔ کچھ دیر بعد سائرہ نے اسے خود سے الگ کر کے پوچھا۔

''خیر تو ہے نا خرم......؟''

''آؤ، تمہیں بتاؤں۔'' وہ اُسے لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ''تم کنسرٹ والی رات ابھی پہنچی نہیں

تھیں۔“

”ہاں، میں ٹریفک میں پھنس گئی تھی۔ میں پہنچی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔“ اس نے تیزی سے کہا تو اس کے بعد والی ساری رُوداد اس نے سائرہ کو بتا دی۔ وہ تو اس رات کا غم غلط کرنے آئی تھی۔ اب جو وہ مل بیٹھے تو خرم نے دل کھول کر رکھ دیا۔ وہ سنتی رہی اور پریشان ہوتی رہی۔

”قتل کر کے میں بہت پچھتایا، دوسرے دن پولیس پکڑ کر لے گئی۔ وہاں انہوں نے شناخت پریڈ کروائی، وہی چوکیدار وہاں موجود تھا جس کو اس رات میں نے زخمی کر دیا تھا لیکن وہ پہچان نہ سکا۔ انسپکٹر نے چند سوال کیے اور چھوڑ دیا۔“

”اب اس میں پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ تم آج ہی ملک سے نکل جاؤ، جتنا خرچ ہوگا میں دے دیتی ہوں۔“ اس نے خرم کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو وہ پریشانی سے بولا۔

”لیکن اب میں کسی دوسرے عذاب میں پھنس گیا ہوں۔“

”کیسی پریشانی؟“ سائرہ نے تشویش سے پوچھا تو اس نے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ ویڈیو دیکھو۔“

سائرہ نے وہ ویڈیو دیکھی تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے کچھ دیر تک خرم کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”پریشان نہیں ہونا، میں ہوں نا۔ میں کچھ نہ کچھ کرلوں گی، بس تم نے اپنے حواس قابو میں رکھنے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا، ”یہ...... یہ ویڈیو بھیجی کس نے ہے؟“

اس کے پوچھنے پر وہ اس اجنبی عورت کی کال کے بارے میں بتانے لگا۔ ابھی وہ تفصیل بتا رہا تھا کہ وہی انجان نمبر اسکرین پر جگمگانے لگا۔ کچھ سوچ کر اس نے کال ریسیو کر لی۔

”امید ہے اب میرے عینی شاہد ہونے پر کوئی شک نہیں رہا ہوگا۔“ وہی سماعتوں میں زہر گھولتی آواز سنائی دی۔

”کیا چاہتی ہو؟“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اعتماد سے کہا

”تم ایک اور قتل کرو گے۔“ لہجہ اب ہر قسم کی کھنک سے عاری اور سپاٹ ہو چکا تھا تو وہ بے ساختہ بولا۔

”کک...... کیا مطلب؟ میں قتل کیوں کروں گا؟“

”ہاں تمہیں ایک مزید قتل کرنا ہوگا۔“ اس نے کہا اور خاموش ہو گئی پھر ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”یا پھر دو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی چڑھنا ہوگا۔“

”م...... مگر کس کو اور کیوں؟“ اس کی زبان سے یہ لفظ بے اختیار ادا ہوئے تھے۔

”یہ وقت آنے پر بتا دیا جائے گا۔“ سکون بھری آواز ابھری۔

”تم کون ہو۔ میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”میں تمہاری دوست ہوں۔ میں اپنے دشمن کا قتل چاہتی ہوں اور یہ کام اب تم کر سکتے ہو۔“

”وہ سب وقتی اشتعال تھا، اب میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں پیشہ ور نہیں ہوں۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”جانتی ہوں۔ سنو۔! میں تمہیں بچانا بھی چاہتی ہوں۔ جسے قتل کروانا چاہتی ہوں، جیسے ہی وہ جہنم واصل ہوا، میں سارے ثبوت تمہیں دے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو خرم نے ہتھیار ڈال دیے۔ مرے ہوئے لہجے میں بولا

”کسے قتل کرنا ہے؟“

”وقت آنے پر بتا دوں گی، جب میں نے یہ سمجھا کہ تم اب میری بات ماننے کے لیے تیار ہو۔“ یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے فون ایک طرف رکھا اور صوفے پر ڈھے گیا۔

”اب کیا ہوگا؟“

سائرہ کی آواز اسے دور سے آتی سنائی دی۔ وہ اسے ایسے دیکھنے لگا جیسے یہ سوال تو اسے کرنا چاہیے تھا۔ یہ جواب تو اسے درکار ہے۔ یہ سوال اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ سائرہ نے اسے ساکت دیکھا تو حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ وہ یہ ثبوت کسی طرح بھی پولیس کو نہیں دے گی۔ اس وقت تک ہم پتا چلاتے ہیں وہ ہے کون؟ اس کے سبھی نمبر مجھے دے دو۔“

خرم نے دونوں نمبر سائرہ کو لکھوا دیے۔ وہ کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھی اسے نہ صرف حوصلہ دیتی رہی بلکہ ذہن کسی دوسری جانب لگانے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ جس وقت سائرہ اس کے گھر سے نکلی اسے بھی ساتھ لیتی گئی تاکہ

آلۂ قتل جو پسٹل تھا، اسے ندی میں پھینک سکیں۔

☆☆☆

کہر کے دبیز پردے کو دھوپ کی تمازت نے گھائل کر دیا تھا۔ جسم کے ساتھ ساتھ آنکھوں کو بھلی لگنے والی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ انسپکٹر صارم کی گاڑی بل کھاتی شہر کے وسط میں جانے والی سڑک پر تیزی سے اُڑی جا رہی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بہنے والی ندی شاداب منظر بکھیرتی جا رہی تھی۔ جائے وقوعہ زیادہ دور نہ تھی۔ پانچ منٹ کی ڈرائیو کے بعد انسپکٹر صارم وہاں پہنچ گیا۔ لاش ایک نوعمر لڑکے کی تھی۔ سڑک کے کنارے اوندھے منہ پڑی تھی۔ خون اس کے چہرے کے گرد سوکھ جانے والے تالاب کی صورت موجود تھا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ انسپکٹر صارم وہاں پہنچ کر ہجوم کو چیرتا ہوا لاش کے پاس پہنچا پھر اکڑوں بیٹھ کر مرنے والے کا معائنہ کرنے لگا۔ مقتول کی کنپٹی پر سوراخ تھا، جہاں سے موت نے راستہ بنایا تھا۔ سر سے نکلنے والے خون نے اسے چہرے سے سینے تک جیسے زمین سے چپکا رکھا تھا۔ خون جم کر خشک ہو چکا تھا۔ انسپکٹر صارم کے محتاط اندازے کے مطابق مقتول کو مرے ہوئے ایک گھنٹے کے لگ بھگ وقت ہو چکا تھا۔ انسپکٹر نے ثاقب خان کی طرف دیکھا پھر اس نے ہجوم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''مقتول کون ہے؟ اور یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''سر! تھانے میں قتل کی اطلاع دینے والے انہی لوگوں میں سے دو ہیں۔ ان کا کہنا ہے مقتول مجید بھنڈر گروپ کا بندہ ہے۔ اس کا نام عرشو ہے۔ قاتل بھی دو سے زائد بندے تھے جو کہ گاڑی میں سوار تھے۔ گندم کے کھیتوں میں سے چل کر ندی کی طرف آتا مقتول شاید مسلسل ان کی نگاہ میں تھا۔ ندی عبور کر کے اس کے سڑک پر نمودار ہوتے ہی اچانک رکنے والی گاڑی سے اس پر پستول سے گولیاں برسائی گئیں۔ جن میں سے ایک گولی اسے لگی اور یہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔''

ثاقب کی بات ختم ہوئی تو ہیڈ کانسٹیبل ثناء اللہ نے بلند آواز سے اطلاع دینے والوں کو صاحب کے سامنے پیش ہونے کا کہا۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ انسپکٹر کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے تو صارم نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں کیسے علم ہے کہ یہ مجیدے بھنڈر گروپ کا ہی بندہ ہے؟''

''جی ہم نے یہ نہیں کہا کہ مرنے والا مجید بھنڈر کا بندہ ہے، ہم اسے نہیں جانتے۔'' ان میں سے ایک تیزی سے بولا تو صارم نے پہلے ثاقب اور پھر ثناء اللہ کی جانب دیکھا۔ بیس پچیس بندے گول دائرے میں لاش اور پولیس والوں کے چاروں طرف کھڑے تھے۔''

''مجید بھنڈر کا نام تو جی کسی اور نے لیا تھا۔ یہ تو قتل کے عینی شاہد ہیں جی۔'' ہیڈ کانسٹیبل ثنا اللہ نے بات کی وضاحت کی۔

''کہاں ہے وہ بندہ؟''

''میں نے کہا تھا، میں اسے جانتا ہوں۔'' ہجوم میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' انسپکٹر صارم نے نرم آواز میں پوچھا۔

''میرا نام لطیف بدر ہے۔ میں کرائم رپورٹر ہوں۔'' اس نے اپنا مکمل تعارف کروایا تو اس نے پوچھا۔

''یہ بھنڈر گروپ سے تعلق رکھتا ہے، ایسا کیوں کہا تم نے؟''

''اس کی تصویر کئی بار اخبار میں شائع ہو چکی ہے۔'' وہ سکون سے بولا تو انسپکٹر صارم گردن ہلا کر رہ گیا۔ دھوپ اچھی خاصی چڑھ آئی تھی۔ اس وقت تک ایمبولینس بھی آ گئی تھی۔ انسپکٹر کے حکم پر پولیس والوں نے دو عینی شاہدوں اور لطیف بدر کو تھانے لے جانے کا بندوبست کیا اور لاش کو پوسٹ مارٹم والوں کے حوالے کر دیا۔

انسپکٹر صارم نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ وہاں اردگرد کوئی آلۂ قتل بازیاب نہ ہو سکا۔ وہاں پر کھڑے افراد سے انسپکٹر مخاطب ہوا۔

''ویسے تو اس قسم کے لوگوں کی موت کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے۔ پھر بھی قتل کرنے والے کو کیفرِ کردار تک پہنچانا پولیس کا فرض ہے۔ تم میں سے قاتلوں کو کوئی جانتا ہے؟ تاکہ ان تک پہنچا جا سکے۔'' اس کے سوال کا جواب نفی ہی میں ملا۔ وہ ان سے مایوس ہو کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ تھانے پہنچا تو کچھ صحافی اس کے انتظار میں جمع تھے۔ وہ اس سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ جن میں سے چند ایک کا جواب اس نے دیا مگر انہیں مطمئن نہیں کر پایا۔ اپنے دفتر پہنچا تو اس کے ماتحت نے ایک حکم نامہ اسے تھما دیا۔ آئی جی نے اسے طلب کیا تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے ثاقب کو بلوایا۔ اس وقت تک وہ فون کال پر مصروف رہا۔ جیسے ہی ثاقب کمرے میں داخل ہوا انسپکٹر اس

سے مخاطب ہوا۔

''اب تک کتنے افراد ہم نے گرفتار کیے ہیں؟''

''جی کل بیس افراد۔''

''ان میں سے کتنے افراد کو چھوڑ دیا؟''

''جن پر کوئی شک نہیں تھا، گیارہ افراد کو چھوڑ دیا ہے۔''

''جو ہمارے پاس ہیں اُن میں کس کا تعلق کس گروپ سے ہے؟''

''بظاہر تو زیادہ کا تعلق مجیدے بھنڈر گروپ سے ہے۔ کچھ ساجھا گروپ کے ہیں۔''

''مجھے بتایا جائے، مزید کتنے افراد ہم ان دونوں گروپس میں سے گرفتار کر سکتے ہیں؟''

''اتنے ہی اور نظروں میں ہیں۔''

''ان سب کو آج رات تک چھاپ لو۔ مجھے شہر میں اب بالکل امن چاہیے۔''

''اوکے باس۔''

''مجھے آئی جی نے بلوایا ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔''

اس پر اسسٹنٹ ثاقب خاموش ہی رہا۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر صارم آئی جی آفس جا پہنچا۔ آئی جی صاحب جیسے اس کا ہی انتظار کر رہے تھے۔

''ایک ہفتے میں سات افراد کا قتل ہو چکا ہے۔ ہم سے پوچھا جا رہا ہے۔ یہ اندھیر نگری بن گئی ہے۔ کیا کر رہے ہو وہاں۔''

''سر، آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں اور میرا عملہ پوری کوشش کر رہا ہے۔''

''کوشش گئی بھاڑ میں، دونوں طرف سے سب کو پکڑ لو۔''

''جی کل تک دونوں گروپس کا مکمل صفایا کر دیا جائے گا۔''

''ہوم منسٹر نے پوچھا ہے ساجھا کا قاتل اب تک گرفتار کیوں نہیں ہوا؟''

''اس کا قتل مجیدے بھنڈر کے گروپ نے کیا ہے۔ کل تک اس گروپ کا ایک ایک فرد گرفتار کر لیا جائے گا۔''

''اپنے علاقے پر توجہ دو۔ ورنہ مجبوراً مجھے تمہارا تبادلہ کرنا ہوگا۔''

''جی بہتر جناب۔''

واپسی پر انسپکٹر کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ دیکھی جا سکتی تھی۔ چند دن میں انسپکٹر نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ شہر کے سبھی غنڈوں کو پکڑ کر اس نے جیل بھر دی تھی۔ ان میں مجیدا بھنڈر بھی شامل تھا۔ اس سے ایک دم جرائم میں کمی ہو جانی چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لکھنے والا امن و شانتی نہیں لکھ پا رہا تھا۔ اس قتل و غارت گری پر انسپکٹر صارم بہت پریشان تھا۔

☆☆☆

چند دن میں زندگی معمول کی طرف پلٹ آئی تھی۔ خرم کو لگا جیسے ساجھے قتل کیس میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ پولیس نے اسے دوبارہ نہیں چھیڑا تھا۔ لیکن خطرے کی تلوار اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ اس اجنبی عورت کے بارے میں اسے ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی تھی جس نے اس کے بارے میں ثبوت فون پر بھیجے تھے۔ وہ جب بھی اُسے فون کرتا، وہ نمبر بند ہی ملتا تھا۔ اس پر خرم نے کئی پیغام بھی بھیجے لیکن کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اگر کوئی سامنے ہوتا تو شاید کوئی ڈیل بھی ہو جاتی لیکن اَن دیکھا خوف نہ صرف پریشان کر کے رکھ دیتا بلکہ اس کا ڈر بھی بڑھ جاتا۔ خرم کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ یہ کوئی معمولی پریشانی نہیں تھی۔ اس کی زندگی کی ڈور کسی ایسی عورت کے ہاتھ میں تھی جس کے بارے میں وہ جانتا تک نہیں تھا۔ نہ اس سے رابطہ ہو پا رہا تھا اور نہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں وہ واپس اپنے گاؤں نہیں گیا بلکہ وہیں رہ رہا تھا۔ سائرہ اس کا تمام تر خرچ برداشت کر رہی تھی۔ سائرہ نے اسے اپنا ذہن اس خوف سے ہٹانے کے لیے مشورہ بھی دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ پھر سے ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' کو متعارف کروائے۔ دوبارہ اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے اس ڈر کو دماغ سے نکال دے مگر وہ اب تک کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔

ایسی ہی ایک صبح جب وہ بیدار ہوا تو اس کے سرہانے رکھا فون بجنے لگا۔ اس نے کسلمندی سے فون اٹھا کر اسکرین پر دیکھا تو اسی اجنبی عورت کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے بڑے نرم انداز سے پوچھا گیا۔

''کیسے ہو؟''

''تمہارے خیال میں کیسا ہو سکتا ہوں۔'' اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے بظاہر سکون سے کہا۔

''اچھا ایک کام کرو مگر پہلے یہ بتاؤ جہاں تم رہتے ہو، وہاں دوسرا اور کون کون ہے؟''

''کوئی بھی نہیں، بس میں اور میرا ملازم ہے۔'' اس نے صاف کہہ دیا تو وہ بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے، تم گیٹ پر جاؤ، وہاں ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس سے بیگ لے لو۔''

''اس بیگ میں کیا ہے؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''جاؤ گیٹ تک......اور فون بند مت کرنا۔'' اجنبی عورت نے سخت لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر باہر کی جانب چل دیا۔ گیٹ پر ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے خرم کو غور سے دیکھا اور ایک سیاہ رنگ کا درمیانہ سا کینوس کا بیگ آگے بڑھا دیا۔

''ایک آدمی ہے اور وہ......''

''بیگ لے لو اُس سے۔'' اجنبی عورت نے کہا تو خرم نے تیزی سے بیگ پکڑ لیا۔ وہ آدمی فوراً گھوما، چند قدم دور کھڑی بائیک اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

''وہ چلا گیا ہے؟'' خرم نے بتایا۔

''اس میں دس لاکھ ہیں۔''

''دس لاکھ......'' اس نے حیرت سے کہا اور فوراً بیگ کھول لیا۔ بڑے نوٹوں کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا، ''یہ کس لیے؟''

''یہ رقم لو اور اپنے میوزک پروگرام کا خواب پورا کرو۔'' اجنبی عورت نے شاہانہ انداز میں کہا تو خرم نے ایک لمحے سوچا پھر پوچھا۔

''مجھ پر یہ عنایت کس لیے؟''

''ساجھے کی وجہ سے تمہارا جو نقصان ہوا تھا، میں نے وہ پورا کر دیا ہے۔ تم نے نادانستگی میں میری برسوں کی خواہش پوری کر دی تھی۔'' اجنبی عورت نے یوں کہا جیسے اسے تسکین مل رہی ہو۔

''کون سی خواہش؟'' اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ساجھے کے قتل کی خواہش۔ جو تم نے انجانے میں پوری کر دی۔ میں ساجھے سمیت اس بندے کو مروانا چاہتی ہوں، جس کے بارے میں ابھی تک تمہیں پتا نہیں۔''

''کون ہے وہ؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''جب تم ذہنی طور پر اُسے مارنے کو تیار ہو جاؤ گے تو بتا دوں گی ابھی تم موج کرو۔'' یہ کہتے ہوئے اس اجنبی عورت نے فون بند کر دیا۔

خرم کے سامنے بیگ میں دس لاکھ کی رقم پڑی تھی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ آخر وہ عورت چاہتی کیا ہے؟ جسے قتل کرنا ہے، اس کا نام نہیں بتا رہی۔ ایک بڑی رقم اسے سونپ دی کہ اپنا شوق پورا کرو۔ ساجھے کو بھی قتل کروانا چاہتی تھی؟ یہ سب کیا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں سوال آیا۔ اس نے ساجھے کے کمرے میں لگے کیمرے کی ریکارڈنگ کیسے حاصل کی؟ وہ جو کوئی بھی تھی، ساجھے کے بالکل قریب تھی۔ پھر اس حد تک رسائی رکھتی تھی کہ اس ریکارڈنگ والے کیمرے تک سے ریکارڈنگ لے اُڑے؟ یہ ریکارڈنگ صرف اسی تک پہنچی ہے یا کوئی دوسرا بھی......نہیں، اگر کسی دوسرے کے پاس ہوتی تو اب تک وہ اس تک پہنچ چکا ہوتا۔ شہر میں جو مجید بھنڈر اور ساجھا گینگ کے درمیان ایک لڑائی چل رہی تھی، دونوں طرف سے جو لوگ پکڑے گئے، یہ سب ڈراما نہیں تھا۔ مجیدا گینگ، ساجھا گینگ یا پھر پولیس، ان تینوں کے پاس اگر ریکارڈنگ ہوتی تو اب تک وہ دھر لیا گیا ہوتا۔ اس گینگ وار میں اتنے قتل نہ ہوتے۔ یہ لڑائی تھمی نہیں تھی۔ البتہ اس کی شدت میں کمی ضرور آ گئی تھی۔

اس نے سوچا، وہ جو کچھ بھی تھا، یہ حقیقت تھی کہ سارے ثبوت اس عورت کے پاس کیسے پہنچے، یہ تو وہی بتا سکتی تھی۔ اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے سبھی سوچوں کو ایک طرف جھٹکا اور سب سے پہلے ملائکہ کو فون کیا کہ وہ فوراً اس سے ملنے چلی آئے۔

☆☆☆

ایک مقامی اخبار کے پہلے صفحے پر ایڈیٹر کا خاص مضمون شائع ہوا تھا جس میں حالیہ گینگ وار کے بارے میں خوب بھڑاس نکالی گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے، لوگوں کی زندگیاں محفوظ نہیں، اس کا ذمے دار پولیس اور حکمرانوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔ دبے لفظوں میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ اس کے پس پشت کون لوگ ہو سکتے ہیں، جلد ہی انہیں بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔ ایڈیٹر نے اسے تخریبی کارروائی کا ایک سنگین اور بدترین اقدام قرار دیا تھا۔

انسپکٹر صارم نے مضمون پڑھا اور اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اس کی بیوی نے اپنے شوہر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھے تو اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی کہ کس خبر نے اس کے میاں کے چہرے پر اثرات مرتب کیے تھے۔ جلد ہی وہ مضمون اس کی نظروں میں آ گیا۔

''ہر حادثے میں غریب ہی کیوں مارے جاتے ہیں'' صائمہ نے چائے پیتے ہوئے انسپکٹر صارم سے پوچھا۔ وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ صائمہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''عام آدمی جو کہ بہت خاص ہوتا ہے۔ ہر بننے والی عمارت میں اس کا خون، وقت، ہنر

استعمال ہوتا ہے۔ یہی غریب آدمی ہر حادثے میں، بڑے آدمیوں کی جگہ اپنی جان قربان کرتے ہیں۔ ان کے ووٹوں سے امیر لوگ منتخب ہو کر اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔ پھر وہی کیوں مرتے ہیں؟''

''امیر اور غریب کی یہ جنگ تو نجانے کب سے چل رہی ہے۔'' انسپکٹر صارم نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر تلخی سے کہا تو اس نے بحث کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''ہاں مگر سوال یہ ہے کہ غریب ہی کیوں مارا جاتا ہے؟''

''حضور آپ ہی فرما دیں۔'' اس نے زچ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''ان غریب لوگوں میں بس ایک ہی خامی پائی جاتی ہے۔ وہ خود پر مسلط ان امیر لوگوں کو ہٹانے کے لیے خود میں اتحاد پیدا نہیں کرتے۔ اسی لیے کیڑے مکوڑوں کی طرح، کبھی سڑکوں پر، کبھی فیکٹری کی جلتی آگ میں، کبھی بھوک و افلاس کے ہاتھوں مرتے چلے جاتے ہیں۔''

انسپکٹر نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ صائمہ کی فلسفہ زدہ باتیں معمول کے مطابق چلتی رہتی تھیں۔ انسپکٹر تھانے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی دوران میں اسسٹنٹ ثاقب کا فون آ گیا

''سر، اکرم چوہدری نے آپ کو اپنے ڈیرے پر بلایا، اس کی دوبار تھانے کے نمبر پر کال آ چکی ہے۔''

''مجھے تو اس نے فون نہیں کیا؟'' اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا، پھر بولا، ''ٹھیک میں اُدھر سے چکر لگاتا ہوا آتا ہوں۔''

انسپکٹر صارم کچھ دیر بعد اکرم چوہدری کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ ڈیرے پر رش لگا ہوا تھا۔ شہر کے تمام صحافی جمع تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ برس پڑا۔

''تمہارا عملہ اور تم کہاں ہو۔ تم اپنے فرائض سے غفلت برت رہے ہو۔ شہر کا کیا حال ہو گیا ہے۔ اس گینگ وار کا ذمے دار آخر کون ہے؟''

انسپکٹر صارم کا دل تو چاہا کہ وہ کہہ دے کہ جناب آپ ہی تو ہیں اس کے پس پردہ لیکن اتنا کچھ کہنے کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ورنہ وہ اسی وقت کہہ دیتا۔ وہ بڑے سکون سے بولا۔

''جناب ہم مجرموں تک پہنچنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔''

''تم سے زیادہ باخبر تو وہ لوگ ہیں جو وہاں جا پہنچے تھے، جہاں اُن کا دشمن چھپا ہوا ہوتا ہے۔''

''ان لوگوں کے بارے آپ بتائیں سبھی جیل میں ہوں گے۔'' انسپکٹر صارم نے اکرم چوہدری کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ تیزی سے بولا۔

''میں ایسے کیسے کہہ سکتا ہوں، یہ آپ پولیس کا کام ہے۔''

''ایسے ہم کسی بے گناہ کو کیسے گرفتار کریں جناب۔'' انسپکٹر نے دل کی بات کہہ دی۔

''مجرم کو تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔'' اکرم نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم کوشش کر رہے ہیں۔ جلد ہی اس گینگ وار کے پیچھے جن لوگوں کا ہاتھ ہے، وہ سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔'' انسپکٹر صارم نے کہا تو وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر دبے لفظوں میں بولا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو سکے، آپ مجرموں تک پہنچیں۔''

''جی ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا وہ صحافیوں کے سامنے صرف بھاشن دینے لیے اس پر رعب جھاڑ رہا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

خرم اور اس کے دوست پھر سے سینڈ ڈیونز بینڈ بنا کر ایک بڑے پروگرام کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ وہ پہلے کی طرح دن رات محنت کرنے لگے۔ اس بار انہوں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ خرم نے انہیں یہی کہا تھا کہ پہلے محنت کریں پھر جیسے ہی مناسب وقت آیا، پروگرام کر لیں گے۔

انہیں ریاضت کرتے ہوئے ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے۔ ایک صبح وہ ناشتے سے فارغ ہو کر سکون سے بیٹھا تھا کہ سائرہ اس کے پاس آ گئی۔ وہ دونوں اپنی ہی باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ آج شام اس کے دوستوں کو پروگرام کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ دونوں طے کرنا چاہتے تھے۔ ان کے درمیان بحث چل رہی تھی کہ خرم کا فون بج اٹھا۔ اسی اجنبی عورت کی کال تھی۔ خرم نے سائرہ کو اسکرین دکھاتے ہوئے کہا۔

''اسی کا فون ہے۔''

''ریسیو کرو اور اسپیکر آن کر دو۔'' سائرہ نے کہا تو اس نے ویسا ہی کیا۔

''کیسے ہو اور سب کیسا چل رہا ہے؟'' اجنبی عورت نے نرم سے انداز میں پوچھا تو وہ منمناتے ہوئے بولا۔

''سب ٹھیک چل رہا ہے۔''

''اچھا، سنو، ابھی کچھ دیر بعد تمہیں میرا وہی آدمی دو لاکھ دے جائے گا، وہ لے لینا۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''ٹھیک ہے مگر یہ اتنی نوازش کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی بتا رہی ہوں، یہ رقم تمہیں اس لیے دے رہی ہو کہ جسے تم کو مارنا ہے، اس کی تیاری کے لیے تمہیں پیسوں کی کمی نہ رہے۔'' اجنبی عورت نے کہا۔

''لیکن مارنا کسے ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''مختار خان کو۔'' اس نے جیسے ہی نام لیا، گویا ایک بم پھٹ گیا۔ خرم کی آنکھیں جیسے ابل پڑیں۔ وہ بے ساختہ کہتا چلا گیا۔

''وہ، شہر کا سب سے بڑا بزنس مین، جس کے آگے پیچھے کئی سیکیورٹی گارڈ ہوتے ہیں۔ جس کے بارے میں پتا نہیں چلتا کہ وہ کب اور کہاں ہوتا ہے، اُسے میں کیسے مار سکوں گا؟''

''شٹ اَپ۔'' موبائل فون کا اسپیکر جیسے چلّا اٹھا۔ ''سنو، میں تمہیں دو ہفتے کی مہلت دے رہی ہوں۔ کام ہو جانے پر تمام ثبوت تمہیں مل جائیں گے۔ ورنہ تم خود ذمّے دار ہو گے۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی فون خاموش ہو گیا۔ اس کا حکم قہر بھرے جھکڑ کی طرح کافی دیر تک اس کی سماعت سے ٹکراتا رہا۔

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ خرم کی حالت یوں ہو گئی جیسے اس کے بدن سے جان نکال لی گئی ہو۔ اس کے سامنے بیٹھی سائرہ گہری سوچ میں گم تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتے، بیل بجی۔ کوئی گیٹ پر تھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' خرم اٹھا تو سائرہ نے کہا۔

''رقم واپس نہ کرنا، لے لینا۔''

''کیوں، مطلب......'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہیں بتاؤں گی، ابھی جاؤ اور رقم لے آؤ۔'' سائرہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر باہر چل دیا۔

گیٹ پر وہی شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ خرم کو دیکھتے ہی اس نے بیگ بڑھا دیا۔ خرم نے بیگ پکڑا تو وہ انہی قدموں پر مڑا، بائیک اسٹارٹ کی اور چل دیا۔ وہ واپس کمرے میں آیا، اس نے بیگ بے دلی سے ایک جانب صوفے پر پھینک دیا۔

سائرہ کو خرم کے چہرے پر صدیوں کی تھکن نظر آئی۔ زندگی کی آخری شب کی سی پستی کا تاثر اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ خرم کو اس بے بسی کی حالت میں دیکھ کر سائرہ کو افسوس ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ کھینچا اور روشنی کمرے میں دوچند ہو گئی۔ وہ چلتی ہوئی خرم تک آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''مختار خان کو تمہارا قتل کرنا کوئی غلط کام نہیں ہوگا بلکہ تم ایک نیک کام کرو گے۔''

''کیا مطلب۔'' وہ آنکھوں میں حیرانی سمیٹ کر بولا۔

''مختار خان ننگِ انسانیت ہے۔ وہ آدمیت کے ماتھے پر بدنامی کا کلنک ہے۔ وہ ایک ناسور ہے جو بہت جلد اس شہر سے لے کر پورے ملک کی جڑوں میں پھیل جائے گا۔''

''وہ کیسے؟'' وہ حیران ہوا۔

''وہ اس طرح کہ مختار خان ہر بار الیکشن اپنی دولت اور بدمعاشی کے بل بوتے پر جیت جاتا ہے۔ وہ خود الیکشن نہیں لڑتا بلکہ اس نے اکرم چوہدری جیسے چند گھوڑے پال رکھے ہیں .... وہ ان پر دولت لگاتا ہے۔ وہ اپنی سیاہ دولت کے ذریعے علاقے کے نامی گرامی بدمعاشوں اور اپنے اثر رسوخ سے اردگرد کے علاقوں پر تسلط رکھتا ہے۔ کیونکہ ان علاقوں کا ہر تیسرا گھر پولیس کا مستقل گاہک ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ ہی جرم ہے، کسی بھی قسم کا جرم ہو، پولیس نے ان کو نہیں چھوڑنا ہوتا۔ پولیس سے ان کو مختار خان ہی بچاتا ہے۔ ان کے لیے بلکہ اپنے فائدے کے لیے۔ کبھی کوئی زبان اس کے خلاف زہر اگلتی ہے تو وہ مکارانہ چال کے بل بوتے پر ان بولنے والوں کا منہ دولت کے زور سے بند کر دیتا ہے۔ اگر دولت بھی کام نہیں کرتی تو زبان ہی بند کر دیتا ہے۔ اس کے اکثر مخالفین حادثاتی موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی ایکسیڈنٹ میں مارا جاتا ہے۔ کوئی مجرم بنا کر پولیس مقابلے میں کام آ جاتا ہے۔ کوئی دہشت گردی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن اصل میں یہ سب مختار خان کا شکار ہوتے ہیں۔ اب تک نہ جانے وہ کتنے قتل کروا چکا ہے۔

پہلے تو وہ صرف ہیروئن کی اسمگلنگ کرتا تھا، اب اس نے خوبصورت عورتوں کی اسمگلنگ کا بھی دھندا شروع کر دیا ہے۔''

سائرہ کے منہ سے مختار خان کے بارے میں سن کر خرم سرتاپا لرز گیا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر دھیرے سے

بولا ''مگر اس سب کی کسی کو خبر نہیں ہے۔ تم کیسے جانتی ہو؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''طوائف کے سامنے بڑے بڑے لوگ بے لباس ہو جاتے ہیں۔ اس کا علم ہم جیسوں کے علاوہ کس کو ہو سکتا ہے؟ ان جیسے لوگوں کے طوائفوں، کال گرلز سے تعلقات کوئی راز کی بات نہیں۔ جب کسی خاص مہمان کی آؤ بھگت کرنی ہو یا کوئی نیا مرغا پھانسنا ہو تو پھر کوٹھوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ وہیں سے یہ باتیں کھلتی ہیں، میں نے اس بارے میں کافی معلومات جمع کی ہوئی ہیں۔ ماضی کی ایک مشہور فلم ایکٹرس جو اچانک عین دورِ عروج میں منظر سے ہٹ گئی تھی، اس کی رکھیل ہے۔ اس سے میرا پرانا رابطہ ہے۔'' سائرہ نے اسے مطمئن کر دیا۔

''لیکن مجھے اُسے قتل کرنے کے لیے صرف دو ہفتوں کا وقت دیا گیا ہے۔ میں کیسے کر پاؤں گا یہ سب؟''

''تم فکر نا کرو۔ فریش ہو جاؤ۔ دو ہفتے بہت ہوتے ہیں۔ اب تم اکیلے نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہیں ان حالات میں نہیں چھوڑ سکتی۔'' سائرہ نے کہا تو خرم کی سنجیدگی مزید گہری ہو گئی۔ خرم کو لفظ اب اجنبی سے لگ رہے تھے۔

خرم نے مختار خان کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسے اپنی جان بچانا تھی لیکن ایک دھڑکا اب بھی لگا ہوا تھا کہ اگر اس کے ثبوت نہ ملے تو کیا کرے گا؟ یہ ایک قتل کرنے کے بعد اگر اس نے کوئی مزید قتل کرنے کا کہہ دیا تو کیا ہوگا؟ اس وقت تو صرف ایک فون کال ہی سے رابطہ تھا اگر وہ کہیں گم ہو گئی تو پھر کیا ہوگا؟ ایسی کئی سوچیں اس کے دماغ میں آتی تھیں مگر مجبوری یہی تھی کہ وہ اس اجنبی عورت کے حکم کا پابند ہو گیا تھا۔

ایک دن اس نے یہی سوال سائرہ کے سامنے رکھے تو وہ بولی ''اگر اس نے دھوکا دیا تو پھر اسے بھی تلاش کر لیں گے۔ پھنس تو گئے ہیں، مزید اب کیا پھنسنا۔ یہ جُوا تو اب کھیلنا ہی پڑے گا۔''

''وہ اتنی زیادہ سیکیورٹی رکھنے والا اور میں نہتا، یہ کیسے ہوگا؟'' اس نے پریشان ہوتے ہوئے کہا تو سائرہ بولی۔

''ہو جائے گا۔ تم اپنی پوری توجہ مختار خان کے قتل پر لگا دو۔''

''مجھے اُس کے بارے میں خاک پتا نہیں، یہ دو ہفتے تو اُس کے بارے میں پتا کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔'' اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں دو دن میں ساری معلومات دے دوں گی بلکہ میرے ذہن میں پلان بھی آ رہا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''بتاتی ہوں۔ مجھے تھوڑا سوچنے دو۔'' سائرہ نے کہا۔

''او کے ہو گیا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر صارم دو دن اور ایک رات سے مسلسل مصروف تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت پرانی فائلیں دیکھتے ہوئے گزرتا، کبھی وہ اکیلے ہی نکل جاتا، یا پھر سیل فون پر لمبی لمبی کال کر کے باتیں کرتا رہتا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی ہوش ہی نہ ہو۔ ایک سہ پہر وہ تھانے میں آیا تو خاصا فریش لگ رہا تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر بہترین ویسٹ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی محفل میں جا رہا ہو۔ اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہی ثاقب کو بلا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آیا اور سیلوٹ کر کے پوچھا۔

''جی سر آپ نے مجھے بلایا۔''

''یار ایک کام کرو، جلدی سے نفری بلاؤ، جتنے لوگ مل جائیں اتنے ہی کم ہیں۔ ان میں زیادہ سے زیادہ لیڈی کانسٹیبل ضروری ہیں، کہیں پر فوراً ریڈ کرنا ہے۔'' اس نے کہا تو ثاقب نے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

''یس سر، ابھی ہو جاتا ہے۔''

''اور ہاں سنو، جلدی واپس آؤ، تمہارے ساتھ چائے پینی ہے۔''

''او کے سر۔'' اس نے کہا اور سیلوٹ مار کر تیزی سے یوں باہر نکلا جیسے اسے چوتھی بار سیلوٹ مارنا نہ پڑ جائے۔ اس کے جاتے ہی انسپکٹر صارم نے فون کال ملائی۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ جس وقت ثاقب دوبارہ واپس آیا، تب اس نے فون بند کر دیا۔

''میں چائے کا کہہ آیا ہوں، ابھی آ رہی ہے۔'' ثاقب نے کہا تو انسپکٹر صارم نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا تو انسپکٹر صارم نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

''جس جگہ ہم ریڈ کرنے جا رہے ہیں، یہ ایک بڑا مشکل مرحلہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو اس کے بعد گمبھیر صورتِ حال کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں سر؟''

''بندر گاہ کے علاقے میں، جہاں ایک گھر میں عورتیں قید ہیں۔ ان کی تعداد پتا نہیں کتنی ہے۔ کیونکہ یہ کنفرم نہیں ہو سکا۔ یہ بات میں تمہیں اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ ریڈ تمہی کو کرنا ہے، میں تم لوگوں سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں تمہیں پلان سمجھا دیتا ہوں، باقی تم خود سمجھدار ہو۔'' انسپکٹر صارم نے کہا اور دراز میں پڑا ہوا ایک کاغذ نکال لیا۔ پھر اسے میز پر رکھا اور اسے سمجھانے لگا۔ اس دوران میں چائے بھی آگئی۔ وہ دونوں پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ نفری پوری ہو جانے کے بارے میں بھی اطلاع مل گئی۔

''میں نکل رہا ہوں، میں تم لوگوں کو اس پوائنٹ پر ملوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کاغذ پر انگلی رکھ دی۔ ثاقب سمجھ گیا تو وہ اٹھا۔ اس نے اپنا ریوالور چیک کیا۔ وہ پہلے سے تیار ہو کر آیا تھا۔ وہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے باہر کھڑی بائیک نکالی اور اسے اسٹارٹ کر کے چل دیا۔

تقریباً بیس منٹ تک چلتے رہنے کے بعد وہ بندر گاہ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ وہ پرانی طرز کا علاقہ تھا، جس میں کہیں بہت چوڑی سڑکیں تھیں اور کہیں بڑے تنگ سے بازار تھے۔ وہ ایک ایسے ہی تنگ بازار میں داخل ہوا۔ مچھلی کی بساند دور ہی سے آنے لگی تھی۔ اس نے اپنی رفتار بہت کم کر لی تھی۔ بازار کے بالکل سرے پر ایک باربر شاپ تھی۔ اس کے باہر ایک نوجوان لڑکا کھڑا تھا، جونہی اس نے انسپکٹر صارم کو دیکھا، وہ اپنی بائیک پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر صارم آگے نکل گیا لیکن اس کی رفتار کم تھی۔ وہ نوجوان کچھ دیر بعد اس کے برابر آ کر حیرت سے بولا۔

''آپ آئے تو وقت پر ہیں لیکن اکیلے؟''

''گھبراؤ مت، سب ٹھیک ہو جائے گا، تم چلو۔'' انسپکٹر صارم نے کہا اور رفتار مزید آہستہ کر دی۔ وہ نوجوان آگے بڑھ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا بازار سے باہر نکل گیا۔ سامنے ایک چوڑی سڑک تھی، وہ اس پر بڑھے اور چلتے گئے۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ سڑک دائیں جانب مڑ گئی اور وہ سیدھے چل دیے۔ آگے پرانی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پار کر کے سامنے ایک پرانی سی حویلی دکھائی دی جس کا پھاٹک بند تھا۔ نوجوان نے بائیک سے اتر کر پھاٹک کھولا پھر بائیک پر بیٹھ کر اندر چلا گیا۔ جبکہ انسپکٹر صارم باہر ہی کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا، ثاقب پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ نفری بھی تھی۔ وہ بالکل تیار تھے۔ تبھی انسپکٹر صارم نے پہلے اپنا سیل فون آن کیا، ثاقب سے بات کی اور آن سیل فون جیب میں ڈال کر اس نے گیٹ کھولا اور بائیک سمیت وہ بھی اندر چلا گیا۔

پھاٹک کے ساتھ ڈیوڑھی تھی، جس کے آگے صحن تھا۔ وہاں چند افراد بیٹھے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے گنز انسپکٹر صارم پر تان لی تھیں۔ وہ ان کی پروا کیے بغیر آگے بڑھا تو ایک شخص نے عجیب سے لہجے میں درشتی سے کہا۔

''وہیں رُک جاؤ۔''

''ٹھیک ہے، میں رُک جاتا ہوں لیکن پہلے اندر سے پوچھ لو۔ ورنہ میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔'' انسپکٹر صارم نے کسی خوف کے بنا کہا تو ان کے چہروں پر سوالیہ تاثر ابھر آئے۔ اتنے میں ایک موٹا سا پستہ قد گنجا سا آدمی باہر نکلا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''ارے صاحب کو اندر آنے دو۔''

صحن میں بیٹھے لوگوں نے گنز نیچے کر لیں اور اپنی اپنی جگہوں پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ وہ برآمدے میں گیا اور پھر ایک کمرے میں چلا گیا جو ہلکے سے بلب جلنے کے باوجود تاریک سا تھا۔

''آؤ صاحب، بیٹھو۔ کیا پیو گے ٹھنڈا یا گرم؟'' اس نے خوشامدی لہجے میں پوچھا تو انسپکٹر صارم نے کہا۔

''یہ جو صحن میں پانچ چھ بندے بٹھائے ہوئے ہیں، یہی تمہاری سکیورٹی ہے۔''

''اجی اتنے ہی بہت ہیں، یہ بھی بس ڈرانے کو رکھے ہوئے ہیں، جب آپ جیسے کرم فرما ہوں تو کاہے کا ڈر۔'' وہ اسی خوشامدانہ انداز میں بولا۔

''اچھا کام کی بات کریں؟'' انسپکٹر صارم نے پوچھا۔

''جی جی، کیوں نہیں، دیکھیں اپنا تو یہ دھندا ابھی بالکل نیا ہے۔ ابھی تو خود ہی سے خرچ ہو رہے ہیں۔ بس اسی لیے آپ کا حصہ نہیں پہنچ سکا۔'' اس نے اس بار چاپلوسی سے کہا۔

''باقی خرچ کے ساتھ ہمارا خرچ پہلے رکھنا ہوتا ہے، یہ کسی نے بتایا نہیں تمہیں، ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے، میرا تبادلہ اِدھر ہوا ہے اور تم نے آکر سلام تک نہیں کیا۔'' انسپکٹر صارم نے رعب سے کہا

''بس غلطی ہو گئی سر، پھر شہر میں کتنا ہنگامہ رہا۔ اپنے خان صاحب بھی کافی مصروف رہے، ان سے بات کر کے ہی آپ کے پاس جانا تھا۔'' اس نے باتوں ہی باتوں میں خان صاحب کا ذکر کر کے اسے مرعوب کرنا چاہا تو انسپکٹر صارم نے کہا۔

''اچھا کام کی بات کرو، میں نے سنا ہے، چالیس پچاس عورتیں بھیج رہے ہو تم؟ اتنا بڑا کام......''

''کہاں سر، ابھی تو مشکل سے اٹھارہ ہوئی ہیں، پچیس بھی ہوجائیں تو میں ایک کھیپ بنا کر بھیج دوں۔'' موٹے گنجے نے رو دینے والے انداز میں یوں کہا جیسے اس کا کام گھاٹے میں جا رہا ہو۔

''میری اطلاع تو یہ نہیں ہے؟'' انسپکٹر صارم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''قسم سے سر، آپ میری بات کا یقین کریں۔''

''میں تمہارے خان صاحب ہی سے بات کروں گا، تم ٹھیک بات نہیں کر رہے ہو۔'' اس نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

''ارے کیوں ایسا کرتے ہیں آپ؟ آئیں میں آپ کو دکھاتا ہوں،'' یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا، ''اگر کوئی پسند آجائے تو آج رات ہی آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''

''چل دکھا۔'' انسپکٹر صارم نے کسی لالچی شخص کی طرح رال ٹپکاتے ہوئے کہا تو وہ راضی ہوگیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ اندر کی طرف لے گیا۔ ایک کمرے سے نیچے تہ خانے کو راستہ جاتا تھا۔ اس کمرے میں دو خونخوار قسم کے بندے اسلحہ سمیت بیٹھے تھے۔ انسپکٹر صارم بڑبڑانے والے انداز میں ثاقب کو راستہ بتاتا جا رہا تھا۔ تہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر وہ ایک بڑے سے ہال میں آن پہنچے، جہاں فرش پر بستر بچھائے، مختلف عمر اور علاقے کی خستہ حال عورتیں بوسیدہ بستروں پر پڑی تھیں۔ ایک بار تو اس کا جی بھر آیا، اس کے دل میں یوں نفرت ابھری کہ جیسے ابھی اس گنجے سمیت سبھی کو کیفرِ کردار تک پہنچا دے۔ پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو پچیس سے بھی زیادہ ہیں؟''

''سر آپ انہیں دیکھیں، چھوڑیں گنتی کو۔''

''دیکھ لیا۔'' انسپکٹر صارم نے زور سے کہا اور لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ ثاقب کو اشارہ دے چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ بعد وہ پہنچ جانے والے تھے۔ انسپکٹر صارم کو یہ وقت نیچے گزارنا تھا۔ دو منٹ بعد وہ واپس سیڑھیاں چڑھ گیا۔ موٹا اس کے پیچھے تھا۔ وہ کمرے میں آ گیا جہاں وہ اسلحہ بردار دو خونخوار کھڑے تھے۔ اس کمرے سے نکل کر اس نے موٹے سے کہا۔

''اچھا، اب بات کر، پہلے کو کیا دیتا تھا اور اب مجھے کیا دے گا؟''

''جی مجھے خان صاحب نے یہی کہا ہے کہ جو پہلے کو دیتا تھا، وہی آپ تک پہنچا دوں۔ اس کے علاوہ جو آپ کہو گے، وہ لڑکی بھیج دیا کروں گا۔'' اس نے بات ختم کرنے والے انداز میں۔ انسپکٹر صارم کا رُخ پھاٹک کی طرف تھا۔ وہ انتظار میں تھا۔ موٹا یہی سمجھ رہا تھا جیسے وہ سوچ رہا ہے۔ جیسے ہی پھاٹک کھلا، انسپکٹر صارم نے چشم زدن میں اپنا ریوالور نکالا اور کوئی وقت ضائع کیے بغیر ان دونوں پر فائر جھونک دیا۔ وہ اسلحہ پکڑے ہی رہ گئے۔ اگلے لمحے وہ زمین بوس ہوگئے۔

موٹے کی آنکھیں حیرت سے اُبل پڑی تھیں۔ ایک لمحہ تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ ہو کیا گیا ہے۔ پھاٹک کی طرف سے کئی فائر ہوئے۔ صحن میں بیٹھے لوگ اپنی جان بچانے برآمدے کی جانب بھاگے۔ انسپکٹر صارم نے موٹے کی گردن کو دبوچا اور اس کی آڑ میں تاک کر فائر کرنے لگا۔ دو منٹ سے بھی کم وقت میں راستہ صاف ہوگیا۔ پولیس کے جوان اندر آچکے تھے۔ ان کے پیچھے لیڈی کانسٹیبل تھیں۔ ان کے پیچھے چند کرائم رپورٹر تھے، جنہوں نے پچھلے دنوں انسپکٹر صارم کی جان کھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی رپورٹنگ کرنے لگے۔ لیڈی کانسٹیبل عورتوں کو نکالنے لگیں۔ جبکہ جوان پوزیشن سنبھالے کھڑے کسی غیر متوقع واقعے سے نمٹنے کو تیار تھے۔

دس منٹ کے اندر وہ پرانی خستہ حال حویلی چھان لی گئی۔ کُل ستائیس عورتوں کو بازیاب کرا لیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ موٹے کو بھی گاڑی میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔

تھانے پہنچ کر حیرت زدہ سے ثاقب نے کہا۔ ''سر یہ تو بہت بڑی ریڈ ہے۔''

''میں پہلے بتا دیتا تو یہ جوان اتنی جلدی تیار نہ ہوتے۔'' انسپکٹر صارم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بات یہ نہیں ہے سر، بہت بڑی سے میری مراد یہ ہے......''

''کہ مختار خان اپنے حواریوں سمیت ہم پر برس پڑے گا، ہمیں نقصان پہنچائے گا، یہی نا؟''

''جی سر۔'' اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں، سب مجھ پر ڈال دو۔ میں کروں گا سامنا۔'' انسپکٹر صارم نے نفرت سے کہا تو ثاقب نے آنکھیں نیچے کرتے ہوئے سیلوٹ کیا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شہر کا وہی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں سینڈ ڈیونز بینڈ میں پہلے اپنا تعارفی پروگرام رکھا تھا۔ اکرم چوہدری اس پروگرام کا مہمانِ خصوصی تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ لوگوں کا اشتیاق بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس بار سیکورٹی کا بڑا

زبردست بندوبست کیا گیا تھا۔ اس لیے بھی عوام مطمئن تھے۔ دیے گئے وقت سے ابھی پانچ منٹ ہی زیادہ ہوئے تھے کہ اکرم چوہدری آگیا۔ اس کے ساتھ ہی پروگرام کا آغاز کر دیا گیا۔

سبھی دوست اسی ترتیب سے اسٹیج پر آگئے۔ ملائکہ کی بورڈ کے پاس آن بیٹھی اور دُھن ترتیب دینے لگی۔ ارسلان اور میرب دونوں مائیک لیے گانے کو تیار تھے۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے ساتھی بھی تھے۔ ایک نوجوان کمپیئر لڑکی پروگرام کا آغاز کر چکی تھی۔ وہ ترتیب بتا رہی تھی کہ یہ پروگرام کیسے ہوگا۔ وہ مہمانِ خصوصی اور لوگوں کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ جس وقت اس نے اعلان کیا کہ فلم اسٹار سائرہ بھی اس پروگرام کا حصہ ہیں تو تالیوں اور سیٹیوں کی گونج بڑھ گئی۔ ایسے میں پردے کے پیچھے سائرہ اور خرم کھڑے تھے۔ نوجوانوں کا ہلّا گلّا شروع ہو چکا تھا۔ خرم نے اسٹیج پر آکر پروگرام کا آغاز کیا اور پھر ملائکہ کے ساتھ کی بورڈ پر بیٹھ گیا۔ پہلا گیت ہی ہٹ گیا تھا۔

ابھی ''سینڈ ڈیونز بینڈ'' کے پروگرام کو چلتے ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ اکرم چوہدری کے کان میں کچھ کہا گیا۔ وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے ہاتھ ملایا اور باہر کی جانب چل دیا۔ خرم نے کی بورڈ ملائکہ کے حوالے کیا اور پردے کے پیچھے چلا گیا۔ تبھی سائرہ نے خرم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم نکلو، میں سب یہاں سنبھال لوں گی۔''

''کنفرم تو کر لو۔'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہ دیکھو، ہو گیا ہے کنفرم، وہ بھی چلا گیا ہے۔'' سائرہ نے اپنا سیل فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ اسکرین پر ایک پیغام تھا۔ وہ پڑھتے ہی خرم نے ایک نگاہ سائرہ پر ڈالی اور پیچھے کی طرف اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اندھیرے نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ خنکی بدستور بڑھ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے سیاہ ساگر نے ستاروں کو ڈبو دیا تھا۔ خرم بائیک بھگائے جا رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ چلتے رہنے کے بعد سڑک کے مغربی رخ پر دائیں جانب موجود درختوں کے جھنڈ کے پاس وہ رک گیا۔ کندھوں سے لے کر ٹخنوں تک چست سیاہ لباس میں ملبوس وہ تاریکی کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ وہ بائیں طرف گھوما۔ سامنے ریسٹ ہاؤس کی عمارت تھی۔ خلافِ معمول داخلی راستے پر دو مسلح سیکورٹی گارڈ چوکس کھڑے تھے۔ وہ پچھلے دو دن سے اس ریسٹ ہاؤس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف گھوم پھر کر یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ خاموشی سے اندر کیسے داخل ہونا ہے۔

سائرہ نے مختار خان کے بارے میں معلومات لینا شروع کر دی تھیں، جبکہ خرم کو کہا کہ وہ سینڈ ڈیونز بینڈ کا پروگرام کرے۔ سائرہ اسی پروگرام کے بہانے مختار خان سے ملنا چاہتی تھی۔ انہوں نے پروگرام کا اعلان کر دیا۔ اس دن سائرہ نے مختار خان سے ملنے کا وقت طے کر لیا تھا کہ شہر میں ایک بہت بڑی خبر سامنے آگئی۔ بظاہر کسی دوسرے بندے سے عورتیں برآمد ہوئی تھیں لیکن اس کے پسِ پردہ مختار خان کا ہی دھندا چوپٹ ہوا تھا۔ وہ باوجود کوشش کے مختار خان سے نہ مل سکی لیکن اکرم چوہدری سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ وہ مہمانِ خصوصی بننے کے لیے راضی ہو گیا۔ سائرہ نے اپنا نیٹ ورک مزید تیز کر دیا۔ مختلف جانب سے کئی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ دو دن پہلے اسے پتا چلا کہ بالکل پروگرام کے وقت انسپکٹر صارم کی اکرم چوہدری اور مختار خان سے میٹنگ ہے۔

سائرہ اسے اپنے اور خرم کے لیے غیبی مدد تصور کر رہی تھی۔ وہ دونوں حیران تھے کہ بالکل اسی دن اور پروگرام کے وقت کے تعین کا پتا لگ جانا، ان کے کام کو مزید آسان کر گیا تھا۔ سائرہ نے خرم کے ساتھ مل کر پلان تبدیل کر دیا۔ اس بار اس نے سینڈ ڈیونز بینڈ کا پروگرام اپنے ذمے لیا اور خرم کو ریسٹ ہاؤس کے علاوہ دیگر کاموں پر لگا دیا۔ وہ اپنے پلان کے مطابق وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک جگہ دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے انتظار تھا کہ جیسے ہی انسپکٹر صارم وہاں سے جاتا ہے، اسے اس ریسٹ ہاؤس کے اندر جانا تھا۔

وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر صارم اپنی بائیک پر ریسٹ ہاؤس سے نکل گیا۔ تبھی اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اپنے پیروں پر دباؤ بڑھایا اور جست لگانے کے انداز میں اُچھلا۔ ریسٹ ہاؤس کی چار دیواری پر ہاتھ جمائے اور جسم کا وزن بازوؤں پر سہار کر دوسری طرف کود گیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کی عمارت سے قدرے فاصلے پر سبزلان میں گرا تھا۔ کسی کی نظروں میں آنے سے پہلے وہ پلک جھپکنے کی سی دیر میں وہاں سے اُڑن چھو ہو کر پودوں اور جھاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ شاید بارش ہونے والی تھی۔ دور سے دیکھنے والوں کو پودوں اور جھاڑیوں میں سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ویسے بھی خنک موسم کے باعث باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ وہیں دبکا کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ وہ عمارت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے اندر

پہنچ گیا۔ اس کی نظریں اکرم چودھری یا مختار خان کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں...... اچانک اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی مگر اگلے ہی لمحے وہ ٹھٹکا۔ مختار خان میٹنگ ہال سے نکل کر برآمدے میں نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ اکرم چودھری تھا۔

خرم نے اپنا اور ان کے فاصلے کا اندازہ لگایا۔ پھر کود کر ان کے سامنے آگیا۔ سائلنسر لگے پسٹل سے یکے بعد دیگرے کئی گولیاں نکلیں اور اکرم چودھری کے پہلو میں گھس گئیں۔ مختار خان کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی جس کی آواز کو اس کی گردن میں گھسنے والی تیسری گولی نے ختم کردیا۔ اندھا دھند فائرنگ کے ساتھ ہی جب اسے یہ احساس ہوگیا کہ وہ دونوں زمین بوس ہوگئے ہیں تو کوئی لمحہ ضائع کیے بنا واپس بھاگا۔ اس وقت وہ چار دیواری پھلانگ چکا تھا جب اندر سے چیخنے چلّانے کی آوازیں ابھریں۔ وہ پوری جان سے بھاگ کر اپنی بائیک تک پہنچا تھا۔ وہ بائیک پر بیٹھا اور پھر اسٹارٹ کرتے ہی ہوا ہوگیا۔

☆☆☆

سینڈ ڈیو نز بینڈ کا پروگرام اپنے عروج پر تھا۔ سائرہ نے اپنی اداؤں سے عوام مسحور کیا ہوا تھا۔ لوگ جھوم رہے تھے۔ جیسے ہی گیت ختم ہوا، اسے خرم دکھائی دیا۔ وہ اپنا لباس بدل چکا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ وہ کامیاب رہا ہے۔ لیکن پھر بھی سائرہ نے ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس نے انگوٹھے سے کامیاب ہونے کے بارے میں عندیہ دے دیا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ وہ جھومتے ہوئے ایک دم سے رک گئی۔ ہال تالیوں سے گونج گیا۔ تبھی سائرہ نے مائیک اپنے ہاتھوں میں لیا اور عوام کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا آپ کو معلوم ہے اتنے بڑے رنگا رنگ پروگرام کے پیچھے کس کی محنت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی۔ عوام نے شور مچا دیا تو وہ بولی، ''وہ ہیں 'سینڈ ڈیو نز بینڈ' کے روحِ رواں خرم سلطان۔ آؤ نا......'' اس نے بلایا تو وہ اس کے پاس کھڑا ہوگیا۔ ''یہ ہیں خرم، پروگرام شروع ہونے پر آپ نے انہیں دیکھا، اب تک جو آواز آپ تک جا رہی ہے، یہ انہی کی وجہ سے۔ تو ہو جائے ان کے لیے تالیاں......''

تالیوں کا شور تھما تو میرب اور ارسلان نے رومانوی گیت چھیڑ دیا۔ سائرہ نے خرم کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کے ساتھ جھومنے لگی۔ تبھی اس نے پوچھا۔

''کیسا رہا؟''

''دونوں اُڑا دیے، مختار کے ساتھ اکرم چوہدری بھی۔''

ٹھنڈی چائے

ہندوستانی فلمی صنعت کے ایک مشہور ہدایت کار کسی ہوٹل میں حد سے زیادہ شراب پی کر داخل ہوئے اور ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو قریب بُلایا جب ویٹر قریب آگیا تو اس سے پوچھنے لگے۔ ''ٹھنڈی چائے ہے؟''

ویٹر نے انکار میں سر ہلایا۔ ہدایت کار واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ آئے اور اسی ویٹر سے پھر پوچھا۔

''ٹھنڈی چائے ہے؟''

ویٹر نے پھر انکار کیا۔ وہ صاحب چلے گئے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر آئے اور ویٹر سے وہی سوال دہرایا۔ ویٹر نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''جی ہاں ہے۔''

انہوں نے کہا۔ ''ایک پیالی لے آؤ۔'' بیرا ٹھنڈی چائے لے کر آیا تو ہدایت کار نے پوچھا۔

''کیا یہ چائے ٹھنڈی ہے؟''

بیرے نے کہا۔ ''ہاں صاحب یہ ٹھنڈی چائے ہے۔''

ہدایت کار نے کہا۔ ''تو پھر جاؤ اور گرم کر لاؤ۔''

مرسلہ، سیدا عجاز یوسف رضوی، کراچی

''اُوہ، خس کم جہاں پاک۔'' اس نے کہا اور خرم کے ساتھ عوام کو اپنی ادائیں دکھانے لگی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ خرم یہیں موجود ہے، جب سے پروگرام شروع ہوا ہے۔

☆☆☆

انسپکٹر صارم یونیفارم پہنے اسی ریسٹ ہاؤس میں کھڑا تھا، جہاں سے وہ تقریباً دو گھنٹے پہلے گیا تھا۔ اس کے سامنے مختار خان اور اکرم چوہدری کی نعشیں پڑی ہوئی تھیں۔ سامنے وہ سارے سیکورٹی گارڈ تھے، جو وہاں پر موجود تھے۔ ان کا ہیڈ پریشان چہرہ لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میرے جانے کے کتنی دیر بعد یہ واقعہ پیش آیا۔''

''سر آپ کے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد۔'' اس نے بتایا۔

''آپ سب کہاں تھے؟'' اس نے پوچھا۔

’’کچھ گیٹ پر اور باقی اندر تھے۔‘‘ اس نے بتایا۔
’’تم لوگوں میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ قاتل کب اور کہاں سے اندر آیا؟‘‘ اس نے حیرت سے پوچھا۔
’’خان صاحب نے ہمیں خود روکا تھا کہ کوئی ان کے قریب نہ رہے، وہ کوئی اہم باتیں کر رہے ہیں۔ آپ جب یہاں تھے تو اس وقت ہم میں سے کوئی قریب نہیں تھا۔‘‘ ہیڈ نے اپنی مجبوری بتائی۔
’’آپ کو پھر بھی محتاط ہونا چاہیے تھا۔‘‘ اس نے کہا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ’’مجرم کا پیچھا کیا کسی نے؟‘‘
’’جب تک ہمیں پتا چلا وہ کسی چھلاوے کے مانند غائب ہو گیا تھا۔‘‘ اس نے کہا تو انسپکٹر صارم سختی بولا۔
’’تو پھر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ قاتل تم میں سے کوئی ایک ہے۔‘‘
’’سر، ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، پلیز ہم پر رحم کریں۔‘‘ ان میں سے ایک بولا تو انسپکٹر صارم نے اسے گھور کر دیکھا۔ اتنے میں ڈی ایس پی وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی انسپکٹر صارم سے پوچھا۔
’’قاتل کا کوئی سراغ ملا؟‘‘
’’کوئی نہیں۔‘‘ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔
’’میں کیا جواب دوں گا اوپر۔‘‘ اس نے کہا تو انسپکٹر صارم نے ان سیکورٹی والوں کو جانے کا اشارہ کیا پھر بولا۔
’’سر، ساجھے کے قتل سے لے کر جو گینگ وار چلی، اس کے پیچھے یہ دونوں ہی تھے، لیکن آج جو انہوں نے مجھ سے بات کی، اس سے میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ انہی مظلوم عورتوں کے پیچھے چھپے کسی بندے کا ہاتھ ممکن ہے۔ بلاشبہ یہ گینگ وار نہیں تھی سر، اس کے پیچھے ضرور کوئی دوسرا بندہ ہے۔‘‘
’’وہ کون ہے؟‘‘ ڈی ایس پی نے سختی سے پوچھا۔
’’اب تو نئے سرے سے سوچنا پڑے گا۔‘‘ انسپکٹر صارم نے کہا تو وہ چیختے ہوئے بولا۔
’’اپنا یہ بے وقوفانہ جواب تم اوپر والوں کو دینا۔ میں تمہیں معطل کر دوں گا اگر مجھے مجرم دو دن میں نہ ملا تو۔‘‘
ان کی باتوں کے دوران میں پولیس کے مختلف شعبوں کے لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ کچھ دیر بعد ان کی نعشیں اٹھا دی گئیں۔ انسپکٹر صارم کے لیے ایک نیا امتحان شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات بارش نے موسم کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ ہر ایک چیز نکھری نکھری تھی۔ خرم بیدار ہوا تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ آج کافی عرصے بعد وہ بیدار ہوا تو فریش تھا۔ یوں جیسے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ اس نے دیکھا سائرہ اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی تھی۔
’’اٹھ گئے؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’ہاں لیکن دل کر رہا ہے، پھر سو جاؤں۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
’’اچھا خبر سنو، مختار خان اور اکرم چوہدری کا قاتل گرفتار نہیں ہو سکا۔ کسی نے ذاتی، کسی نے سیاسی انتقام لکھا ایک نے تو وہی بات کہہ دی کہ یہ حالیہ عورتوں والے اسکینڈل کا شاخسانہ ہے۔‘‘
’’اور کیا لکھا ہے؟‘‘ اس نے پوچھا تو وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔
’’وہی حکمرانوں کے رٹے رٹائے بیان کہ قاتل سے آہنی ہاتھوں کے ساتھ نمٹا جائے گا۔ قاتل جلد گرفتار کرنے کا وعدہ قانون کی حکمرانی کا اعلان اور انسپکٹر صارم کو معطل کر دیا گیا۔ انسپکٹر صارم کا کہنا تھا کہ قاتل میٹنگ میں شامل کوئی فرد تھا جس نے سائلنسر لگے پستول سے گولیاں چلائیں۔‘‘
’’یہ انسپکٹر صارم بھی نا، انتہائی فضول قسم کا بے وقوف آدمی ہے۔‘‘ خرم نے تبصرہ کیا۔
’’میں نہیں مانتی، اس نے اگر وہ عورتیں بازیاب نہ کرائی ہوتیں تو میرا بھی اس کے بارے میں یہی خیال ہوتا۔‘‘ سائرہ نے کہا۔
’’خیر، ہمیں کیا، ویسے تمہارا پلان بڑا شاندار تھا۔‘‘ خرم نے کہا تو وہ حیرت سے بولی۔
’’کون سا پلان، پروگرام تو سارا تم نے کیا ہے۔‘‘
تبھی ان دونوں کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔
’’چلیں میں بھول گیا۔ لیکن تب تک نہیں جب تک مجھے وہ......‘‘ وہ کہتے کہتے رک گیا۔
’’وہ بھی ہو جائے گا۔ بس تم حوصلہ رکھنا۔ اب اٹھو، میرے گھر چلو...... وہیں چل کے آرام کرتے ہیں، وہاں کم از کم کھانا بنانے کو نوکر تو ہیں۔‘‘ سائرہ نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔
سائرہ کے بنگلے میں ناشتا کرنے کے بعد خرم اور سائرہ لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اسی دوران پورچ میں کار رکنے کی آواز آئی۔ سائرہ تیزی سے اٹھ گئی۔ خرم بھی تجسس سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا کہ ایک نقاب پوش خاتون داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے عبایا پہنا ہوا تھا۔ وہ سائرہ سے ملی اور پھر خرم کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک صوفے

پر بیٹھ گئی۔ خرم نے دیکھا وہ اچھے قد کاٹھ کی ایک بھرپور... جسامت کی عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی کا اندازہ اس کے ہاتھ اور آنکھوں کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر سائرہ سے پوچھا۔

''یہی خرم ہے نا؟''

''جی یہی ہے۔'' سائرہ نے تصدیق کر دی تو اس عورت نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے ایک خاکی لفافہ نکال کر سائرہ کو تھماتے ہوئے کہا۔

''یہ لو ثبوت، گواہ رہنا کہ میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ خرم اچھل پڑا۔ تب تک سائرہ نے وہ لفافہ اسے دے دیا۔ جسے خرم نے لے کر بے تابی سے کھولا تو اس میں ایک چھوٹے سے پلاسٹک کے لفافے میں ایک میموری کارڈ تھا جو کہ سی سی ٹی وی کیمروں کا تھا۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ ان دونوں کی آخر کیا کیمسٹری ہے، دونوں کب سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں؟ کہیں مجھ سے قتل کروانے میں اس سائرہ کا تو ہاتھ نہیں؟ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ بولی۔

''حیران مت ہو خرم، تم جو پوچھنا چاہتے ہو میں وہ بتا دیتی ہوں۔''

''ساجھے کے کمرے میں اگر تم سی سی ٹی وی کیمرا لگوا سکتی تھیں تو اسے بخوبی... مروا بھی سکتی تھیں۔ یہ.....''

''کیا یہ حقیقت نہیں ہے میں نے جو ویڈیو بھیجے وہ سی سی ٹی وی ہی کے تھے؟'' اس نے پوچھا

''تم اسے تسلی سے دیکھ لینا۔ میں نے ایک کیمرا وہاں لگوایا تھا۔ ہم کافی دنوں سے ساجھا کی ریکی کر رہے تھے۔ اس کے کمرے میں کیمرا لگوانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔''

''تمہاری آخر مختار خان اور ساجھا سے کیا دشمنی تھی۔'' خرم نے پوچھا تو وہ اپنے بارے میں بتاتی چلی گئی۔

☆☆☆

''آج سے اٹھارہ سال پہلے ہم گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ شہر تھوڑے سے فاصلے پر تھا۔ میں یونیورسٹی پڑھنے جایا کرتی تھی۔ ہم دو بہنیں تھیں۔ میرے والد ایک چھوٹے سے زمین دار تھے۔ انہوں نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر شہر میں آکر فیکٹری لگائی تھی۔ گھر سے شہر تک کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ہمارے والد ہم بہنوں کو اچھی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم روزانہ گاؤں ہی سے شہر چلی جایا کرتی تھیں۔ میں کیمپس جا رہی تھی جبکہ میری چھوٹی بہن صائمہ کالج میں پڑھتی تھی۔ ان دنوں اسی کیمپس میں مختار خان بھی تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ بدمعاشی کر رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میرا... کیمپس کی خوبصورت ترین لڑکیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا احساس مجھے میرے اردگرد کے لوگوں اور دوستوں نے دلایا تھا۔ ایک سال سکون سے گزر گیا۔ نجانے مختار خان نے مجھے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ ان دنوں میرا دوسرا سال شروع ہو چکا تھا، جب میرا اور اس کا سامنا ہوا۔

مختار خان ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ اگر اس کا مقصد شادی ہوتا تو میں کچھ اور سوچتی لیکن اس کا مقصد اپنی ہوس ہی پوری کرنا تھا۔ کھلونا بننا مجھے کسی صورت پسند نہیں تھا۔ مختار خان اتنا بے باک تھا کہ اس نے ایک دن چھٹی کے وقت بہت سے اسٹوڈنٹس کے سامنے دھمکی دے دی کہ اگر میں ویسے نہ مانی تو اٹھا لوں گا کیونکہ اب تم میری ضد بن گئی ہو۔ تم پر میرا دل آ گیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے پہلے مسلسل دو ماہ سے وہ مجھے تنگ کر رہا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس سے بچنے ہی کی کوشش کی۔ میں پڑھنا چاہتی تھی۔ میرے بہت سارے خواب تھے جنہیں میں پورا کرنا چاہتی تھی۔ اپنا نام بنانا چاہتی تھی۔ میرے دو سال پورے ہونے کو تھے۔ امتحان قریب ہونے کے باعث میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ایسا معاملہ بنے کہ مجھے پڑھائی ہی سے ہٹا لیا جائے۔ میں خاموشی سے یہ وقت گزار لینا چاہتی تھی۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ کیمپس میں مختار خان نے مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے مجھے اغوا کرنے کی پوری تیاری کی ہوئی تھی۔ یہ دھمکی وہ آئے روز دیتا تھا۔ ایک دن اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور قریب کھڑی کار کی جانب بڑھا۔ میرے لیے یہ زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ میں نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مار دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ منہ سے لفظ نہ نکالنے والی ایسا بھی کر گزرے گی۔ اس نے آگے بڑھ مجھے پھر پکڑنا چاہا تو میں نے شدید نفرت میں اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ اپنے منہ سے تھوک صاف کیا اور... غضب ناک انداز میں کہہ کر چلا گیا کہ بہت جلد اس تھوکنے کا ایسا انتقام لوں گا کہ کوئی تمہارے منہ پر تھوکے گا بھی نہیں۔

کیمپس چھوڑنے کے ایک ماہ بعد میں.... امتحان دے رہی تھی۔ اس دن میرا آخری پیپر تھا۔ میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ واپس گاؤں آ رہی تھی۔ شہر سے گاؤں جانے والی سڑک پر اس نے میرا راستہ روک لیا۔ اس نے اپنی کار سے روڈ بلاک کیا ہوا تھا۔ مجھے تو اس وقت پتا چلا جب ڈرائیور نے کار

روک کر ہارن بجایا۔ تب تک مختار خان اپنی کار سے نکل کر باہر آچکا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ میں سمجھی تھی مختار خان کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ لیکن یہاں بات الٹی تھی۔ یوں راستہ روک کر کھڑا ہونا معافی مانگنے والے لوگوں کا انداز نہیں تھا۔ وہ چند لمحوں میں ہم تک آن پہنچے۔ دونوں لڑکوں نے میری طرف والا گیٹ کھولا، مجھے دائیں اور بائیں بازوؤں سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ میں نے بڑی مزاحمت کی لیکن میری ایک نہ چلی۔ انہوں نے مجھے اپنی کار میں ڈال لیا۔ پھر میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہی۔ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ مختار خان نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس نے اپنی ہوس پوری کی اور مجھے سڑک پر پھینک دیا۔ پھر اس نے کار کے ڈیش بورڈ پر پڑی ایک چھوٹی سے بوتل نکالی اس کا ڈھکن کھولا، اس وقت تک میں اپنے ساتھ ہونے والے ظلم سے جو وہ کرنے جا رہے تھے بے خبر تھی۔ لڑکوں نے مجھے پھر پکڑ لیا۔ اس وقت مختار خان کی آواز آئی۔ ''میں نے کہا تھا کہ میں تیرے چہرے کا وہ حشر کروں گا کہ کوئی اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے آگے بڑھ کر اس بوتل کو میرے چہرے پر پھینکا۔ جیسے ہی تیزاب.... میرے منہ پر پڑا، تکلیف سے میری چیخ نکل گئی۔ جب وہ تیزاب پھینک رہا تھا۔ میں نے زور لگا کر ایک لڑکے سے خود کو چھڑایا۔ جس کی وجہ سے میری آنکھیں اس تیزاب کی زد میں آنے سے بچ گئی تھیں۔ میرے رخسار، اور گردن اس کی زد میں آئی۔ میں تکلیف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ جس نے میرے بالوں کو پکڑا تھا وہ ساجھا تھا اور دوسرا یہی اکرم چوہدری تھا۔ ابو نے تھانے میں رپورٹ لکھوا دی، میرا بیان لیا گیا، ساجھا اور اکرم روپوش ہو چکے تھے۔ مختار خان بیرونِ ملک بھاگ گیا تھا۔ دراصل اس کی پہلے ہی تیاری مکمل تھی۔ اسی رات اس کی فلائٹ تھی۔ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے بہانے بیرونِ ملک گیا تھا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا نقاب اتار دیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر سائرہ اور خرم حیرت سے اچھل پڑے۔ خوبصورت آنکھوں کے نیچے سارا چہرہ جلا ہوا تھا۔ وہ اتنے شاکڈ ہوئے کہ ایک لفظ بھی.... نہیں بولا گیا بس ایک ٹک اسے دیکھتے رہے۔ چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ نقاب پہن لیا۔ ان کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

''تو یہ سب آپ نے انتقام لینے کے لیے کیا؟'' خرم نے کہا۔

''ہاں، میں نے بہت کوشش کی تھی، لیکن کئی برس تک یہ لوگ میری نگاہوں سے اوجھل رہے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک ان سے انتقام نہ لے لوں اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری نہیں کراؤں گی۔ میں جب بھی آئینہ دیکھتی، میرا انتقام مجھے یاد رہتا۔ اب میرا انتقام پورا ہو چکا ہے۔ اب پہلی فرصت میں پلاسٹک سرجری کروا لوں گی۔''

''لیکن میں یہاں آپ کے اس......'' خرم نے پوچھنا چاہا تو وہ بولی۔

''میرے شوہر نے پھر میری قسم پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم نے ساجھے اور مختار خان کو تلاش کر لیا۔ ان پر کڑی نگرانی رکھی ہوئی تھی۔ ساجھا جہاں رہتا تھا وہاں ایک خفیہ کیمرا فٹ کروایا۔ پھر ایک دن تم اس کہانی میں کود پڑے۔'' اس اجنبی عورت نے کہا۔

''آپ کا شوہر......'' خرم نے حیرت سے پوچھا ہی تھا کہ داخلی دروازے سے انسپکٹر صارم تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر خرم کی روح فنا ہو گئی۔ سائرہ بھی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ سیدھا خرم کی جانب بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''میں ہوں اس کا شوہر۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہمارے کھیل میں جان بوجھ کر نہیں کودے، لیکن ہمارا راستہ آسان ہو گیا۔''

''یہ...... یہ سب کیسے؟'' اس نے پوچھنا چاہا تو وہ بولا۔

''سارے سوالوں کا یہی جواب ہے کہ سائرہ نے میری مدد کی۔ یہ ہمارا دکھ سمجھ گئی تھی۔ تم میرے پلان کے مطابق سب کچھ کرتے رہے ہو۔ اب تم سے بس ایک ہی بات کہنی ہے۔''

''بولیں......'' وہ خود پر قابو پا کر بولا۔

''میں معطل ہو چکا ہوں، مجھے اب نوکری کرنی بھی نہیں ہے۔ دوسرا کوئی آیا تو نجانے کیا کرے۔ جتنی جلدی ہو سکے، تم اس ملک سے نکل جاؤ۔ تمہاری انجان مدد کا شکریہ۔'' اس نے کہا اور اس اجنبی عورت کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ اجنبی عورت نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور وہ دونوں باہر کی جانب چل دیے۔ خرم پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

''اوئے، اِدھر میری طرف دیکھ، میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ تمہارا پاسپورٹ میں نے لے لیا تھا۔ آج شام کی فلائٹ ہے۔''

''اتنی جلدی یہ سب؟'' وہ حیرت سے بولا پھر ہنستے ہوئے سائرہ کو بانہوں میں جکڑ لیا۔

صید و صیاد

روبینہ رشید

جو اعلیٰ ذہن اور مجنوبہ قوتِ تخیل کے ساتھ وسیع تجربہ رکھتے ہوں... وہ انسانوں کے اندر جھانکنے کا ہنر پالیتے ہیں... کرداروں کی داخلی، خارجی کیفیات... ان کی نفسیاتی کشمکش... خودکلامی کے انداز سے وہ اس کے شعوری، لاشعوری پہلوئوں کو سمجھتے چلے جاتے ہیں... کچھ لوگ ساری زندگی اپنے لیے جیتے ہوئے گزار دیتے ہیں‘ وہ ناخوش اور خالی ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں... خوشی انہی کو ملتی ہے... جو دوسروں کے لیے جینا جانتے ہیں... ایسے ہی کرداروں پر مشتمل سنسنی خیز... تجسّس سے بھرپور سرورق کی کہانی... جہاں ایک قاتل تھا... اور دوسرا مسیحا... جو دوسروں کی جان بچانے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے...

چالاک مجرم اور ذمّے دار سراغ رساں کے
درمیان ہونے والی آنکھ مچولی کی ہنگامہ خیزیاں......

درد کی ایک تیز لہر رابعہ کو ہوش کی دنیا میں گھسیٹ لائی۔ لمحے بھر کو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ہے؟ پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

وہ کار پارک کر کے گلی سے باہر نکل رہی تھی کہ اچانک وہ پرانی سی کار اس کے عین سامنے آ کر رکی تھی۔ وہ سرمئی رنگت کی کسی پرانے ماڈل کی کار تھی۔ رابعہ کی توجہ اس کی جانب نہیں تھی۔ وہ اپنے بیگ میں مستقل بجنے والے موبائل کو تلاش کرنے میں مصروف تھی کہ اچانک اسے اپنے دائیں

پہلو میں گرم سی چیز کے اُترنے اور پھر تکلیف کا احساس ہوا، اس نے بے اختیار پہلو پر ہاتھ رکھا اور جب ہٹایا تو اس پر کچھ خون لگا ہوا تھا۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر اس سب کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ وہ شخص اس کے سامنے آ گیا۔

''اوہ، شاید آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' ایک منمناتی مگر سرد آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ایک درمیانی قامت کا دبلا پتلا شخص تھا مگر اس کی آنکھوں میں کسی سانپ جیسی سرسراہٹ تھی۔ اسے وہ آنکھیں پہلے لمحے میں ہی بہت بُری لگی تھیں۔

اس سے قبل کہ وہ کچھ کہہ سکتی، اسے قریب آنے سے روک سکتی، اس نے سہارا دینے والے انداز میں اسے پکڑا۔ اس کا دوسرا ہاتھ رابعہ کے چہرے کی طرف بڑھا جس میں کوئی رومال نما چیز تھی۔ اس کے چہرے پر لگتے ہی ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے ..... اس کی سماعت میں آنے والی آخری آواز اس کے ہاتھ میں موجود موبائل کے زمین سے ٹکرانے کی تھی جو کافی تگ و دو کے بعد اسی لمحے بیگ سے دریافت ہو گیا تھا۔

''اوہ......'' سب یاد آتے ہی اس نے بوکھلا کر تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ حرکت نہیں کر پائی۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کی جانب بندھے ہوئے تھے جبکہ ایک پیر کو رسی کی مدد سے دیوار میں لگے آہنی کنڈے سے باندھا گیا تھا۔ حرکت کرنے سے پہلو میں موجود درد نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔

''آخر کیوں؟'' یہ سوال اس کے ذہن میں جھما کے مار رہا تھا، یہ سب کیوں اور کس لیے ہوا تھا۔ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ شاید تاوان کی خاطر...... دوسرے خیال نے فوراً پہلے خیال کو مسترد کیا۔ ''تو اب میں کیا کروں؟'' اس کا دماغ ساکت سا ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ دوبارہ بے ہوش ہو جائے گی۔ ''نہیں، مجھے ہمت نہیں ہارنی ہے۔'' وہ اپنے آپ سے بولی اور سر جھٹک کر کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا، اس کی دیواروں کا پلستر کئی جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشندان وغیرہ نہیں تھا۔ صرف ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو اس وقت بند تھا۔ زمین پر ایک پھٹا ہوا گدا پڑا تھا جس پر چادر اور تکیے کا تکلف موجود نہیں تھا۔ وہ اس وقت اسی گدّے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دور زمین پر ایک پلیٹ میں سوکھے ہوئے ڈبل روٹی کے ٹکڑے تھے جس پر کئی چھوٹے چھوٹے کاکروچ رینگ رہے تھے۔ اس نے جھرجھری سی لی۔

وہ بہت خوف زدہ تھی۔ اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں، بریکنگ نیوز کی دھماکا دار آوازیں اس کے تصور کے اسکرین پر جگمگا کر اسے مزید خوف زدہ کر رہی تھیں۔ خدا جانے اب تک باہر کسی کو اس کے ساتھ ہونے والے اس حادثے کی خبر تھی بھی کہ نہیں' نہ جانے ان کو پتا چلنے تک وہ شخص اس کا کیا حال کرے۔ وہ زندہ بچ بھی پائے گی کہ نہیں؟ اس کا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ ننھی مہرین کا خیال اس کی آنکھوں میں پانی لے آیا۔ اس کی ننھی شہزادی ابھی صرف دس ماہ کی تھی۔ وہ اسے اب بھی دیکھ بھی پائے گی کہ نہیں...... آنسو اب اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

''رابعہ، ناکام ہو جانا یا کسی مشکل میں پھنس جانا ہار نہیں ہوتی، ہار تب ہوتی ہے جب آپ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔'' اس نے گویا خود کو سمجھایا۔ ''مسئلے کے اردگرد کہیں نہ کہیں اس کا حل موجود ہوتا ہے بس ہمیں صحیح وقت پر صحیح جگہ اسے تلاش کرنا ہوتا ہے۔''

'وہ کیا کرے؟' اس نے بے تابی سے ہاتھوں پر بندھی رسی کو جھٹکا دے کر کھولنے کی کوشش شروع کی۔ کئی بار کی ناکام کوششیں اس کے درد میں اضافہ اور ہاتھوں پر خراشیں ڈالنے کے سوا کچھ اور نہیں کر پائی تھیں۔

'اسے اس کے واپس آنے سے پہلے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔' اس نے بے صبری سے سوچا۔ وہ اسکول میں گرلز گائیڈ کی ہیڈ گرل رہی تھی۔ انہیں اس میں مختلف انداز میں گرہیں باندھنے، کھولنے اور اس قسم کی صورتِ حال میں خود کو آزاد کروانے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ اب آج کل جبکہ حالات اتنے زیادہ مخدوش ہیں اور بزدل دہشت گردوں کو اسکول کے بچے اپنا آسان ٹارگٹ نظر آنے لگے ہیں تو اسکول، کالجوں میں اس تربیت کے زیادہ جدید طریقے فوری طور پر اپنانے چاہئیں بلکہ اسے تعلیم کا مستقل حصہ یا مضمون قرار دیا جانا چاہیے، رابعہ آج کل تعلیم اور اس کے ذریعے حقیقی تربیت کے متعلق ہی ریسرچ کر رہی تھی۔ گرلز گائیڈ کے دنوں کے بارے میں سوچ کر اس میں ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔ اس نے ہاتھوں کی انگلیوں کو موڑ کر رسی کھولنے کی تکنیک کو آزمانا شروع کیا۔ پریکٹس واقعی مہارت کو قائم کرتی اور بحال رکھتی ہے اور وہ تو اس معاملے میں کم از کم گزشتہ پندرہ برسوں سے بالکل آؤٹ آف پریکٹس تھی۔ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ متعدد ناکام کوششوں کے بعد وہ بالآخر رسی کو ڈھیلا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ہاتھوں میں پڑی

خراشوں میں جلن ہو رہی تھی۔ مسلسل حرکت سے پہلو کا زخم بھی دُہائیاں دے رہا تھا مگر یہاں معاملہ زندگی کا تھا سو وہ سب برداشت کر کے کوشش میں لگی رہی۔ بالآخر دس منٹ کی کاوش کے بعد اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا، اس کے بعد دوسرے ہاتھ کی آزادی اور پھر پیر کھولنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔

وہ آزاد تھی۔ وہ خوشی کے عالم میں جھٹکے سے اٹھی۔ پھر پہلو پر ہاتھ رکھ کر جھک سی گئی۔ اس نے قمیص اٹھا کر چوٹ کا جائزہ لیا، اس کی کمر پر آگے کی جانب کم از کم ڈھائی انچ لمبا کٹ لگا ہوا تھا جس پر خون جما ہوا تھا، اس کے اردگرد کی جگہ قدرے سرخ سی ہو رہی تھی۔ رابعہ نے آہستگی سے اس پر ہاتھ پھیرا پھر تکلیف کی تیز لہر کو نظرانداز کرتے ہوئے تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔ اس کا ہاتھ ہینڈل کی ناب پر پہنچ کر ایک لمحے کو ساکت سا ہو گیا۔ 'اگر وہ باہر موجود ہوا؟' اس سوچ نے ایک منٹ کو اسے ہراساں کر دیا مگر اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس نے بے آواز انداز میں دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے ایک پتلی سی راہداری تھی، اس کے ایک کونے پر کم وولٹیج کا ایک بلب جل رہا تھا۔ وہ آہستگی سے باہر نکل آئی۔ راہداری ایک چھوٹے لاؤنج نما ڈائننگ روم پر ختم ہو گئی تھی۔ کمرے میں عام سی میز، کرسیاں اور ایک پرانا صوفہ رکھا ہوا تھا۔

لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہی تازہ ہوا نے اس کا استقبال کیا.... باہر چھوٹا سا پورچ اور گرین ایریا تھا جس کے بعد گیٹ نظر آ رہا تھا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا، اردگرد کوئی دوسرا مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ آزادی اور گھر جانے کے امکان نے اسے خوشی سے بھر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ خوف بھی اس کے پیر پکڑ رہا تھا۔

اس نے پورچ کی جانب قدم بڑھایا تب ہی اچانک اسے اپنی کلائی پر کسی سخت اور کھردرے ہاتھ کی گرفت محسوس ہوئی پھر اسی سرد منمناتی آواز میں ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا۔ رابعہ کے مڑنے سے قبل ہی کوئی بھاری آہنی چیز اس کے سر پر گری اور وہ اندھیروں کی گہرائی میں ڈوبتی چلی گئی۔

☆☆☆

آفیسر کریم خاموشی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمبی قدوقامت اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ عمر کی چالیسویں دہائی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اکثر اس کے ساتھی اور کولیگ اسے ہیرو کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔ وہ اسپیشل برانچ کا خصوصی آفیسر تھا۔ اسے اور اس کے ونگ کو پیچیدہ کیسز کی صورت میں بُلایا جاتا تھا۔ اس کی گہری بھوری آنکھوں میں اس وقت تاسف کا تاثر بہت گہرا تھا۔ اس کے ساتھ ایک قدرے نوجوان آفیسر بھی موجود تھا۔ ان سے چند قدموں کے فاصلے پر سڑک کے قریب اس کی گاڑی کے ساتھ ساتھ پولیس کی موبائل بھی موجود تھی۔ وہ چند لمحے اپنی جگہ کھڑا رہا پھر دھیمے قدموں سے آگے بڑھا، سمندر کے سامنے بنی چوڑی حفاظتی دیوار کے کونے پر وہ لاش موجود تھی۔ اسے حفاظتی دیوار پر کسی گڑیا کے مانند بٹھایا گیا تھا۔ وہ ایک نوجوان عورت تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں سامنے کی جانب پھیلی ہوئی تھیں جبکہ ہاتھ اطراف میں تھے۔ کریم نے آگے بڑھ کر اس کے سیدھے بازو کو چھوا، وہ قدرے غیر قدرتی انداز میں مڑا ہوا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہوا میں اڑتے سنہرے بال وگ تھے۔ لاش کے ہونٹوں پر تیز گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائی گئی تھی۔

آلۂ قتل اب تک اس کی گردن میں موجود تھا۔ اسے گلابی رنگ کے ریشمی اسکارف سے قتل کیا گیا تھا جبکہ اس کے ایک پیر پر مصنوعی بیکنی گلاب رکھا ہوا تھا۔

''اسے گزشتہ 24 گھنٹوں کے درمیان ہی قتل کیا گیا ہے۔'' کریم نے کہا۔

''سر مگر اس کی آنکھیں کچھ الگ لگ رہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''اوپری پپوٹوں کو پوری طرح کھول کر سیاہ دھاگے سے سی دیا گیا ہے۔'' کریم نے سادگی سے کہا۔

''اوہ، کیا واقعی......''

''تم خود دیکھ لو۔''

''اوہ خدا، کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے۔'' شہباز لاش کو غور سے دیکھنے کے بعد تاسف سے بولا۔ کریم جواب میں خاموش رہا تھا۔ شہباز کے ساتھ یہ اس کی دوسری ملاقات تھی۔ وہ اس سے خاصا جونیئر تھا مگر فرانسک کے شعبے میں خاصا ماہر تھا۔

''پتا نہیں ابھی کتنی دیر اور لگے گی؟'' عقب سے آنے والی سرگوشی نما آواز کو اس کی حساس سماعت نے اچک لیا تھا۔ دور پیچھے سڑک پر دو پولیس انسپکٹر اور کچھ سپاہی موجود تھے۔ یہ ان میں سے ہی کسی کی آواز تھی۔

''لگ رہا ہے کہ لاش سے بیان اگلوانے کے چکر میں ہیں یہ لوگ۔'' دوسری آواز میں طنز نمایاں تھا۔

کریم مسکرایا، وہ بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ ان کے ذہنوں

میں کیا چل رہا تھا۔ یقیناً وہ یہ کیس خود دیکھنا چاہتے تھے اور اسپیشل برانچ کی مداخلت انہیں ناگوار گزر رہی تھی۔ پولیس کا ایسا رویہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اگرچہ ایک دوسرے کی مدد کررہے تھے اور ان کی منزل بھی ایک ہی تھی مگر کریڈٹ لینے کی خواہش اکثر بُرے رویے اور تعاون نہ کرنے کی شکل میں سامنے آتی تھی۔

''سوری بھائیو تمہیں ابھی کچھ دیر اور کھڑا ہونا ہوگا۔'' اس نے سوچا اور کندھے اچکاتے ہوئے دوبارہ لاش کی جانب متوجہ ہوگیا۔ شہباز اب بھی لاش کے معائنے میں مصروف تھا۔

''ایس پی اور ایس ایچ او کا خیال ہے کہ یہ ہیومن ٹریفکنگ کا چکر ہے...... مگر مجھے ایسا نہیں لگتا۔'' وہ اسے اپنی جانب مڑتے دیکھ کر بولا۔

''کیوں؟ تمہیں ایسا کیوں نہیں لگتا؟'' کریم نے انجان بن کر پوچھا۔

''سر اس کی عمر 30 سال کے لگ بھگ ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ غالباً اس کے ایک یا دو بچے بھی ہیں اس کے علاوہ بھی یہ اس قسم کی ٹریفکنگ کا حصہ نظر نہیں آتی۔''

''درست......'' کریم نے گہری سانس لی۔

''مگر مجھے اس سنہری وگ کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''

''دیکھنا پڑے گا۔'' کریم نے گردن جھٹکی۔ ''وجہ کچھ بھی ہو مگر اس کا سبب بالوں کی رنگت چھپانا نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے تمام بال شیو کردیے گئے ہیں۔''

''اور یہ گلاب......'' شہباز نے گلاب کو احتیاط سے پلاسٹک کے بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''شاید کوئی پیغام ہے۔''

''کپڑے کا سستا سا گلاب ہے۔'' کریم کی نظر پلاسٹک بیگ میں پڑے گلاب پر جمی تھی جو ہر جگہ مل سکتا ہے۔ ''ہم اس پر کام کریں گے مگر مجھے نہیں لگتا کہ اس سے کچھ معلوم ہوسکے گا۔''

کریم کو شک تھا کہ موجودہ چیزوں میں سے شاید ہی کچھ ان کی تحقیقات میں مدد کرسکے۔ اس نے ایک بار پھر غور سے لاش کا جائزہ لیا۔ اس کے سر کی پچھلی جانب، پہلو میں اور دونوں کندھوں پر زخموں کے نشان موجود تھے یعنی قتل سے پہلے اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور پھر گلا گھونٹ کر اس ویرانے میں سجادیا گیا۔

اس نے گہری سانس لی۔ لاش کو صبح واک کے لیے آنے والے ایک بوڑھے جوڑے نے دریافت کیا تھا۔ اس کے اردگرد نہ کسی گاڑی کے ٹائر کے نشانات تھے اور نہ ہی ایسا کوئی کلیو مل سکا تھا جس سے قاتل کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہوسکے۔

اسے اس وقت آمنہ کی کمی بہت شدت سے محسوس ہورہی تھی۔ آمنہ اسپیشل برانچ کی واحد خاتون آفیسر تھی اور کریم اس کے ساتھ برسوں سے کام کررہا تھا۔ ان کے آخری کیس کے بعد سے وہ چھٹیوں پر تھی۔ اس واردات کو دیکھ کر کریم کا ذہن بار بار اس کی جانب جارہا تھا۔ وہ اسی قسم کا کیس تھا اور آمنہ کو اس میں سخت ذہنی اور جسمانی اذیت سے گزرنا پڑا تھا جس کے بعد آرام اس کا حق تھا مگر اس وقت وہ اسے بےحد یاد آرہی تھی۔ اس کی باریک بینی کا پورا ڈپارٹمنٹ قائل تھا۔

'اگر وہ یہاں ہوتی تو اس سارے منظر کو کیسے دیکھتی؟' اس نے سوچا پھر چند لمحے بعد گویا ہار مان کر پیچھے مڑا۔

''کام ہوگیا ہے۔'' اس نے پولیس کی نفری کی جانب دیکھ کر آواز دی۔ ''آپ باڈی کو لے جاسکتے ہیں۔''

لاش کی منتقلی تک وہ اور شہباز وہیں کھڑے رہے تھے۔

''سر آپ کے خیال میں کیا وہ دوسرا قتل کرے گا؟'' شہباز نے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' کریم بولا۔

''آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' شہباز نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیونکہ......'' کریم ایک لمحے کو رکا پھر بولا۔ ''یہ اس کا پہلا قتل نہیں ہے۔''

☆☆☆

''کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے؟'' پولیس چیف نے کریم کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس وقت پولیس ہیڈکوارٹر میں تھے۔ کمرے میں کریم کے علاوہ پولیس چیف، ایس پی، فرانسک ہیڈ اور دو اعلیٰ افسران موجود تھے۔

''سو فیصد'' کریم نے بھاری آواز میں کہا۔ ''انداز، طریقۂ کار اور پریزنٹیشن بہت کچھ بالکل ویسی ہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس بار زیادہ مہارت سے کام کیا گیا ہے۔''

''تم تھوڑا تفصیل میں جاسکتے ہو۔'' ایس پی نے پوچھا۔

''یہ چھ ماہ قبل کی بات ہے۔ آپ نے سائرہ عبداللہ

کے قتل کے بارے میں سنا ہوگا؟''

''ہاں، مگر اس کا قاتل تو جل کر مرگیا تھا۔'' ایس پی نے کہا۔

''ہاں، کل تک میرا بھی یہی خیال تھا مگر آج اس لاش کو دیکھنے کے بعد میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ سائرہ کی لاش بھی اسی طرح ایک ویران علاقے میں ملی تھی۔ وہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ اس کی گردن میں بھی گلابی اسکارف تھا اور اس سے اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ سر پر وگ تھی، اسے گنجا نہیں کیا گیا تھا۔ صرف بال چھوٹے کیے گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھی اسی طرح سی دیے گئے تھے اور اس کی لاش کے پاس بھی بیکنی گلاب پایا گیا تھا۔ اس کیس کے فوراً بعد ایک اور خاتون اغوا ہوئی تھی۔ اسپیشل برانچ کی آفیسر آمنہ نے جان پر کھیل کر اسے بچایا تھا مگر وہ خود پھنس گئی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ آگ لگی تھی اور ہمیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ مرگیا ہے۔''

''یعنی اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکی تھیں۔'' چیف نے گہرا سانس لیا۔

''کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ ہمارے پاس نہ تو گواہ تھا نہ ہی کوئی وجہ قتل، کوئی ایک ایسی وجہ سامنے نہیں آسکی تھی جس کی بنا پر اسے اس طرح قتل کیا جاسکتا۔'' کریم دھیمے انداز میں بولا۔

اسی لمحے میز پر رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ ایس پی نے فون اٹھایا۔

''شِٹ......'' وہ دوسری جانب سے کہی گئی بات کے جواب میں بولا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ وہی ہے؟'' اس کے بعد وہ چیف سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں موجود باقی تمام افراد ساکت سے بیٹھے رہ گئے تھے۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی۔

''سر......'' وہ چیف کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لاش کی شناخت ہوگئی ہے۔ اس کا نام رابعہ جلیل ہے۔ وہ مشہور سیاست داں جلیل احمد شاہ کی بیٹی ہے۔''

''اوہ......!'' کریم کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔

''اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ڈپارٹمنٹ کو سخت دباؤ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' پولیس چیف نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کریم کو اس طرح کے دباؤ کے تصور سے ہی الجھن ہوتی تھی مگر وہ سمجھ رہا تھا کہ آنے والے کچھ دن یا ہفتے بہت سخت ثابت ہونے والے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ آمنہ بھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔

''کریم......'' پولیس چیف نے اس بار اسے براہِ راست مخاطب کیا۔ اس کی آنکھیں کچھ سوچ رہی تھیں۔ ''جس قسم کے حالات میں ہم اس وقت ہیں تمہیں معاملہ پریس تک جانے سے قبل فوری طور پر کوئی ایسا روڈ میپ بنانا ہوگا جو ہمیں قاتل تک لے جاسکے...... تمہیں اپنی پوری کوشش کرنی ہوگی۔''

''جی سر......'' کریم نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

''آمنہ سے رابطہ کرو۔'' انہوں نے کہا۔

''سر! میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کے لیے کام کرنا اور خصوصاً اس کیس پر کام کرنا بہت مشکل ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں یہ سمجھتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ اس کے بغیر اس کیس میں ہم تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہ اس سارے معاملے سے گزر چکی ہے اور اسے بخوبی سمجھتی ہے، ڈپارٹمنٹ کو اس کی ضرورت ہے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

کمرے میں موجود تمام افراد اب کریم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میرے لیے اس سے یہ سب کہنا مشکل ہے۔''

''کریم یہ میرا آرڈر ہے۔'' انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اوکے...... میں کوشش کرتا ہوں۔'' چند لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر کریم نے کہا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ آمنہ کے گھر کے سامنے کار لاک کررہا تھا۔ یہ ایک خوب صورت سا کاٹیج نما ون یونٹ مکان تھا۔ اس کا بیرونی حصہ مختلف درختوں، بیلوں اور پودوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے گیٹ کے ساتھ لگی بیل کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک ادھیڑ عمر خان صاحب یکا یک چراغ کے جن کے مانند برآمد ہوئے۔

''جی صاحب......''

''مجھے آمنہ بی بی سے ملنا ہے۔'' کریم نے اسے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہ آمنہ کے ساتھ ہونے والے واقعے کا نتیجہ تھا۔

''بی بی صاحب سے......؟'' اس نے گویا تصدیق چاہی۔ ''میں پوچھتا ہوں۔'' کریم کے سر ہلانے پر وہ جیسے

اچانک آیا تھا ویسے ہی غائب ہو گیا مگر پھر اگلے ہی لمحے دوبارہ باہر نکل آیا۔ ”صاحب، آپ کا نام کیا ہے؟“

اندر جا کر واپس باہر لوٹنے میں اسے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے آکر دروازہ کھولا۔ اندر بھی ایک چھوٹا سا لان تھا۔ اس کے ساتھ بنے مختصر سے پورچ میں آمنہ کی کار کھڑی تھی۔ کریم کو لاؤنج میں بٹھا کر خان صاحب باہر نکل گئے۔

”آپ......؟“ ایک قدرے ناراض لہجے نے کریم کو چونکا دیا۔ یہ آمنہ کی آواز نہیں تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ آمنہ کی چودہ سالہ بیٹی شیریں اسے ناراضی سے گھور رہی تھی۔

”کیسی ہو شیریں......؟“ وہ بالآخر بولا۔

”میں ٹھیک ہوں انکل...... کیا آپ مما کو لینے آئے ہیں؟“

”نہیں شیریں...... میں ان سے ملنے آیا ہوں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”پھر ٹھیک ہے۔“ اس بار اس کا لہجہ نارمل تھا۔

”کیا ٹھیک ہے......؟“ آمنہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب کچھ......“ کریم اسے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ اب بھی کافی کمزور لگ رہی تھی۔ اس نے لان کا پرنٹڈ سوٹ پہن رکھا تھا۔ بھورے بال سنہرے چہرے کا ہالا بنے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح ایک گرم جوش مسکراہٹ موجود تھی مگر اس کی آنکھیں سب ٹھیک نہ ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔

”یعنی آل از ویل......“ وہ مسکرائی۔ ”یار شیریں ویل (ٹھیک) سے سب ایکسیلنٹ (بہترین) ہو سکتا ہے اگر تم ایک اچھی سی کافی بنا لاؤ۔ یو نو کریم...... شیریں ماسٹر ہے کافی بنانے کی......“ شیریں کے جانے کے بعد وہ اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کیسے ہو تم......؟“

”ٹھیک۔“ وہ بولا۔ ”شیریں ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہے۔“

”ہاں...... خطرناک حد تک......“ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“ کریم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یار وہ بیٹی سے زیادہ اب میری اماں بننے کی کوشش کرتی ہے، خود ہی فیصلہ کر لیتی ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے، کیا کھانا ہے، کہاں جانا ہے، وغیرہ وغیرہ اور کمال یہ ہے کہ مجھ سے اس پر عمل بھی کرواتی ہے۔ میں تو گھر چھوڑ کر بھاگنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“ وہ متانت سے بولی۔

”کس کے ساتھ......؟“ کریم نے اسے چھیڑا۔

”یہی تو مسئلہ ہے۔“ آمنہ نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔ ”آج کل لوگوں کو بھاگنے دوڑنے کی فرصت ہی کہاں ہے۔ اچھا میری کہانی چھوڑو، تم بتاؤ کیسے آنا ہوا؟“

”سوچا تمہاری خیریت معلوم کر لوں۔“ کریم نے کہا۔ ”کیس کی فائل وہ ساتھ لایا تھا مگر وہ اس نے صوفے کے ساتھ آڑ میں رکھ دی تھی۔ اس دوران شیریں کافی دے گئی تھی۔

’اچھا اور وہ کیا ہے جو تم نے چھپا کر صوفے کے اس طرف رکھا ہے؟“ آمنہ نے کافی پیتے پیتے اچانک پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ کریم گڑبڑا گیا مگر اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ آمنہ اب اس جھٹکے کے اثرات سے باہر نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

”بتا دو یار...... کیا دوسری شادی کر رہے ہو؟ کارڈ وغیرہ لائے ہو جو اتنا ڈر رہے ہو؟“ اس نے گھر کا۔

”ایسی ہماری قسمت کہاں۔“ وہ غمناک لہجے میں بولا۔

”تم مردوں کا یونیورسل مسئلہ ہے دوسری شادی کا شوق......“ وہ بولی۔ ”شیریں کے پاپا کا بھی پسندیدہ ٹاپک تھا یہ......“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

”آمنہ یہ ایک تازہ کیس ہے...... سائرہ عبداللہ کیس سے ملتا جلتا......“ وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

”شاہانہ کیس......“ آمنہ نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ ماتھے پر دو لکیریں ابھری سی آئی تھیں۔ ”مجھے دکھاؤ۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ کریم نے جواب میں فائل اس کی جانب بڑھا دی۔ اس فائل میں کیس کی تمام تفصیلات اور تصاویر موجود تھیں۔ آمنہ چند لمحوں تک اس کا جائزہ لیتی رہی۔ تصاویر پر اس کی نظریں جم سی گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے پھر اس نے کریم کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ کریم تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آمنہ اس کے مقابلے میں بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اسے حقیقی افسوس ہوا تھا۔

”میں بہت خوف زدہ ہوں کریم۔“ وہ بالآخر بولی۔

''کیوں؟'' کریم نے بے اختیار پوچھا۔ ''مت ڈرو، وہ مر چکا ہے، وہ اب تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔''

''تم یہ یقین سے کہہ سکتے ہو؟ خاص طور پر یہ سب دیکھنے کے بعد......؟'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''آمنہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ وہی ہو اس کی لاش شناخت نہیں ہوسکی تھی مگر ہم سب اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ وہ مر چکا ہے اور ہم اسے بھی......'' وہ فائل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اسے بھی نہیں چھوڑیں گے یا تو یہ ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا یا پھر اسے پھانسی کی سزا ہوگی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

آمنہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے فائل بند کر کے کریم کی طرف بڑھا دی۔ ''مجھے افسوس ہے کریم......'' وہ بالآخر بولی مگر اس بار اس کے لہجے میں بہت اجنبیت تھی۔ ''میرا خیال ہے تمہیں اب چلنا چاہیے۔''

کریم حیرت سے اس کا چہرہ تکتا رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آمنہ اس سے ایسا سلوک کر سکتی ہے۔ اس نے آمنہ کے ہاتھ سے فائل لی۔ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کا کندھا تھپک کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کریم کے جانے کے بعد وہ کافی دیر وہیں بیٹھی رہی تھی۔ اس کا دماغ ساکت سا ہو گیا تھا۔ اسے تو لگنے لگا تھا کہ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ سب کچھ بھولتی جا رہی ہے مگر ان تصویروں نے اسے دوبارہ خوف اور اذیت کے اسی جہنم میں پہنچا دیا تھا۔

آنسو اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور جسم ہوا کے تیز جھکڑ میں آئے پودے کے مانند لرز رہا تھا۔ یہ سب ختم ہونا چاہیے۔ اسے اپنے کام کی جانب لوٹنا تھا مگر اس سب کے ساتھ اس حالت میں یہ کیونکر ممکن تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ گالوں پر بہنے والے آنسوؤں کو سختی سے پونچھا۔ اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ کریم اس کا پندرہ بیس سال پرانا دوست تھا، ہر مشکل وقت میں وہ آمنہ کے ساتھ کھڑا رہا تھا۔ تیمور کے جانے کے بعد اس نے اس کی بہت مدد کی تھی پھر اس کیس میں جسمانی طور پر شدید متاثر اور ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد آج اگر وہ اپنے قدموں پر کھڑی تھی تو اس کا بہت حد تک کریڈٹ کریم کو بھی جاتا تھا۔ وہ اسے اس طرح کیسے مایوس کر سکتی تھی۔ اسے شرمندہ کیسے کر سکتی تھی؟ اس نے تاسف کے عالم میں سر ہلایا۔

''مما......'' شیریں کی آواز نے اسے چونکایا۔

''جی بیٹا۔'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''آپ رو رہی تھیں؟'' وہ اس کے قریب آکر بولی۔ ''کریم انکل سے کوئی بات ہوئی ہے؟'' وہ نہایت فکرمندی سے ماں کا جائزہ لے رہی تھی۔

''نہیں شیریں، انہوں نے کچھ نہیں کہا ہے۔''

''وہ آپ کو واپس آنے کو تو نہیں کہہ رہے تھے؟''

''وہ کہیں یا نہ کہیں شیریں مگر مجھے کام تو کرنا ہی ہے نا۔'' اس بار اس نے بیٹی کو بغور دیکھا۔

''نہیں مما، اب میں آپ کو یہ خطرناک کام نہیں کرنے دوں گی...... دیکھیے ہمارے پاس مکان کا کرایہ تو آتا ہی ہے ہم اسی میں گزارہ کرلیں گے۔'' وہ بولی۔

''شیریں ابھی تمہیں یہ سب سوچنے کی ضرورت نہیں ہے میری گڑیا۔'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔ ''پھر میرا کام صرف اسی لیے تو ضروری نہیں ہے بیٹا۔''

''کیا مطلب......؟''

''بیٹا یہ میری ذمے داری ہے جو میں اپنے لوگوں کے لیے کر سکتی ہوں اور جو مجھے آتا ہے وہ صلاحیت میرے معاشرے، میرے لوگوں کا مجھ پر قرض ہے اور اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔'' اس نے دھیرے سے شیریں کا بازو پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا شوق بھی رہا ہے۔ تمہارے بابا سے شادی کے بعد سب کچھ بہت اچھا تھا مگر تمہاری دادی اور دوسرے خاندان والوں کو میری اسپیشل برانچ کی ملازمت پر خاصا اعتراض تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں خواہ کوئی اور کام کرلوں مگر یہ نوکری چھوڑ دوں، اس بات کو لے کر تیمور پر بہت دباؤ تھا۔ بالآخر ایک دن تمہارے بابا نے مجھ سے اس معاملے میں بات کی۔''

''پھر آپ نے کیا کہا؟'' شیریں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وہی کہ یہ میرا شوق ہے۔ خواب تھا میرا کہ میں اپنے بابا کی طرح اسپیشل برانچ میں اپنا، ان کا اور اپنے ملک کا نام روشن کرسکوں، مگر ان کے کہنے سے میں یہ سب چھوڑ سکتی تھی...... لہٰذا میں نے تیمور سے کہا کہ وہ فکر نہ کریں، میں یہ نوکری چھوڑ دوں گی۔''

''پھر......؟''

''پھر تمہارے بابا مسکرائے۔'' آمنہ کی آنکھیں خواب کی سی کیفیت میں تھیں۔ ''اور انہوں نے کہا کہ میری

خوشی ان کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے اور آج سے یہ میرا نہیں ان کا خواب ہے، اس کے بعد نہ جانے انہوں نے تمہاری دادی کو کیا کہا اور کس طرح سمجھایا کہ اس کے بعد کسی نے اس بات کو لے کر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تمہاری پیدائش کے بعد بھی یہ ان کی ہمت اور سپورٹ تھی کہ میں سب کچھ کرتی رہی۔ انہوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔''

''مما میں بھی آپ کا ساتھ دینا چاہتی ہوں۔'' شیریں کی آنکھوں میں اب موتی چمک رہے تھے۔ ''مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ کو کچھ نہ ہو جائے۔ میرے پاس آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔''

''تم بالکل پریشان مت ہو، تمہاری ماں اتنی کمزور یا ترنوالہ نہیں ہے۔'' اس نے بیٹی کا کندھا تھپتھپایا۔ ''اور اب مجھے باتوں میں لگا کر یہ بھلانے کی کوشش مت کرو کہ تمہاری ٹیوشن کا وقت ہوا جا رہا ہے۔ چار سو بیس لڑکی...... فوراً تیار ہو کر آؤ۔'' اس کے اعصاب یکلخت پُرسکون ہو گئے تھے۔

''آپ کہتی ہیں تو میں چھٹی کر لیتی ہوں۔''

''ہرگز نہیں، تیار ہو کر آؤ، مجھے تمہیں چھوڑ کر ایک کام سے بھی جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے مام مگر واپسی میں، میں برگر اور فرائز لوں گی۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''اف، کرپشن ہی کرپشن پھیلی ہوئی ہے ہر طرف......'' آمنہ نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

شیریں کے جانے کے بعد آمنہ نے غور سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں پر موجود زخم بھر چکے تھے۔ بس ہلکے ہلکے نشان باقی تھے۔ اسے اب اپنے ذہن اور دل پر پڑی خوف کی خراشوں کو بھی مٹانا تھا۔ ''بہت وقت گزر چکا ہے آمنہ، اب تمہیں ہمت کرنا ہوگی۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ سعدیہ مہر کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ سرخ اینٹوں سے مرصع چھوٹا سا مکان تھا۔ جو ایک ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع تھا۔ سعدیہ نے فون پر گفتگو کے بعد اپنا مکمل پتا واٹس ایپ کر دیا تھا۔ آمنہ اس پتے اور گوگل میپ کی مدد سے بالکل صحیح جگہ پہنچ گئی تھی۔ سعدیہ بھی اس کے ساتھ اس خوفناک تجربے سے گزر کر بچنے والی دوسری خاتون تھی۔ آمنہ چند لمحے کار میں بیٹھی ہمت مجتمع کرتی رہی پھر کار سے باہر نکل آئی اور دروازے کی جانب بڑھی۔ وہ اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ سعدیہ اپنی عمر کی تیسری دہائی میں تھی۔ وہ بہت زیادہ گوری رنگت اور کھڑے نقوش کی مالک تھی۔ مرون اور سیاہ پرنٹ کے سادہ مگر نفیس لباس میں وہ جچ رہی تھی۔

''آمنہ تمہاری آمد سے بہت خوشی ہوئی۔'' وہ آمنہ کا ہاتھ تھام کر اسے اندر لے جاتے ہوئے بولی۔

نشست پر بیٹھتے ہوئے آمنہ نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ لاؤنج بہت صاف ستھرا اور خوب صورت فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ ایک کامیاب تنہا خاتون کے گھر کے مانند وہاں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی مگر چند ہی لمحوں میں اسے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہر طرف سے بند گھر تھا۔ کمرے بلکہ غالباً سارے گھر کی کھڑکیاں مضبوطی سے بند تھیں۔ ان پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ آمنہ کے اندر آتے ہی سعدیہ نے جس طرح فوری طور پر دروازہ بند کر کے اس پر موجود تین چار لاک فوراً لگائے تھے۔ اس سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''تم نے دوبارہ جاب جوائن کر لی؟'' رسمی گفتگو اور تواضع کے بعد سعدیہ نے پوچھا۔ ''کیسا لگ رہا ہے، زندگی کی طرف لوٹنا؟''

''اچھا...... بہت اچھا لگ رہا ہے، میں نے دفتر جوائن نہیں کیا ہے فی الحال......'' آمنہ مسکرائی۔

''پھر بھی تم باہر نکلتی ہو، سارے کام کرتی ہو، یہ بہت بڑی بہادری ہے۔'' سعدیہ بولی۔

آمنہ اسے دیکھتی رہ گئی پھر پوچھا۔ ''اور تم......؟ تم اس سب سے باہر نکلیں یا نہیں؟''

سعدیہ جواب میں بالکل خاموش رہی تھی۔

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ تم نے خود کو اس گھر میں بند کر رکھا ہے...... تمہاری وہ پرانی ملازمہ ہے تمہارے ساتھ؟''

''ہاں پروین ہے، باہر کے تمام کام وہی کرتی ہے۔'' سعدیہ نے آہستگی سے کہا۔

''سعدیہ تمہیں کوشش کرنا ہوگی، اگر تم نے خود کو اسی طرح بند رکھا پھر تو یہ اسی طرح ہوا۔ جیسے تم ابھی تک اس کی قید میں ہی ہو۔'' اس کے ان الفاظ پر سعدیہ کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ ''سوری۔'' اس نے کہا۔

''نہیں آمنہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ ''میں تمہارا

شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی ہوں۔''

''وہ تم پہلے بھی ادا کر چکی ہو۔'' آمنہ مسکرائی۔ ''اب میرے پاس شکریہ رکھنے کی جگہ ختم ہوگئی ہے۔''

''مگر شاید میں نے تمہیں سوری کبھی نہیں کہا ہے۔'' سعدیہ نے کہا۔

''کس بات پر......؟'' آمنہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''اگر...... اگر اس دن تم مجھے نہ بچاتیں تو تم اس مشکل میں نہ پھنستیں۔'' وہ بمشکل کہہ پا رہی تھی۔

''سعدیہ! وہ میرا فرض تھا، تمہیں اس کے لیے شرمندہ ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔'' آمنہ نے نرمی سے کہا۔ ''اس طرح مت سوچو، تم پہلے ہی ایک مشکل وقت گزار کر آئی ہو۔''

''ہر روز...... ہر روز صبح بستر سے نکلنا اور زندگی جینا میرے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں ہوتا۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''تم میرا گھر دیکھ رہی ہو نا، میں تیز روشنی میں نہیں بیٹھ سکتی۔ ٹیلی ویژن یا گانے نہیں سن پاتی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہ کوئی اندر گھس نہ آئے اور میں اس کی آواز نہ سن پاؤں۔ کوئی بھی چیز مجھے ڈرا دیتی ہے۔'' وہ خاموشی سے رو رہی تھی۔ ''میں اب بھی زندگی پر، لوگوں پر بھروسا نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے گھر سے باہر قدم نکالتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

آمنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھی تھی۔ وہ اسے تسلی دینا چاہ رہی تھی مگر الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

''تم آج یہاں کیوں آئی ہو......؟'' سعدیہ نے اچانک پوچھا۔

''کوئی خاص وجہ نہیں...... تم سے ملنا چاہتی تھی۔''

آمنہ اس کے اچانک اور براہِ راست سوال پر گڑبڑا گئی۔

''نہیں، مجھے لگ رہا ہے کہ تمہیں کوئی خاص بات پریشان کر رہی ہے۔'' وہ غور سے آمنہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

آمنہ خالی الذہنی کی کیفیت میں چند لمحے تک اسے دیکھتی رہی۔ وہ آخر یہاں کیوں آئی تھی؟ شاید اسے سعدیہ کی رائے کی ضرورت تھی۔ وہ ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی۔ بالآخر اس نے گہری سانس لی۔

''سعدیہ ایک نیا کیس شروع ہوا ہے...... نیا نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ یہ کسی پرانے کیس کی اگلی کڑی ہے۔''

سعدیہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''اور تم مجھ سے مشورہ کرنا چاہتی ہو کہ تمہیں اس پر کام کرنا چاہیے کہ نہیں......؟''

آمنہ جواب میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ ایسے سعدیہ سے جواب کی توقع تھی مگر وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ کمرے میں چھا جانے والے اس اچانک سکوت نے آمنہ کو پریشان سا کر دیا تھا۔ اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کمرے میں نظر دوڑائی، بائیں سمت کی پتلی سی راہداری جس کی دوسری جانب بیڈ رومز تھے۔ ایک چھوٹی سی میز پر ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ حیرت کی بات اس کی وہاں موجودگی نہیں تھی بلکہ یہ تھی کہ اس کا تار ساکٹ میں لگے ہونے کے بجائے اس کے قریب پڑا تھا۔

''یہ اس فون کا تار تم نے کیوں نکال رکھا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے سوال نے سعدیہ کو جیسے گڑبڑا دیا۔ اس کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔

''وہ......'' وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''وہ مجھے فون کرتا رہتا ہے۔''

''کون......؟''

''اسلم...... اسلم بشیر۔'' اس کے جواب پر آمنہ کا دل گویا اچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔

''وہ مر چکا ہے۔'' آمنہ نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے خود اس جگہ کو آگ لگائی تھی اور اس کی لاش مل گئی تھی۔''

جواب میں سعدیہ نے گردن ہلائی۔ ''وہ کسی اور کی لاش ہوگی...... وہ زندہ ہے۔''

اس کا یقین آمنہ کو لرزا رہا تھا۔ اس کے بدترین اندیشے گویا سچ ثابت ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''وہ زندہ ہے...... وہ مجھے فون کرتا رہتا ہے۔'' سعدیہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ فون کرتا ہے، گہری گہری سانسیں لیتا ہے اور فون بند کر دیتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ وہی ہے، یقین کرو آمنہ وہ زندہ ہے۔''

''دیکھو ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہو۔'' آمنہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہم اسے چیک کر سکتے ہیں۔ میں اس کا انتظام کر سکتی ہوں، ہم اس کال کو ٹریس کر لیں گے۔''

''نہیں......'' سعدیہ نے حتمی انداز میں کہا۔

''کیوں؟'' آمنہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''میں...... میں اسے ناراض کرنا نہیں چاہتی۔''

سعدیہ نے بے چارگی سے کہا۔ آمنہ کے لیے اب اس ماحول میں مزید رکنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ہاتھ پاؤں میں لرزش ہو رہی تھی۔

''میں چلتی ہوں۔'' وہ بالآخر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے شیریں کو سینٹر سے لینا ہے ورنہ میں کچھ دیر اور رک جاتی۔''

سعدیہ اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی۔ اچانک اس نے آمنہ کا بازو پکڑا، اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ آمنہ کو اس کے ناخن اپنے گوشت میں اُترتے محسوس ہو رہے تھے۔

''آمنہ...... پلیز تم اس کیس پر کام کرو، اس کو پکڑو اور اسے مار ڈالو...... پلیز آمنہ......'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اس عورت سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ عورت کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ قدرے صحت مند جسامت اور خوب صورت نقوش کی مالک تھی۔ پونی میں بندھے اس کے سیاہ بالوں اور شخصیت کو دیکھ کر اس کے ماڈل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ دونوں اس وقت علاقے کے معروف سپر اسٹور میں کھڑے تھے۔ وہ شیلف سے سامان اٹھا کر اپنی ٹوکری میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ موبائل پر کسی سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ گفتگو کے دوران وہ بار بار ہنس پڑتی تھی۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا شاید اسے اس کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے اسے گھورتے ہوئے گردن کو جھٹکا دیا۔ اس کا درمیانے سے چھوٹا قد، عام سی شخصیت ہمیشہ سے ہی کسی کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اس عورت کو ذرا بھر اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کب سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی مگر وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ اس کا نام شرمین تھا۔ اس کا شوہر ایک آرٹ گیلری چلاتا تھا جبکہ وہ خود ایک خیراتی میڈیکل کلینک میں کام کرتی تھی۔ آج اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ اسے ان دنوں میں شرمین کے چھٹی والے دن کے تمام معمولات کا علم ہو چکا تھا۔ وہ قریبی جم میں ایک گھنٹا گزارتی تھی۔ پارک میں واک کرتی تھی۔ سامان خرید کر گھر جاتی تھی اور پھر لنچ کرنے اپنے شوہر کی گیلری میں چلی جاتی۔

اچانک شرمین نے کال بند کی اور قریبی کیشیئر کی طرف بڑھی۔ وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔ کاؤنٹر پر چھوٹی سی قطار سی لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک اور شخص کو ہٹا کر شرمین کے بالکل پیچھے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ خودکار دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ اسے اس وقت اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کا گھر جانتا تھا بلکہ ایک بار اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کے اندر تک جا چکا تھا۔

اب اسے جلد ہی کچھ کرنا تھا، اس نے سوچا۔ 'جلد بلکہ بہت جلد......'

☆☆☆

شرمین زاہد اپنی کار کے اندر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے پاس قدرے پرانی ایف ایکس تھی۔ وہ عجیب سی الجھن اور خوف محسوس کر رہی تھی جس کی وجہ خود اس کی سمجھ سے بھی باہر تھی۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہو۔ گزشتہ کئی دنوں سے کئی بار اسے اس بات کا احساس ہوا تھا۔ ''قنوطی ہوتی جا رہی ہوں میں یار۔'' وہ اپنے آپ سے بولی۔ ''میں کون سی کوئی بڑی شخصیت ہوں جو میرے دشمن مجھے نقصان پہنچائیں گے۔'' اس نے سر جھٹکا۔ کار اسٹارٹ کی اور ذہن کو کچھ اور سوچنے کی ہدایت کی۔ اپنی بہن سدرہ اور اس کی چھوٹی سی بیٹی کا تصور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا۔ سدرہ کی بیٹی کی تیسری سالگرہ ہونے والی تھی اور اس کا پورا انتظام شرمین خود کر رہی تھی۔

☆☆☆

''مجھے ڈر ہے کہ اب موقعِ واردات پر شاید ہی تمہیں کچھ مل سکے۔'' کریم بولا۔ وہ اور آمنہ اس وقت کریک پر سمندر کے سامنے بنی حفاظتی دیوار کے سامنے کھڑے تھے۔

''دیکھتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ تصویروں اور رپورٹس سے میرے ذہن میں مکمل تصویر نہیں بن پا رہی تھی۔'' آمنہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک ہو نا؟'' کریم نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

''ہم......'' اس نے سر ہلایا۔

وہ دونوں اب موقعِ واردات کے قریب تھے۔ ''ششش......'' آمنہ کراہی پھر جھک کر اس نے اپنے پیروں کی جانب دیکھا۔ اس طرف آنے والے راستے پر موجود چھوٹی بڑی جھاڑیوں میں سے کچھ غالباً کانٹے دار تھیں۔ ان میں سے کچھ کانٹے اس کی جینز پر چپکے ہوئے تھے اور سوئیوں کے مانند چبھ رہے تھے۔ اس نے ان کانٹوں کو جھاڑا۔ چند لمحوں بعد وہ موقعِ واردات پر کھڑے تھے۔

''لاش اس دیوار پر تھی۔'' کریم بولا۔

آمنہ اس دیوار کو چند لمحے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''وہ تصویریں کہاں ہیں؟''

کریم نے دونوں فولڈرز اس کے سامنے رکھ دیے۔ ایک فولڈر اس تازہ قتل کی تصاویر اور رپورٹس پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے فولڈر میں چھ ماہ قبل ہونے والے قتل کی تصاویر موجود تھیں۔ آمنہ ان دونوں فولڈرز کی تصاویر نکال کر سامنے رکھتی جارہی تھی۔

''کریم یہ ہمارے پرانے کیس سے بہت ملتا جلتا ہے۔ دونوں عورتیں اپنی عمر کی تیسری دہائی میں تھیں، شادی شدہ تھیں اور ان کے بچے بھی تھے۔ ہمیں یہ چیک کرنا چاہیے کہ ان دونوں عورتوں یا ان کے بچوں کے درمیان کہیں کوئی تعلق تو موجود نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں کسی کی ڈیوٹی لگاتا ہوں۔''

''باقی سب کچھ ایک جیسا ہے، گلابی ربن سے دونوں کا گلا گھونٹا گیا ہے۔'' وہ کہے جارہی تھی۔ ''وہی سنہری وگ، بیگنی رنگ کا کاغذی پھول، دونوں قتل میں آنکھوں کے اوپری پپوٹوں کو اوپر کی جانب سیا گیا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ شاید وہ نفسیاتی مریض یہ چاہتا تھا کہ اس کے شکار موت کے بعد بھی اسے دیکھتے رہیں۔''

آمنہ نے سر ہلایا پھر گویا اس کے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ''نہیں......'' وہ قدرے تیز آواز میں بولی۔ ''اسے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔''

''پھر......اس کی اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟'' کریم نے پوچھا۔

''تم یہ دیکھو کریم کہ وہ ہمارے سامنے کیا منظر پیش کرنا چاہتا ہے۔ یہ نیلے کانٹیکٹ لینس جن سے آنکھوں کے اصلی نہ ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ پپوٹوں کو اوپر سی کر آنکھوں کو خوب بڑا بنا دیا گیا ہے۔ جسم پر ویزلین لگا کر پلاسٹک نما چمک دی گئی ہے۔ سر پر سنہری وگ لگائی گئی ہے۔ اس نے اپنی دونوں شکاروں کو گڑیا کی سی شکل دی ہے...... سوچو کریم...... کیا یہ لاش گڑیا نہیں لگ رہی......؟'' آمنہ نے تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''تم سچ کہہ رہی ہو......واقعی۔'' کریم بولا۔

آمنہ اب زمین کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک خیال اس دوران کسی کانٹے کے مانند اس کے ذہن میں چبھا۔ اسے زمین پر کئی جگہ کانٹے پڑے نظر آئے تھے۔ لاش کے برآمد ہونے کے بعد سے جائے واردات پر پولیس کے سوا اور کوئی نہیں آیا تھا۔ دیوار کے بالکل ساتھ پڑے کانٹے ان کے مددگار ہوسکتے تھے۔

''کریم! جب کل تم لوگ یہاں آئے تھے تب یہ کانٹے یہاں بکھرے ہوئے تھے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''مجھے اندازہ نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ شاید یہ موجود ہی تھے۔''

''انہیں جمع کرلو۔'' وہ بولی۔ ''اس سے ہمیں شاید قاتل کے ڈی این اے کی خبر مل سکے۔''

کریم کی آنکھیں ایک لمحے کو پھیل سی گئیں پھر اس نے ہاتھ میں پکڑے بیگ سے زپ لاک لفافہ نکالا اور ٹیویزر کی مدد سے کانٹے چن کر اس میں ڈالنے لگا۔ یہ باریک بینی ہی آمنہ کا کمال تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرایا، اسے خوشی تھی کہ وہ ٹھیک ہوتی جارہی تھی۔

''وہ اپنے کام میں ماہر ہوتا جارہا ہے۔'' آمنہ کی آواز نے اسے چونکایا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ اب تک اس نے اپنا تیسرا ٹارگٹ تلاش نہ کرلیا ہو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

☆☆☆

کریم نیلی آنکھوں کے سمندر میں تھا اور کمال کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اصلی نہیں تھی۔ اسے اپنے کیسز، مقدمات اور جرائم کے بارے میں ڈراؤنے خواب دیکھنے کی عادت نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔

اس بڑے سے ڈول اسٹور میں اس کے اردگرد ہر طرف گڑیاں ہی گڑیاں تھیں جن کی پوری طرح کھلی ہوئی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ اب تک کئی دکانوں اور اسٹورز پر جاچکا تھا مگر یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی اسٹور تھا جسے اس کے مالکوں نے ڈول ورلڈ کا نام دے رکھا تھا۔ اس دکان میں مختلف سائز اور طرز کی غالباً ہزاروں گڑیاں موجود تھیں۔

''میں سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ ایک ڈول اسٹور سے خصوصی برانچ کو کیا کام پڑسکتا ہے؟'' دکان کا منحنی مالک اس کا کارڈ دیکھ کر جزبز ہوگیا تھا مگر اس نے اسے اپنے دومنزلہ آراستہ و پیراستہ اسٹور کا جائزہ لینے سے نہیں روکا تھا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری منزل میں داخل ہورہے تھے۔ کچھ قدم آگے بڑھ کر کریم ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے کئی شیلفس پر موجود گڑیاں بالکل اس لاش کی کاپی محسوس ہورہی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں میں بیگنی رنگ کا پیکنگ میں استعمال

ہونے والا پھول تک موجود تھا۔

☆☆☆

وہ ایک عالیشان قلعے نما محل کے لمبے چوڑے گیٹ کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دو چاق چوبند گارڈز چیکنگ میٹر سے اس کی کار کو چیک کر رہے تھے۔ سیکیورٹی کلیئرنگ کے بعد انہوں نے بڑا گیٹ کھول دیا اور آمنہ کی چھوٹی سی کار لمبے چوڑے ڈرائیو وے سے گزر کر پورچ میں جا رکی۔ اس کے اترتے ہی ایک شوفر نے اس سے کار کی چابی لے لی تاکہ اسے پارکنگ ایریا میں کھڑا کیا جا سکے۔ سامنے برآمدے میں ایک نوجوان اس کا منتظر تھا۔

''میں فیصل احمد شاہ ہوں۔ رابعہ کا بھائی۔'' وہ دھیمے سے بولا۔ ''میں آپ کو اپنے والد اور والدہ کے پاس لے جاتا ہوں، وہ آپ کے منتظر ہیں۔''

''شکریہ...... مجھے آپ کی بہن کو پیش آنے والے حادثے پر بہت افسوس ہے۔'' آمنہ کے الفاظ پر نوجوان نے سر ہلایا۔ اس کی عمر 25 سال کے لگ بھگ تھی۔ کندھوں سے تھوڑے اوپر تک لمبے بال، گوری رنگت اور ہلکی ہلکی داڑھی مونچھوں کے ساتھ وہ ایک اسمارٹ شخصیت کا مالک نظر آ رہا تھا۔ لکڑی کے منقش دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک نئی دنیا اس کے سامنے تھی۔ قیمتی ساز و سامان سے سجے اس گھر کو نوادرات سے گویا بھر دیا گیا تھا۔ ایک لمبی راہداری سے گزرنے کے بعد فیصل نے ایک دروازہ کھولا۔ یہ ایک لاؤنج نما کمرا تھا جہاں آرام دہ صوفے موجود تھے۔ انہی صوفوں میں سے ایک تھری سیٹر پر جلیل احمد شاہ اور اس کی بیوی موجود تھے۔

''ڈیڈی یہ اسپیشل برانچ سے آمنہ احمد ہیں۔ ہمیں انہی کی آمد کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ آمنہ صاحبہ یہ میرے ممی اور ڈیڈی ہیں۔'' فیصل نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔

''سب سے پہلے تو میں اس سانحے پر آپ دونوں سے افسوس کرنا چاہتی ہوں۔'' آمنہ نے کہا۔

اس کے اس جملے پر جلیل احمد کا چہرہ تو ساکت ہی رہا تھا جبکہ اس کی بیوی نے گردن کو ہلکا سا خم دیا تھا گویا اس نے اس کی تعزیت کو قبول کیا تھا۔ وہ دونوں اپنی کلاس کی مکمل نمائندگی کر رہے تھے۔ جلیل احمد شاہ طویل القامت دہری جسامت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر رعونت نے ڈیرا ڈال رکھا تھا جبکہ اس کی بیگم کا چہرہ جوان نظر آنے کے شوق میں مہنگی سرجریوں اور بوٹوکس کے استعمال سے قدرے مصنوعی سا محسوس ہو رہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں اس تکلیف دہ موقع پر آپ کو زحمت دے رہی ہوں مگر میں آپ سے آپ کی بیٹی رابعہ کے بارے میں چند سوالات کرنا چاہتی ہوں، امید ہے آپ تعاون کریں گے۔''

''ظاہر ہے، آپ سوال کریں۔'' جلیل شاہ نے دبنگ لہجے میں کہا۔

''کیا آپ لوگ رابعہ سے روزانہ رابطے میں تھے؟''

''بالکل......'' جلیل شاہ کی بیوی نے کہا۔ ''وہ ہماری بیٹی تھی۔ شادی کے بعد وہ یہاں سے قدرے دور رہ رہی تھی مگر ہماری روز ہی بات ہوتی تھی۔''

''کیا اس نے کبھی آپ سے ایسی کوئی بات کہی جس سے اندازہ ہو کہ کوئی اسے دھمکیاں دے رہا تھا یا وہ کسی سے خوف زدہ تھی؟''

''نہیں...... بالکل نہیں، اگر وہ ایسا کچھ بتاتی تو وہ شخص آج تک آزاد ہوتا؟'' جلیل شاہ کی اہلیہ کے انداز میں بہت سختی تھی۔

''رابعہ ان دنوں کچھ پریشان ضرور تھی۔ اس کے اپنے شوہر سے تعلقات بالکل ٹھیک نہیں تھے اور وہ طلاق لینے والی تھی۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ طلاق کی صورت میں ستار شاہ اسے بچے دینے سے انکار کر رہا تھا۔'' اس بار فیصل بولا تھا۔

''میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔'' اس بار جلیل شاہ کی اہلیہ نے شوہر کو فہمائشی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے ہی رابعہ کو نقصان پہنچایا ہو؟''

''نہیں۔'' آمنہ نے سر ہلایا۔ ''اس کیس میں ان پر شک نہیں کیا جا رہا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ اس طرز کا دوسرا قتل ہے، چھ ماہ قبل بھی کئی عورتوں کو اغوا کیا گیا تھا۔ ڈپارٹمنٹ اور تفتیش اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہمیں ایک جنونی سیریل کلر کا سامنا ہے جسے عورتوں کو تکلیف پہنچا کر انہیں قتل کر کے سکون ملتا ہے۔ آپ کی بیٹی غالباً اس سے واقف بھی نہیں ہوگی، اس قتل میں ذاتیات کا دخل کم سے کم ہے۔'' آمنہ نے تفصیل سے بتایا۔

''عجیب باتیں کر رہی ہو تم......'' اس بار وہ بھڑک اٹھی تھیں۔ ''تمہارے خیال میں یوں ہی کسی نے ہماری بیٹی کو قتل کر دیا۔ تم لوگوں کی اسی قابلیت کی وجہ سے ہی تو ملک کا یہ حال ہے۔ شرلاک ہومز بنتے ہیں آتا جاتا کچھ نہیں۔''

ماہِ فروری 2018ء کے دل کش شمارے کی حسین جھلکیاں
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
پاکیزہ
رفعت سراج اور شیریں حیدر کے مسلسل ناول کی نئی چونکا دینے والی اقساط
حیا بخاری کے سلسلے وار ناولٹ...... محبت لفظ ہے لیکن...... میں دیکھیے کردارنگاری کے حسین جوہر
ناہید سلطانہ اختر کے مشاق قلم کا شاہکار افسانہ...... چاک چاک قبائے دل
فرحین اظفر...... عورت کہانی میں ایک نہایت حساس موضوع لیے حاضر ہیں
روشانے عبد القیوم کا مکمل ناول...... میرا عشق صوفیانہ
کردار سازی اور روح کی بالیدگی کا اہتمام لیے
ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت
کے ایمان افروز کالم
شائستہ زریں نے مہمان بلایا شہزاد شیخ اور ان کی وکیل ہم سفر کو
اس کے علاوہ
مایہ ناز قلم کاروں کی دل کو چھو جانے والی بہترین تحریریں جن میں عقیلہ حق، طیبہ عنصر مغل، بشریٰ سیال،
ھما بیگ، ماہ وش طالب، نزہت جبین ضیا، حرا قریشی، صدف آصف و دیگر مصنفات شامل ہیں۔
اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مستقل سلسلے، رنگارنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آزمودہ ترکیبیں اور بہت کچھ......

''فیصل تم اپنی والدہ کو اندر لے جاؤ۔'' اس بار جلیل شاہ بولا تھا۔ ''مجھے میڈم آمنہ سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا ہیں۔''

ان دونوں کے جانے کے بعد جلیل شاہ نے سخت نگاہوں سے آمنہ کو گھورا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا یہ انداز بہت سوں کو خوف زدہ کر دیتا ہوگا مگر آمنہ کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ جوابی طور پر خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی تھی۔ آخر کار جلیل شاہ نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر آمنہ کی جانب بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' آمنہ نے لفافے کو تھامتے ہوئے پوچھا۔

''اس میں وہ سب کچھ ہے جو تم جاننا چاہتی ہو۔''

''کیا میں اسے کھول سکتی ہوں؟''

''بالکل.....'' اس کے جواب کے ساتھ ہی آمنہ نے لفافہ کھول لیا تھا۔ اندر ایک سفید کاغذ پر بارہ نام لکھے ہوئے تھے ان میں سے چند کو وہ جانتی تھی۔ تین صحافی، دو اینکرز اور باقی نام دیگر سیاست دانوں کے تھے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ میں اس فہرست کا کیا کروں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ میرے دشمن ہیں، شاید ان کے علاوہ بھی کچھ ہوں مگر یہ میرے بڑے دشمن ہیں اور مجھے یقین ہے کہ رابعہ کے معاملے میں ان میں سے ہی کسی کا ہاتھ ہے۔'' وہ وثوق سے بولا۔

''آمنہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''سر میں نے آپ کو ابھی بتایا ہے کہ یہ قتل ذاتی نوعیت کا نہیں ہے۔''

''یعنی تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ میری بیٹی اتفاق سے ایک جنونی کے ہاتھ لگی اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ کان کھول کر میری بات سنو، میری بیٹی کا قتل نہ صرف ذاتی ہے بلکہ یہ سیاسی قتل ہے۔ تمہارا کام میری بات سننا ہے، مجھ پر اپنی تفتیش کا حکم لگانا نہیں ہے۔'' اس بار وہ غصے میں بپھر سا گیا تھا۔

آمنہ جواب میں اسے گھورتی رہی تھی۔

''مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری بات سمجھ نہیں پا رہی ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میری پہنچ بہت دور تک ہے۔ تمہارے ادارے کے بڑے افسران میرے دوست ہیں اور میں ان سے ایک لمحے میں رابطہ کر سکتا ہوں۔ مجھے اس کیس پر بات سمجھنے والا آفیسر چاہیے۔''

آمنہ چند لمحے سکتے کے سے عالم میں اسے گھورتی رہی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔''

''یہی بہتر ہے۔'' وہ پاس رکھی گھنٹی کو بجاتے ہوئے بولا۔ لمحہ بھر میں بوتل کے جن کے مانند ایک باوردی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ ''میڈم کو باہر تک چھوڑ دو، یہ بہت بڑا گھر ہے یہ کہیں گم نہ ہو جائیں۔'' یہ کہہ کر وہ خود کمرے سے باہر نکل گیا۔

آمنہ اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔ جلیل احمد شاہ صرف ایک مغرور اور متکبر شخص ہی نہیں تھا۔ ضرور کچھ اور تھا جو وہ چھپا رہا تھا اور جو کچھ وہ چھپا رہا تھا وہ اسے کسی بھی قیمت پر معلوم کر کے رہے گی۔

☆☆☆

''تو تمہارے خیال میں جلیل احمد شاہ ڈپارٹمنٹ کے لیے مسائل کھڑے کرے گا؟'' ڈی آئی جی پرویز احمد نے پوچھا۔

آمنہ اور کریم اس وقت ان کے کمرے میں موجود تھے۔

''جی سر، مجھے افسوس ہے مگر وہ اس سانحے کو سیاسی طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں بہرحال اس قسم کا دباؤ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے، ہم اسے دیکھ لیں گے۔ اس ساری گڑبڑ سے ہمیں جو راہ ملی ہے وہ یہ ہے کہ اب ہمیں اپنا کام اور تیز کرنا ہوگا۔ اس کے اوپر بات کرنے سے قبل ہمارے پاس کوئی منطقی ثبوت ہونا چاہیے۔''

''بالکل سر۔''

''میں فارنسک سے شہزاد کو اور انسپکٹر جمشید کو بھی بلواتا ہوں، دیکھتے ہیں کہ انہیں مزید کیا ملا ہے۔''

چند لمحے میں وہ دونوں کمرے میں موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کئی فولڈرز تھے۔

''سر قاتل نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔ اچھی طرح چھان بین کے بعد بھی کہیں کوئی فنگر پرنٹ یا ڈی این اے تک پہنچانے والی کسی بھی چیز جیسے لاش کے ناخنوں میں سے کسی جلد کے ریشے، بال، خون کا کوئی قطرہ کچھ بھی نہیں ملا ہے۔ اس نے مکمل احتیاط اور فنکاری سے اپنا کام کیا ہے۔'' چیف فارنسک آفیسر شہزاد نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ان کانٹوں سے کچھ مدد ملی؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''نہیں، اس پر پلاسٹک ٹائپ کسی سخت چیز کے ریشے

ملے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے دستانے وغیرہ پہنے ہوئے تھے۔''

''اور کوئی خاص بات......؟'' کریم نے پوچھا۔

''جی سر، ایک بہت خاص بات معلوم ہوئی ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولا۔ ''رابعہ جلیل شاہ اس نامعلوم قاتل کا دوسرا نہیں تیسرا شکار تھی۔ ایک سال پہلے شہر کے شرقی حصے میں ایک عورت کو بالکل اسی انداز میں قتل کیا گیا تھا۔'' وہ ایک فولڈر میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اسے اسی طرح اغوا کیا گیا تھا۔ اس کے جسم پر بھی تشدد کے نشانات ملے ہیں۔ اسے گلابی ربن سے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ سر پر سنہری وگ بھی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے پپوٹے سلے ہوئے نہیں تھے اور اسے جھاڑیوں میں پھینک دیا گیا تھا۔ مقامی پولیس نے اس کیس پر کام کیا تھا اور پھر کوئی سراغ نہ ملنے پر فائل بند کردی گئی تھی۔''

''ہوں......'' پرویز احمد کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑے ہوئے تھے۔ ''جمشید، ایک کام کرو، اپنے ریکارڈ سے ان سب کے نام پتے نکالو جو ریپ اور اس قسم کے دیگر جرائم میں ملوث رہے ہیں۔ ان میں بھی ان لوگوں پر زیادہ توجہ کرو جو اغوا، ریپ اور قتل کے سلسلے میں سزا یافتہ ہوں۔''

''نہیں۔'' آمنہ کے بے اختیار بول پڑنے پر سب نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہم غلط سمت.... جارہے ہیں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں نے پچھلے دنوں قتل کی رپورٹ کو بھی پڑھا ہے اور اس فولڈر کے مطابق بھی کسی عورت کا قتل سے قبل ریپ نہیں کیا گیا ہے۔''

''ہاں، یہ درست ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''میرا تجزیہ یہ ہے کہ یہ قتل کسی انتقامی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسے عورتوں کو تکلیف پہنچا کر لطف آتا ہے اور یہ سارا معاملہ کہیں گڑیوں سے جا کر ملتا ہے، کوئی کڑی ایسی ہے جو اس سب کو ایک خاص انداز کی گڑیا سے ملاتی ہے، تب ہی وہ عورتوں کو قتل کر کے انہیں ان کی شکل دے دیتا ہے۔ اس ایک سال میں اس نے اپنے کام میں مہارت حاصل کی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''یعنی ہمارا پالا ایک چالاک اور سفاک قاتل سے ہے؟'' شہزاد نے کہا۔

''نہیں، میرا خیال اس سے مختلف ہے۔'' آمنہ بولی۔ ''نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ بظاہر عام سا، بے ضرر سا ایک ایسا شخص ہے جس کے بارے میں یہ گمان بھی مشکل ہو کہ وہ ایسا کچھ کرسکتا ہے۔''

''یعنی اس سب کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس وقت ایک دھندلکے میں کھڑے ہیں۔ وہ موجود ہے، یہ ہم جانتے ہیں۔ وہ کہاں ہے، کیسا ہے اس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں، وہ خطرناک ہے اور اب یقیناً کامیابی کے نشے میں چوتھے شکار کی تلاش میں ہوگا۔ ہمیں کسی بھی طرح اسے روکنا ہے...... کیسے؟ یہ ابھی ہمیں معلوم نہیں ہے۔'' شہزاد احمد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''مگر ایک بات میں جانتا ہوں کہ ہمیں اگلے تین دنوں میں اسے پکڑ لینا ہے۔ تین دن بعد منسٹر صاحب ملک واپس آرہے ہیں جس کے بعد جلیل شاہ کا کھیل شروع ہوجائے گا، اس میں الجھنے کے بعد ہم اس ممکنہ شکار کو بچا نہیں پائیں گے۔ ہمیں اس سے قبل ہی حقیقت کو آشکار کرنا ہے۔''

☆☆☆

واپسی پر وہ دونوں ہی خاموش تھے، شہزاد کا تیار کردہ فولڈر آمنہ کے ہاتھ میں تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' کریم نے اس کی مسلسل خاموشی پر پوچھا۔

''اسلم بشیر...... کریم کیا وہ زندہ ہے؟ کیا وہی یہ سب کررہا ہے؟'' وہ بولی۔

''نہیں، مجھے ایسا نہیں لگتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے وہ لاش خود دیکھی ہے۔ آگ میں جل جانے کے باعث وہ قابلِ شناخت نہیں تھا مگر اس کا قد کاٹھ، جسامت وہی تھی اور اس جگہ صرف وہی تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ وہ مرچکا ہے۔ یہ کوئی اور ہے آمنہ، دنیا میں اس قسم کے ذہنی مریضوں کی کمی نہیں ہے۔''

''تمہیں اس بات کا کس حد تک یقین ہے؟''

''ننانوے فیصد یقین ہے مجھے۔'' وہ بولا۔

''مگر سو فیصد تو نہیں ہے نا۔'' آمنہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''آمنہ سو فیصد یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کیا ہم سو فیصد یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم اگلے گھنٹے تک زندہ رہیں گے؟ یا کل سورج نکلے گا؟ یہاں کچھ بھی سو فیصد نہیں ہے۔ امید، امکانات کو روشن کرتی ہے اور یہ روشنی یقین کی وادی تک لے جاتی ہے۔ سفر کبھی تمام نہیں ہوتا۔ ہر منزل نئی امید کو جنم دیتی ہے اور ہر نئی امید ایک نئے امکان کو...... یار میں خاصا فلاسفر سا نہیں ہوتا جارہا؟'' وہ ہنسا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو کریم۔'' آمنہ بھی ہنس پڑی۔

کریم اسے گھر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ فولڈر ہاتھ میں تھامے اندر آگئی۔

''پھر لیٹ ہوگئیں؟'' شیریں لاؤنج میں اس کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے کسی ہیڈ مسٹریس کی طرح پوچھا۔

''سوری بیٹا، کام کا پہلا دن تھا۔'' وہ اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے بولی۔

''سوری کچھ نہیں ہوتی، آپ نے غلطی کی ہے اور آپ کو اس کی سزا ملے گی۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''کیسی سزا! می لارڈ......؟''

''میڈم شیریں کو آئسکریم کھلوائیے۔ آج ویسے بھی بوا اماں نے کڑھی بنائی ہے۔'' وہ آواز دبا کر بولی۔ ''اور غضب خدا کا کہ اس کی غذائیت پر لیکچر بھی دیا ہے۔ میری تو آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اچھے بھلے بے چارے پکوڑوں کو اس طرح ڈبونے کی ضرورت کیا ہے، بہرحال میں پزا بھی کھاؤں گی۔''

''او کے......مگر میں بہت تھک گئی ہوں اور کام بھی ہے۔'' وہ ہاتھ میں پکڑا فولڈر لہراتے ہوئے بولی۔

''اس میں کیا نیا ہے؟'' شیریں نے منہ بنایا۔ ''مگر میرے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔'' اس نے اپنا فون اٹھایا۔ ''ابھی آرڈر کرتی ہوں پزا، آئسکریم اور برگر سب خود گھر آجائیں گے۔''

''یہ برگر کہاں سے آگیا اب......؟'' اس نے بیٹی کو گھورا۔

''یہ باہر نہ لے جانے کا جرمانہ ہے اماں۔'' وہ آواز بنا کر بولی۔ ''آپ پیسے نکال کر رکھیں باقی سب کام میں کر لوں گی یوں بھی ساری ذمے داری میرے سر پر ہی تو ہے۔'' وہ فون کو کان سے لگا کر اوپر جاتے ہوئے بولی۔ آمنہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ فون کے الارم سے کھلی تھی۔

وہ کہاں تھا؟ خالی الذہنی کی کیفیت میں اس نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ یہ ایک صاف ستھرا چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک جانب میز کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کاؤچ تھا جس پر وہ اس وقت دراز تھا۔ کمرے کی ایک دیوار پر الماریاں سی بنی ہوئی تھیں اور ایک کونے میں فریج اور مائیکروویواوون نظر آرہے تھے۔ اس کا ذہن اب بھی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور سامنے موجود دروازے کو کھولا۔ سامنے ایک پتلی اور چھوٹی سی راہداری تھی جس کے دوسری جانب ایک کمرا تھا جس کی دیوار کے ساتھ طبی معائنے والا اسٹریچر رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو وہیل چیئر بند حالت میں موجود تھیں۔

''اور۔'' اس کے دماغ میں گھنٹی سی بجی وہ ''فری میڈیکل کلینک'' میں تھا۔ وہ مسکرایا۔ آج تو اس کے لیے بہت اہم دن تھا۔ اس دن کے لیے اس نے مسلسل تین ہفتوں تک محنت کی تھی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ یہاں کس طرح داخل ہوا تھا۔ تصور ہی تصور میں اس نے خود کو اپنی چالاکی پر گویا شاباش دی۔ وہ شام پونے سات بجے کلینک میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت یہاں کافی مریض موجود تھے۔ اس کے بند ہونے کا وقت بھی قریب تھا۔ لہٰذا اسٹاف تیزی سے کام نمٹا رہا تھا۔

اس نے بلڈ پریشر چیک کرانے کا بہانہ بنایا تھا اور کمال کی بات یہ ہے کہ اس کا بلڈ پریشر اسی نے چیک کیا تھا جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ وہ تین ہفتوں سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ گھر پر، کام پر جاتے ہوئے، شاپنگ کرتے ہوئے اس کے تمام معمولات اسے ازبر تھے۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔

بلڈ پریشر چیک کرانے کے بعد وہ موقع پاتے ہی الماری کے نچلے بڑے خانے میں چھپ گیا تھا۔ اسٹاف الماری چیک کیے بغیر کلینک بند کر گیا تھا۔ ان سب کے جانے کے بعد وہ وہاں سے نکل کر اسٹاف کے لیے مختص اس کمرے میں آکر سو گیا تھا۔ سونے سے قبل وہ الارم لگانا نہیں بھولا تھا کیونکہ آج اس کے لیے وقت کا حساب بہت اہم تھا۔ اس نے فون کی گھڑی کو دیکھا۔ آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

''وہ اب آتی ہی ہوگی۔'' اس نے سوچا۔ اس کی نگرانی کی ریکی کے دوران وہ جان چکا تھا کہ وہ ہر روز آٹھ بجے کلینک پر پہنچتی ہے۔ کلینک کھول کر اسے ڈاکٹروں اور مریضوں کے لیے سیٹ کرنا اس کا کام تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے صفائی کا کام کرنے والا اور وارڈ بوائے آجاتے تھے۔ آٹھ سے ساڑھے آٹھ تک وہ کلینک میں تنہا ہوتی تھی۔

مگر آج کا دن مختلف تھا، آج وہ اکیلی نہیں رہے گی۔ اس نے سوچا۔ اسے باہر کوریڈور میں اس کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یعنی وہ وقت پر پہنچ گئی تھی۔ وہ اطمینان سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے دو مرتبہ کے تجربوں میں وہ خود بھی خوف زدہ تھا مگر تیسرے تجربے نے اسے

بہت اعتماد دیا تھا۔ وہ اس بار کچھ نیا بھی کرنا چاہتا تھا۔ کیا کرنا چاہیے؟ اس نے سوچا پھر مسکرایا۔ وہ اسے حیران کرنا چاہتا تھا۔ ”اس کا استقبال میرا ذاتی نشان کرے گا۔ میرا شناختی نشان......“ وہ مسکرایا۔

☆☆☆

شرمین کے قدم تیزی سے کلینک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس کا ذہن دن بھر کے کاموں کی تفصیل تیار کر رہا تھا۔ اسے اس فری کلینک میں کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ ایک بڑی آرگنائزیشن کی جانب سے چلنے والی اس فری کلینک سے روزانہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد مستفید ہوتی تھی۔ اسے اپنا کام بہت پسند تھا۔ روزگار کے ساتھ ساتھ لوگوں کے کام آنا ایک بہت اچھا احساس تھا۔ اسے صبح کے اوقات میں ڈاکٹرز کی گزشتہ روز مہیا کی گئی لسٹ کے مطابق دواؤں کو ترتیب دینا ہوتا تھا، ساتھ ہی سب کے شیڈولز کی تیاری کرنا ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے وقت کی پابند تھی اور اس کی اس خوبی کو اس کے دفتر میں بہت سراہا جاتا تھا۔ آج اسے یوں بھی شام کو قدرے جلدی نکلنا تھا۔ لہٰذا اسے اپنے تمام کام جلد از جلد نمٹانے تھے۔ اس کی بھانجی کی دو دن بعد سالگرہ تھی اور آج انہوں نے اس کے لیے شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔

کلینک کا دروازہ کھل کر وہ اندر داخل ہوئی اور معمول کے مطابق اندر آکر دروازے کو دوبارہ لاک کر دیا۔ صفائی کے کام کے لیے آنے والے اسٹاف کی آمد تک وہ دوازے کو مقفل ہی رکھا کرتی تھی۔

ویٹنگ ایریا اور استقبالیہ ڈیسک سے ذرا آگے آکر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس سے قدرے آگے صاف ستھری زمین پر کچھ پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں نیم اندھیرے کی بنا پر وہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ کیا تھا۔ اس نے کمرے کی لائٹیں روشن کیں۔ سامنے کمرے کے عین درمیان .... ایک بیگنی رنگت کا پیکنگ وغیرہ میں استعمال ہونے والا پھول پڑا ہوا تھا۔

”یہ یہاں کیسے آیا؟“ اس نے حیرت سے سوچا اور آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ عام سی ربن نما میٹریل سے تیار کردہ وہ پھول بالکل نیا اور چمک دار نظر آرہا تھا۔

کلینک بند ہونے سے قبل صفائی ان کا روز کا معمول تھا پھر یہ اسٹاف کی نظر سے کیسے بچ سکتا ہے۔ اس نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ اچانک اسے ہلکی سی آواز سنائی دی اور خوف کی لہر نے اسے سر سے پیر تک بھگو ڈالا۔ یہ پھول اور یہ آواز...... اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اس وقت کلینک میں اکیلی نہیں ہے۔ ذہن میں بجنے والا خطرے کا یہ سائرن اس قدر شدید تھا کہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر واپسی کے لیے مڑی۔

وہ مڑی ہی تھی کہ ایک مضبوط ہاتھ نے اس کے بازو کو جکڑ لیا۔ شرمین نے مڑے بغیر اپنی کہنی کو جسم کی تمام تر طاقت کے ساتھ حملہ آور کی پسلی میں دے مارا، ایک زوردار کراہ کے ساتھ وہ دہرا ہوا تھا اسی لمحے شرمین تیزی سے دروازے کی جانب لپکی۔ وہ کسی بھی قیمت پر فوراً یہاں سے باہر نکلنا چاہ رہی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے ہینڈل کو گھمایا پھر اسے یاد آیا کہ دروازہ تو خود اس نے لاک کیا ہوا ہے۔ بدحواسی کے عالم میں اس نے بیگ سے چابیوں کا گچھا نکالا، دروازے کی چابی کو ڈھونڈ کر لاک میں لگایا، دروازے کے ساتھ بنی کھڑکی پر پڑے بلائنڈز کی باریک سی درز سے اسے سامنے ایک شخص گزرتا نظر آیا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی شرمین کے ہونٹوں سے مدد کے لیے چیخ برآمد ہوئی مگر وہ چیخ آواز بننے میں ناکام رہی۔ عین اسی لمحے کسی نے اس کے چہرے پر باریک کپڑا رکھ دیا تھا۔ اس کپڑے کو اس قدر سختی سے اس کے منہ پر جمایا گیا تھا کہ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دماغ سناٹے اور تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا پھر پہلے اس کے ہاتھ میں موجود چابیوں کا گچھا زمین پر گرا اور اس کے بعد اس کے ہاتھ جو اس کپڑے اور گرفت کو ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے، بے جان انداز میں نیچے آگرے۔

☆☆☆

آمنہ اور کریم اس وقت شہر کے ایک مہنگے کلب کے ایک ہال میں موجود تھے۔ ان کے اردگرد کافی اسٹالز لگے تھے جن پر طرح طرح کی گڑیاں موجود تھیں۔

”اس شہر میں کیا کیا ہوتا ہے۔“ کریم کندھے اچکا کر بولا۔ ”کم از کم میرے علم میں یہ نہیں تھا کہ اس قدر لوگ گڑیاں جمع کرتے ہیں کہ ان کے لیے ایسا سیمینار اور ایگزیبیشن کی جاسکے۔“

”شوق دا کوئی مول نہیں ہے کریم میاں۔“ آمنہ متانت سے بولی۔ ”ان سب کے پاس خوب روپیا ہے بس اسے خرچ کرنے کے طریقے ڈھونڈتے ہیں، افسوس کہ اسی شہر میں لاکھوں بچے سڑکوں پر سوتے ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو...... آخر ہمیں یہاں سے کیا ملے گا آمنہ......؟“ کریم بور ہو رہا تھا۔

”شاید ہوسکتا ہے کہ وہ قاتل یہاں آیا ہو۔ اسے

گڑیوں سے دلچسپی ہے یہ تو ہم جانتے ہی ہیں۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ کچھ دیر فون پر بات کرتا رہا۔ اس کے چہرے کی رنگت اس تیزی سے بدلی تھی کہ آمنہ ٹھٹک کر کھڑی رہ گئی۔

''کیا ہوا ہے کریم؟'' فون بند ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

''ہم یہاں وقت ضائع کر رہے ہیں آمنہ۔''

''کیا مطلب؟''

''اس نے ایک اور عورت کو اغوا کر لیا ہے۔'' وہ بولا۔ آمنہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''اوہو، یہ یہاں کیسے آ گیا؟'' کریم فری میڈیکل کلینک میں داخل ہوتے ہوئے بڑبڑایا۔

''کون؟'' آمنہ نے پوچھا پھر کریم کی نگاہوں کے تعاقب میں سامنے کھڑے ایس پی فخر الدین کو دیکھ کر وہ بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ ایس پی فخر الدین کو جس قدر وہ دونوں ناپسند کرتے تھے اتنا ہی وہ بھی ان سے چڑتا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی ان کی تفتیش کی راہ میں روڑے اٹکا سکتی تھی مگر فی الحال ان کے پاس اس حوالے سے سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

''مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی ہے جس نے پچھلے تین قتل کیے ہیں؟'' ابتدائی گفتگو کے بعد آمنہ نے پوچھا۔

''اس کی وجہ ہے۔'' فخر الدین نے پلاسٹک کے زپ بیگ کو اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا جس میں بیگنی رنگ کا پھول موجود تھا۔ ''یہ یہاں زمین پر گرا پڑا تھا۔''

''اوہ۔'' آمنہ بولی۔ ''بیورو نے اس پھول کے متعلق میڈیا کو کوئی خبر نہیں دی تھی یعنی یہ کسی نقال کا کام نہیں تھا۔''

''شکار کون ہے؟'' کریم نے پوچھا۔

''اس کا نام ثمرین ساجد ہے وہ یہاں کام کرتی ہے۔ صبح سب سے پہلے کلینک پہنچتی ہے۔'' فخر الدین بولا۔ ''ہاں، تم دونوں کے لیے ایک خبر اور ہے، میرا یہ اسسٹنٹ۔'' اس نے سامنے کھڑے انسپکٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج سے تم دونوں کے ساتھ اس کیس پر کام کرے گا۔''

''میرا نہیں خیال کہ ہمیں اس پر کسی اضافی مدد کی ضرورت ہے ایس پی......'' کریم صفائی سے بولا۔

مگر جلیل احمد شاہ اس بات سے متفق نہیں ہیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''ان کا کہنا ہے کہ تم لوگ اس کیس کو اس کی اصل روح کے مطابق نہیں سمجھ رہے ہو۔''

''خیر اس کے مطابق تو بعد میں بات ہوگی۔'' کریم کا صبر جواب دے گیا۔ ''فی الحال اہم بات یہ کیس ہے جس میں وقت ضائع نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیا ہمارے پاس کوئی عینی گواہ ہے؟''

''ہاں، ایک ہے۔ اس خاتون کا نام سائرہ بانو ہے۔ وہ وہاں ویٹنگ روم میں بیٹھی ہے۔''

''کیا آپ نے اس کا انٹرویو کر لیا ہے؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ کافی نروس ہے، ہم اسے اپنے ساتھ بیورو لے جائیں گے وہیں اس کا بیان لیا جائے گا۔'' فخر الدین بولا۔

آمنہ نے ایک لمحے کو فخر الدین کی آنکھوں میں دیکھا پھر سر جھٹک کر ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک گواہ کو ملزم کی طرح بیورو کیوں لے جایا جائے۔ انہی حرکتوں کی وجہ سے لوگ گواہی دینے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اس نے سوچا۔

سائرہ بانو ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ چالیس سے اوپر کی گول مٹول خاتون تھی جو کہ دفتر میں صفائی وغیرہ کا کام کرتی تھی۔ آمنہ صوفے پر اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''میں آمنہ ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''مجھے آپ سے کچھ سوال کرنے ہیں۔''

''جی پوچھیے...... میں تو کب سے انتظار کر رہی ہوں، مجھ کو اپنے گھر واپس بھی جانا ہے۔'' وہ بولی۔

''جی میں سمجھتی ہوں، کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ یہاں کیا ہوا ہے؟ آپ نے کیا کیا دیکھا، پلیز اچھی طرح یاد کر کے بتائیے گا۔'' اس نے کہا۔

''میں سامنے والے دفتر کی صفائی کے لیے جلدی آتی ہوں۔ مجھے لگا تھا کہ اندر کچھ گرنے کی آواز آئی ہے۔ میں نے کھڑکی سے کسی کو ایک عورت کو کھینچتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''اوہ...... کیا آپ نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا تھا؟''

سائرہ بانو نے ایک لمحے کو سوچا پھر بولی۔ ''نہیں، میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا شاید کلینک میں بلب نہیں جل رہا تھا۔'' پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ''اس نے اپنے منہ پر ماسک پہن رکھا تھا۔''

''کس قسم کا ماسک......؟'' کریم نے پوچھا۔

''وہ جیسے لوگ مٹی سے بچنے کے لیے پہنتے ہیں۔''

''اچھا...... پھر کیا ہوا؟''

''میں نے فوراً پولیس کو فون کیا، جب میں ان سے بات کررہی تھی تب میں نے بلڈنگ کے پاس سے ایک ٹرک کو جاتے دیکھا تھا۔''

''ٹرک......؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''جی چھوٹے والا...... اور وہ بہت پرانا اور گندہ تھا۔ اس پر کور پڑا ہوا تھا اور اس کا رنگ نیلا تھا۔''

''آپ نے اس کا نمبر دیکھا تھا؟''

''نہیں...... نمبر مجھے کہیں نظر نہیں آیا، پتا نہیں کیوں میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' وہ قدرے شرمندگی سے بولی۔

''کوئی ایک نمبر بھی نہیں؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''نہیں، پتا نہیں وہ مجھے کیوں نظر نہیں آیا۔''

فخرالدین نے اسی لمحے آمنہ کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ''آمنہ ہمیں اسے بیورو لے جانا ہے۔''

''بہت شکریہ سائرہ...... تم اب جاسکتی ہو، اپنا پتا وغیرہ لکھوا دو، ہمیں ضرورت پڑے گی تو تم سے رابطہ کرلیں گے۔''

''یہ کیا بکواس ہے۔'' اس کے جاتے ہی فخرالدین غرایا۔ ''میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ اسے بیورو لے کر چلنا ہے۔''

''کس لیے؟'' آمنہ نے پوچھا۔ ''وہ جو جانتی تھی بتا چکی ہے۔''

''اگر اس سے ٹھیک سے تفتیش کی جاتی تو شاید اسے نمبر یاد آجاتا۔'' وہ سختی سے بولا۔

''نہیں، اس عورت کا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ اس نے مجھے تفصیل سے سب بتایا ہے مگر اسے نمبر یاد نہیں ہے اس کا صرف ایک ہی مطلب ہوسکتا ہے۔''

''کیا؟''

''یہ کہ ٹرک پر نمبر پلیٹ تھی ہی نہیں، ہوتی تو وہ اسے ضرور نظر آتی اور اسے کچھ نہ کچھ ضرور یاد ہوتا۔''

''شرمین کے گھر والوں کو اطلاع ہوگئی ہے؟'' کریم نے اگلا سوال کیا۔

''اس کے شوہر کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ وہ یہاں آیا تھا مگر اس کی حالت بہت زیادہ خراب تھی اس لیے اسے گھر بھجوا دیا گیا۔ ان کا گھر یہاں سے واکنگ ڈسٹنس (پیدل) پر ہے۔'' فخرالدین بولا۔ ''انسپکٹر جمال اس کے گھر جا کر بیان لے لیں گے۔''

''سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیسے آیا؟'' آمنہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''اس کے پاس یا تو چابی تھی یا پھر اس نے چابی کی کاپی حاصل کرلی تھی۔ اس کلینک کے کسی فرد سے اس کی دوستی بھی ہوسکتی ہے مگر یہ طے ہے کہ وہ لاک یا دروازہ کھڑکی توڑ کر اندر داخل نہیں ہوا۔'' انسپکٹر جمال بولا۔

کریم اس دوران کلینک کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آمنہ......'' چند لمحے بعد اس نے آواز دی۔ ''یہ دیکھو، میرا خیال ہے کہ مجرم اس راستے سے دفتر میں داخل ہوا تھا۔''

اس کی آواز پر وہ سب اس کی طرف لپکے تھے۔ وہ استقبالیہ کے ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے کی الماری کے پاس کھڑا تھا۔

''کیا مطلب، کیا اس الماری سے باہر کا راستہ موجود ہے؟'' فخرالدین نے پوچھا۔

''نہیں، وہ باہر سے اندر نہیں آیا۔'' کریم بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تم یہ باکسز کی حالت دیکھو......'' کریم بولا۔ ''یہاں اتنی جگہ موجود ہے کہ ایک آدمی آرام سے یہاں چھپ سکتا ہے۔''

''تم درست کہہ رہے ہو۔'' آمنہ نے الماری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس دوران فخرالدین نے فرانسک ٹیم کو وہاں طلب کرلیا تھا۔

''یوں لگ رہا ہے جیسے وہ کل شام کو مریض بن کر کلینک آیا ہوگا اور پھر سب کی نظر بچا کر یہاں چھپ گیا۔ وہ جانتا ہوگا کہ صبح شرمین یہاں تنہا ہوتی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کل شام کو کلینک آنے والے تمام مریضوں کا ریکارڈ چیک کرنا ہوگا۔'' آمنہ بولی۔

''وہ تمام رات یہاں تھا فرانسک کو احتیاط سے پورے کلینک کو چھاننا ہوگا۔''

''بالکل۔ فخرالدین میرا خیال ہے کہ ان حالات میں جبکہ ہم جان گئے ہیں کہ وہ باقاعدہ ریکی کرکے اس خاتون کو اغوا کرکے لے گیا ہے۔ مجھے اور آمنہ کو ہی اس کے شوہر کا انٹرویو کرنا چاہیے۔'' کریم بولا۔

فخرالدین نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔

☆☆☆

شرمین کا گھر کلینک سے چند گلیوں کے فاصلے پر تھا۔ اپارٹمنٹ میں اس کے شوہر ساجد کے علاوہ اس کی بہن

نسرین اور اس کا شوہر مقصود بھی موجود تھے۔ وہ سب ہی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ ساجد کی حالت سب سے خراب تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا طویل القامت شخص تھا۔ اس کے بال کندھوں تک تھے جو اس وقت بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ لوگ اس وقت کو سوال و جواب میں کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ پلیز میری بیوی کو ڈھونڈ یئے، آخر وہ اسے ہی کیوں اغوا کر کے لے گیا ہے؟'' جملے کے آخر میں اس کی آواز بھرا گئی۔

''یہ سوال و جواب شرمین کی واپسی کے لیے ہی ضروری ہیں۔ جب تک ہمارے پاس مکمل معلومات نہیں ہوں گی ہم آگے کیسے بڑھ سکیں گے۔'' آمنہ نے نرمی سے کہا۔

''آپ جو کرنا چاہیں کریں...... بس کسی طرح شرمین کو ڈھونڈ نکالیں۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''ہماری یہی کوشش ہے۔'' کریم نے کہا۔ ''ساجد صاحب کیا حال ہی میں آپ کی وائف نے کسی قسم کے خوف کی شکایت کی تھی کہ کوئی انہیں تنگ کر رہا ہو؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' وہ بولا۔ ''اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''آپ سے؟'' آمنہ نے اس کی بہن نسرین کی طرف دیکھا۔

''نہیں، مجھ سے بھی نہیں۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''ساجد صاحب یہ تھوڑا مشکل سوال ہے، یہ بتائیے کہ آپ یا شرمین صاحبہ کی کسی سے کوئی دشمنی ہو، کوئی ایسا شخص جو آپ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو۔''

''نہیں۔'' وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں چند لمحے آمنہ کو دیکھنے کے بعد بولا۔ ''ہم عام سے لوگ ہیں میڈم، میں فنکار ہوں، ایک گیلری میں کام کرتا ہوں۔ ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے اور شرمین کو تو سب ہی پسند کرتے ہیں، وہ ہے ہی اتنی اچھی، ہر ایک کا خیال رکھنے والی۔''

''ٹھیک ہے، ایک آخری بات، کیا آپ ان کی کوئی تازہ تصویر فراہم کر سکتے ہیں؟''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ بولا۔ ''ابھی دو ہفتے پہلے کی تصویر ہے۔'' اس نے میز پر رکھے موبائل کو آن کر کے ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی آمنہ بھونچکا سی رہ گئی۔ یہی حال کریم کا بھی ہوا تھا۔ اس تصویر میں شرمین اور تین سال کی ایک بچی موجود تھے۔ دونوں ہنس رہے تھے اور ان کے درمیان .... ایک گڑیا رکھی تھی جس کی آنکھیں ان پر جمی تھیں اور اس کے ہاتھ میں بینگنی رنگ کا کاغذ کا پھول تھا۔ وہ دونوں چند لمحوں تک تصویر کو گھورتے رہے۔

''یہ...... یہ بچی کون ہے ساجد صاحب؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''میری بیٹی ہے۔'' ساجد کے بجائے نسرین نے جواب دیا۔

''یہ تصویر کتنی پرانی ہے؟''

''میں نے کہا نا دو ہفتے سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ وہ مومو یعنی اپنی بھانجی کو گڑیا دلانے لے گئی تھی۔ اسے گڑیا بہت پسند تھی۔''

''اوکے! کیا آپ ان کے ساتھ تھے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے یہ گڑیا کہاں سے لی تھی؟'' کریم نے سوال کیا۔

''نہیں، میں اس وقت گھر پر تھا اور اس نے مجھے دکان کا نام نہیں بتایا۔ کیا یہ کوئی اہم بات ہے؟''

''شاید...... کیا کسی طرح سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے؟''

''میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا کہ اس بات سے میری شرمین کے اغوا کا کیا تعلق ہے؟ مگر ہم اکثر رسیدیں محفوظ رکھتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں شاید اس گڑیا کی رسید موجود ہو۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیلف سے ایک ڈبا اٹھایا۔ اسے ٹٹولنے کے بعد بولا۔ ''یہاں رسید نہیں ہے مگر پلیز مجھے بتائیے کہ اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟''

''ہمیں...... ہمیں لگتا ہے کہ شرمین کو اغوا کرنے والے اور ان گڑیاؤں میں کوئی کنکشن موجود ہے۔'' آمنہ بمشکل بولی۔

''مگر آپ کو یہ کیوں لگ رہا ہے؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آپ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ آپ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں؟''

آمنہ اور کریم خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک محبت کرنے والے شوہر کو یہ حقیقت بتانا کہ اس کی بیوی کو ایک جنونی نے اغوا کیا ہے اور وہ اس سے قبل 3 خون کر چکا ہے، بہت ہی مشکل تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ایسا پہلے بھی کر چکا ہے۔'' ساجد نے پوچھا۔ ''اف میرے خدا۔'' یکلخت جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ ''میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ وہ عورتوں کو قتل کر دیتا ہے اور ان کی لاشوں کو ویران جگہوں پر چھوڑ دیتا ہے...... اف...... یہ کیا ہو گیا ہے۔'' وہ سر پکڑ کر صوفے پر ڈھے گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ نسرین بھی اب باقاعدہ رو رہی تھی۔

''تو آپ کو یقین ہے کہ شرمین اس کا تازہ شکار ہے، کیا وہ زندہ ہو گی یا اس نے میری بہن کو مار ڈالا ہو گا۔'' نسرین نے پوچھا۔

''نہیں، میں یہ نہیں کہہ رہی۔'' آمنہ بولی۔

''تو پھر......؟'' وہ دونوں امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

آمنہ کے دماغ میں جوار بھاٹا سا چل رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شرمین ابھی زندہ ہو گی مگر وہ ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہو چکی تھی جس سے اس کی آزادی یا تو موت کی شکل میں ہو سکتی تھی اور یا پھر بروقت مل جانے کی شکل میں۔

''وہ مل جائے گی ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آپ خود کو سنبھالیں۔'' کریم یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

گاڑی میں بیٹھنے تک وہ دونوں بالکل خاموش رہے تھے۔ آمنہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ تو گئی تھی مگر اس نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی۔

''تم کیا سوچ رہی ہو؟'' کریم نے بالآخر پوچھا۔

''کریم یہ سارا چکر گڑیا سے شروع ہوتا ہے۔'' وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔ ''اس نے جتنی عورتوں کو اب تک شکار بنایا ہے اسے انہوں نے گڑیا خریدتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ یہاں کوئی نہ کوئی ایسی دکان ہے جہاں سے ان تینوں عورتوں نے گڑیا خریدی ہے اور اگر ہم اس اسٹور کو ڈھونڈ لیں تو شاید ہمارے لیے اس تک پہنچنا آسان ہو جائے۔''

اس سے پہلے کہ کریم کچھ کہہ پاتا اس کا فون بج اٹھا۔

''ہیلو...... جی ایس پی صاحب۔'' وہ بولا۔ ''کیا؟ واقعی؟ او کے ہم لوگ پہنچ رہے ہیں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ آمنہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''فخر الدین، وہ کہہ رہا ہے کہ انہوں نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔''

☆☆☆

وہ بیورو پہنچے تو فخر الدین ان کا منتظر تھا۔ ''وہ پکڑا گیا ہے۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

''کیسے......؟''

''میڈیکل کلینک کی ایک نرس نے اس کے بارے میں بتایا۔ اس کے بارے میں خواتین مریض اور خود نرسوں کو بھی شکایت رہ چکی ہے۔ وہ مجہول سا آدمی ہے اور بار بار نکالے جانے کے باوجود کلینک میں بہانے بہانے سے گھستا آیا تھا۔ اس کا علم ہوتے ہی ہم نے اس کے فلیٹ پر چھاپا مارا اور اسے یہاں لے آئے۔''

''مگر یہ تو صرف شک کا معاملہ ہے، ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ یہ وہی ہے۔'' آمنہ بولی۔

''اس نے اعتراف کر لیا ہے۔'' فخر الدین بولا۔

''کیا......؟ واقعی؟'' آمنہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

''اور شرمین؟ وہ کہاں ہے؟ کیا وہ مل گئی؟''

''ہم اس پر کام کر رہے ہیں؟'' فخر الدین نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' آمنہ کا چند لمحے پہلے والا اطمینان ہوا ہو گیا۔

''اس کے اردگرد کے فلیٹس کی تلاشی جاری ہے، ہمارے لوگ علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ اسے اتنی جلد دور نہیں لے جا سکا ہو گا۔ ہم اس سے اگلوا لیں گے ویسے بھی وہ بہت باتیں کر رہا ہے۔ تم لوگوں کو اس کا فلیٹ دیکھنا چاہیے۔ ڈیڑھ کمروں کے اس فلیٹ کو اس نے قتل، سیریل کلرز کی خبروں کے تراشوں سے بھرا ہوا تھا۔''

''وہ اس وقت کہاں ہے؟'' کریم نے پوچھا۔

''وہ کمرائے تفتیش میں ہے اور ہم وہیں چلتے ہیں۔''

''وہ عورت کہاں ہے اور تم نے ٹرک کہاں چھپایا ہے؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی انسپکٹر جمال کی چیختی ہوئی آواز ان کے کانوں میں پہنچی۔

''کون عورت......؟ اور میرے پاس کوئی ٹرک نہیں ہے، کار کیا رکشا تک بھی نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''میرے پاس لائسنس بھی نہیں ہے اور مجھے ٹرک چلانا آتا بھی نہیں ہے۔''

آمنہ اور کریم اب اندر پہنچ چکے تھے۔ وہ ان کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تفتیش کے تازہ آثار موجود تھے۔ وہ ایک درمیانی قامت کا موٹا سا شخص تھا۔

''میں اس سے کچھ سوال کرنا چاہتی ہوں۔'' آمنہ بولی۔

''آمنہ یہ کیس اب تقریباً حل ہو چکا ہے، انہیں کام کرنے دو۔'' فخر الدین بولا مگر آمنہ اسے نظرانداز کر کے

آگے بڑھ گئی۔

''تم...... کیا تمہیں گڑیا پسند ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں کوئی بارہ سال کی لڑکی ہوں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''میں ایک خطرناک قاتل ہوں...... تم لوگ پریس کو بلاؤ، میں ان کے سامنے سب بتاؤں گا۔'' اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ آمنہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اسی وقت فخرالدین نے اسے سختی سے باہر جانے کا حکم دیا۔

''میں ایک سوال اور پوچھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ باہر آتے ہی وہ اس پر برس پڑا۔ ''تم شاید یہ کیس ختم کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ قاتل پکڑا گیا ہے، اس نے اعتراف بھی کرلیا ہے، ہمیں صرف اب اس عورت کو تلاش کرنا ہے...... سمجھ گئیں تم۔''

''ایس پی صاحب، مجھے یہ لگ رہا ہے کہ ہم نے غلط آدمی پکڑا ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے غصے میں میز پر ہاتھ مارا۔ ''خود کو شرلاک ہومز سمجھنا بند کردو آمنہ اگر یہ کیس تم حل نہیں کر پائی ہو تو اسے تسلیم کرو اور یاد رکھو کہ میں یہاں انچارج ہوں اور تم کو میرا حکم ماننا ہے، میں تمہارے گزشتہ کاموں اور پھر جس تکلیف سے تم گزری ہو اس کی وجہ سے تمہاری اس ضد پر کوئی رپورٹ نہیں کررہا ہوں مگر اب حالات قابو میں ہیں، تم گھر جاکر آرام کرسکتی ہو۔''

آمنہ چند لمحے اسے گھورتی رہی پھر باہر کی طرف چل دی، کریم بھی اس کے ساتھ تھا۔

''کریم تم رک سکتے ہو......؟'' فخرالدین بولا۔

''ایس پی صاحب میں نہیں سمجھتا کہ میری بھی یہاں کوئی ضرورت ہے، آپ تو کیس ویسے بھی حل کرچکے ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا اور باہر نکل گیا۔ آمنہ کار میں اس کا انتظار کررہی تھی۔

''کریم یہ وہ نہیں ہے۔'' اس کے کار اسٹارٹ کرنے کے بعد وہ نرمی سے بولی۔ ''اور مجھے اس کا یقین ہے۔ وہ اب بھی آزاد ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ شرمین کہاں ہے۔''

☆☆☆

اسے یقین تھا کہ بیورو نے غلط شخص کو پکڑا ہے۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ توجہ کا طالب ایک نفسیاتی مریض تھا۔ اس قسم کے اعترافات وہ اپنے کیریئر میں کئی بار سن چکی تھی۔ مسئلہ فخرالدین کا تھا۔ وہ ان کا باس تھا اور وہ ہر قیمت پر جلد از جلد کسی قاتل کو گرفتار کرکے جلیل شاہ سے داد و تحسین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آمنہ نے دانت بھینچ کر سوچا۔

شرمین اور وہ سفاک قاتل کہاں ہوسکتے تھے۔ وہ سوچ سوچ کر تھک گئی تھی۔ اس کا دماغ گویا کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ اچانک اس کے دماغ کی اسکرین پر ڈاکٹر سجاد کھوسہ کا نام جگمگایا۔ سجاد شہر کے ماہر کرمنالوجسٹ تھے۔ وہ نہ صرف اس موضوع پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے بلکہ مجرموں کی نفسیات اور تفتیش کے موضوع پر کئی کتابیں بھی تحریر کرچکے تھے۔ بیورو بھی اکثر ان کی خدمات سے استفادہ کرتا رہتا تھا۔ اسے ان سے بات کرنا چاہیے، اس نے سوچا اور گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس وقت وہ ان سے بات نہیں کرسکتی تھی۔ بہتر تھا کہ وہ بھی کچھ دیر سولیتی، اسے اگلی صبح کے لیے توانائی درکار تھی۔

☆☆☆

''تو تمہیں یقین ہے کہ وہ قاتل نہیں ہے۔'' ڈاکٹر سجاد نے اس کی ساری بات سن کر نرمی سے پوچھا۔ آمنہ اس وقت ان کے دفتر میں موجود تھی۔ ڈاکٹر سجاد لمبی قامت اور درمیانی جسامت کے مالک تھے۔ ان کے سر کے تمام بال سفید تھے جو ان کے شفیق چہرے پر بھلے محسوس ہورہے تھے۔

''جی......'' آمنہ نے سر ہلایا۔

''میں نے اس کیس کی فائل بھی دیکھی ہے اور اب تمہاری رائے بھی سن لی ہے۔ اس قاتل کے اس طرح پکڑے جانے کی خبر مجھے بھی ملی تھی اور جو کچھ تم بتارہی ہو اس کی روشنی میں یہ جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اس خبر سے اصل قاتل مغویہ کو فوری قتل کرکے اپنے ہونے کا ثبوت دینے کی کوشش کرے گا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''جی...... یہ ڈر مجھے بھی ہے۔'' آمنہ بولی۔

''آمنہ تمہیں معلوم ہے نا کہ میں ہمیشہ تمہاری رائے کو اہمیت دیتا ہوں؟ جانتی ہو کیوں؟''

''کیوں؟......'' اس نے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم میں وہ خاص بات ہے جو ہر پولیس والے یا تفتیش کار میں نہیں ہوتی۔ تم میں وہ ساتویں حس موجود ہے۔''

''ساتویں حس......؟''

''ہاں، وہ ساتویں حس جو مجرموں کو سمجھنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کیس میں تمہیں اپنے دل کی بات سننی ہے۔ تم اسے ڈھونڈو، میرا خیال ہے کہ

وہ تمہیں کسی خوب صورت علاقے میں ملے گا یا کم از کم اچھی طرح سجے سجائے گھر میں، کیونکہ وہ ایک نفسیاتی مریض تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ بدصورتی اور بدترین کو خوب صورتی کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، تم میری بات سمجھ رہی ہو نا......؟''

''جی......'' آمنہ نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

کچھ دیر بعد وہ دفتر کی طرف ڈرائیو کر رہی تھی۔ اگر اسے موقع ملا تو وہ اس شخص سے بات کرنے کی کوشش ضرور کرے گی' اس نے سوچا۔

وہ مین شاہراہ پر ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی تھی تب ہی اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر سعدیہ کا نام چمک رہا تھا۔

''سعدیہ......'' اس نے فون اٹھا کر کہا مگر دوسری جانب سے صرف چند سسکیاں سنائی دیں۔ ''سعدیہ کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا......؟''

''آمنہ کیا تم نے اسے ڈھونڈ لیا؟ کیا کوئی اسے ڈھونڈ رہا ہے......؟'' وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ یقیناً اسلم بشیر کے بارے میں ہی پوچھ رہی تھی۔

''سعدیہ وہ مر چکا ہے۔'' وہ بولی۔

''تم میری بات کا یقین کرو آمنہ، وہ زندہ ہے اور اگر تم لوگوں نے اسے ابھی تک نہیں پکڑا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ وہی ہے۔''

اس کے انداز میں ایسا کچھ تھا کہ آمنہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی پھیل گئی۔

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ ہوا کیا ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ میرے گھر پر فون کرتا رہتا ہے، اس وجہ سے میں نے لینڈ لائن کٹوا دی ہے مگر اب اسے...... میرا یہ نمبر بھی معلوم ہو گیا ہے، وہ اس پر بھی مسلسل کال کر رہا ہے، وہ کچھ بولتا نہیں صرف گہری سانسیں لیتا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ یہ وہی ہے اور اب...... اب وہ میرے گھر تک آ گیا ہے......'' وہ بولتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔

''کیا......؟'' آمنہ تقریباً چیخ پڑی۔

''ہاں، وہ میرے دروازے پر پتھر اور چیزیں مارتا ہے۔'' آمنہ اس کے انداز سے اس کی حالت سمجھ رہی تھی۔

''سعدیہ...... میں سیدھی تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ اور اس سے پہلے میں بیورو میں بات کرتی ہوں تاکہ وہ دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔''

''وہ کچھ نہیں دیکھیں گے۔'' سعدیہ ہذیانی ہنسی ہنس کر بولی۔ ''کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ تم بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو، کوئی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

ٹریفک اب کچھ کھلا تھا۔ آمنہ نے فون کو اسپیکر پر ڈالا اور آگے بڑھی۔

''مجھ سے بات کرتی رہو سعدیہ، میں تمہارے پاس ہی آ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''ٹریفک کا حسبِ معمول بُرا حال تھا۔ سعدیہ کا گھر یوں بھی کافی دور تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسے وہاں پہنچنے میں کم از کم ایک گھنٹا ضرور لگ جائے گا۔

''میں فون بند کر رہی ہوں۔'' سعدیہ نے پانچویں بار کہا۔

''نہیں، مجھ سے بات کرتی رہو۔'' آمنہ فوراً بولی۔

''سعدیہ پلیز خود کو سنبھالو۔''

''میں اب یہ سب برداشت نہیں کر سکتی آمنہ۔'' وہ عجیب سی آواز میں بولی۔ ''بس تم سے یہ کہنا ہے کہ تم خود کو بچانا...... میں اب یہ سب ختم کر دوں گی۔''

''تم میرے پہنچنے سے پہلے کچھ بھی نہیں کرو گی۔ میں آ رہی ہوں نا؟'' آمنہ بوکھلا کر بولی۔

''اللہ حافظ آمنہ......''

''سعدیہ میری بات سنو، اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کوئی بھی بھلائی کی ہے تو تم فون بند نہیں کرو گی۔'' آمنہ بولی۔

دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا تھا پھر ایک لمحے بعد اسے سعدیہ کی سسکی نما آواز سنائی دی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ لائن پر ہے، اسے سعدیہ کے گھر پہنچنے تک اسے فون پر رکھنا تھا اور اس کی توجہ بھی بٹانی تھی۔ انہیں چند سال پہلے ایک تربیت میں یہ سب سکھایا گیا تھا۔

''سعدیہ تمہیں میرے لیے ایک کام کرنا ہے۔'' وہ بالآخر بولی۔

''کیا......؟''

''تم کچن میں جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ اس وقت تمہارے پاس کون کون سے مصالحے موجود ہیں۔''

''یہ کیا بکواس ہے آمنہ......؟''

''میں کسی وجہ سے کہہ رہی ہوں اگر تم مجھ پر یقین رکھتی ہو تو یہ کرو پلیز......''

''اوکے......'' وہ بالآخر بولی۔

''گڈ......''

اگلے پانچ منٹ میں اس نے سعدیہ کو ایک کاغذ لا کر اس پر مصالحوں کے نام لکھنے میں لگائے رکھا تھا۔ اصل مسئلہ ٹریفک کا تھا۔ وہ حتی الامکان تیزی سے کار چلا رہی تھی مگر مادر پدر آزاد ٹریفک اور جگہ جگہ ترقیاتی کاموں کی تیزی نے اسے مات دے دی تھی۔

''آمنہ وہ گھر میں داخل ہو گیا ہے۔'' سعدیہ یکلخت بولی۔

''کیا......؟'' وہ چلّائی۔

''ہاں آمنہ وہ یہاں ہے۔ میں اس کے قدموں کی آوازیں سن رہی ہوں...... وہ...... وہ اسی طرف آرہا ہے۔ وہ پورے گھر میں ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔

''سعدیہ وہ پورے گھر میں نہیں ہوسکتا۔ تم یوں کرو کہ باہر چلی جاؤ...... کسی کے گھر...... یا سڑک پر میرا انتظار کرو، اس گھر سے باہر نکلو۔'' آمنہ بولی۔

''اوہ......'' کار کو لگنے والے جھٹکے سے اس کی توجہ سڑک کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ فون پر سعدیہ سے گفتگو میں اتنی مشغول ہو گئی تھی کہ فٹ پاتھ پر ٹکرانے ہی والی تھی۔ اس نے گاڑی کو چند لمحے کے لیے روکا، اپنے اعصاب مجتمع کیے اور بولی۔

''سعدیہ میں بس تھوڑے سے فاصلے پر ہوں، تم پلیز میری خاطر پولیس کو فون کرو، میں پہنچ رہی ہوں۔'' دوسری طرف بالکل خاموشی تھی۔ سعدیہ لائن کاٹ چکی تھی۔ آمنہ نے اس کا نمبر ملایا۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں مگر فون ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔ ناکام ہو کر اس نے بیورو کا نمبر ملایا۔ اور وہاں موجود آپریٹر کو سعدیہ کا ایڈریس لکھوا دیا۔

''یہاں فوری مدد بھجواؤ...... یہاں ایک خاتون اکیلی رہتی ہیں اور اس وقت ان کے گھر میں کوئی گھس گیا ہے جس سے انہیں جان کا خطرہ ہے۔''

فون بند کر کے اس نے ایک بار پھر سعدیہ کا نمبر ملایا۔ سعدیہ نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ وہ اب اس کے گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ کسی نہ کسی کو فوری طور پر اس کے پاس پہنچنا چاہیے، اس نے سوچا۔ تنہائی سعدیہ کا ایک بڑا مسئلہ تھا اگر وہ اتنی تنہا نہ ہوتی تو شاید سنبھلنا اتنا مشکل نہ ہوتا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ ایک بہن تھی جو برسہا برس سے کینیڈا میں مقیم تھی اور اپنی زندگی میں مگن تھی۔ رشتے دار اگر تھے بھی تو ان سے ملنا جلنا نہیں تھا نہ ہی کوئی قریبی دوست تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس نے بڑا مکان بیچ کر یہ ٹاؤن ہاؤس لے لیا تھا اور باقی رقم بینک میں محفوظ کر دی تھی جس کا منافع اس کی زندگی کے گزر بسر کے لیے کافی تھا۔ وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتی تھی اور اس حادثے کے بعد تو بالکل ہی نظر بند ہو گئی تھی۔

سعدیہ کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ اس کے مکان تک پہنچ گئی تھی۔ باہر پولیس کی کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اسے دور سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر وہ ان کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ آمنہ نے گھر کے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ ہلکی سی آواز سے کھل گیا۔ وہ ایک لمحے کو حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے اپنا پسٹل نکالا اور اندر داخل ہو گئی۔

''سعدیہ......'' اس کی آواز کے جواب میں کوئی سامنے نہیں آیا تھا۔

آمنہ کو یقین سا ہو رہا تھا کہ یہاں کچھ بُرا ہو چکا ہے۔ وہ ہال میں سے گزرتی ہوئی لاؤنج میں پہنچی، سب کچھ اپنی جگہ پر موجود تھا مگر سعدیہ کا کہیں پتا نہیں تھا، وہ کچن میں داخل ہوئی۔ سامنے کاؤنٹر پر مصالحوں کی بوتلیں، ایک کاغذ اور قلم موجود تھا یعنی سعدیہ فون بند کر کے سب کچھ ویسا ہی چھوڑ گئی تھی۔ پولیس سائرن کی آواز اب قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ مکان میں کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اس پُراسرار خاموشی سے آمنہ کے اعصاب متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہال سے مڑ کر اب وہ سعدیہ کے بیڈروم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں دروازہ کھولا مگر اندر قدم رکھتے ہی وہ اپنے تمام حفاظتی کوڈز بھول گئی تھی۔ اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آگیا تھا اور لمحے بھر کے لیے کمرا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا سا گیا۔

سعدیہ اس کے سامنے تھی۔ وہ ہوا میں معلق تھی۔ پنکھے کے کنڈے میں پھنسی رسّی سے بنایا گیا پھندا اس کی گردن میں تھا اور پیروں کے پاس سیڑھی نما اسٹول لڑھکا ہوا پڑا تھا۔

آمنہ ایک لمحے ساکت کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ ''نہیں۔'' پھر یکدم وہ ہوش میں آگئی تھی۔ ''کچھ نہیں ہوسکتا سعدیہ...... میں آگئی ہوں۔'' وہ لپک کر اسٹول سیدھا کر کے اس پر چڑھی اور سعدیہ کے پیروں کو سہارا دیتے ہوئے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا...... مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ سعدیہ اب وہاں نہیں تھی۔

آمنہ چند لمحے اسی طرح کھڑی رہی پھر اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اسی لمحے اسے نیچے لوگوں کے قدموں کی آواز سنائی

دی۔

"میں یہاں ہوں۔" وہ خود کو بمشکل سنبھال کر پکاری۔ چند لمحوں میں تین پولیس آفیسر کمرے میں داخل ہو گئے تھے۔

انہیں حالات سمجھانے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔ اس کے بعد انہیں معمول کی کارروائی میں مصروف چھوڑ کر وہ سعدیہ کے گھر سے باہر آ گئی۔ اس کے اعصاب چیخ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر وہ تمام آنسو، سعدیہ کی بے بسی، اس کی آواز کی تکلیف اس کے دل پر خراشیں ڈال رہی تھی۔

وہ گاڑی کی طرف بڑھی ہی تھی کہ فون پر فخر الدین کا نام چمکنے لگا۔ اس وقت وہ کسی سے اور خصوصاً فخر الدین سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر کسی ممکنہ خبر کے خیال سے اس نے فون ریسیو کر لیا۔

"آمنہ مجھے اس خاتون کی خودکشی کا علم ہوا ہے، تم اب کہاں ہو......؟" وہ بولا۔

"میں وہیں ہوں، بس نکل رہی ہوں اور نتیجے میں اتنی جلدی نہ کرو، یہ قتل بھی ہوسکتا ہے۔" وہ بولی۔

"انسپکٹر جمال کو وہاں سے خودکشی کا نوٹ بھی ملا ہے۔" وہ بولا۔ "اس پر صرف ایک ہی جملہ لکھا تھا اور اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ خودکشی ہی ہے۔"

"کیا لکھا تھا......؟" آمنہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"یہی ایک راستہ ہے۔" وہ بولا۔

"یہ لکھا تھا......" آمنہ کا دل گویا ڈوب سا گیا۔

"ہاں، خیر تم اب بیورو آ جاؤ، کیس تو تقریباً ختم ہو ہی چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلیل شاہ اس بات سے خوش ہوگا کہ میں نے اتنی جلدی اس کی بیٹی کے قاتل کو گرفتار کر لیا۔"

"میری بات غور سے سنیے فخر الدین صاحب۔" آمنہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "آپ نے غلط آدمی پکڑا ہے، وہ قاتل نہیں ہے، اسے چھوڑ کر اصل قاتل کو ڈھونڈیے ورنہ ہمارے پاس ایک اور لاش اور بہت سا افسوس ہی بچ پائے گا۔"

"میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے اور میں تمہارا باس ہوں، یہ تمہیں یاد رکھنا چاہیے۔ اس حوالے سے تمہیں کسی سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔ جلیل شاہ آج ہماری تعریف کے لیے پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔" وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتا آمنہ نے اس سے قبل ہی فون بند کر دیا۔ وہ شدید غصے میں تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے آگے کی جانب بڑھی۔ کار کا رخ بیورو کی طرف نہیں تھا۔

☆☆☆

"تو اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" جلیل شاہ نے آمنہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ فخر الدین نے قاتل کو گرفتار کر لیا ہے اور میرا کون سا دشمن اسے استعمال کر رہا تھا یہ بھی جلد.. معلوم ہو جائے گا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اصل قاتل نہیں ہے۔ شاید آپ کے بھاڑے کے ٹٹو نے آپ کو یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ ایک اور عورت اغوا ہو چکی ہے اور اس کا اب تک کوئی علم نہیں ہوسکا ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

"کیا......تم فخر الدین کو بھاڑے کا ٹٹو کہہ رہی ہو؟ میرے خیال میں وہ تمہارا باس ہے اور اگر کوئی اور عورت اغوا ہوئی ہے تو وہ تم لوگوں کی نااہلی ہے، میرا اس سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

"یہی میں کہہ رہی ہوں کہ اس تفتیش سے آپ کا کوئی تعلق ہونا بھی نہیں چاہیے۔" آمنہ نے کہا۔ "دنیا آپ کے گرد نہیں گھومتی سر اور مجھے آپ سے ایک ضروری سوال بھی کرنا ہے۔"

"میں تمہیں تمہارے سوالات کے جواب دے چکا ہوں۔" وہ رعونت سے بولا۔

"مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کیا رابعہ کو گڑیا جمع کرنے کا شوق تھا یا وہ گڑیاں خریدا کرتی تھی؟"

"کیا احمقانہ سوال ہے اور مجھے اس کا جواب کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"شاید آپ کی مسز جانتی ہوں، کیا میں ان سے بات کر سکتی ہوں۔"

"نہیں، ہرگز نہیں، اور میں بھی اب تم سے بات نہیں کرنا چاہتا......" اس کے اس جواب کے ساتھ ہی آمنہ صوفے سے کھڑی ہوئی تھی۔

"ایک بات اور......شاید تم نے اس بارے میں سوچا نہ ہو مگر میں تمہیں اس کا یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا کیریئر ختم ہو چکا ہے۔"

آمنہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر کار میں آ کر بیٹھی اور اس محل سے باہر نکل آئی۔ اس نے صحیح کیا یا غلط...... یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی مگر وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ ایک عورت موت کی دلدل میں دھنس رہی ہے اور بیورو یا کسی کو بھی اسے بچانے کی فکر نہیں ہے۔ فخر الدین گرفتار شخص سے آگے

سوچنے پر آمادہ نہیں ہے۔ شرمین کو بچانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ کس سے بات کرنی چاہیے یہ فی الحال اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسے ڈرائیو کرتے ہوئے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس کے فون کی میسج ٹون بجی۔

''فوراً دفتر پہنچو۔'' فخرالدین کا پیغام اس کے سامنے تھا۔

یعنی جلیل شاہ نے بالکل وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے تلخی سے سوچا۔

وہ فخرالدین کے کمرے میں پہنچی تو کریم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر ٹینشن کے آثار نظر آرہے تھے۔

''بھاڑے کے ٹٹو......'' فخرالدین اسے دیکھتے ہی بولا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ آمنہ کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اسی لیے بڑے کہتے ہیں کہ پہلے تولو پھر بولو۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

''آئی ایم سوری، میں غصے میں تھی۔'' اس وقت وہ یہی کر سکتی تھی۔

''سوری سے کیا یہ سارا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ تم کیا سوچ کر شاہ صاحب کے گھر گئی تھیں۔ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ وہ کتنے ناراض ہیں۔'' وہ غرایا۔

''ان کی ناراضگی بیورو کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے سر...... مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔'' آمنہ نے نرمی سے کہا۔

''تمہیں اپنے آپ پر بہت زیادہ ہی یقین ہے آمنہ، جسے بیورو نے گرفتار کیا ہے جس نے اعترافِ جرم بھی کر لیا ہے۔ وہ قاتل نہیں ہے، شاہ صاحب کچھ چھپا رہے ہیں...... تم شاید خود کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھنے لگی ہو جبکہ میری رائے میں تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' فخرالدین سختی سے بولا۔

''میں پھر وہی کہوں گی کہ اگر میرا دماغ خراب بھی ہے تب بھی یہ بیورو کا اس وقت کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ابھی تک شرمین کو نہیں ڈھونڈ پائے ہیں، وہ عورت اس وقت نہ جانے کس عذاب میں ہو گی صرف ایک لمحے کے لیے سوچیے کہ اگر میرا اندازہ درست نکلا اور قاتل کوئی اور ہوا تو بیورو کو کس قدر مسائل کا سامنا ہو گا؟''

''آمنہ درست کہہ رہی ہے سر۔'' کریم نے اس کی تائید کی۔

فخرالدین چند لمحے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

''ہمیں اس کو دیکھنا ہو گا۔'' اس کے جواب پر آمنہ نے اطمینان کی سانس لی۔

''آمنہ میں نے سنا ہے کہ تمہاری دوست نے خودکشی کر لی ہے، کیا ہوا تھا؟''

''وہ یہ ذہنی بوجھ سہہ نہیں پائی۔'' آمنہ کی آنکھوں میں سعدیہ کا چہرہ گھوم گیا۔

''کیسا ذہنی بوجھ؟ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم اب تک یہ سمجھتی ہو کہ شاید اسلم بشیر زندہ ہے۔ نہیں، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ آمنہ کو منہ کھولتے دیکھ کر بولا۔ ''میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں مگر یہ حقیقت نہیں ہے، یہ تم سمجھ سکتی ہو...... پوچھنا میں یہ چاہتا ہوں کہ کیا تم نے سعدیہ سے اپنے اس وہم کا تذکرہ کیا تھا؟''

اس کی آنکھیں آمنہ پر جمی ہوئی تھیں، اب آمنہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس طرف جا رہا تھا۔

''سر...... اس موضوع پر اس وقت بحث کا فائدہ کیا ہے؟'' کریم بولا۔

''وہ یہ سب برداشت نہیں کر سکی آمنہ کیونکہ یہ خوف تم نے اس تک پہنچایا؟'' اس بار وہ براہِ راست الزام عائد کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم خود ذہنی طور پر اس وقت درست طریقے سے سوچنے کے قابل نہیں ہو۔''

آمنہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ اس نے سعدیہ کے شک کو کبھی یقین نہیں دیا تھا مگر پھر بھی یہ الفاظ اسے چھلنی کر رہے تھے۔

''سر اب یہ سب ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔'' کریم کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''بیٹھ جاؤ کریم۔'' فخرالدین نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور تم آمنہ، مجھے تمہارا بیج اور ریوالور چاہیے۔ تمہیں فوری طور پر معطل کیا جاتا ہے۔ تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔''

''فخرالدین......'' کریم نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر آمنہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے اپنا سرکاری ریوالور اور کارڈ نکال کر فخرالدین کی میز پر رکھ دیا۔ کریم دوبارہ کھڑا ہو گیا تھا مگر آمنہ نے اسے سر کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

کار میں بیٹھنے کے بعد آنسو بالآخر آنکھوں کی قید سے

آزاد ہوگئے تھے مگر وہ خود یہ محسوس کر کے حیرت زدہ تھی کہ یہ دکھ کے نہیں اطمینان کے آنسو تھے۔ ان چند دنوں میں پہلی بار اس نے خود کو آزاد محسوس کیا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ فخر الدین کچھ نہیں کرے گا۔ اس کے پاس ایک مجرم دکھانے کے لیے موجود تھا مگر وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتی۔ اب اسے ہی کچھ کرنا تھا اور وہ مطمئن تھی کہ اب اسے کوئی اس کا کام سکھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ اس کو ڈھونڈے گی اور شرمین کو بچانے کی پوری کوشش کرے گی۔ پوری کوشش۔

رات دیر تک وہ جاگتی رہی تھی۔ اس کا لائحہ عمل اب کیا ہونا چاہیے؟ وہ مسلسل سوچے جارہی تھی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ان تمام عورتوں نے کسی ایک ہی جگہ سے مختلف اوقات میں گڑیا خریدی تھی اور اس قاتل نے وہیں انہیں اپنا ٹارگٹ بنانے کا فیصلہ کیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دکان یا اسٹور تلاش کرنا ضروری تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا یا تو وہ اس جگہ سے وابستہ تھا یا پھر اس کا اس سے قریبی تعلق تھا۔ اگر ایک بار وہ اس جگہ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی تو پھر شاید اس شخص کو ڈھونڈ نکالنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے کمپیوٹر کھولا اور شہر کے مختلف علاقوں میں موجود گڑیا فروخت کرنے والے خاص اسٹورز بلکہ تمام بڑے اسٹورز جہاں کھلونوں کا سیکشن موجود تھا اس کی لسٹ میں شامل ہوتے جارہے تھے۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ دکانوں اور اسٹورز کی ایک بڑی تعداد کا ڈیٹا شاید نیٹ پر غیر موجود بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ہر علاقے کو خود چھاننا تھا۔ اس نے سوچا اور تھک کر تکیے پر سر رکھ دیا۔ نہ جانے شرمین ساجد کے لیے یہ رات اپنے دامن میں کیا لائی ہو۔ خدا جانے وہ زندہ بھی تھی کہ نہیں، اس نے دکھ سے سوچا۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت نیند کے نرم و گرم بازو نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کی آنکھ فون کی بیل سے کھلی تھی۔ اس کے اٹھنے تک فون بند ہوگیا تھا۔ اس نے سامنے لگی گھڑی کو دیکھا وہ ساڑھے دس بجنے کا اعلان کررہی تھی۔

''اوہ...... اس قدر دیر ہوگئی۔'' وہ گھڑی دیکھ کر اچھل کر بیٹھ گئی۔ ''مجھے کسی نے جگایا کیوں نہیں، دفتر کو دیر ہوجائے گی۔'' بستر سے کھڑے ہونے تک اسے یاد آچکا تھا کہ اسے آج دفتر نہیں جانا تھا۔ فخر الدین اسے معطل کر کے جبری رخصت پر بھیج چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور فون کی جانب ہاتھ بڑھایا تاکہ کال بیک کی جاسکے۔ فون اٹھاتے ہی وہ دوبارہ بجنے لگا تھا۔ اسکرین پر کریم کا نام چمک رہا تھا۔

''کیا حال ہے کریم...... کوئی خبر......؟'' حال احوال کے بعد اس نے پوچھا۔

''آمنہ کیا تم کھڑی ہوئی ہو......؟'' کریم نے پوچھا۔

آمنہ کا دل اس سوال کو سن کر ڈوب سا گیا تھا۔ وہ بستر پر ہی بیٹھی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ کریم کے پاس کوئی بُری خبر ہی تھی۔

''شرمین ساجد کی لاش مل گئی ہے۔'' ایک لمحے کے سکوت کے بعد وہ بولا۔ ''اس بار اس نے بہت تیزی دکھائی ہے۔''

''فخر الدین کا کیا کہنا ہے اب؟'' آمنہ نے تلخی سے پوچھا۔

''تم درست تھیں صرف تم نے ہی کہا تھا کہ اصل قاتل گرفتار نہیں ہوا ہے۔ اب وہ اپنی خفت کو پکڑے گئے احمق پر جھوٹ بولنے اور پولیس کو گمراہ کرنے کے مقدمے بنا رہا ہے۔''

''کریم تم ابھی کہاں ہو؟''

''میں یہاں موقع واردات پر ہوں۔''

''تمہارے پاس لاش اور اردگرد کی تصاویر ہوں گی۔ تم مجھے انہیں سینڈ کرسکتے ہو؟''

''کیوں نہیں، مگر تم جانتی ہو نا کہ آفیشلی تم کیس سے باہر ہو۔''

''میں جانتی ہوں اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ بولی۔ ''وہ قاتل ابھی آزاد ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے حوصلے بڑھ رہے ہیں۔''

''میں تصاویر بھیج رہا ہوں مگر تم مجھے بتائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی آمنہ......''

''ٹھیک ہے کریم...... تم فکر مت کرو۔''

چند لمحوں بعد وہ شرمین کی لاش کی تصاویر دیکھ رہی تھی۔ سب کچھ رابعہ کے قتل کے مانند نظر آرہا تھا۔ سنہری وگ، تیز گلابی لپ اسٹک، گلے میں گلابی اسکارف، آنکھوں کے سلے ہوئے پپوٹے اور وہ بیگنی پیکنگ کا پھول جو اس کا شناختی نشان بن چکا تھا۔

چند لمحے تصاویر دیکھنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے چہرے پر تاسف، خوف اور غصہ بکھرا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ کریم کا نمبر ملایا۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''مجھے بھی...... شاید ہم اسے بچا سکتے اگر ہم اس چکر میں

نہ پڑ گئے ہوتے۔'' کریم کے لہجے میں بھی دکھ گھلا ہوا تھا۔

''کیا ٹرک کے نشانات، فنگر پرنٹ کچھ ملے ہیں۔''

''نہیں، اگرچہ کہ کچھ بھی ضائع نہیں ہوا مگر وہ بہت محتاط اور چالاک ہے۔''

''کیا لاش اکڑ چکی تھی؟'' ایک خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

''جب ہم اس تک پہنچے تب تک اکڑ چکی تھی۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ کیا اس نے اسے قتل کر کے اس پوز میں تیار کر دیا ہوگا اور لاش کے اکڑنے کے بعد یہاں لایا ہو گا؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''نہیں، اس کا پوز بالکل پہلے جیسا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے ٹھٹھرنے سے پہلے یہاں لے آیا گیا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس نے اسے یہاں قتل کیا ہو گا؟''

''نہیں کریم، وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا، یہ اسے قتل کر کے اور تیار کر کے یہاں لایا ہو گا مگر اس کے لیے اس نے وقت کا صحیح صحیح اندازہ رکھا ہوگا۔ اتنے خون کرنے کے بعد وہ یہ اچھی طرح جان گیا ہے کہ لاش کتنی دیر میں اکڑ جاتی ہے۔ لاش کو دو سے چار گھنٹے کا وقت درکار ہوتا ہے اکڑنے میں...... یعنی اس نے اپنے شکار کو موقع واردات سے زیادہ دور نہیں رکھا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ ممکن ہوسکتا ہے۔'' آمنہ نے کہا۔

''آمنہ تمہیں اس کیس پر واپس آنا ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے چیف آفیسر یا آئی جی صاحب سے بات کرنی چاہیے۔'' کریم نے کہا۔

''فخر الدین اسے پسند نہیں کرے گا۔'' وہ بولی۔

''وہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ پہلے میں اس سے ہی بات کروں گا۔''

''نہیں، میرا مشورہ ہے کہ فی الحال تم ایسا مت کرو...... ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں بھی معطل کر دے۔ ہوسکتا ہے کہ خود ہی کوئی راستہ بن جائے۔''

''تم کیا کرنے والی ہو؟'' کریم نے پوچھا۔

''فی الحال میں سوچ رہی ہوں، جیسے ہی کوئی آئیڈیا آیا میں تم سے بات کروں گی۔'' آمنہ بولی اور فون بند کر دیا۔

سچ یہ تھا کہ اس وقت اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ خود کو ہارا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو حقیقت صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ وہ شرمین کو بچا نہیں پائے تھے۔ وہ ہنستی مسکراتی خوب صورت خاتون ایک تکلیف دہ انجام سے نہیں بچ پائی تھی۔ اس کی لاش کی تصویر اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔

شہر کے سارے گڑیا بیچنے والے اسٹورز اور سپر اسٹور کی چیکنگ ایک بہت طویل کام تھا اور اسے ڈر تھا کہ قاتل کے منہ پر خون لگ گیا تھا، وہ اس کے کسی اور کو نشانہ بنانے سے پہلے کچھ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے گوگل میپ پر اس جگہ کو پن کیا جہاں سے شرمین کی لاش ملی تھی۔ 'اسے اس جگہ سے دو گھنٹے کے فاصلے پر کہیں موجود ہونا چاہیے۔' وہ بڑبڑائی۔ اس لوکیشن کے اطراف میں کافی بڑا علاقہ اس کے سامنے تھا۔ اسے یقین تھا کہ قاتل نے اس کام کے لیے اپنے گھر کا انتخاب کیا ہوگا، اس جگہ کا جہاں یقیناً اس نے کچھ بہت برا وقت گزارا تھا جس نے اس کے دماغ کو اس خطرناک نہج تک پہنچا دیا تھا۔ آمنہ نے میپ پر نظر آنے والے پارکس اور دیگر پبلک مقامات کو غائب کر دیا۔

وہ اسی سوچ میں تھی کہ اس کی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''مس آمنہ، میں جلیل احمد شاہ بول رہا ہوں۔'' وہ اس کی آواز سن کر حیران رہ گئی تھی۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، فوراً......''

آمنہ گڑبڑا سی گئی تھی۔ 'اس جیسا متکبر آدمی خود اسے فون کر کے ملنے کو کہہ رہا تھا، ایسا کیا ہوسکتا ہے۔' اس نے سوچا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم فون پر بات کر سکتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''فون پر اس حوالے سے بات نہیں ہوسکتی۔'' وہ بولا۔ ''کیا یہ ملاقات آج ہی ہو سکتی ہے؟ میں تمہارے دفتر آسکتا ہوں اگر تم چاہو......''

''میں فی الحال معطل ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس بارے میں بہتر جانتے ہوں گے۔''

''اوکے...... پھر پلیز تم میرے گھر پر آجاؤ۔'' آمنہ کا دل چاہا کہ وہ انکار کر دے مگر اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے پاس آمنہ کو بتانے کے لیے کچھ تھا اور اسے امید تھی کہ شاید اس سے اسے قاتل کا کچھ پتا مل سکے۔

''اوکے، میں دو گھنٹے میں آپ کے گھر پر ہوں گی۔'' وہ بولی اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''میں تمہارا مشکور ہوں۔'' جلیل احمد شاہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہیں کچھ دینا ہے۔''

آمنہ مشکوک سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اول

تو اس جیسے مغرور شخص کا یہ انداز بیاں اس کی سمجھ سے باہر تھا، اس کے بعد وہ اسے کچھ دینے کی بات بھی کر رہا تھا۔
جلیل شاہ نے مزید تمہید کے بجائے آمنہ کے سامنے رکھی میز پر مسرون لیدر کی ایک خوب صورت ڈائری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاید تمہارے کام آئے گی۔''
''یہ...... یہ کیا ہے؟''
''یہ میری بیٹی رابعہ کی ڈائری ہے۔ میں نے اس کے......'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا۔ ''دنیا سے جانے کے بعد اس کے گھر سے لیا تھا۔ میں نہیں جانتا اس میں کیا ہے کیونکہ میں اسے پڑھنے کی ہمت نہیں کر سکا مگر مجھے یقین ہے کہ اس میں جو کچھ ہوگا اس کا لوگوں کو علم ہونا مناسب نہیں ہو گا۔''
آمنہ ڈائری ہاتھ میں لیے اسے دیکھ رہی تھی۔
''مس آمنہ میری بیٹی اپنی زندگی کے آخری سال میں منشیات کی عادی ہو گئی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ اس بری عادت سے باہر نکل آئے اور آخری ماہ میں وہ خود بھی اس کی کوشش کر رہی تھی۔'' وہ بھی اس ڈائری کو ہی دیکھ رہا تھا۔
''اس کی موت کے بعد شروع میں، میں یہ سمجھا تھا کہ اس کے پیچھے ان ہی لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے جس سے وہ منشیات خریدتی ہوگی۔''
''آپ کی بیٹی کے قتل کا منشیات والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے شاہ صاحب......'' آمنہ بالآخر بولی۔
''ہاں اب میں سمجھ گیا، ایک اور عورت کی لاش اسی طرح برآمد ہو گئی ہے اور اگر یہ سب نہ روکا گیا تو اور بھی عورتیں اس کا شکار ہوں گی۔ مجھے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ شاید اس کی وجہ میرا سیاسی اسٹیٹس وغیرہ ہے۔''
آمنہ سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جلیل شاہ نے شاید زندگی میں چند ہی بار اپنی غلطی تسلیم کی ہوگی۔
''تم یہ ڈائری لے جاؤ شاید یہ تمہیں تمہارے کیس میں مدد دے سکے گی۔''
''یہ اب میرا کیس نہیں ہے شاہ صاحب، مجھے معطل کر دیا گیا ہے۔'' وہ ہلکی سی تلخی سے بولی۔
''یہ بھی میری غلطی ہے مگر تم فکر نہ کرو اس کیس پر تم کام کرو گی۔ مجھے ذرا سا وقت دو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''
آمنہ چند لمحے بالکل خاموش رہی پھر بولی۔ ''شاہ صاحب مجھے بھی آپ سے معذرت کرنی ہے۔ آخری بار جب میں یہاں آئی تھی میں بہت زیادہ پریشان تھی اور میں نے بہت سی ایسی باتیں کہہ دی تھیں جو مجھے آپ کو نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ میں معذرت خواہ ہوں۔''
جلیل شاہ نے جواب میں ہاتھ ہلایا۔ یعنی اس نے اس کی معذرت قبول کر لی تھی۔ آمنہ ڈائری لے کر کھڑی ہو گئی۔
''میں صرف ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر مڑ کر پوچھا۔ ''آپ فخر الدین کے بجائے یہ ڈائری مجھے کیوں دے رہے ہیں؟''
جلیل شاہ پہلی بار پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''کیونکہ میں نے تمہارے بارے میں ایک بات جان لی ہے۔ تم کسی کی بھی بھاڑے کی ٹٹو نہیں ہو۔''
آمنہ اسے دیکھتی رہی۔ ایک ایسے شخص کی جانب سے ملنے والی عزت نے جو خود اپنے علاوہ کسی کو تعریف کے قابل نہ سمجھتا ہو اسے گنگ سا کر دیا تھا۔
''میں اس پر تیزی سے کام کروں گی اور میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس ڈائری کا کوئی ایک لفظ بھی افشا نہیں ہوگا۔'' وہ بولی۔
''مجھے تم پر یقین ہے۔'' جلیل شاہ بولا اور اس نے آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔
آمنہ فوری طور پر اس ڈائری کو دیکھنا چاہتی تھی مگر اس نے خود کو گھر پہنچنے تک ڈائری کھولنے سے بمشکل روکے رکھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی وہ ڈائری کھول کر بیٹھ گئی۔
رابعہ جلیل شاہ نے ڈائری میں اپنے نشے کی عادت اور پھر اپنی بیٹی کی خاطر اسے چھوڑنے کے عزم کی تفصیل جگہ جگہ لکھ رکھی تھی۔ بہت سے لوگوں کے بارے میں اس کی رائے موجود تھی، خود اپنے باپ کے بارے میں اس کے کچھ اچھے تاثرات نہیں تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کا ایک اور خاتون سے افیئر ہے اور وہ اس سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ ڈائری میں اس کے مستقبل کے پلان تھے۔ وہ دنیا گھومنا چاہتی تھی۔ ملک میں تعلیم و تربیت کے شعبے میں ایک خاص ادارہ کھولنا چاہتی تھی مگر اب اس کے سارے منصوبے ہمیشہ کے لیے فنا کا لباس پہن چکے تھے۔ آمنہ کی آنکھوں کے سامنے اس کی لاش کی تصاویر گھوم رہی تھیں۔
اس نے اس کی پوری ڈائری پڑھ ڈالی تھی۔ مگر اسے کہیں قاتل کے حوالے سے کوئی کلیو کوئی ایک سطر بھی نہیں ملی تھی۔ اس ڈائری کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی امیدیں بہت بلند تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا

مگر اب وہ پھر ایک بند گلی میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے مایوسی سے ڈائری کو بستر پر اچھال دیا۔

عین اسی وقت اس ڈائری سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑ کر اس کے قدموں میں آ گرا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا۔ کاغذ کی تہ کو کھولا۔ ایک لمحے کو اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ ایک رسید تھی۔ ایک ڈول ہاؤس سے خریدی گئی گڑیا کی رسید۔

☆☆☆

رسید کے اوپر اسٹور کا ایڈریس، فون نمبر نام اور ویب سائٹ کی تفصیل موجود تھی۔ علینا فیشن اینڈ ڈولز۔ آمنہ نے غور سے نام کو دوبارہ دیکھا۔ رسید پر لمبائی میں خصوصی گڑیا ہاؤس بھی تحریر تھا جس کے نیچے ملاقات کے لیے اپائنٹمنٹ لازمی ہونے کی اطلاع بھی دی گئی تھی۔ اس نے ڈائری کو دوبارہ کھولا، رسید پر لکھی گئی تاریخ کے مطابق صفحہ نکالا۔ رابعہ کی تحریر اس کے سامنے چمک رہی تھی۔ ''آج میں نے سارہ کے لیے ایک خاص تحفہ خریدا ہے، ابھی تو وہ اس سے نہیں کھیل پائے گی مگر تھوڑی بڑی ہونے کے بعد وہ اسے ضرور پسند کرے گی۔''

''ہوں۔'' آمنہ نے گہری سانس لی تو رابعہ نے یہ گڑیا اس جگہ سے خریدی تھی۔ یقیناً باقی عورتوں نے بھی گڑیاں وہیں سے خریدی ہوں گی اور وہیں اس قاتل نے انہیں پہلی بار دیکھا ہوگا۔

اس نے گوگل میپ کے ذریعے علینا فیشن اینڈ ڈولز کا پتا تلاش کیا۔ وہ فوراً وہاں پہنچنا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے اس کو... کریم سے بات کرنا تھی۔ کریم نے پہلی گھنٹی پر فون اٹھا لیا تھا۔

''کریم مجھے ایک لیڈ ملی ہے.....'' وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

''کیا.....؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے وہ اسٹور تلاش کر لیا ہے۔''

''آمنہ..... زبردست مگر تمہیں معلوم ہے نا کہ ڈپارٹمنٹ نے تمہیں معطل کیا ہوا ہے، تمہیں اس کیس پر کام نہیں کرنا ہے۔ فخر الدین کو معلوم ہوا تو وہ بات بڑھا دے گا۔'' کریم کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''خیر مجھے کام کرنے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے، ویسے مجھے یہ لگ رہا ہے کہ جلد ہی میری معطلی ختم ہو جائے گی۔''

''واقعی.....؟ اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر تمہیں یہ کس نے کہا ہے؟'' کریم نے پوچھا۔

''جلیل احمد شاہ نے۔''

''کیا؟ کہیں تم دوبارہ اس کے گھر تو نہیں گئیں؟ تم کیا گڑبڑ کر رہی ہو؟'' کریم پریشان ہو گیا تھا۔

''اس نے مجھے بلایا تھا، اسی نے مجھے رابعہ کی ڈائری دی تھی جس سے اس اسٹور کا علم ہوا۔ میں وہاں جا رہی ہوں تم چاہو تو وہاں آ جاؤ۔''

''میری بات سنو، تم وہاں اکیلی نہیں جاؤ گی۔ تمہارے پاس تمہارا کارڈ تک نہیں ہے۔ اگر وہاں کوئی مشکل صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تو تمہارا پسٹل بھی موجود نہیں ہے، مجھے پہنچنے دو۔''

''کریم میرے پاس میرا ذاتی پسٹل موجود ہے۔ اور تم گھبراؤ مت، معطلی سے میرے اندر کی اسپیشل برانچ روح تو نہیں نکلی ہے تم ضرور آؤ مگر میں پہلے نکل رہی ہوں۔ میں وہاں کوئی شور شرابا نہیں چاہتی، نہ ہی یہ کہ وہ قاتل ہوشیار ہو جائے۔ تم بھی اسٹور میں مجھ سے رابطے کے بعد داخل ہونا..... سمجھ رہے ہو نا؟''

''سمجھ رہا ہوں مگر مجھے یہ پروگرام زیادہ پسند نہیں آیا ہے۔'' وہ بولا۔

آمنہ نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔

کریم چند لمحے فون کو گھورتا رہا پھر ہلکی سی بپ پر اس نے بٹن دبایا، آمنہ نے اسے اسٹور کا پتا بھیج دیا تھا۔ کریم نے پتا پڑھ کر ٹھنڈی سانس لی اور کھڑا ہو گیا۔ یہ اسٹور اس کے دفتر سے خاصی مسافت پر تھا۔ اسے اپنے آمنہ کے وہاں پہنچنے سے قبل پہنچ پانے کی کم ہی امید نظر آ رہی تھی مگر اسے تیزی سے حرکت کرنا تھی تاکہ وہ اس بی شرلاک ہومز کو موت کے منہ میں کودنے سے روک سکے۔

☆☆☆

آمنہ کو علینا فیشن اینڈ ڈولز کو تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ شہر کے پوش علاقے میں موجود یہ بوتیک اور ڈول اسٹور ایک قدرے پرانی عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ عمارت کو جدید انداز میں سجایا گیا تھا۔ شیشے کا بڑا سا دروازہ بند تھا مگر اس پر ''اوپن'' کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ آمنہ نے دروازے کے ساتھ لگی بیل کا بٹن دبایا جس کے چند لمحوں بعد ایک عورت نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کی قدرے فربہ اندام خاتون تھیں۔

''خوش آمدید، تشریف لائیے۔'' وہ اسے راستہ دیتے ہوئے بولی۔

"شکریہ، کیا آپ علینا ہیں؟" آمنہ نے پوچھا۔

"جی ہاں...... میرا نام ہی علینا ہے، بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں، آپ کس قسم کے لباس پسند کریں گی؟"

"میں اصل میں آپ کا ڈول ہاؤس والا سیکشن دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"مگر اس کے لیے اپائنٹمنٹ درکار ہوتا ہے، اگر آپ نے لیا ہے تو شاید میں بھول گئی ہوں۔" وہ متانت سے بولی۔

"نہیں...... مجھے اصل میں کسی نے آپ کا پتا دیا ہے۔"

"اچھا...... میرے کسی معزز کلائنٹ کے توسط سے آپ آئی ہیں۔ اس صورت میں تو میں آپ کو انکار نہیں کر سکتی۔ آیئے میں آپ کو ڈول سیکشن دکھاتی ہوں۔"

اسٹور کا پچھلا حصہ ڈول سیکشن کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں مختلف شیلفس پر بہت سی گڑیاں موجود تھیں۔ ایک جانب گڑیاؤں کی آرائش کا سامان، وگ، ملبوسات وغیرہ تھے۔ ایک شیلف ان سے متعلق رسائل اور کتابوں سے بھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ آمنہ کو وہاں داخل ہوتے ہی ایک تیز بو سی محسوس ہوئی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے اندر بڑھتی چلی گئی تھی۔ گڑیوں میں اسے کچھ خاص نظر نہیں آیا تو وہ رسائل والے شیلف کی جانب بڑھی۔ کچھ کتابیں دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ یہ کتابیں بھی مختلف گڑیوں کے ساتھ بیچی جاتی ہیں۔ کتابیں دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ میں میگزین آگیا۔ اس کے سرورق پر ایک گڑیا کی تصویر تھی۔ آمنہ اسے دیکھ کر ساکت سی ہوگئی تھی۔ گڑیا کے سنہرے بال، اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ گلے میں گلابی اسکارف تھا۔ ہونٹوں پر تیز گلابی لپ اسٹک تھی اور اس کے ایک ہاتھ پر بیگنی رنگ کا پھول موجود تھا۔ آمنہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی شروع ہوگئی تھی۔ وہ نامعلوم سفاک قاتل اپنے شکار کو اسی گڑیا کی شکل میں ڈھال دیتا تھا۔

"جی کچھ پسند آیا آپ کو......؟" علینا کی آواز نے اسے اس سحر سے نکالا۔

"کیا آپ کے پاس اس رسالے والی گڑیا موجود ہے؟" اس نے رسالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد کہا۔ "یہ کافی پرانا رسالہ ہے۔ ہم نے شاید اس طرز کی گڑیاں کبھی نہیں رکھیں۔ یہ ڈیزائن سالوں پرانا ہے اور عام مارکیٹ میں مل رہا تھا جبکہ ہم خاص ڈیزائنرز پر کام کرتے ہیں۔"

"اوکے......" اس نے قدرے مایوسی سے پوچھا۔ "آپ کے ہاں کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟"

"جی......" اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ تنہا تو یہ اسٹور نہیں چلا رہی ہوں گی؟"

"میرے پاس دو لڑکیاں ہیں مگر زیادہ تر کام میں خود دیکھتی ہوں، میں نے بتایا نا کہ میرا اسٹور زیادہ تر خاص کسٹمرز ہی استعمال کرتے ہیں۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہ کس نے آپ کو میری طرف بھیجا ہے؟"

"ہاں...... رابعہ جلیل شاہ نے......"

علینا کا چہرہ یک دم بجھ سا گیا تھا۔ "اس کے ساتھ بہت برا حادثہ ہوا ہے، کیا آپ کوئی رپورٹر ہیں؟"

"نہیں، میں اسپیشل برانچ کی آفیسر ہوں۔"

"اوہ۔" وہ بولی۔ "کیا میں کوئی مدد کر سکتی ہوں؟"

"یہاں کتنے مرد کام کرتے ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں۔" علینا نے سر ہلایا۔

آمنہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے، ہر منزل آخر میں بند گلی بن جاتی تھی۔ اس نے گڑیا والے حصے سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھایا پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔

"یہ عجیب سی بو غالباً تیز فینائل کی ہے، کیا آپ نے ابھی پونچھا لگوایا ہے؟" اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں، ایک گھنٹا ہوگیا اصل میں ہم نے ایک آدمی کو صفائی کے کام پر رکھا ہوا ہے، وہ یہاں باقاعدہ ملازمت نہیں کرتا صرف صبح جلدی آکر صفائی وغیرہ کا کام کرتا ہے۔" علینا نے کہا۔ "کافی عرصے سے وہ کام کر رہا ہے مگر آج کل وہ کچھ ٹھیک کام نہیں کر رہا، میں خود اسے نکالنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"صفائی کرنے والا۔" آمنہ نے دہرایا۔ "اس کا نام کیا ہے؟ کیا آپ کے پاس اس کا پتا موجود ہے؟"

"اس کا نام شہباز خالد ہے، اس کا پتا ہے میرے پاس...... ہم ہر ایک سے مکمل کاغذ لیتے ہیں۔" علینا پریشان ہوکر کاؤنٹر کی جانب مڑتے ہوئے بولی۔

چند لمحوں بعد آمنہ کے ہاتھ میں ایک ایڈریس موجود تھا۔ اس نے اسے سرچ پر ڈالا اور حیران رہ گئی۔ یہ پتا اس علاقے میں موجود ہی نہیں تھا۔

"یہ پتا جعلی ہے۔" وہ بولی۔ "آپ کے پاس اس کے شناختی کارڈ کی کاپی ہے؟"

"کاپی تو نہیں ہاں نمبر موجود ہے، وہ ایک ضروری کام

سے لیا تھا ہم نے......'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ ''ایک بار اسے کچھ پیسے بھجوائے تھے کسی فون سروس سے......''

جتنی دیر میں علینا نے نمبر نکالا آمنہ، کریم کو اس بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔

''تم فوری طور پر اس شناختی کارڈ ہولڈر کا پتا نکلوا کر بھیجو کریم......'' اس کے لہجے میں جوش بھرا ہوا تھا۔

چند لمحوں بعد اسے کریم کا پیغام مل گیا تھا۔ اس کے فون کے اسکرین پر وہاں سے چند میل کے فاصلے پر واقع فارم ہاؤسز میں موجود ایک مکان کا پتا جگمگا رہا تھا۔ آمنہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں اس قاتل کا پتا موجود تھا۔ یکلخت اسکرین بدلی اور کریم کا نام بیل کے ساتھ گنگنایا۔

''ہاں کریم مل گیا ہے۔'' وہ بولی۔

''آمنہ میری بات غور سے سنو، میں نے کور تیار کرلیا ہے۔ ہم یہاں سے نکل رہے ہیں، تم جانتی ہو کہ ٹریفک اور فاصلہ موجود ہے۔ تم جہاں ہو وہیں ہمارا انتظار کرسکتی ہو؟''

''تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے، میں وہاں جارہی ہوں کریم۔''

''اچھا تو پھر تم اس مکان میں ہمارے آنے سے پہلے داخل مت ہونا، پلیز آمنہ......''

''اوکے۔'' آمنہ بولی اور فون بند کردیا۔

''مجھے یہ بتایئے کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ شہباز قاتل ہو سکتا ہے؟'' علینا نے یقین نہ آنے والے لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ کو فی الحال کچھ زیادہ نہیں بتا سکتی مگر علینا اب آپ اس شخص کو اپنے اسٹور میں داخل مت ہونے دیجیے گا، وہ بہت خطرناک ہے۔'' آمنہ یہ کہتی ہوئی اسٹور سے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

دس منٹ بعد وہ اس چھوٹے سے خوب صورت فارم ہاؤس کے باہر کھڑی تھی۔ یہ ایک خوب صورت علاقہ تھا۔ وہ چند لمحے اس مکان کو دیکھتی رہی۔ پھر کار سے باہر نکل آئی۔ اس وقت اس کے ذہن میں آندھیاں سے چل رہی تھیں۔ اسلم بشیر، سعدیہ، سعدیہ کی پنکھے سے لٹکی لاش، رابعہ کی سلی ہوئی آنکھیں، شرمین کی اکڑی ہوئی لاش، سب گویا گڈمڈ ہو رہا تھا۔

فارم ہاؤس کا گیٹ صرف ایک لوہے کے کھٹکے سے بند کیا گیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

''کوئی ہے؟'' اس نے آواز دی۔ ''مجھے شہباز خالد سے کام ہے۔''

جواب میں ہر طرف سکوت سا طاری تھا۔ وہ چھوٹے سے پورچ کو عبور کرتی ہوئی اندرونی دروازے تک پہنچی۔ دروازہ لاک تھا۔ آمنہ نے ایک لمحے سوچا پھر بالوں سے پن نکال کر کوشش کی۔ وہ عام سا لاک ایک منٹ میں ہی کھل گیا تھا۔ اس نے اپنا سیاہ گلاک دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اندر داخل ہوگئی۔ یہ ایک لاؤنج نما ڈرائنگ روم تھا جہاں پرانے مگر آرام دہ صوفے پڑے تھے۔ چند قدم آگے بڑھ کر ایک عام سا ڈائننگ روم نظر آیا۔ وہ چاروں طرف دیکھتی محتاط انداز میں قدم بڑھا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار خاندان کی تصاویر کے فریم سے سجی تھی۔ اس نے تصویروں کو غور سے دیکھا۔ وہاں کئی تصویریں تھیں۔ دو تصویروں نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی، ایک میں ایک دس سال کا بچہ اسکول یونیفارم میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے برابر موجود تصویر میں اسی عمر کی بچی گلابی فراک اور سنہری وگ پہنے ایک عورت کے ساتھ کھڑی تھی۔ آمنہ نے غور سے دونوں تصویروں کو دیکھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ دونوں تصاویر میں ایک ہی بچہ تھا جسے عورت والی تصویر میں لڑکی کا گیٹ اپ دیا گیا تھا۔ اس تصویر میں بچی کے تاثرات میں غصہ، تکلیف اور ناپسندیدگی واضح تھی۔ ان سے نیچے لگی تصویر گویا اس کے سامنے سب کچھ روشن کرگئی تھی۔ اس میں بھی وہی بچی اسی عورت کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی۔ وہ گڑیا گلابی فراک، اسکارف اور سنہری وگ سے سجی تھی اور اس کے ہاتھ میں بینگنی رنگ کا پھول تھا۔ یہ وہی سرورق والی گڑیا تھی۔ آمنہ کی سمجھ میں اب سب کچھ آتا جارہا تھا۔ اس دیوار کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ تھا جو اس وقت بند تھا۔

'شاید یہ وہی قتل گاہ ہے۔' اس نے سوچا اور قدم آگے بڑھایا۔ کمرے کے لاک کی ناب پر ہاتھ رکھتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ دروازہ لاک نہیں ہے مگر پھر بھی وہ اسے کھولتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

بالآخر اس نے اسے کھول لیا۔ اندر قدرے اندھیرا تھا۔ آمنہ نے دیوار پر ٹٹول کر لائٹ کا سوئچ تلاش کیا اور اسے دبا دیا۔ کمرے میں ملگجی سی روشنی پھیل گئی۔ اندر موجود منظر نے اسے ساکت سا کردیا تھا۔ کمرے کی ایک جانب لوہے کا ایک پائپ سا لگا تھا۔ نیچے ایک پھٹا ہوا سا بدنما گدا پڑا تھا۔ ایک جانب ایک خطرناک چاقو پڑا تھا جس پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ زمین پر بھی خون کے دھبے موجود تھے۔ اردگرد اور بھی بہت کچھ بکھرا ہوا تھا جس میں ایک موٹی سی رسی بھی شامل تھی۔

آمنہ نے جھرجھری سی لی۔ اسی وقت اس کے سر پر کسی نے حملہ کیا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ لمحہ بھر کے لیے چکرا کر رہ گئی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر کہیں جا گرا۔ اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر یکلخت لائٹ غائب ہوگئی تھی۔ اس نے بروقت اپنی جگہ سے حرکت کی کیونکہ اسی لمحے اسے ایک غصے بھری غراہٹ کے ساتھ کسی کا ہاتھ حرکت کرتا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ ابھی کھڑی ہوئی ہی تھی کہ ایک اور وار نے اس کے کندھے میں آگ سی بھر دی۔ سر کی چوٹ اور کندھے کی تکلیف نے اسے زمین پر گرا دیا۔

''مجھے ہوش میں رہنا ہے۔'' وہ خود کو تلقین کر رہی تھی مگر محسوس یہ ہو رہا تھا جیسے زندگی کی ریت کے مانند ہوش و حواس اس کی برداشت کی بند مٹھی سے نکلتے جارہے تھے۔ دروازہ ہلکا سا کھلا تھا، اس میں اسے وہ شخص حرکت کرتا نظر آرہا تھا۔ یقیناً وہ وہیں موجود تھا اور صحیح لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ آمنہ زمین پر پڑی تھی۔ وہ خود اپنے سر سے بہتے خون کی چپچپاہٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے زمین پر سرک کر اپنے پسٹل کو ڈھونڈنا چاہا اور بمشکل اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ سایہ اسے اٹھتا دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی راڈ تھی۔ اس بار اس نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ آمنہ کو زور سے دھکا دیا تھا جس سے وہ زمین پر دوبارہ گر پڑی تھی۔ لوہے کی راڈ کا اگلا وار اس کے جسم پر کرسکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں لرز گئی مگر اگلے لمحے راڈ کے زمین پر گرنے کی آواز آئی اور پھر اسے اپنا بایاں پاؤں کسی رسی کے پھندے میں پھنستا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اسے قید کرنے لگا تھا۔ کریم اور ڈپارٹمنٹ کے لوگوں کی آمد کے بعد اس کی موت تو یقینی تھی مگر کیا وہ اسے چھوڑ دیتا...... آمنہ کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے تصور میں شرمین کی تصویر اس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ اسے اپنی بیٹی کے لیے جینا تھا اور یوں بھی اسے ایک مکار اور بزدل قاتل کی مرضی سے ملنے والی موت کیسے قبول ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا اور پھر بے آواز انداز میں زمین پر پسٹل کی تلاش میں ہاتھ پھیرا۔ پسٹل تو اس کے ہاتھ میں نہیں آسکا مگر اس بار اس کے ہاتھ میں کوئی تیز اور نوکدار چیز آگئی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر اس پر ہاتھ پھیرا۔ یہ وہی چاقو تھا جو اس نے زمین پر پڑا دیکھا تھا۔

اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ شہباز اب رسی کو لوہے کے پائپ سے باندھ رہا تھا۔ وہ اس کی جانب سے مطمئن نظر آرہا تھا۔

آمنہ نے اپنی تمام طاقت مجتمع کی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شہباز نے اسے اٹھتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیر کے مانند اس کی جانب لپکا۔ آمنہ اپنے آزاد پیر کی مدد سے اٹھی اور اس نے پوری طاقت سے ہاتھ میں پکڑا چاقو شہباز کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ پھر اس نے چاقو دوبارہ کھینچ لیا تھا اور دیوانگی کے عالم میں اسے بار بار اس کے پیٹ میں مارتی رہی تھی۔ اس کے کانوں میں اس کی ہلکی اور پھر تیز چیخ کی آوازیں گونج رہی تھیں اور پھر پورا منظر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس کا پورا جسم بُری طرح دکھ رہا تھا خصوصاً سر اور کندھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کریم کا چہرہ تھا۔ 'کیا یہ خواب ہے؟' اس نے خود سے پوچھا۔

''کریم......'' اس کی آواز پر وہ مسکرایا۔

''مبارک ہو تم جیت گئیں۔ تم نے یہ کیس بھی حل کرلیا اور اپنے خوف کو بھی شکست دے دی آمنہ۔''

آمنہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ابھی تک اسی فارم ہاؤس میں تھی۔ اس کے اردگرد ڈپارٹمنٹ کے لوگ کارروائیوں میں مصروف تھے۔

''وہ......وہ کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مر چکا ہے......تم نے اسے جہنم واصل کر دیا۔''

''اوہ......'' آمنہ نے گہری سانس لی جو تکلیف کی شدت کی وجہ سے کراہ میں ڈھل گئی تھی۔

''ہلنے کی کوشش مت کرو۔ تم زخمی ہو مگر جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' کریم بولا۔ ''ایمبولینس پہنچنے والی ہے، تم ذرا ٹھیک ہو جاؤ، پھر میں تمہارے کان کھینچوں گا۔ تمہیں منع کیا تھا نا ہیرو بننے سے...... ذرا سوچو کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو......؟'' کریم کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم لوگ آرہے ہو، بچا لو گے مجھے......'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''تمہیں یہ خطرہ نہیں مول لینا چاہیے تھا۔ بہر حال اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ مسکرایا۔ ''یہاں بھی اور ڈپارٹمنٹ میں بھی۔''

وہ بھی جواباً مسکرائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی سماعت میں ایمبولینس کے سائرن کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کا دل مطمئن تھا۔ ایک بھیانک خواب بالآخر ختم ہوگیا تھا۔